انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

اڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

ناشر

انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ

۱/۱

شمارہ نمبر (۴)

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اُردو اَدب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ — دس روپے

قیمت فی پرچہ — دو روپے پچاس نئے پیسے

مطبوعہ
یونین پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی ۶

اُردو ادب ۵

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	میر کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ	ڈاکٹر محمود الٰہی	۵
۲	سودا کی غزلیں	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۳
۳	اُردو کی آوازیں	ڈاکٹر گیان چند	۵۳
۴	اردو کا ایک قلمی روزنامچہ	نادم سیتاپوری	۶۷
۵	مکاتیب امیر مینائی	ابو محمد سحر	۸۶
۶	منتخب الفواید	جاوید نہال	۱۰۳
۷	شاہ عبدالقادر کرنولی کا ارشادنامہ	سخاوت مرزا	۱۱۵
۸	بیخود بدایونی کی رام کہانی	معراج دھول پوری	۱۲۰

ڈاکٹر محمود الٰہی

کلیاتِ میر کا ایک نادر قلمی نسخہ

ریاست رام پور نے علم و ادب کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آج بھی کوئی بڑا تحقیقی کام وہاں کے کتب خانۂ رضائیہ سے استفادہ کئے بغیر غالباً مکمل نہیں گردانا جاسکتا۔ رام پور کی صولت پبلک لائبریری بھی مخطوطات، اخبارات و رسائل اور قدیم مطبوعات کے نادر ذخیرے کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لائبریری میں چند اہم نادر مخطوطات بھی محفوظ ہیں جن کا علمی حلقوں میں ابھی خاطر خواہ تعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ میرے نزدیک ان مخطوطات میں سب سے اہم کلیات میر ہے جو کئی حیثیتوں سے قابل لحاظ ہے۔

اردو میں تحقیق کا کارواں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن یہ امر قابل افسوس ہے کہ ابھی تک بڑے شاعروں کے دواوین اور کلیات کی ایڈیٹنگ اور تدوین نو کی طرف خاص توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ہمارے بڑے شاعروں میں صرف غالب کا دیوان (نسخۂ عرشی) ایسی صورت میں شائع ہوا ہے جسے محققانہ تدوین کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ سودا اور میر کا جو کلیات متداول ہے وہ الحاق و التباس سے پاک نہیں ہے۔ چار سال قبل اردو دنیا، آرام باغ کراچی نے کلیات میر مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ میر کے اہم مطبوعہ اور مخطوطہ دواوین و کلیات مرتب کے پیش نظر تھے اور انھوں نے میر کا تقریباً سارا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام بڑی محنت اور چابک دستی سے سمیٹ لینے کی کوشش ہے۔ لیکن دوسرے شعراء کے دواوین کی طرح اس میں بھی نہ تو اختلاف نسخ پر کوئی بحث کی گئی ہے اور نہ الحاق و اضافہ کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ ہند و پاک کی دانش گاہوں میں اب ایڈیٹنگ کا کام شروع ہو گیا ہے اور امید ہے کہ کلیات میر کا بھی کوئی تحقیقی ایڈیشن شائع کیا جائے گا۔ میر کے کلیات کا زیر بحث مخطوطہ نئے کام کرنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

یہ مخطوطہ اس لحاظ سے نامکمل کہا جاسکتا ہے کہ اس کے سرورق پر یا آخر میں نہ تو کاتب کا نام ہے اور نہ اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس کی کتابت کب ہوئی۔ اس کی بھی وضاحت نہیں ملتی کہ یہ میر کا کون سا دیوان ہے۔ اس نسخے کے تاریخی تعین کے سلسلے میں مجھے واضح شواہد اور قرائن تو نہ مل سکے

۷۔ در تعریف مادہ سگ گفتہ شد (۱۲ شعر)
۸۔ مثنوی در غربت برشگال کہ باراں دراں سال بسیار شدہ بود (۸۴ شعر)
۹۔ مثنوی در ہجو اکول یعنی بسیار خور بود (۴۷ شعر)
۱۰۔ مرثیۂ مرغ کہ بخانۂ فقیر بود (۲۴ شعر)
۱۱۔ در تعریف آقا رشید خوش نویس (۱۷ شعر)
۱۲۔ ساقی نامہ (۹۵ شعر)
۱۳۔ مثنوی مسمیٰ بجوش عشق
۱۴۔ مثنوی بدریائے عشق
۱۵۔ مثنوی مسمیٰ با عجاز عشق گفتہ شد
۱۶۔ مثنوی مسمیٰ بخواب و خیال گفتہ شد
۱۷۔ مثنوی مسمیٰ بہ شعلۂ شوق گفتہ شد

اس نسخے میں "من قصایدات میرؔ" کے عنوان سے چھ قصائد شامل ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(الف) جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل
(ب) فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجکو شکار
(ج) یک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال
(د) غنچہ ہو دل پر آتے ہیں اندوہ اب تمام
(ہ) جو پہونچی قیامت تو آہ و فغاں ہے
(و) رات کو مطلق نہ تھی یہاں جی کو تاب

اس نسخے میں حسب ذیل عنوانات کے تحت بھی کلام ملتا ہے:
(الف) مخمس غزل فارسی (ب) مخمس غزل مولوی جامی (ج) مخمس غزل خود (د) در ہجو خواجہ سرا (ہ) در صفت اسپ نواب آصف الدولہ بہادر۔ اس میں ۵۲ رباعیات ۱۹ مراثی اور سلام ملتے ہیں۔ مراثی اور سلام کے پہلے مصرعے یہ ہیں:

۱۔ حیدر کا جگر پارہ وہ فاطمہ کا پیارا (۱۷ بند)
۲۔ محرم کا نکلا ہے پھر کر ہلال (۳۶ بند)
۳۔ خاک تیری فرق پر اے بے مروت آسماں (۱۵ بند)
۴۔ ایماں یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی (۲۱ بند)
۵۔ بھائی بھتیجے خویش و پسر یاور اور یار (۲۳ بند)

۶۔ دل تنگ ہو مدینہ سے جب ادھر چلا حسین (۴۰ بند)
۷۔ نہ چھوڑی دشمنوں نے گھر میں شئے دوست (۱۶ بند)
۸۔ دکھ سے تمہارے کیا کلام یا امام یا حسین (بطرز غزل ۱۶ شعر)
۹۔ وقت رخصت کے جو روتی تھی کھڑی زار بہن (۲۹ بند)
۱۰۔ سجاد کو فلک نے کس کس طرح ستایا (۲۴ بند)
۱۱۔ امت تھی نبی کی کہ یہ کفار حسینا (۳۳ بند)
۱۲۔ شش اقلیم شوکت السلام (۱۰ اشعر)
۱۳۔ ساقی کوثر کے پیارے السلام (۹ شعر)
۱۴۔ اے بدخشان نبی کے لعل احمر السلام (۷ شعر)
۱۵۔ تمامی حجت کی خاطر امام (۳۵ بند مربع)
۱۶۔ آیا محرم غمگیں رہا کر (۲۴ بند)
۱۷۔ کہانی رات تھی آل نبی کی (۲۸ بند مربع)
۱۸۔ اے سبط مصطفےٰ کے تجکو سلام پہونچے (۹ بند مربع)
۱۹۔ السلام اے کام و جان مصطفےٰ (۱۶ بند مربع)

آخر الذکر مرثیہ مطبوعہ کلیات میں نہیں ہے۔ میرا یہ قیاس ہے کہ یہ میر کا غیر مطبوعہ مرثیہ ہے اور ابھی اس کا تعارف کسی نے نہیں کرایا۔ بہرحال ابھی میں اس پہلو پر مزید تحقیق کر رہا ہوں اور اگر یہ ایک اضافہ ثابت ہوا تو اردو ادب کی کسی اشاعت میں منظر عام پر آجائے گا۔

اٹھارہواں مرثیہ (سلام) "یعنی اے سبط مصطفےٰ کے تجکو سلام پہونچے" مطبوعہ کلیات میں تو نہیں لیکن خواجہ احمد فاروقی نے میر تقی میر ـــــ حیات اور شاعری میں اسے نقل کیا ہے۔ خواجہ صاحب کو یہ سلام عشرت رحمانی کے ذریعہ ملا تھا (بحوالہ اردو جولائی ۱۹۳۲ء) میری نظر سے محولہ بالا رسالہ نہیں گزرا کہ عشرت رحمانی کے ماخذ کا علم ہوتا۔ بہرحال یہ نسخہ خواجہ صاحب کے دعویٰ کا ایک مزید ثبوت فراہم کرتا ہے اور اب یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ میر کا کلام ہے۔ کاتب نے اس مخطوطے کا خاتمہ بھی اسی سلام کے آخری شعر:

ہر لحظہ اور ہر دم ہر گاہ اور بے گہ
اے شاہ دوسرا کے تجکو سلام پہونچے

پر کیا ہے۔

زیر بحث مخطوطے کے حاشیوں پر مختلف فارسی اور اردو شعراء کے متعدد اشعار درج ہیں جن میں

راسخ، اختر، نعمت خاں عالی اور نظامی قابل ذکر ہیں۔ بعض ایسے اشعار بھی ہیں جن کے شاعر کی تحقیق میں ابھی تک نہ کرسکا. صفحہ ۳ اور ۴ کے حاشیے پر قاضی محمد صادق خاں اختر کا حسب ذیل قطعہ ہے۔ (مخطوطے میں شاعر کا نام ہے) یہی قطعہ قاضی عبدالودود کو ایک مجہول المولف بیاض میں ملا تھا جسے انہوں نے ایک مختصر تعارفی نوٹ کے ساتھ ہماری زبان علی گڑھ (۸۔ اگست ۵۹ء) میں شائع کرایا تھا قاضی صاحب کے الفاظ میں یہ (قطعہ) ایک دوسری بیاض میں شیفتہ کے نام سے منسوب ہے اور تیسری میں سودا کے نام سے ہے .... اس کے اصل مصنف قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں اور یہ قطعہ ایک زمانے میں بہت مشہور تھا۔ اس قطعے کو مولانا حسرت موہانی نے بھی "مجموعہ مثنوی سراپا سوز........" میں اختر کے حالات کے ذیل میں نقل کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ قطعہ اردو زبان کے مشہور ترین قطعوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مخطوطے میں زیر بحث قطعہ کے بعض الفاظ قاضی صاحب اور مولانا حسرت موہانی کے نقل کردہ متن سے مختلف ہیں۔ اس لئے اسے من و عن نقل کیا جاتا ہے۔

کل شیخ بن کے مجتہد عصر آ گیا — دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہ تبختر مجھے بہ طنز — معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ سچ ہے یہ ہیں ہم بھی جانتے — پر کیا کہیں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو ایک عرض میں کروں — لیکن نہ کیجے گر مجھے مورد عتاب کا
سنے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو وہ تش — اور واں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حیا — دے ذائقہ زباں سے دہن میں لعاب کا
منت میں یوں کہے کہ میرا تو لہو پیے — گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو — گر آپ خوف کیجئے روز حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام — قایل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

اس قلمی نسخے کے حاشیے پر راسخ عظیم آبادی کی مثنوی "مہر و وفا" بھی درج ہے جو ۱۵۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی:

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق — شمع دیوان کبریا ہے عشق

سے شروع ہوکر "یہ تو ادنیٰ اثر ہے الفت کا — ننگ تاثیر ہے محبت کا" پر ختم ہوتی ہے کاتب نے شاعر کا نام نہیں لکھا۔ میر اور راسخ کی مثنویوں میں رنگ و آہنگ کی جو مماثلت پائی جاتی ہے، ممکن ہے کہ اس کے پیش نظر راسخ کی یہ مثنوی کلیات میر کے حاشئے پر لکھ دی گئی ہو، مثنویات راسخ کے مدون ڈاکٹر ممتاز احمد نے اس مثنوی کے صنعت عشق اور جذب عشق بھی نام بتائے ہیں لیکن اس نسخے میں مثنوی کا عنوان صرف "مہر و وفا" ہے۔

حاشیے پر ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو کلیات مطبوعہ میں نہیں لیکن میر کی غزلوں کے رنگ کے ہیں جو میر پر کام کرنے والوں کے لئے بہترین مواد ہے۔ اس کتب خانے میں مذکورہ کلیات میر کے علاوہ میر کی تین مثنویوں شعلۂ عشق، اعجاز عشق، اور دریائے عشق کے قلمی نسخے بھی ملتے ہیں جو اس لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔ کہ ان میں مطبوعہ کلیات کے متن سے بعض اشعار کے الفاظ مختلف ہیں۔

کلیات میر کے تعارف کے ضمن میں میر کی دریائے عشق کے ایک اور قلمی نسخے کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ جامع مسجد، گورکھپور کے کتب خانے میں یہ نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے جس سے سال کتابت کا یقین کیا جا سکے۔ مثنوی ۲۱ صفحات اور ۲۵۲ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ مطبوعہ کلیات میں یہ مثنوی ۲۶۵ اشعار کی ہے۔ اس مثنوی میں چند شعر ایسے بھی ہیں جو مطبوعہ کلیات میں نہیں ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مثنوی دریائے عشق (شعلۂ عشق) مرتبہ کارمائیکل اسمتھ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء میں پائے جاتے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں:

ایک نے ابتدا ملامت کی　　　ایک نے شور سے قیامت کی
ایک اسے تیر سے ڈراتا تھا　　　ایک برچھی اسے دکھاتا تھا
ایک کہنے لگا کہ او بے ننگ　　　زندگانی کا ہے یہ بھی کوئی ڈھنگ
مجکو گھر میں نہیں ہے اب آرام　　　دل کو شام و سحر ہے رنج تمام

صولت پبلک لائبریری، رام پور میں مذکورۃ الصدر مخطوطات کے علاوہ چند ایسے مخطوطات اور بھی جن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مثلاً، الف مرثیہ ــــ مونس و مراثی (ب) دلگیر ــ ایک مرثیہ (ج) ترغیب الجہاد ــــ مولانا اسمٰعیلؒ (د) رسالۂ حسن و عشق (فارسی) مجہول المصنف۔ (ھ) دیوان خستہ (و) دیوان مظہر جانجاں (فارسی)، دو نسخے (ز) قصۂ سیاہ پوش۔ کاتب کنور سین (ح) خلاصۃ التواریخ ــــ منشی سجان رائے (ط) منتخب تاریخ افغان ــــ شیخ عبداللہ۔ اس کتاب میں محبت خاں محبت کے ذکر کے ضمن میں ان کی مثنوی اسرار محبت کے چند شعر نقل کئے گئے ہیں۔ اور مثنوی کے شان نزول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ی) ۱۸۸۹ء مطابق ۱۳۰۶ھ کا ایک قلمی مجموعۂ رسائل ہے جو کیسر علی گڑھ تحریک کی مخالفت میں لکھا گیا ہے۔ اس میں سرسید کی تحریروں اور حالی کی شاعری کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ مسدس حالی کے جواب میں ایک مسدس بھی مجموعے میں شامل ہے (ک) اس قلمی ذخیرے کی آخری اہم کتاب میرے نزدیک قاضی محمد صادق اختر خاں کی مثنوی سراپا سوز ہے جس کا نام کاتب نے مثنوی سوز عشق لکھ دیا ہے۔

ؔ اس مثنوی پر عطا کاکوی کا ایک نوٹ معاصر حصہ ۳ میں شائع ہو چکا ہے۔

"مجموعہ مثنوی سراپا سوز ... " مرتبہ مولانا حسرت موہانی میں ناسخ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ نہیں شامل ہے۔ اس مخطوطے میں وہ قطعہ ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے سراپا سوز کے دو قلمی نسخوں کی نشان دہی کی ہے۔ یہ نسخہ ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے اور سراپا سوز کا سال تصنیف متعین کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ اشپرانگر نے اس کا سال تصنیف ۱۲۳۱ھ بتایا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے ناسخ کے قطعۂ تاریخ کو بنیاد بنا کر بجا طور پر اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ اس کا سال تصنیف ۱۲۴۴ ہجری ہے۔[۵۱] زیر بحث قلمی نسخے میں خود مصنف کی کہی ہوئی تاریخ شامل ہے جو در حقیقت جزوِ مثنوی ہے۔ اختر مثنوی اس طرح ختم کرتے ہیں:

حق تعالیٰ اسے کرے مقبول — بطفیل رسول و روح بتول
سال تاریخ کی اگر تصریح — کوئی چاہے تو تعمیہ ہے ملیح
سن کے آ و جد میں ہر ایک نے کہا — ہے یہ آتشکدہ محبت کا
ہو چکی یہاں تمام عشق کی بات — بر محمد و آلہ صلوٰت

"ہے یہ آتشکدہ محبت کا" سے ۱۲۳۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اشپرانگر کے پیش نظر مثنوی کا کوئی ایسا مسودہ رہا ہوگا جس میں مصنف کے یہ اشعار شامل رہے ہوں گے اور انہوں نے "ہے یہ آتشکدہ محبت کا" کو بنیاد بنا کر سال تصنیف متعین کر لیا۔ ان سے غلطی یہ ہوئی کہ شاعر نے تعمیہ کی طرف جو اشارہ کیا ہے، اس پر غور نہیں کیا جس کے رو سے سال تصنیف ۱۲۴۴ھ متعین ہوتا ہے۔ میکش اکبر آبادی نے سراپا سوز کے جس مطبوعہ نسخے کا ذکر کیا ہے۔ اس میں بھی یہ اشعار ملتے ہیں۔[۵۲]

اس جگہ سراپا سوز کے ایک اور نادر قلمی نسخے کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا جو آزاد لائبریری کے ذخیرۂ حبیب گنج (نمبر ۵۵/۲) میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۴۷ھ میں لکھا گیا تھا اور اس میں ناسخ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ شامل نہیں ہے۔ اس نسخے میں یہ ترقیمہ ہے:

"... مثنوی موسوم بہ سراپا سوز من تصانیف قاضی محمد صادق خاں متخلص باختر بخط بے نمط احقر العباد مرزا علیم الدین بوقت عصر روز دوشنبہ دہم شہر صیام المبارک ۱۲۴۷ھ اثنی عشر مائتہ وسبعتہ اربعون ہجریہ مقدسہ در مستقر الخلافتہ اکبرآباد بپاس مطالبہ خود صورت اختتام یافت"

---

۵۱ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔
۵۲ اردو ادب مارچ ۵۳ء

ڈاکٹر خلیق انجم

سودا کی غزل گوئی

سودا ایک عظیم شاعر تھے۔ لیکن عظیم غزل گو نہیں۔ اگر ان کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو ان کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا۔ ان کی شہرت و مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب ترین نمونے موجود ہیں اور صفِ اول کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انہوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ غزل میں "خارجیت"، "زورِ بیان" اور "نشاط آمیز لب و لہجہ" انہی کی دین ہے۔

میدانِ غزل میں جہاں تک زبان و بیان اور قدرتِ اظہار کا تعلق ہے۔ سودا کا ایک مخصوص رنگ اور لب و لہجہ ہے۔ جو اُن کی اُستادی پر حرف نہیں آنے دیتا۔ لیکن غزل کی دوسری شرائط کے اعتبار سے وہ اپنے بعض ہم عصر غزل گو شعراء سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ہر شاعر آسانی سے طبع آزمائی کر سکتا ہے۔ بلکہ اردو شاعری کی تو یہ روایت رہی ہے کہ تقریباً تمام شاعروں کی ادبی زندگی کا آغاز غزل ہی سے ہوا لیکن غزل بہت کم مزاجوں کو راس آتی ہے۔ اس میں بیشتر مضامین رسمی اور روایتی ہوتے ہیں۔ عام طور پر شاعر حسن و عشق اور شراب و میکدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن ان رسمی مضامین پر بھی شاعر کی اپنی چھاپ ہوتی ہے۔ ساغر و مینا کے پردوں میں اس کے احساسات، سماج اور دنیا کے متعلق اس کے نظریات، عام زندگی کے تجربات و مشاہدات غرض سب ہی کچھ چھپا ہوتا ہے۔

دوسرے اصنافِ سخن کی طرح غزل کی بنیاد بھی خارجی زندگی پر ہوتی ہے۔ لیکن غزل میں خارجی زندگی براہِ راست نہیں پیش کی جاتی۔ بلکہ مادی تجربات کو پہلے شاعر کے آتش کدۂ دل میں تپنا پڑتا ہے۔ اصل مسالہ دل کی دنیا سے فراہم ہوتا ہے۔ اور دماغ اسے خوبصورت سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ بالفاظ دیگر اعلیٰ درجے کی غزل گوئی کے لئے "دروں بینی" پہلی شرط ہے۔

سودا کا مزاج اور ذہن غزل کو راس نہیں آسکتا تھا، ان کی شوخ، چنچل اور طراروں سے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس دردمندی، سوز و گداز اور برشتگی و خستگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجے میں

نرمی و گھلاوٹ اور انداز بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ قدرت نے سوؔدا کو حزن و ملال اور ان کے لطیف احساسات سے محروم رکھا تھا اس لئے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقت یعنی غم کے آتش سیال کو الفاظ کے نرم و نازک سانچوں میں ڈھالنے سے معذور تھے۔

سوؔدا کا ادبی کارنامہ قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی ہے۔ جن میں داخلیت کی بجائے خارجیت کو دخل ہوتا ہے۔ اُن سے قبل ہی یہ دونوں اصناف اردو میں رائج تھیں۔ لیکن یہ صرف سودا تھے۔ جنھوں نے ان کو باقاعدہ فن کی صورت دی۔ اور فنی اعتبار سے ان اصناف کو انتہا پر پہنچا دیا۔ یہ بات بغیر کسی شک شبہ کے کہی جاسکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی اُن کا ثانی نہیں۔

اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سودا پہلے قصیدے اور ہجو کے شاعر ہیں۔ اور بعد میں غزل گو۔ اُن کی پوری غزلوں میں جتنے نشتر نکلیں گے وہ شاید اُن سے کم ہوں جو دوسرے درجے کے بعض معاصر شعرا کے ہاں مل جائیں گے۔ حالانکہ سوؔدا کے مقابلے میں ان کا سرمایۂ فن بہت مختصر ہے۔

کلیاتِ سوؔدا میں سوزؔ کی سوا سو کے قریب غزلیں اور بیانؔ، قائمؔ یقینؔ اور شیدا کے بعض اشعار بھی شامل ہوگئے ہیں۔ جنھیں ہم مدتوں سودا کا کلام سمجھ کر جھومتے رہے ہیں۔ اور بیانؔ، قائمؔ وغیرہ کی مثنویاں الگ ہیں۔

سوؔدا کی زندگی ہی میں بعض اہلِ نظر غزل گوئی میں دوسرے شاعروں کو اُن پر ترجیح دیتے تھے۔ لچھمی نرائن شفیقؔ نے چمنستان شعرا میں لکھا ہے "اگرچہ یقین ہے کہ مرزا سودا غزل، رباعی و مخمس و مثنوی و قصیدہ و قطعہ بند وغیرہ میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔۔۔ لیکن یقین کے ریختے میں جو فصاحت و ملاحت ہے وہ چیزے دیگر ہے۔"(۱) شفیقؔ نے یقینؔ اور سوؔدا کا موازنہ کرتے ہوئے کسی شاعر کی دو رباعیاں بھی نقل کی ہیں۔ پہلی رباعی میں سودا اور یقینؔ کو سجاد کلیم و میر و درد و تسکین اور ہندوستان کے تمام اردو شاعروں پر ترجیح دی ہے؎

جس طرح سے لاتے ہیں مضامینِ متین اشعار میں ریختے کے سودا و یقین
ایسا کوئی نہیں ہند میں ہر چند کہ ہیں سجاد و کلیم و میر و درد و تسکین

لیکن دوسری رباعی میں انعام اللہ خاں یقینؔ کو سودا سے بہتر شاعر بتایا ہے؎

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سوؔدا کرے جو فکر تتبع یقیں کا از دل و جاں
کہیگا معنی باریک و خوب شیریں تر ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں(۲)

صاحب نشترِ عشق نے لکھا ہے کہ "اگرچہ سودا تمام طرز کلام پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن مدح و قدح میں

سلہ چمنستان شعرا ص/۱۶۲
سلہ ایضاً ص/۱۶۲

کہ جس سے مراد ہجو و قصیدہ ہے انہوں نے معجزہ دکھایا ہے[۱]۔ شاہ محمد حمزہ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ سوداؔ غزل و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی سب خوب کہتے ہیں۔ اور خاص طور پر قصیدہ گوئی میں سحر سامری دکھاتے ہیں۔

سوداؔ کے ہم عصر شاعروں میں میر تقی میرؔ عظیم غزل گو تھے۔ اس لئے اکثر تذکرہ نگاروں نے ان دونوں فنکاروں کا موازنہ کیا ہے۔ اس موازنے سے متعلق کچھ کہنے سے بیشتر مناسب ہے کہ میرؔ کی بنیادی خصوصیت بیان کر دی جائیں تاکہ ان دونوں کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے میرؔ کی غزل گوئی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "انہوں نے (میرؔ نے) جس درد اور سوز کے ساتھ یہ نغمہ چھیڑا ہے اس کی مثال دنیائے اردو میں نہیں ملتی۔ میرؔ کی فنادگی و دل سوزی، خستگی و برشتگی نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کر دی ہے۔ اور ان کے کلام کو سوز و گداز کا آتشکدہ بنا دیا ہے۔"[۲]

سوداؔ اور میرؔ کے کلام میں صرف یہی فرق ہے کہ سودا اس خصوصیت سے محروم تھے جو میر کا طرہ امتیاز ہے اور بیشتر تذکرہ نگاروں نے بھی مختلف الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بھگوان داس ہندیؔ نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے "اکثر لوگ فن ریختہ میں میرؔ اور مرزاؔ کو ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ اور اکثر غزل و مثنوی میں میرؔ کو اور ہجو و قصیدہ میں مرزا کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں"[۳]۔ حکیم سید احمد علی خاں یکتاؔ کو سوداؔ سے بہت عقیدت اور محبت ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے دیباچے میں کیا ہے۔ لیکن وہ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ میرؔ کا فن لاثانی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میرؔ نے غزل کو اس انداز سے کہا ہے کہ کوئی اور نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اس باب میں ملک الشعراء پر حرف آتا ہے۔ (بظاہر ملک الشعراء سے مراد سوداؔ ہے)... لیکن میرؔ کی تقلید و پیروی بہت مشکل ہے۔ اگرچہ ان کا کلام فصاحت نظام سعدی کے کلام کی طرح بظاہر آسان نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ممتنع ہے۔ بیشتر شعراء ان کے مقلد ہیں۔ لیکن یہ شعراء مطلقاً ان کی طرز نہیں پا سکے۔ اس کے برخلاف اگرچہ سودا کے کلام میں کمال پختگی ہے۔ لیکن ہر صاحب فہم کے لئے اس کی تقلید ممکن ہے"[۴]۔ یکتاؔ نے میرؔ اور سوداؔ کے کلام پر بہترین تنقیدی رائے دی ہے۔ دماغ کی شاعری کی تقلید ممکن ہے۔ لیکن دل

---

[۱] نشتر عشق (قلمی) ورق
[۲] میر تقی میر ص/۳۲۱-۳۲۲
[۳] تذکرہ ہندی ص/۲۴
[۴] دستور الفصاحت ص/۲۵

کی شاعری کی نہیں۔ اور سودا کی غزل گوئی دماغ کی شاعری ہے۔

قدرت اللہ قاسم نے ان دونوں کے فرق کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "بعض لوگوں کے خیال سے مرزا اچھے غزل گو نہ تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا ایک بیکراں دریا ہیں اور میر ایک عظیم الشان نہر۔ جہاں تک فن کی معلومات کا تعلق ہے میر کو مرزا پر برتری اور قوت شاعری میں مرزا کو میر پر سروری حاصل ہے" [۱] قاسم کی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سودا تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ لیکن میر صرف غزل گوئی پر قادر تھے۔ مگر اس فن میں بے مثال تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد ان دونوں کے کلام کے متعلق رائے دیتے ہیں کہ "میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز تھی اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لئے ان کی غزلیں بھی ہیں۔ اور خاص خاص بحور و قوافی میں ہیں۔ مرزا کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر، ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ توسن فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا۔ رک نہ سکتا تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے۔ تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی۔ جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے باندھ لیتے تھے۔ بیشک ان کی غزلوں کے اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدے کا رنگ دکھاتے ہیں"[۲]

آزاد نے میر اور مرزا سے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ جس سے ان دونوں کے کلام کی خصوصیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ نہ ہوا ہو۔ لیکن اس سے میر اور مرزا کا فرق بخوبی واضح ہوتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ "ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انہیں کے پاس گئے۔ اور عرض کی کہ آپ فرمائیں انہوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے [۳]

جدید دور کے تذکرہ نگاروں میں رام بابو سکسینہ کہتے ہیں "مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات جزئیات کے بیان کی قدرت دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے" [۴] غرض یہ کہ سودا غزل میں داخلیت کو نہ نبھا سکے۔ اور خود

---

[۱] مجموعہ نغز جلد ۱ ص/۲۳۱
[۲] آب حیات ص/۱۶۴-۱۶۵
[۳] آب حیات ص/۱۶۴
[۴] تاریخ ادب اردو (اردو ترجمہ) ص/۱۷۴

سودا کو بھی یہ احساس تھا کہ لوگ انہیں قصیدے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

کہتے ہیں وہ جو ہے سودا کا قصیدہ ہی خوب ان کی خدمت میں لئے میں یہ غزل جاؤں گا

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سودا غزل گوئی میں میر تک نہیں پہنچ پائے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا سودا غزل میں بالکل ناکام رہے؟ کیا ان کا اپنا رنگ اور انداز نہیں تھا۔ اور وہ صرف روایتی مضامین باندھتے رہے۔ شیخ چاند کا یہی خیال ہے کہ سودا کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"سودا کا غزل میں کوئی خاص رنگ نہیں۔ وہ اس میدان میں طرح طرح طبع آزمائی کرتا ہے۔ غزل کی جان سادگی بیان ہے۔ سودا نے غزل میں اس کا بہت کم خیال رکھا ہے۔"

مجھے شیخ چاند کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ غزل میں سودا کا اپنا رنگ ایک مخصوص رنگ ہے جس کی بنیاد خارجیت، زور بیان اور نشاط آمیز لب ولہجے پر ہے۔

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

سودا غالباً پہلے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کو داخلیت کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر نکالا۔ اگرچہ اس کوشش میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ ان کا کلام عموماً بے تاثیر ہو گیا۔ لیکن مصحفی کے ہاں جو داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ سودا کا مرہونِ منت ہے۔ سودا نے غزل کو جو ایک خارجی انداز بخشا تھا۔ مختلف زمانوں میں ان کے نمائندے انشا، جرات، ناسخ، شاہ نصیر اور ذوق وغیرہ رہے ہیں۔ یہ تمام شعرا اپنے اپنے مزاج کے مطابق سودا سے متاثر تھے۔ سودا کے ہاں جو زور بیان معنیٰ آفرینی، خیال بندی، پرواز تخیل، جدت بیان، قدرت اظہار نشاط انگیزی اور جوش و خروش ہے۔ اردو ادب میں اس کی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ سودا کو زبان پر پورا عبور رہے۔ سینکڑوں ہندی اور فارسی محاورے انہیں کی بدولت اردو زبان میں داخل ہوئے۔ الفاظ خواہ ہندی کے ہوں یا ٹھیٹھ فارسی کے، ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ سودا ان کو اس طرح برجستہ استعمال کرتے ہیں کہ وہ الفاظ اردو کے معلوم ہوتے ہیں۔ زبان پر ان کی یہی قادر الکلامی ہے۔ جو سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیتی ہے۔ اور وہ مشکل سے مشکل خیال کو باندھ لیتے ہیں۔ ان کی جدت پسند طبیعت نے گلستانِ غزل کو دلآویز، حسین اور رنگین استعارات اور تشبیہات کے پھولوں سے سجایا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ سودا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا "زور بیان" ہے۔ وہ معمولی سے مفہوم کو اس انداز اور ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ شعر میں برجستگی صوتی بلند آہنگی ترنم اور ایک مخصوص موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میر نے اُن کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

۵؎ سودا ص/۱۴۲-۱۴۳

"بسیار خوش گو است، بلا گرداں ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ،
در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ بر مصرع برجستہ اش سرو
آزاد بندہ، پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ" ؎۱

محمد حسین آزاد نے سودا کی جن خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی خصوصیت زور بیان ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے۔ جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس در و بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چابیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں، شعر مزا ہی نہیں دیتا۔" (۱)

ان خصوصیات پر تفصیلی بحث آگے کی جائے گی۔

مناسب ہوگا اگر ہم یہاں ان فارسی شاعروں کا ذکر کر دیں۔ جنہوں نے سوداؔ کو متاثر کیا۔ اور ان کی ادبی شخصیت کے بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔

سوداؔ اور فارسی شاعر اگرچہ عہد محمد شاہ میں فارسی شاعری روبہ زوال تھی، لیکن ابھی تک اس کی ادبی حیثیت برقرار تھی، شمالی ہند میں ابتدائی دور کے کچھ فارسی شعرا نے اردو میں شعر کہنا شروع کئے۔ یا اردو کی سرپرستی کی۔ دوسرے قسم کے شاعروں میں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں بہت اہم ہیں۔ آرزو فارسی کے بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ انہوں نے خود بھی اردو میں شعر کہے۔ لیکن اردو شاعری پر ان کا ناقابلِ فراموش احسان یہ ہے کہ انہوں نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی پہلی نسل کی تربیت کی۔ اور ان کی کوششوں کو سراہا۔ مرزا مظہر نے بھی کچھ دوسری نسل کے لئے کیا۔

فارسی میں اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہونا بند ہو گئے تھے۔ لیکن اس دور کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں فارسی ادب کا بہت اچھا مذاق تھا۔ اور پھر وہ لوگ اردو شاعروں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ خود فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اس لئے فطری طور پر اردو غزل فارسی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اردو شاعروں پر فارسی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ابتدائی دور سے لے کر غالبؔ تک بہت کم صفِ اوّل کے ایسے شاعر ملیں گے۔ جنہوں نے

؎۱ نکات الشعرا ص/۳۱ ؎۲ آبِ حیات ص/۱۵۸

فارسی میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ سودا کے بارے میں روایت ہے کہ وہ پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بلکہ انہوں نے خود اپنے ایک قطعہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلیات میں دیوانِ فارسی بھی شامل ہے۔ فارسی ادب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔ اور فارسی کے مسلم الثبوت استادوں سے انہیں کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ عبرت الغافلین سے ہوتا ہے۔ جس میں سودا نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مرزا فاخر مکیں نے امیر خسرو، شیخ سعدی، مولانا روم، مولوی جامی، آسی سبزواری، نعمت خاں عالی، مرزا صائب، خان آرزو اور دوسرے فارسی شعرا کے کلام پر کئے تھے۔ اور پھر خود سودا نے فاخر مکیں کے اشعار پر اعتراضات کئے ہیں۔ سند کے طور پر انہوں نے جو فارسی اشعار پیش کئے ہیں وہ بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے فارسی ادب کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے بعض فارسی مصرعوں اور غزلوں کو بھی تضمین کیا ہے۔

سودا نے کسی فارسی شاعر کا مکمل تتبع تو نہیں کیا۔ لیکن اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات سے وہ ضرور متاثر ہیں اور بعض شاعروں کے اندازِ سخن کی چھاپ ان کے کلام پر پڑی ہے۔ چونکہ وہ غیر معمولی ذہین انسان تھے۔ ایجاد اور جدت کی پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اس لئے فارسی شاعروں سے انہوں نے جو کچھ مستعار لیا۔ اس پر قناعت نہیں کی بلکہ ان تمام پھولوں کو سجا کر خود اپنا گلستاں بنا لیا ہے۔

اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات کو "سبک ہندی" کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی بدنظمی، معاشی بدحالی اور روبہ زوال تہذیب کا اثر فارسی ادب پر یہ پڑا کہ ادب میں جمود آ گیا۔ ایک مخصوص اقتصادی نظام اور تہذیب کی ترقی کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے۔ زندگی ایک منزل پر پہنچ کر رک گئی تھی ظاہر ہے کہ ادب بھی اس منزل سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ اس ٹھہراؤ اور جمود نے ادب میں جو رجحانات پیدا کئے انہیں اہلِ ایران "سبک ہندی" کہتے ہیں۔ پروفیسر سید حسن "سبک ہندی" کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں " اس سبک کی خصوصیات یہ ہیں۔ دقتِ مضامین و رقتِ معانی، پیچیدگیٔ خیال، باریک اندیشی و نازک کاری، مشکل پسندی و نکتہ آفرینی، دور و دراز تشبیہات و استعارات کا کثرت سے استعمال، صحت زبان کو قربان کر کے نئے نئے مضامین و جدید مطالب کی بندش، تصنع اور تکلف میں افراط اور استحکام زبان و افکار کی طرف سے لاپروائی۔ ایرانی نقاد کا خیال ہے کہ اس سبک نے فارسی شاعری میں ابتذال اور سوقیانہ پن پیدا کیا۔ اور ہندوستانی شعرا جس چیز کو ندرتِ مضمون اور جدتِ خیال سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت عامیانہ افکار کی بندش ہے" [۱]

شاہ حاتم پہلے اردو شاعر ہیں۔ جو ان رجحانات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے شاگرد سودا کے ہاں ان میں سے تمام نہیں تو کچھ خصوصیات مل جاتی ہیں۔

---

[۱] اردوئے معلی غالب نمبر جلد ۱ ص/۶۹

سودا پر جن فارسی شاعروں کا اثر نظر آتا ہے وہ اسی سبک ہندی کے نمائندہ شاعر ہیں۔ بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے۔ "اگر مثال بندی اشعار غزل میں سودا کو اپنے وقت کا صائب کہا جائے تو ٹھیک ہے"۔[1] حکیم سید احمد علی خاں یکتا نے بھی سودا پر صائب کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے سودا اس پاکیزگی اور ملاحت کے ساتھ غزل کہتے ہیں کہ اگر صائب موجود ہوتے تو خود اس کی داد دیتے۔[2]

سودا کے ہاں جو خارجیت ہے وہ ایک حد تک صائب کا اثر ہے۔ صائب زورِ بیان میں غزل کو قصیدے کی حدوں میں لے آتے ہیں۔ یہی حال سودا کا ہے۔ ان کی اکثر غزلوں پر قصیدے کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ صائب کی طرح ان کے ہاں بھی مثالی شاعری کے اچھے خاصے نمونے مل جاتے ہیں۔ سودا نے صائب کے ایک مصرع کو بہت دلچسپ انداز میں تضمین کیا ہے ؎

سنا ہووے جو سودا یہ مصرع صائب   تو پوچھ خلق سے میں کیا کروں بیاں تنہا
کہ ایک دن میں اُسے راہ میں اکیلا دیکھ   کہا کدھر چلے اے فخرِ شاعراں تنہا
دیا جواب دلم سیر باغ می خواہد   کہا میں ہو متبسم کہ مہرباں تنہا
جو ہووے امر تو میں بھی چلوں کتاب کے بیچ   رکھے ہے لطف بھلی کچھ سیر بوستاں تنہا
سنا یہ مجھ سے تو کہنے لگا کہ پوچ مگو   گرفتہ ایم اجازت ز باغباں تنہا

سودا نظیری نیشاپوری سے بھی بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ نظیری کی طرح وہ بکثرت محاورے استعمال کرتے ہیں۔ اور بقول شیخ چاند "حالات وکیفیات اور معشوقانہ اداؤں کو سودا نے مادی اشیاء سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ سب نظیری کا اثر ہے۔ اس کے سوا اس کی تقلید میں مضامین کو جدت آمیز انداز میں بھی بیان کیا ہے"۔[3] نظیری کی طرح سودا نے بھی قطعہ بند غزلیں کہی ہیں جن میں وہ نظیری سے کچھ کم کامیاب نہیں ہیں۔ سودا کا ایک مقطع ہے۔

یہ غزل سودا کہی ہے تو نے اس انداز کی   ہند سے پہونچے گی ہاتھوں ہاتھ نیشاپور تک

اس شعر میں سودا نے غالباً نظیری سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

سودا کے ہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں۔ جن میں مضمون آفرینی، نازک خیالی، باریک اندیشی اور خیال بندی کے جوہر دکھلائے گئے ہیں اور بظاہر یہ اثر مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی کا ہے۔ جو اس میدان کے مرد ہیں۔ سودا ناصر علی کو نعمت خاں پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ ناصر علی کا "خیال" مرغوب تر ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں   اُس سے مرغوب تر ہے اس کا خیال

---

[1] ا۔ تذکرہ ہندی ص/۱۲۵۔ ب مصحفی کے بھی تقریباً یہی الفاظ ہیں۔ تذکرہ ہندی گویاں ص/۱۳۵
[2] دستور الفصاحت ص/ ۱۷   [3] سودا ۔ ص/۱۵۶

لیکن سودا پر بیدل کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ انہوں نے بیدل کے مصرعے بھی تضمین کئے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

سودا بقول حضرت بیدل بکوئے دوست   خط جبین ماست ہم آغوش نقش پا

ایک اور غزل کے قطعہ بند اشعار ہیں۔

سودا سے کہا میں کہ ترے شہرے کو سن کر   دیکھا جو تجھے آ کے تو لے بے سر و پا ہیچ
بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرع بیدل   عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

سودا قصیدے اور ہجو کے بادشاہ تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں شعر مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد و غیر ازیں کہ زبان ہر دو۔ باہم مخالف دارد فرقے نتواں کرد"... مگر ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم ہے۔ سودا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے کہ محاورہ اور زبان کا حاکم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ ہے۔[1] یہ جملہ خوبیاں سودا میں موجود تھیں۔ جو بظاہر اس بات کا ثبوت ہیں کہ انوری کو بھی سودا کے مزاج میں اچھا خاصا دخل تھا۔ سودا نے ایک قطعہ بند غزل لکھی ہے جس میں الفاظ کی شان و شوکت، زور بیان اور محاوروں کے برجستہ استعمال میں وہ انوری تک پہنچ گئے ہیں۔ انہیں خود بھی اس کا احساس ہے کہ یہ مخصوص انداز سخن انوری کا ہے۔ اسی لئے مقطع میں کہتے ہیں

غرض یہ وہ غزل قطعہ بند ہے سودا   کہ اس کی قدر کوئی کیا جز انوری جانے

سلیم اور کلیم فارسی کے مشہور تمثیل نگار شاعر ہیں۔ سودا نے ان کی غزلوں کو تضمین بھی کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں شاعروں کو پسند کرتے تھے۔ ان شاعروں کی طرح سودا کے یہاں بھی تمثیل نگاری ہے اور غالباً اسی لئے قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں۔ "در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گزارد"[2]

اب ہم مختلف عنوانات کے تحت سودا کی غزل گوئی کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کریں گے۔

داخلیت

دبستان دلی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہے جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو مغل حکومت کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔ جس پر تفصیلی بحث پہلے باب میں کی جا چکی ہے۔ کچھ لوگ تصوف کے شیش محل میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ کچھ نے عیش و عشرت میں ڈوب کر زندگی کی تلخیوں کو بھلا دیا تھا۔ اس عہد کے صوفیا یا تصوف کے فلسفوں سے دلچسپی رکھنے والے عام طور پر وہ لوگ تھے جو اجتماعی زندگی سے رشتہ توڑ کر انفرادیت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اردو شاعری میں شدید

---

[1] آب حیات ص/۱۶۳   [2] طبقات الشعراء (قلمی)

داخلیت انہیں سماجی اور سیاسی حالات کی پیدا کردہ ہے۔ ابتدائی عہد کے بعض اردو شاعر خود صوفی تھے اور اکثر شاعروں کو تصوف سے دلچسپی تھی۔ اسی لئے خود میں گم رہنے کا انداز" لینی ذات کے علاوہ تمام کائنات کو فراموش کردینے کی تمنا، محبت میں محبوب سے بھی بے نیاز ہوجانا داخلیت کے یہ مختلف روپ شاعری میں بہت مقبول ہوئے۔ داخلیت کے شہنشاہ میر تقی میر ہیں۔ جو برباد ہوگئے۔ لیکن ہارے نہیں۔ جنہوں نے ایک زندہ صوفی کی طرح خود کو گم کرکے پوری کائنات کو حاصل کیا۔ دبستانِ دلی کی اس خصوصیت یعنی داخلیت کا آغاز میر سے ہوتا ہے۔ سودا کے ہاں بھی داخلیت ہے مگر اس میں میر کا سا سوز و گداز اور خستگی و برشتگی کی بجائے رنگینی اور سرمستی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر اور سودا کی داخلیت اور اظہار غم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مرزا سودا اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے میر اور درد سے مختلف آدمی تھے مگر انہوں نے بھی زمانے کی لاٹھی کھائی تھی۔ انہوں نے متین اور باوقار احتجاج کی بجائے ہزل اور سوقیت کے دامن میں پناہ لی۔ سودا کے انداز کو بزبانِ غم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔[۱] ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سودا کے ہاں میر، درد اور قائم اور اثر جیسی داخلیت نہیں ہے۔ وہ خارجی شاعر ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں خارجیت انہیں سے شروع ہوتی ہے اور سودا کی غزل میں جو خارجیت ہے وہ ہزل اور سوقیت سے پاک ہے۔

سید امداد امام سودا کی داخلیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> خارجی پہلو کو تو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبان اردو میں سوا میر انیس کے کوئی ان کا جواب نہیں ہے۔ مگر داخلی پہلو پر ان کو ویسی قدرت حاصل نہ تھی جس کے سبب سے وہ میر تقی صاحب میر سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں۔[۲]

سودا کی داخلیت میں خارجیت کی بھی ہلکی سی چاشنی ہوتی ہے۔ اُن کے ہاں بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں صرف داخلیت ہو چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کہ ہم

اتنا کہاں ہے سوز طلب دل پتنگ کا
رکھتی نہیں ہے شمع بھی ایسا جگر کہ ہم

بس نہ تھا اک داغ اسے دل پھر تو اس سے لگ چلا
اُس دبی آتش کو ڈرتا ہوں نہ سلگائے فراق

سینے سے سوزِ عشق ترا ہاتھ کب اٹھائے
تا پھوٹ کر جگر سے نہ جائے پار داغ

دیکھا جو ادھر خشم سے ڈر کر
دل خالی کیا میں آہ بھر کر

کیوں مجکو نہ مارا غم دوری نے ترے آہ
کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہار محبت

---

۱ نقد میر ص/۲۷		۲ کاشف الحقائق (جلد دوئم) ص/۱۰۶

تصورِ حسن و عشق

ناممکن ہے کہ سوداؔ قتیل غمزہ و عشوہ نہ رہے ہوں۔ لیکن ان کا عشق بھی لاکھوں انسانوں کی طرح معمولی عشق تھا۔ جس کی بنیاد ذہنی کیفیات سے زیادہ جسمانی ضروریات پر ہوتی ہے۔ سوداؔ کا دل و دماغ عشق کے معمولی تجربات اور روایتی مضامین تک محدود ہے اس لئے وہ اس مقام سے محروم ہیں جہاں عشق مادی کثافت کے پردے چاک کر کے حقیقت کا انکشاف کرتا ہے اور عاشق کے دل میں ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا درد سمو دیتا ہے۔ ان کے ہاں ماورائیت اور روحانی عشق کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں مگر یہ عشق صرف ذہن و فکر تک محدود ہے۔ جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس عشق کی بنیاد ان فلسفوں پر ہے جو اس دور یہ زوال تہذیب میں ذہن انسان کے آخری پناہ گاہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے مادی عشق میں وہ بلندی اور رفعت نہیں جو ذہنی آسودگی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان کا عشق صحت مند نہیں اس لئے مجبوراً انہیں عشق کے اس تصور کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جو تصوف کی دین ہے۔ جس میں مجازی عشق زینہ ہے حقیقت تک پہنچنے کا۔ ذاتِ خداوندی میں خود کو کھو دینے کا۔ یا بالفاظ دیگر جز کی انفرادیت کھو کر کل ہو جانے کا۔ لیکن تصوف میں بھی سوداؔ فکر و خیال سے آگے نہیں بڑھتے۔

اُن کے ہاں عشق کے بیشتر مضامین محض رسمی اور روایتی ہیں۔ اور عشق کا تصور وہی ہے۔ جو اس دور میں مقبول تھا۔ جس میں جنس اور روحانیت، محبوب اور خدا خلط ملط ہو گئے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں مادی عشق کی بہت اہمیت تھی۔ کیونکہ یہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے اس لئے یہ حضرات اپنے مریدوں کو مجازی عشق کی ہدایت کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک انسان خود کو مادی عشق میں جلا کر خاک نہ کرے اسے یہ حق نہیں ملتا کہ وہ خدا تک پہنچنے کی تمنا کرے۔ میر تقی میر کے والد میر کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ

"بیٹا عشق کرو۔ عشق ہی اس کارخانہ ہستی کا چلانے والا ہے . . . بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔"[1]

اسی قسم کی نصیحت نقشبندی سلسلے کی ایک برگزیدہ ہستی یعنی مرزا مظہر جان جاناں کو اُن کے والد بھی کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "جس انسان کا دل محبت کے داغوں سے برشتہ نہیں ہوا۔ اور اُس کی طبیعت کے خاشاک جل کر خاک نہیں ہوئے اور دل پاک نہیں ہوا اس کی طینت کی زمین خدا کی محبت کے تخم کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ مجازی عشق زینہ ہے عشق حقیقی کا ——— اگر تم نے عشق مجازی کا رشتہ طوقِ گلو نہ کیا اور کوچہ و بازار میں رسوا و خوار نہ ہوئے تو فقیری روح تم سے خوش نہیں رہے گی۔"[2] سودا کے ہاں اس عشق کا واضح تصور ملتا ہے۔ اُن کا شعر ہے ؂

---

[1] میر کی آپ بیتی ص/۳۳ [2] معمولات مظہریہ ص/۱۱

ناصحا اس عشق سے ہوتا ہے لذت یاب دل جس میں حرمت کم ہو رسوائی و خواری بیشتر

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا سنتا ہے اے دِوانے جب دل دیا تو پھر کیا

اس عشق میں سر پر خاک ڈالنی پڑتی ہے۔ گریبان چاک کرکے خاک و خون میں نہانا پڑتا۔ عشق کی لذت تو اسی میں پنہاں ہے کہ انسان ناکام رہے۔ اور خون جگر کھاتا رہے۔ بقول سودا خضر نے آب حیات صرف اس لئے پیا تھا کہ وہ خون جگر کی لذت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

عشق میں خون جگر کھانے کی گر لذت نہ تھی خضر نے حیراں ہو آبِ زندگانی کیوں پیا

عشق میں لطف ہی ناکامی کا ہے۔ اگر عاشق کی آہ و زاری کا اثر محبوب پر ہو جائے تو وہ عشق کی اصل لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔

تاثیر عشق نے مزہ درد کھو دیا ان نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا

سودا کو اس کا افسوس ہے کہ غم دوری" میں وہ زندہ رہے۔ گویا ان کی محبت میں ابھی کمی تھی۔ اب ان کی غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ محبوب کے پاس جائیں اور اظہار محبت کریں۔

کیوں مجکو نہ مارا غم دوری نے ترے آہ کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہار محبت

عشق میں وہ دونوں انسان کامیاب ہیں جنہوں نے اپنے محبوب کو پالیا یا جو محبوب کے راستے پر شہید ہو گئے۔ سودا کوہکن کی اس لئے تعریف کرتے ہیں۔ وہ اگر "قمار عشق" میں شیریں کو نہ پاسکا تو کیا ہوا۔ اس نے اپنا سر تو کھو دیا۔ اور پھر سودا خود کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور شرم دلاتے ہیں کہ جب ان سے یہ بھی نہ ہو سکا تو پھر کس منہ سے خود کو "عشق باز" کہتے ہیں۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

اور پھر یہاں سے سودا کے عشق میں ماورائیت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ ان کا عشق افلاطونی بننے لگتا ہے۔ شاعر پر محبوب کی آنکھوں کا جادو چلتا ہے اور نہ زلفوں کا سحر۔ وہ عشق برائے عشق کرتا ہے۔

نہ آنکھوں میں تری جادو نہ ہرگز سحر زلفوں میں یہ دل جس سے ہے دیوانہ محبت کا ہے وہ لٹکا

عشق ایک فن شریف ہے جو ہر بوالہوس کے بس کی بات نہیں۔ مرزا مظہر کا ایک شعر ہے

ہوس عشق مکن اے دل بے صبر و قرار عاشقی فن شریفے ست و لے کار تو نیست

سودا کا شعر ہے۔

گر کہیں عاشق ہے اے سودا تو میں تجھ سے کہوں وہ عمل لائیو جو نیک ہو کردار عشق

ایک اور شعر ہے

عشق سے صاف دلوں کو نہیں تازی نسبت　　　　رہے تھا سنگ میں پہلوے شرر آئینہ

عشق کا وہ مسلک ہے جس میں انسان کے جذبے کی قدر ہے۔ جہاں فلاں ابن فلاں کی کوئی قیمت نہیں۔ عشق کا کوئی حسب ہے اور نہ نسب بقول سوداؔ ؎

کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سوداؔ　　　　جوں ذاتِ خدا جس کی حسب ہے نہ نسب ہے

عشق کا گھر دیر و حرم کی طرح تنگ بھی نہیں۔ اس میں اتنی کشادگی اور وسعت ہے کہ ہر فرقے، ہر جماعت اور ہر مذہب کے لوگ اس میں آسکتے ہیں ؎

عشق وہ گھر ہے جہاں ہفتاد و دو ملت کو ہے راہ　　　　تنگ جوں دیر و حرم کب در ہے اس درگاہ کا

عشق ایک مذہب ہے۔ اسلام میں خلاف شریعت کام کرنے والے کو دوزخ میں ڈالا جائے گا لیکن مذہب عشق میں گناہ کرنے والے کے لئے بہت بڑی سزا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی دوزخ نارِ عشق کا ایک شمہ ہے ؎

عشق کے ذرہ شریعت سے قدم باہر نہ رکھ　　　　سمجھے ہے دوزخ کو اپنا ایک شمہ نارِ عشق

اگر جذبہ صادق ہے۔ اور عاشق سلامت روی سے راہ عشق طے کرتا ہے تو بندگی اپنی انتہا کو پہنچ کر خداوندی ہو جاتی ہے اور بقول سوداؔ ؎

کمال بندگی عشق ہے خداوندی　　　　کہ ایک زن نے مہ مصر سا غلام لیا

اگرچہ محبوب گوشت پوست کا انسان ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ مظہر خداوندی ہے۔ خدا کا نور ہے جو خوبصورت انسانوں کے سانچوں میں ڈھل گیا ہے ؎

کفر کی میری تجلی ہے نظیر شمع طور　　　　پوجوں ہوں جس بت کو میں اک نور ہے اللہ کا

یا

جھمکے ہے انہیں حق کی تجلی کہ جو کوئی　　　　جوں شمع ہو رہے ہیں سراپا گداز عشق

سوداؔ کے ہاں یہ تمام مضامین محض روایتی اور رسمی ہیں انہوں نے تصوف کو محض فلسفے کی حد تک قبول کیا ہے۔ ان کی عملی زندگی میں اسے کوئی دخل نہیں۔ اسی لئے سوداؔ کے تصور عشق میں ایک جمود اور ٹھہراؤ ہے۔ اس میں متحرک زندگی کے آثار بالکل نظر نہیں آتے۔

سودا کے عشق کا بھرم اس وقت کھلتا ہے جب کہ وہ اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہیں

محبوب ان کے ہاں محبوب کا کوئی مکمل اور جامع تصور نہیں۔ انہوں نے محبوب کے جسم، بعض اعضا اور صفات کی ضرور مدح کی ہے۔ مگر پورا کلیات سوداؔ پڑھنے کے بعد بھی ہمارا ذہن سوداؔ کے محبوب کی تصویر بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اور سیرت الفاظ کے گورکھ دھندے میں چھپی رہتی ہے۔ بظاہر اس

کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ خود سودا کے ذہن میں کوئی حسین تصویر نہیں تھی۔ ان کے ہاں ذاتی تجربات، مشاہدات اور انفرادی حسیات و تاثرات کی شدید کمی ہے۔ انہوں نے خوبصورتی کو جانچنے کے تمام پیمانے مستعار لئے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ اسی لئے محبوب کی تعریف میں انہوں نے جتنے بھی مضامین باندھے ہیں۔ وہ سب محض رسمی ہیں۔ اور کہیں بھی محبوب کی انفرادیت نہیں ابھرنے پائی۔

ان کے ہاں وہ معاملہ بندی بھی نہیں جو انشا و جرأت اور بعض دوسرے شاعروں کے ہاں مل جاتی ہے اور جو کم از کم ایک زندہ محبوب کا پتا دیتی ہے۔

سودا کا محبوب امرد ہے ایسے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں انہوں نے اپنے محبوب کے "خط" کے متعلق گل افشانیاں کی ہیں۔ خط کا تعلق جمالیات سے نہیں، حسیات اور تاثرات سے بھی بہت کم ہے۔ یہ مضمون صرف شعر کہنے کے لئے ہوتا ہے اس موضوع پر سودا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جز خط سبز عارض دلدار ہم نشیں
دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو رنگ اور نمک

خط آ چکا پہ مجھ سے دلہی ڈھنگ اب تلک
ویسا ہی میرے نام سے ہے ننگ اب تلک

خط سبز اس کے ست عارض پر ہو گیا دونی صفا
یہ وہ آئینہ ہے پہونچا دے جسے زنگار فیض

کوچ شاہ حسن کا ہے وہ غبار خط نشاں
گرد لشکر سے اٹھی وقت سواری پیشتر

ممکن ہے ہیئت کے اعتبار سے اس قسم کے بعض اشعار کا شمار عظیم شاعری میں ہو جائے۔ لیکن جہاں تک مضمون اور مواد کا تعلق ہے یہ تیسرے درجے کی معمولی، سطحی اور ناقص شاعری ہے۔ پہلے شعر کا مضمون "رنگ اور نمک نا ردیف اور قافیہ کا مرہون منت ہے۔ اور "نمک" ردیف ہے اور "رنگ" قافیہ کا دوسرا شعر مطلع ہے اور ظاہر ہے کہ "ڈھنگ" اور "ننگ" کے قافیے اس کی تخلیق کے موجب ہیں۔ تیسرا شعر "خط سبز" "دونی صفا" "آئینہ" اور "زنگار" جیسے الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ چوتھے شعر میں ایک خوبصورت تشبیہ ہے۔ ان تمام اشعار سے سودا کی قادر الکلامی کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کو اپیل نہیں کرتا۔

اب چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سودا نے محبوب کے جسم، خط و خال اور بعض اعضا کی تعریف کی ہے۔ ؎

عالم کا قمری آسا ہے طوق بندگی کا
قامت کو تیرے جیسے سرو رواں بنایا

لب لعل بتاں پر سرخی پان ہے کہ جادو ہے
بنا دی شکل طوطی صورت سرخاب آتش پر

یہ اس کے رنگ عارض سے ہے دل و جاں پر
ٹھیرتا ہی نہیں سینے میں جوں سیماب عاشق پر

دیکھے اگر صفائے بدن کو ترے صبا
کھولے کبھو نہ شرم سے بند قبائے گل

خال زیر زلف پرمت جی جلائے مرغ دل
مان میرا بھی کہا یہ دام ہے دانہ نہیں

سودا خرام قد کو ترے دیکھ کر کہے　　ہے راستی تو یہ کہ ہوا ہاں تمام ناز
ہے خوبی دنداں دہن خوبوں میں لیکن　　تیسی کہوں اس کی کہ موتی کی لڑی ہے
تبسم یوں نمایاں ہے مسی آلودہ دنداں سے　　ہو ابر سیہ میں اس طرح بجلی کی تجلیاں
دندان ولب پہ سارے تھا نیم جاں میں لیکن　　مستی دو انگلی مل کر کھایا جو پان مارا
ہے سرو سے قامت کے ترے قمری تو والہ　　اور کبک دری تک تیری رفتار کا عاشق
نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سودا بیاں　　شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

ان تمام اشعار میں محبوب کے جسم اور اعضا کی تعریف کی گئی ہے، مگر کوئی ایک شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کی آسودگی کا سامان نہیں ہو سکتا۔ یہ سب روایتی مضامین ہیں۔ محبوب کی یہ تمام صفات سو فیصدی رسمی ہیں جن پر فارسی اور اردو کے ہزاروں شاعر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ان میں صرف سودا کا طرز بیان ہے اور تشبیہات و استعارات ہیں۔ جنہوں نے انہیں گوارا کر دیا ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ کے اہل نہیں تھے۔ ان کی توجہ زبان و بیان پر تھی۔ وہ محبوب کی خوبیوں سے اتنے متاثر نہیں ہوئے کہ ان کے احساسات اور جذبات بے تکلف، سادہ اور بیساختہ زبان اور لب ولہجہ میں ڈھل جائیں۔ وہ محبوب کی قامت سے زیادہ "قمری" "طوق بندگی" "سرو رواں" پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ محبوب کے لب لعلیں ان کے لئے اتنے اہم نہیں جتنے کہ "طوطی"، "سرخاب" اور "آتش" ہیں۔

سودا اور ان کے محبوب کے تعلقات بھی بہت عبرتناک ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی نظر میں ذلیل و خوار رہتے ہیں۔ رقیبوں کو ہمیشہ ان پر ترجیح دی جاتی ہے ان سے محبت یا ان پر التفات تو بہت دور کی بات ہے، ان کا ذکر آتے ہی محبوب میلوں دور بھاگ جاتا ہے۔ وہ جب محبوب کو دردِ دل سناتے ہیں تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا ہے۔ اس قسم کے مضامین میر سے لیکر آج تک تقریباً تمام غزل گو شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔ یہ غزل کے روایتی مضامین ہوتے ہیں۔ جو اکثر محض قافیہ کی مجبوری سے باندھے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر اور محبوب کے اصل تعلقات کی جھلکیاں بھی ہوتی ہیں جن میں محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ بلکہ محبوب بھی عاشق پر فدا ہوتا ہے۔ جن سے عاشق کی خودداری اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دونوں کے قابلِ احترام انسانی رشتے کا پتہ چلتا ہے، مگر سودا اور ان کے محبوب کے تعلقاتِ ہمیشہ ہی مضحکہ خیز رہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ـــــ

ڈرتے ڈرتے جو کہا میں کہ ترا عاشق ہوں　　قہقہہ مار لگا کہنے وہ طنّاز درست
ٹک سادہ دلی پر تو مرے رحم کر اے یار　　ہوں تجھ سے ستمگر سے طلب گارِ محبت
باتیں مجھے بھاتی ہیں بآمیزش دشنام　　ہوں اس لئے اس شوخ کی گفتار کا عاشق
دیکھے ہے مجکو اپنی گلی میں تو پھر مجھے　　ویسی ہی گالیاں ہیں وہی سنگ اب تلک
سنتا ہے جس جگہ وہ مرا ذکر ایک بار　　بھاگے ہے واں سے لاکھ ہی فرسنگ اب تلک

تصوف سودا کے ہاں تصوف کے مضامین صرف برائے شعر گفتن ہیں۔ اور بقول محمد حسین آزاد جو ایشیا کی شاعری کی مرغوب نعمت ہے۔ اس میں مرزا پھیکے ہیں۔ وہ حصہ خواجہ میر درد کا ہے۔ سودا شہر آشوبوں اور ہجوؤں کے سہارے زوال پذیر سماج کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے لب و لہجے میں جو تضحیک اور طنز و تلخی ہے انہیں حالات کی پیدا کردہ ہے۔ جنہوں نے بعض لوگوں کو تصوف کی پناہ گاہ میں جگہ دی تھی۔ جس پر پہلے باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ سودا تصوف کو صرف فلسفہ کی حد تک مانتے تھے۔ ان کی عملی زندگی میں اسے کوئی دخل نہیں تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کے جتنے مضامین ملتے ہیں ان کی بنیاد تصوف کے مقبول عام فلسفوں پر ہے۔ سودا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے میں خدا کا ظہور ہے۔ لیکن نگاہ دیدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ وہ موسیٰ تھے جنہیں خدا کا جلوہ دیکھنے کے لئے کوہ طور پر جانا پڑا۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو ہر سنگ میں اس کے ظہور کا شرار دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

سودا نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

جیسے بلبل صرف گلستان میں دیکھتی ہے۔ وہ بیاباں کے ہر خار میں موجود ہے۔ زلیخا کو جو نور صرف مہ کنعاں میں نظر آیا تھا۔ وہ ہر ستارے میں نظر آسکتا ہے بشرطیکہ چشم بینا ہو ؎

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا
ہم نے اسے پُر خار بیاباں میں دیکھا

روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا
جس نور کو تو نے مہ کنعاں میں دیکھا

سودا مذہب کی ان ظاہری رسوم کے خلاف ہیں جو انسانوں میں تفریق اور ایک دوسرے سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔

خدا سے محبت کرنے والوں کے لئے مسجد اور مندر کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کے لئے دل سب سے بڑی عبادت گاہ ہے۔

دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی
یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا

شیخ کعبہ دل کی حقیقت سے بے بہرہ ہے۔ اور خانقاہ و مدرسہ کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔

کعبۂ دل کی حقیقت کو پہونچ اے شیخنا
خانقاہ و مدرسہ تیرا ٹھکانا ہے عبث

جس نے ذات باری تعالیٰ کا نشان پالیا ہے۔ وہ پھر رام و رحیم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خدا ہندو یا مسلمان نہیں ہے، یہ مسجد و مندر انسان کی اپنی تخلیق ہیں۔

ہے مبرا یہ زباں کہنے سے اب رام رحیم
جن نے پایا ہے نشاں اس کو نہیں نام سے کام

۱؎ آب حیات ص/۱۶۳

سوداؔ کی نظر میں وہ انسان قابلِ عزت و احترام ہے جو دوسرے انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ ہندو بتوں کی پوجا کرتے ہیں مسلمان خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن سوداؔ اس شخص کو پوجتے ہیں جو آشنا پرست ہے ؎

ہندو ہیں بت پرست مسلمان خدا پرست
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست

ایک بت خانے کو توڑ کر مسجد بنانے سے اتنا ثواب نہیں ہوتا جتنا برہمن کا دل ٹوٹنے سے گناہ ہوگا۔

توڑ کر بت خانے کو مسجد بنا کی تونے شیخ
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

خدا کو تلاش کرنا ہے تو انسانوں ہی میں تلاش کرو۔ خدا کے بندوں کی دل جوئی کرو۔ خدا خود مل جائے گا ؎

شیخ کعبہ میں خدا کو تو عبث ڈھونڈے ہے
طالب اس کا ہے تو ہر ایک کی کر دل جوئی

سوداؔ کے ہاں جو کہیں کہیں انسانی عظمت کا احساس ملتا ہے۔ وہ بھی تصوف کی دین ہے۔ مثلاً

جلوے تہے ہم ہیں صنم بزم جہاں میں
گر شمع نہ ہووے تو شبِ تار ہے سایا

یا

جو خاک نشیں ہیں نہ انہیں سمجھیو کم قدر
وہ دانہ ہے خرمن جسے ماٹی میں رلایا

واعظ و زاہد صوفی حضرات اہلِ باطن ہوتے ہیں۔ جو تصنع، بناوٹ اور دکھاوے سے نفرت کرتے ہیں ان کا مقصد خدا تک پہنچنا اور خود کو خدا کی ذات میں گم کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس کی قطعی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کے بارے میں عوام کی کیا رائے ہے۔ وہ مذہب کی ظاہری رسوم اور پابندیوں سے بے نیاز رہتے ہیں۔ اس کے برعکس زاہد اور واعظ کی زندگی میں مکر اور ریا کو دخل ہوتا ہے۔ ان کے کردار اور گفتار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی تنہائیاں رند مشرب کی زندگی کی طرح رنگین اور ہر طرح کے گناہوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ تصوف کی معرفت ہی اردو میں واعظ اور زاہد پر لعن طعن کے یہ مضامین گئے ہیں۔ سودا جیسے ظریف انسان کو اس سے بہتر اور کیا موضوع مل سکتا تھا۔ ان کے دیوان میں سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں واعظ کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اور اکثر اشعار میں نظریاتی اختلاف سے زیادہ مضحکہ اڑانے کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ یہاں صرف چند اشعار پیش کئے جائیں گے ؎

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا
الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

مغ نے دی پگڑی پہ زاہد کے مجھے قرض شراب
کام سودا ہی کا ہوتا ہے خدا ساز درست

شیخ اتنا تو جتاؤ نہ تم اپنا تقویٰ
عوض مے ہے گرو جبہ و دستار ہنوز

شیخ صاحب سے مریدوں کو نہیں زہد کا فیض
بخشے ہے رندوں کو ان کا جبہ و دستار فیض

کہا تو مان لے سودا کا توبہ کر اس سے
لب و دہن کے تئیں کرکے شست و شو واعظ

بے ثباتی صوفی شعرا کا یہ بہت محبوب موضوع ہے۔ بے ثباتی اور قناعت کے فلسفے زوال پذیر سماج

میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔ اسی لئے دبستانِ دلی کے تقریباً تمام شاعروں کے ہاں ان موضوعات کی بھرمار ہے۔ بعض شاعر ایسے بھی ہیں جن کے ہاں تصوف کے دوسرے فلسفوں پر بہت کم اشعار ملتے ہیں۔ لیکن ان دو موضوعات پر انہوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ سوداؔ کا بھی یہی خیال ہے۔ ان کے شہر آشوب بے ثباتی فلسفے کی دوسری شکل ہیں۔ دراصل یہ فلسفہ شکست خوردہ انسانوں کے لئے مرہم کا کام کرتا ہے۔ اگر انسان مادّی دنیا میں ناکام رہے تو دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لیتا ہے کہ یہ دنیا ناپائدار ہے۔ یہاں ہمیشہ کس کی بنی رہی ہے۔ دنیا کی مثال اس سورج کی ہے جو صبح پوری تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو لیکن شام ہوتے ہوتے جس کا چہرہ زرد پڑ جائے۔ پھر ایسی ناپائدار چیز سے دل لگانے سے فائدہ؟ سوداؔ نے اس موضوع پر بہت شعر کہے ہیں ؎

رخصت ہے باغباں کہ ٹک دیکھ لیں چمن — جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا
دورِ ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشم پر آب — دیکھ سوداؔ گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا
یہاں جو کوئی آیا گھر آسماں دنی کے — دو دن کھلا کے روٹی اس کو ندان مارا
آراستہ جو بزم ہوئی دورِ فلک میں — واں جام بجز گردشِ ایام نہ آیا
ہے رنگ تماشائے جہاں صورتِ خورشید — جو صبح کو دیکھا وہ نظر شام نہ آیا
اتنا عیش جہاں کی جو تو دیکھا چاہے — بزمِ مستاں پہ نگہ غور سے کر آخرِ شب
اس جامہ پہ اتنا نہ ابھر بلبلے کی طرح — جامہ یہ ترا پوچ ہے تو غیر ہوا ایچ
کر خانۂ گردوں پہ نظر چشمِ فنا سے — ہے مثلِ حباب اس کی بھی تعمیر ہوا پر
دیوے تجھے وہ کچھ کہ نہ پھر چھین لے تجھ سے — زنہار نہ رکھ یہ طمعِ خام جہاں پر
کچھ اس چمن میں آکے نہ دیکھا میں جوں حباب — آبِ رواں کو سیر کیا سو بھی یک نفس

قناعت اگرچہ سودا ہرگز قانع نہیں تھے۔ ان کی تمام زندگی امیروں اور نوابوں کی قصیدہ خوانی میں گزری۔ مگر ان کے کلام میں قناعت کے موضوع پر جتنے اشعار ملتے ہیں تصوف کے کسی اور فلسفہ پر نہیں ملتے۔ بظاہر اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دور کے عوام میں قناعت کے فلسفے کو بہت زیادہ مقبولیت تھی۔ جو اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا ردعمل تھی۔ مغل تخت پر اتنی تیزی سے بدلتے ہوئے بادشاہوں کو دیکھ کر انسان گوشہ نشینی کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ سوداؔ کا شعر ہے ؎

خطرہ ہے تجھ سے مسندِ شاہی کو اے فلک — حاضر ہے پوست سخت مرا پشم تو اکھاڑ

دلی کی عظیم الشان عمارتوں اور حویلیوں کو اجڑا ہوا اور برباد دیکھ کر انسان سوچتا تھا کہ ان حویلیوں کا مالک بننے سے بہتر ہے کہ وہ کلاہِ فقر سر پر سجا لے۔ بقول سودا ؎

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں — یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہیں اب اجاڑ
ایسی سجی ہے سر پہ سہارے کلاہِ فقر — جس کے حضور ہو نہ سکے تاجِ شاہ سبز

گھر امن کا اسی کو ملا زیر آسماں   جس نے جہاں میں اس کی مسمار کی ہوس
مفلسوں کو نہیں دنیا میں کسی کا خطرہ   خوف ہے ان کو کہ جو دام و درم رکھتے ہیں
گو منتظر دعا کا ہمارے ہے اب قبول   دست و دہن یسار ہیئے اپنی یہ خو نہیں
یہ رتبہ جاہ و دنیا کا نہیں کم مال زادی سے   کہ اس پر روز و شب میں سیکڑوں ہی چڑھتے آتے ہیں
دیکھی نہ بنا ہم نے وہ قصر فریدوں کی   جو اپنے خرابہ کی تعمیر نظر آئی

سودا کے عہد میں تبدیلی اتنی تیزی سے ہو رہی تھی کہ قناعت کو علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کل جو تخت پر تھا، آج بھیک مانگ رہا ہے۔

طلب نہ چرخ سے کرنا تو راحت اے سودا   پھرے ہے آپ وہ کاسہ لئے گدائی کا
سیم و زر کے آگے سودا کچھ نہیں انسان کی   خاک میں رہنا بھلا تھا بلکہ اس اکسیر کا
میخانے میں ازل کے مرے دل سے زاہدا   دھویا ہے نقش ساقی نے امید و بیم کا
بیٹھو رہ سودا تسلی دل کو دے   دربدر منت سے کیا حاصل پھرا
حباب آسا کیا ہے کار استغنا تمام اپنا   رکھا محروم میں قطرے سے اس دنیا میں جام اپنا
طمع دولت کی بیتاب و تعب مت رکھ زمانے سے   ہوس تا نہ پھونکے آگ میں مس زر نہیں ہوتا
مجھ گدا نے بھی کسی شاہ سے ڈالا نہ سوال   گو مجھے بخت نے اسکندر و دارا نہ کیا
دیر بانٹے تھا متاع دو جہاں اے سودا   بینوائی نے مری اس کو اشارا نہ کیا
شاہاں سے سوال اپنی رعونت شکنی ہے   کونین تلک ورنہ ہے پیش فقرا ہیچ
نہ دیکھی خوشدلی جز یک تبسم ہم نے غنچے میں   ہوا ہے اس چمن کے ہے دلا ترک ہوس بہتر
نظر میں ان کے جن کو دولت استغنا نے بخشی ہے   مگس سے ہے ہما بہتر ہما سے ہے مگس بہتر

احساس تشنگی

سودا کو اس سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زوال کا شدید احساس ہے جس نے حکمران طبقے سے لیکر عوام تک ہر فرد کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ سودا کی ہجو و شہر آشوب طنز و ظرافت اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان میں سیاسی اور سماجی شعور تھا۔ وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن انہیں ورثہ میں جو مروجہ علوم ملے تھے اور جن فلسفیوں شاعروں اور ادیبوں نے ان کی شخصیت بنائی تھی۔ ان میں سے کوئی سودا کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا اور سودا حالات کا تجزیہ نہ کر سکے اور زوال کے گہرے اندھیرے میں دور تک روشنی کی کرن نہ دیکھ سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہاں تشنگی، پیاس اور بے چینی کا احساس پیدا ہوگیا۔ انہوں نے زندگی میں سب کچھ حاصل کیا۔ دولت، عزت اور شہرت ہمیشہ ان کے غلام رہے۔ لیکن جب سودا اپنے ارد گرد کے ماحول پر نظر ڈالتے تو انہیں ایسے لوگ بھی نظر آتے جو حوادث زمانہ کے شکار رہتے، سودا خود کو اس سماج کے

اعلیٰ طبقے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ اس لئے اس طبقے کی بربادی خود ان کی اپنی بربادی تھی۔ شریفوں کو ذلیل اور ذلیلوں کو شریف بنتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ وہ جاگیرداری نظام کے پروردہ تھے۔ جس میں شرافت کا دار و مدار انسان کے خاندان، خون اور حسب و نسب پر ہوتا ہے۔ ذاتی صلاحیتوں پر نہیں۔ سوداؔ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کی زبوں حالی عبرت ناک تھی۔ ان کے سامنے اعلیٰ طبقے کا اقتدار پاش پاش ہو رہا تھا، جو اپنے طبقے کے بعض ذہین افراد اپنی ذاتی کوششوں، سازشوں اور چال بازیوں سے دولت اور طاقت حاصل کر رہے تھے۔ زوال کے اس خطرناک طوفان میں بعض لوگ تصوف کے ساحل پر اتر گئے جہاں تصوف کے فلسفوں کی مدد سے انہوں نے زندہ رہتے ہوئے بھی زندگی سے فرار حاصل کر لیا۔ اور وقتی طور پر مصائب و آلام سے نجات پالی۔ مگر سوداؔ کے پہلو میں دل نہیں تھا اور دماغ بہت ہی مشکل سے تصوف سے سمجھوتہ کرتا ہے۔ اس لئے حالات کی ننگی تلوار ہمیشہ ان کی گردن پر لٹکی رہی وہ اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے کس حد تک متاثر تھے انہوں نے حالات کا کس طرح تجزیہ کیا اور ان پر کس طرح تنقید کی ہے؟ اس پر تفصیلی بحث "شہر آشوب" کے باب میں کی گئی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ مالی اعتبار سے سوداؔ تقریباً تمام زندگی آسودہ رہے۔ انہیں اپنے عہد کے امراء و روساء اور نوابین کی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن انہیں یہ احساس ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ آسمان ان کے حق میں بخیل ہے۔ انہیں دنیا میں وہ سب کچھ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ سوداؔ نے اپنی ناکامی کا ذکر طرح طرح سے کیا ہے۔ محبت میں ناکامی اور محبوب سے دائمی جدائی بھی دنیوی ناکامی کے استعارے ہیں۔ اس موضوع پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا
کچھ اپنے تئیں جز ثمر خام نہ آیا

اس کا تو گلہ کیا ہے کہ بستانِ جہاں میں
مجھ تک قدح بادۂ گلفام نہ آیا

یوں منہ نہ دھولے صبح کہ آگے مرے سوداؔ
جوں لالہ پر از خون جگر جام نہ آیا

کسی کا دیں کیا حق نے کسی کی دنیا
سب کا سب کچھ کیا پر تجھ کو ہمارا نہ کیا

برگشتہ نصیب اپنے نہ پھرتے کبھو دیکھے
ہر چند رہی گردش ایام جہاں پر

پائے نہ جھانکنے بھی کبھو ہم در چمن
رکھتے ہیں دل میں رخنۂ دیوار کی ہوس

آن کر اس میکدے کے بیچ جز چشمِ پُر آب　　　قسمت اپنی ہم نہ پائے ساغر معمور تک

کیا گلا صیاد سے ہم کو یونہیں گزرے ہے عمر　　　اب اسیرِ دام ہیں تب تھے گرفتارِ چمن

خرمن برق زدہ کا ہوں وہ دانہ کہ مجھے　　　نہ کوئی مرغ چگے نہ کوئی بو دے مجھ کو

غم پرستی غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ اس کا اثر مزاج پر مختلف ہوتا ہے۔ بعض ہستیاں غم کو شکار کر لیتی ہیں اور بعض کو غم۔ میر نے انفرادی اور ذاتی غم کو اتنی وسعت دی کہ اس میں آفاقیت پیدا ہو گئی۔ ان کے اشعار میں کائنات کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی یاسیت اور قنوطیت کی فضا میں انسانی وقار و عظمت کا احساس، بلند حوصلگی، زندگی کی ہلچل، گرمی، تڑپ اور ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ ملتا ہے۔ جس سے غم زدہ اور شکست خوردہ انسان میں حوصلہ، عزم اور نبرد آزمائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر سوداؔ کا غم انفرادی اور کسی حد تک روایتی ہے۔ ایک بڑے شاعر کی طرح سوداؔ اپنے غم میں آفاقیت اور ہمہ گیریت پیدا نہیں کر سکے۔ ان کے غم میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکی جو اپنے دامن میں ہر غم زدہ کو پناہ دے سکے۔ اور جو ہر زخم پر مرہم کا کام دے سکے۔ غم کے بیان میں ان کی خارجیت مخل ہوتی ہے۔ ان کا مزاج مفہوم کے بیان کرنے سے زیادہ الفاظ کی مرصع کاری کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اسی لئے ان کی داستانِ غم سنکر بیساختہ منھ سے "واہ" نکل جاتی ہے لیکن "آہ" صرف میرؔ کا حصہ ہے۔

سودا کے ہاں غم کے بیشتر مضامین رسمی ہیں جن پر ان کے اندازِ بیان کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

سودا وصل میں بھی غم ہجر کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ غم ایک مستقل کیفیت ہے اور وصل وقتی ہے

وصل بھی ہو تو دل مرا غم نہ چھوڑے ہجر کے　　　یہ تو ہمیشہ ہے رفیق وصل ہے گاہ گاہ کا

آنکھوں سے آنسو اس وقت بہتے ہیں جب انسان اپنے غم کی انتہا پر پہنچ جائے۔ اور ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو کسی کے رونے کا ذکر سنکر متاثر نہ ہوں۔ لیکن سودا اپنی اشکباری کا ذکر اس طرح اور ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی شاعرانہ صناعی کا تو قائل ہو جاتا ہے لیکن متاثر نہیں ہوتا۔ مثلاً

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشکِ گرم سے　　　دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا
کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کو الم سے　　　تھا طفلی میں گہوارہ مرا دامنِ غم سے
شربت ہے مجھے زہرِ غمِ ہجر کہ میری　　　گھٹی جو بنی روزِ تولد سو وہ سم سے

غافل غضب سے ہو کے کرم پر نظر نہ رکھ — پُر ہے شرارِ برق سے دامن سحاب کا
پوچھتے ہی پوچھتے گذری ہے مجھ کو روز و شب — چشم ہے یا رب مری یا منہ کسی ناسور کا
سودا سے یہ پوچھا میں دل میں بھی کسی کو دوں — وہ کر کے بیاں اپنا روداد بہت رویا

بعض اشعار میں سوداؔ میرؔ سے قریب آ گئے ہیں۔ اس لئے ان اشعار میں تاثیر بھی ہے اور درد بھی۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ چند ملاحظہ ہوں۔

دوستو سنتے ہو سودا کا خدا حافظ ہے — عشق کے ہاتھ سے رہتا ہے یہ رنجور سدا
بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا — دی تھی خدا نے آنکھ یہ ناسور ہو گیا
اس باغ میں اک گل کو خنداں جو کہیں دیکھا — سو غنچہ کی واں صورت دلگیر نظر آئی

زورِ بیان

سوداؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زورِ بیان ہے۔ اور یہی خصوصیت انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ کرتی ہے۔ اگرچہ دوسرے شعرا کے یاں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس ہمہ گیری کے ساتھ نہیں کہ اسے ان کے کلام کی خصوصیت کہا جا سکے۔ یہ سوداؔ اور صرف سوداؔ کا حصہ ہے۔ اسی نے سوداؔ کو انفرادیت بخشی ہے۔ اور اسی خصوصیت کی وجہ سے سوداؔ کی آواز سب سے علیٰحدہ ہے۔ ان کی طبیعت میں جو شگفتگی و زندہ دلی، نشاط و سرمستی اور رنگینی ہے۔ اسی نے ان کے وجدان کو نشاط آمیز بنایا ہے۔ اور یہ زورِ بیان اسی نشاط آمیز وجدان کا عطیہ ہے۔ ان کے کلام میں داخلیت موجود ضرور ہے۔ لیکن اس میں سوز و گداز، درد و غم اور دھیمی دھیمی آنچ کی بجائے، شوخی، البیلا پن، دبی دبی زیر لب مسکراہٹ ہے۔ دبستانِ دلّی کے بیشتر شاعروں کے کلام پر یاسیت و قنوطیت رنج و غم اور شکست خوردگی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس سودا کے ہاں وہ رجائیت ہے۔ جو شکست کھا سکتی ہے لیکن شکست تسلیم نہیں کر سکتی۔ وہ بربادیوں کا ماتم نہیں کرتے، ناکامیوں کا نوحہ نہیں پڑھتے بلکہ ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور ان پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ اسی جذبے اور فطرت نے انہیں عظیم ہجو نگار بنایا ہے۔

نشاط آمیز وجدان نے ان کے کلام میں ہماہمی اور طوفان کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ سوداؔ صرف مفہوم ہی پر نہیں بلکہ الفاظ پر بھی توجہ کرتے ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ کو زبان پر تقریباً برابر قدرت تھی۔ لیکن میرؔ قلبی واردات اور احساسات کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے لئے شاعری درد و غم کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس سوداؔ اسے فن سمجھتے ہیں۔ انہوں نے عبرت الغافلین اور سبیل ہدایت میں جو تنقیدیں کی ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معنی و الفاظ دونوں کو برابر اہمیت دیتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے سودا کی اس خصوصیت کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اکثر

کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں۔ جن سے کلام اُن کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصہ ہے چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا(۱)

حقیقت یہی ہے کہ سودا کو الفاظ کی مرصع کاری پر جو قدرت تھی وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ ہر مصرع بیساختہ اور برجستہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صرف آمد ہے۔ شاعر نے دماغ پر زور نہیں دیا خود بخود یہ مصرع ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایک اچھا شعر کہنے کے لئے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

غنچے سے مسکرا کے اُسے زار کر چلے / نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے
آئے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب / پروانے ہی کو شمع سے بیزار کر چلے
لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں / رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا
چمن میں صبح جب اس جنگ جو کا نام لیا / صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا
سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ / کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا
بالیں پہ جو سودا کے ہوا شورِ قیامت / خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے
کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا / ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
تم جن کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے ان کی / لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں

یہ اشعار زورِ بیان کی بہترین مثال ہیں۔ ان کی برجستگی، سلاست، روانی، صفائی اور بے ساختگی کہہ رہی ہے کہ یہ معمولی دماغ کی پیداوار نہیں۔ لطفِ بیان نے ان میں شعریت پیدا کی ہے۔ ان میں زندگی کی ہمہ رنگی ہے۔ خارجیت ہے۔ لیکن وہ خارجیت نہیں جس نے بعد کے شاعروں میں مریضانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ غم ہے۔ لیکن نبرد آزمائی کے حوصلے کے ساتھ۔ اسلوبِ بیان میں دریا کا سا بہاؤ ہے۔ یہ فن اکتسابی نہیں، خداداد ہے۔

سودا کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے تکرارِ لفظی سے بھی کام لیتے ہیں۔ میر کے ہاں بھی اس کی

۱۔ آبِ حیات ص/۱۵۷-۱۵۸

اچھی خاص مثالیں ہیں لیکن دونوں کے ہاں نمایاں فرق ہے۔ سوداؔ کے ہاں تکرار لفظی، شوخی، شگفتگی اور رنگینی کو بڑھاتی ہے لیکن میرؔ کے ہاں داخلیت کی کیفیت اور اثر کو۔

بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے   یاں چٹ گئے ہیں اس سے جلاے بڑے بڑے
قامت نے تیرے باغ میں جا خط بندگی   لکھوا لیا ہے سرو چمن سے کھڑے کھڑے
بوسہ کی ان لبوں سے یہ سوداؔ ہوس نہ رکھ   جن سے کہ مانگ مانگ میں دشنام رہ گیا
سن سن کے عرض حال مرا یار نے کہا   سوداؔ نہ باتیں بیٹھ کے یاں متصل بنا
اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے   پھر پھر گل آ چکے پہ سجن تم بھلے گئے
ساق سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری   شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

سوداؔ کے ہاں زور بیان کی ایک اور صورت ہے۔ اور وہ ہے حروف عطف یا حروف ربط کے واسطے سے مصرع یا شعر کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا یا مختلف ہم معنی الفاظ کو حرف عطف کے واسطے سے ایک مصرع میں جمع کرنا۔ اس سے ان کے کلام میں جو صوتی بلند آہنگی، ترنم، موسیقیت اور پرشور بیان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کی مخصوص انفرادیت کی تشکیل کرتی ہے۔

عزت و آبرو و حرمت و دیں و ایماں   روؤں کس کس کو میں یارو کہ گیا کیا کیا کچھ
والہ و شیفتہ و زار و حزیں و مجنوں   اپنے عاشق کو کل اس نے نہ کیا کیا کیا کچھ
ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی   ایک گھنٹے میں جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ
نہ تلطف نہ محبت نہ مروت نہ وفا   سادگی دیکھ کہ اس پر بھی ملا جاتا ہوں
جور و ستم تعدی و اندوہ و درد و غم   مائل ہوئے ہیں اس دل ناشاد کی طرف
یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام   کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح
مہر و وفا و شرم و مروت سبھی کچھ اس میں سمجھے تھے   کیا کیا دل دیتے وقت اس کو ہم نے خیال خام کیا

دین و دل و ایمان و حواس و خرد و ہوش   سب کچھ گئے لیکر نہ گئے سینہ سے غم کو

صورت میں میں کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے   اک دھج ہے وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے
صبر و قرار و ہوش و دل و دیں فدا کیا   تس پر بھی میری جان تجھے مجھ سے کیں رہا

نشاط آمیزی

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سودا پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو نشاط آمیز لب و لہجہ دیا ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جو انہیں میرؔ، دردؔ اور دوسرے ہم عصر شعرا سے الگ کر کے ان کی آواز میں انفرادیت اور ایک مخصوص آہنگ پیدا کرتی ہے

اگرچہ سودا اس گہرائی و گیرائی خود سپردگی اور خستگی سے محروم تھے۔ جو شدید داخلیت کے لئے ضروری ہیں لیکن وہ اس بگڑی ہوئی خارجیت کے بھی شکار نہیں جو فحاشی کی حدوں سے آگے نکل جاتی ہے۔ ان کے ہاں ایک رکھ رکھاؤ، اعتدال اور توازن ہے۔ جسے ان کے مزاج کی شگفتگی اور رنگینی نے حسین تر بنا دیا ہے فراق گورکھپوری نے سودا کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "سودا کے کلام میں داخلیت کی چاشنی ہوتے ہوئے بھی خارجیت نمایاں ہے۔ لیکن اس کے یہاں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا گہرا رنگ اختیار کرنے کی بجائے شگفتگی، البیلا پن، سرمستی، نشاط اور رنگینی اختیار کرلی ہے۔ کیونکہ جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ تو نشاط کی فطری وسعت شاعر کے دل کو دنیا کی رنگا رنگ بزم آرائیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ اور صحیح معنی میں خارجی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔" سودا کے کلام میں تڑپا دینے والی تاثیر نہیں ہے۔ لیکن ان کے مضامین میں جدت و ندرت ہے۔ تنوع و نکتہ آفرینی ہے۔ شوخی اور شگفتگی ہے جس کا اثر زبان و بیان پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ہندی اور فارسی کے وہ الفاظ جو اردو میں مروج نہیں تھے جتنے سودا کے ہاں ملتے ہیں شاید کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتے۔ سودا کے لئے شاعری صرف "درد و غم" کا بیان یا پردہ سخن نہیں بلکہ وہ ہیئت پر بھی پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ اب سودا کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمایئے جس میں انہوں نے غم عشق کا بیان کیا ہے۔ لیکن اس طور پر کہ سننے والا آہ بھر کر خاموش ہونے کی بجائے سر دھننے لگتا ہے۔

جوں شمع تو ہوا شب ہجراں میں صرف اشک   پر جس قدر میں چاہوں تھا اتنا نہ رو سکا
نہ کھینچ اے شانہ ان زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا   اسیر ناتواں ہے یہ نہ دے زنجیر کا جھٹکا
داغ تجھ عشق کا جھمکے ہے مرے دل کے بیچ   مہر ذرہ میں درخشاں نہوا تھا سو ہوا
تاثیر عشق نے مزہ درد کھو دیا   ان نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا
بوسہ کے ذائقہ کو نہیں شہد و سم میں فرق   ہم پی گئے اسے ہمیں قسمت نے جو دیا
ہے طرفہ تمنا کہ رہوں لب بہ لب اس کے   جس سے کہ کبھو بوسہ بہ پیغام نہ آیا
خبر لے وادی میں سودا کی یوں سنا ہے آج   کہ ایک شوخ کسی بے گنہ کو مار آیا
سینے سے میں دعا کو لایا جو شب لبوں تک   کہنے لگی اجابت کیدھر خیال آیا
جب تیشہ کو کوہکن نے لیا ہاتھ تب یہ عشق   بولا کہ اپنی چھاتی پہ دھرنے کو سل بنا
تیرے کوچے سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا   جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا
ہے فکر وصل صبح تو اندوہ ہجر شام   اس روز و شب کے دھندے میں ہیں اب تو مر چلا
تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں   یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں
جب میں گیا اس کے تو اسے گھر میں نہ پایا   آیا وہ اگر میرے تو در خود نہ رہا میں

عجب قسمت ہماری ہے کہ جس کی شمع الفت سے
چراغ دل کیا روشن سو ہے داغ آشنائی کا

جو مذکور اس سے کرتا ہے مرا غم خوار رونے کا
تو کہتا ہے کہ چپ رہ ہے اسے آزار رونے کا

خونِ جگر شراب ترشح بہ چشم تر
ساغر مرا گرو نہیں ابر بہار کا

کیا کروں گا لیکے واعظ ہاتھ سے حور کے جام
ہوں میں ساغر کش کسی کی نرگس مخمور کا

کس قدر بنت العنب سے دل ہے سودا کا بھرا
زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے تعاقب سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا

چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نکہت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگذر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

سادگی بیان

یہ ٹھیک ہے کہ سودا کی غزل پر قصیدے کا رنگ ہے لیکن ان کے ایسے اشعار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جن میں سادگی بیان کا اعجاز دکھایا گیا ہے۔ ان اشعار میں سودا نے فارسی ترکیبوں اور فارسی اضافتوں سے دامن بچائے رکھا ہے۔ ان اشعار میں حسن بیان بھی ہے اور تاثیر بھی۔ ان کے ہاں سہل ممتنع نہیں ہے۔ لیکن اس سہل بیانی اور سادگی بیان کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جس پر ہر شاعر کو قدرت نہیں ہوتی۔ یہ سلاست اور روانی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی۔

حاضر ہے تیرے سامنے سودا کراس کو قتل
مجرم یہ سب طرح سے ہے ہر یک نگاہ کا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفت جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

جگر ان کا ہے جو تجھ کو صنم کہہ یاد کرتے ہیں
میاں ہم تو مسلماں ہیں خدا بھی کہتے ڈرتے ہیں

یارو میں کیا عہد اسے مانیو تم سچ
پھر دل نہ کہیں دوں اگر اب کے رہے جی بچ

سو جھی تدبیر نہ تقدیر کو بہلانے کی
جب تجھے قتل پہ عاشق کے مچلتے دیکھا

سرشک چشم نہ تھا میں کہ اے فلک تونے
نظر سے خلق کے گرتے نہ مجھ کو تھام لیا

تیرے کوچہ سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا
جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا

چھوٹی بحروں میں شعر کہنا میر کا فن ہے۔ سودا نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے اور جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے وہ اکثر میر تک پہنچ جاتے ہیں۔ میر چھوٹی بحروں میں۔ سادگی بیان سے کام لیکر شعر کو تیر و نشتر بنا دیتے ہیں۔ سودا نے بھی چھوٹی بحروں میں گفتگوئے سادہ کی ہے۔ رہا سوال تاثیر کا تو وہ صرف میر کا حصّہ ہے۔

جو عمل چاہیئے کیجئے مرے دکھ دینے کا
وہ نہ کیجے کہ کہے کوئی سزا وار نہ تھا

پیار و اشفاق و وفا مہر و محبت الطاف　　دل کو جس روز لیا کون سا اقرار نہ تھا

غیروں کے دیکھ بیٹھے ہوئے بزم میں تری　　جب کچھ نہ بس چلا تو میں ناچار اٹھ گیا

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں　　شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

اس کے کوچہ میں نہ چل ساتھ مرے اے سودا　　آفت آجائے نہ اے یار کہیں میرے پر

سودا کا حال تو نے نہ دیکھا کہ کیا ہوا　　آئینہ لیکے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز

ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس　　تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبح چمن تیرا　　گل ادھر سے گئے گلچیں گئی روتی ادھر شبنم

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں　　کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

دیکھے بلبل جو یار کی صورت　　پھر نہ دیکھے بہار کی صورت
برق دیکھی ہو جس نے سو جانے　　مجھ دل بے قرار کی صورت

قاصد اشک آکے خبر کر گیا　　قتل کوئی دل کا نگر کر گیا
فائدہ اب کیا کرے تریاق وصل　　زہر غم ہجر اثر کر گیا

دل میں تیرے جو کوئی گھر کر گیا　　سخت مہم تھی کہ وہ سر کر لیا
وہم غلط کار نے دل خوش کیا　　کس پہ سجانے وہ نظر کر گیا

دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر　　دل خالی کیا میں آہ بھر کر

رنجش کا مرے نہ پوچھ باعث آ جانے دے یار درگذر کر

گدا دست اہلِ کرم دیکھتے ہیں ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے سو ایک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

جب نظر اس کی آن پڑتی ہے زندگی تب دھیان پڑتی ہے
جھیل لیتے ہیں عاشق اے فرہاد جس کے سر جیسی آن پڑی ہے

دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے دین و دنیا سے جی اچٹتا ہے
عشق سی تو نہیں ہوں میں واقف دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

مشکل زمینیں

سودا نے نئی نئی اور برجستہ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اور اپنی چابکدستی سے ان سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیا ہے۔ انہیں الفاظ پر اتنی قدرت ہے کہ خار زار بھی گلستاں بن جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان کی خارجیت اشعار کو سوز و گداز سے محروم کر دیتی ہے۔ سودا کی ایسی غزلوں میں میر کی سی نشتریت، داخلیت اور تڑپا دینے والی کیفیت نہیں لیکن محض قافیہ بندی ہوتے ہوئے بھی وہ خارجی فن کا مکمل نمونہ ہیں۔ ان زمینوں میں سے بیشتر سودا کی اپنی ایجاد ہیں۔ یہاں چند زمینیں اور قافیے پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے سودا کی عظمت اور فن کا اندازہ ہوگا۔

ے ٹک خاک لے تو چھوڑ کے غافل پلنگ و خواب
سنگ و خواب، بنگ و خواب، ننگ و خواب،
خدنگ و خواب، لنگ و خواب،

ے ہمیشہ سے مری چشم پر آب در تہ آب
حباب در تہ آب، گلاب در تہ آب، سراب در تہ آب
خواب در تہ آب، کباب در تہ آب، آفتاب در تہ آب
حجاب در تہ آب، خوشاب در تہ آب

دوا بہت ہے جو دے سر کو سنگ و خشت، شکست بخت
زشت شکست، کنشت، شکست۔ زشت شکست، کشت شکست

فندقی انگشت کیا کر رہا ہے رنگ دست
اور ننگ دست، مرسنگ دست، از زیرسنگ دست
ڈھنگ دست، جنگ دست، پاسنگ دست،
دنگ دست

لا گے ہے کس کے منہ پہ بایں زور پشت دست
مغرور پشت دست۔ دور، بدستور، پور،
مقدور، نور، منظور،
ہستی کو تری بس ہے اک گل کی اشارت
بلبل، مل، تل، کاکل، بگل، سنبل، قلقل

نامے کا اپنے جس میں جو کروں ساز درست
آواز، انداز، اعجاز، ناز، طناز، دغا باز، خداساز۔

بنگ پی بنگ خیال اس کا ہے افلاک پرست
خاک، ادراک، تاک، فتراک، ہوسناک
خاک، مسواک، بیباک۔

اشک کو کب ہے شناسائے گہر سے پیوند
نظر، شجر، سحر، اثر، دیدۂ تر، جگر، ہنر
کھینچ کر پوست کیے گردش ایام سفید
بادام، انجام، گل اندام، سیہ فام، شام۔ نیگام
یہ اس کے رنگ عارض سے ہے دل بیتاب آتش پر
سیماب، آب، تیزاب، اسباب، شب تاب، سرخاب
شراب ناب، گرداب، پیچ و تاب۔
کب لگ سکے اس سے کوئی رنگ اور نمک
نیرنگ، تنگ، سنگ، رنگ، جنگ، ڈھنگ، آہنگ، بنگ، گلرنگ۔

یہی وہ شاعری ہے جس نے انشا اور مصحفی کے ہاتھوں فروغ پایا۔ اور ناسخ نے انتہا کو پہنچا دیا۔ نے اپنی ہمہ گیر طبیعت سے مجبور ہو کر ایسی مشکل زمینوں میں غزلیں کہی تھیں انشا اور مصحفی کو اپنی اہمیت کا سکہ جمانے کے لئے اس میدان میں آنا پڑا۔ ناسخ کو فن پر پوری مہارت اور زبان پر قدرت حاصل تھی۔ لیکن اس خداداد سوز و گداز سے محروم تھے جو عظیم شاعری کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے وہ آتش کے مقابلہ میں فنی پینترا بازی سے کام لیتے رہے۔ اور ان کا پورا دیوان اثر سے محروم رہا۔ سودا کی زمینوں کی ان غزلوں میں بھی بیشتر اشعار ایسے ہیں جو صرف قافیہ بندی کے زمرے میں آتے ہیں۔

شمع رو کہنا اُسے سودا ہے تاریکی عقل — شمع کا عکس اس کے عارض پر کلف ہے ماہ کا
سمور و قاقم و سنجاب ہے سرما میں منعم کو — رکھیں ہیں آسرا غربائے لنج دلنگ آتش کا
کر رکھا ہے کلس گنبد دستار اُسے — شیخ جی آپ ہیں کس مرتبہ مسواک پرست

جو دیکھے مرغ ہوا کو وہ دام میں تیرے — تو ہووے رشک سے ماہی کباب در تہ آب
گئی ہے سر سے گذر موج اشک آنکھوں کی — مجھے یہ لے گئی خانہ خراب در تہ آب
بے خوابی سے ہے میرے جو شاکی وہ شمع رو — یارو کھو یہ اس سے کہ ناداں پتنگ و خواب
دل طوطی خط کو نہ دے اس شوخ کے سودا — کھاوے گا اس آئینے کو زنگار محبت
دامن ابر پچھڑتا ہے جو اتنا شاید — کسو عاشق کے ہوا دیدۂ تر سے پیوند
فریب وعدہ کا شکوہ جو میں رو رو کے کرتا ہوں — تو میری سادہ لوحی پر وہ ہنس دیتا ہے قہقہہ کر
جز خط سبز عارض دلدار ہم نشیں — دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو رنگ اور نمک
ہر مرغ کو پہچان کے نامے کو تو لینا — نامے کے کبوتر کا ہے میرے جگری رنگ

ایہام گوئی

سودا جب میدان ادب میں آئے ہیں تو ایہام گوئی ابھی خاصی متروک ہو گئی تھی۔ اکثر شاعر اس غیر فطری صنعت سے متنفر ہو چکے تھے۔ سودا کے استاد شاہ ایہام گوئی سے توبہ کر چکے تھے۔ سودا جیسے ذہین الشان کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ بھی ایہام گوئی سے انکار کر دیں۔ ان کا شعر ہے۔

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر شعر و سخن میں ایہام کا ہوں میں

میر نے نکات الشعرا میں ایہام گوئی کی سخت مخالفت کے باوجود لکھا ہے کہ اگر ایہام سلیقہ سے باندھا جائے تو گوارا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سودا کے یاں بھی ایہام کی چند مثالیں مل جاتی ہیں۔ لیکن کلیات سودا کی ضخامت کے پیش نظر ان مثالوں کی تعداد کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر سودا ایہام میں شعر کہتے ہیں تو انہیں

معذرت پیش کرنی پڑتی ہے۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرا نہیں ہے یہ مضمون و آبرو کا ہے سوداؔ یہ سلسلہ

چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سوداؔ نے ایہام سے کام لیا ہے۔

کس قدر بنت العنب سے دل ہے سوداؔ کا برا زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

سوداؔ غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا گل پھاڑیں سن کے جیب کو اور دیں بلبلیں صلا

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں فیروزہ ہووے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا

جب مست چمن سے ہو چلا گھر کو وہ لالا غنچے نے صراحی لی اٹھا گل نے پیالا

انہوں نے ایک پوری غزل ایہام میں کہی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے جو کچھ تو چاہے یک شب مجھ پاس آ کے سو لے

وہ تو پچی کا ہرگز ہم کو سکھے نہ نامہ گدڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گولے

اس غزل کے مقطع میں بھی سوداؔ نے معذرت پیش کی ہے۔

ہو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سوداؔ تو اس زمین میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

مزاح اور ظرافت

سوداؔ اردو ہجو نگاری کے امام ہیں اور ابھی تک اردو ادب کی پوری تاریخ اس فن میں سوداؔ کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی ہجو نگاری پر علیحدہ باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف اس ظرافت کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ جو اُن کی غزلوں میں بکھری ہوئی ہے۔

سوداؔ فطری طور پر بہسوڑ، زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کا کلیات پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات اور حالات کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا ہے۔ جہاں کہیں اسے بے جوڑ، بے ڈھنگی، بے آہنگ اور مضحکہ خیز چیزیں نظر آتی ہیں۔ وہ ہنس دیتا ہے۔ کبھی یہ ہنسی زیر لب ہوتی ہے اور کبھی قہقہہ بن جاتی ہے۔ سوداؔ اپنے کمال فن سے ان واقعات کی تصویر اتار دیتے ہیں۔ اور اگر اصل واقعات میں کچھ کمی ہو تو وہ اپنے زور تخیل سے انہیں مکمل اور جامع بنا دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات تمام انسانوں کی ملکیت بن جاتے ہیں۔

بقول مولانا محمد حسین آزاد ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں بھی ظرافت کا عنصر ہے۔

غزل میں جہاں کہیں اُن کی رگ ظرافت پھڑکی ہے۔ وہ متانت و سنجیدگی اور تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں آئے۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی طرح اکثر و بیشتر وہ خود ہی اپنے نشتروں کا شکار بنتے ہیں۔

انہوں نے اپنی اور محبوب کی کمزوریوں کا اس طور سے مضحکہ اڑایا ہے کہ بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ یہ ظرافت اس عہد کے عاشق اور محبوب کے تعلقات کی مکمل تصویر بھی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اس مصیبت سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے   تو کہے آج ہی جا میں کہوں کل جاؤں گا

(سودا اپنا مذاق اڑاتے ہیں)

نواحی میں ترے کوچے کی ہے یہ حال سودا کا   کہ جوں چند آشیاں گم کرکے بستی میں پھرے بھٹکا

باتیں کرو عدو سے سودا کو گالیاں دو   قربان ہوں آپ کی میں اس داد اور دہش کا

مجلس سے مجھ کو اٹھتے جلیسوں کے سامنے   عزت کبھو نہ دی یہ کہ پوچھے کدھر چلا

نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھ ان دنوں رقیب   تھوڑے سے دم دلاسے میں کتنا ابھر چلا

مانگا جو میں دل کو تو کہا بس یہی اک دل   جتنے ہی تو چاہے مرے کوچے سے اٹھالا

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا منہ   طلب رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح

نکالے ہے وہ بے رخ ہو کے اپنے گھر سے یوں مجھ کو   شہ شطرنج کو جس طرح کشتیں دیویں شہہ شہہ کر

ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آجاتا ہوں   صید خائف کی طرح رو بقفا جاتا ہوں

جب پیر مغاں سے جا میں دختر رز مانگی   بولا کہ سعادت ہے پر وہ ابھی بالی ہے

جو یوں لاٹھی دکھاتا ہوں تو دانت اپنے نکوسے ہے   رقیب آگے ترے دے ہے مجھے بندر کی سی گھرکی

فارسی اور اردو ادب میں شیخ و زاہد کی عیاری و مکاری پر بہت لے دے رہی ہے۔ ان دونوں بانولں کے طنز و ظرافت کا بیشتر حصہ اس موضوع پر ہے۔ سودا نے بہت دلچسپ انداز میں واعظ و شیخ کی گت بنائی ہے ؎

سچ میں دنیا تو ہم چھوڑیں گے لیکن زاہدا　　چھوڑنا تیری طرح داڑھی کا مشکل ہوئے گا
ٹوٹا وضو شیخ تو جو رو کے ان کی نیند　　اچٹی تو یہ کہا کہ صدائے تفنگ خواب
واعظا دیکھیو بولا تو اگر سودا سے　　بے طرح کا ہے یہ کافر بت بیباک پرست
ڈروں ہوں میں نہ کریں رند تیری داڑھی کا　　تبرکات میں داخل ہر ایک مو واعظ
ہزار شیشہ مے اس میں تئیں چھپائے ہیں　　تری جو پگڑی ہے یہ صورت سبو واعظ
دیکھ زاہد کے سر عمامہ نو　　ہاتھ اٹھا رند بولے یا رزاق
شیخ صاحب کے عقد میں دنیا　　آئی تھی کب جو دی انہوں نے طلاق
پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا　　الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

غزل کے بعض قطعات ظرافت کی مکمل تصویریں ہیں۔ جن میں سودا نے مضحکہ خیز واقعات پیش کئے ہیں۔ اور ان واقعات کی ستم ظریفی کا اکثر شکار خود ہیں۔

سودا کو کہتے ہیں کہ ہے اس سے مصاحبت　　کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا
اوروں کی نسبت ان دنوں کچھ لگ چلا تھا دو　　دو چار جھڑکیوں میں بدستور ہو گیا

ایک اور قطعہ میں سودا نے تو اردو شاعری کی اس روایتی محفل کا مضحکہ اڑایا ہے جس میں محبوب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ عاشق محفل میں پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ہی بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ جو روایتی عاشق کی قسمت میں ہے۔ سودا کے قدرت بیان اور جزئیات نگاری نے اس قطعہ کو انتہائی دلچسپ بنا دیا ہے۔

ترغیب نہ کر مجھ کو واں چلنے کی اے سودا　　اس یار نے اب ہم سے یہ چہل نکالی ہے
وارد میں ہوا اس کے کل گھر میں تو یہ دیکھا　　تیوری سے چڑھا صورت کچھ اور بنالی ہے
ہر بات پہ ہے میری اوروں سے اسے چشمک　　مجھ پر وہ کنایہ ہے نوکر یہ جو گالی ہے
غیر اس کے اشارے سے جب کرنے لگے نوکیں　　اٹھا میں یہ کہہ کر تب یاں مرغ کی پالی ہے
ایک ان میں سے یوں بولا کیوں جاتے ہو تم بیٹھو　　جاؤ گے تو یہ مجلس پھر لطف سے خالی ہے
اس شوخ نے یہ سن کر بولا کہ خدا سے ڈر　　سر پر سے بلا اپنی جوں توں کی ہیں ٹالی ہے
پس غور کر اے ناداں جس گھر میں یہ صحبت ہو　　واں جا کے خوشی آنا یہ خام خیالی ہے

ایک اور قطعہ میں سودا نے ایک شیخ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ شیخ صاحب قسمت کے مارے ایک شام کو اتفاق سے میخانے سے گذرے۔ رندوں نے کس طرح ان کا استقبال کیا۔ اور ان کی کیا گت بنائی سودا کی زبانی سنیئے۔

کوئی میخانہ سے ناگہ شام کو گذرے جو شیخ　　کیا کہوں سودا جو رندوں نے سلوک ان سے کیا
کر سلام ان کو کہا جلدی سے لو یا رو قدم　　ہیں ز قسم اولیا یا از قبیلِ انبیاء

کوئی بولے تھا ملو منہ سے انہوں کی خاک بلا   کوئی کہتا تھا کرو آنکھوں میں اپنے طوطیا
آخر کار اس جگہ کیا دیکھتا ہوں رات کو   وہ مقدس صورت اور ایسے بزرگ بے ریا
ڈھونڈتے جاتے ہیں پیچھے پیچھے عمامہ کو آپ   اک مرید آگے چلا جاتا ہے دکھلاتا دیا

قطعات

سوداؔ فارسی کے جن شاعروں سے متاثر تھے ان میں نظیری نیشاپوری کا بھی نام آتا ہے۔ نظیری کی طرح سوداؔ نے بھی اکثر قطعہ بند غزلیں کہی ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا جزئیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی اور رہی سہی کسر وہ اپنے تخیل سے پوری کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ بعض قطعات منظوم افسانچے بن گئے ہیں۔ اس قسم کے چند قطعات "ظرافت نگاری" کے تحت دیئے جا چکے ہیں۔ چند اور ملاحظہ ہوں۔ ایک قطعہ میں سوداؔ نے اہلِ دنیا اور اہلِ چمن کا موازنہ کیا ہے۔ انہیں اہلِ چمن پر رشک آتا ہے۔ کیونکہ خدا نے زندگی کا پورا لطف ان کی قسمت میں لکھا ہے۔ وہ کسی سے حسد کرتے ہیں اور نہ کوئی ان سے۔ انہیں والئ شام بننے کی تمنا ہے اور نہ والئ روم، نہ وہ ہوسِ جاہ و منصب میں گرفتار، اور نہ کوئی انہیں بخشش کرنے والا ہے۔ یہ اہلِ چمن کبھی تلاش دنیا میں مارے مارے نہیں پھرتے ان کی پوری زندگی عیش و عشرت کا مرقع ہے۔ صبح کو جب بلبل حسین نغمے سناتی ہیں تو ہر ایک گل بہار سے اپنے حصے کا جام لے لیتا ہے۔ اس قطعہ میں سوداؔ کی تمنا و عمل ہے۔ اس عہد کے سیاسی وسماجی حالات کا۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ ہو[۵۹]

معاشِ اہلِ چمن جائے رشک ہے سوداؔ   کہ زندگی کا انہوں نے مزا تمام لیا
کسی کا ان میں سے محسود ہے نہ والیِ روم   حسد کسی کو نہ اس پر کہ جن نے شام لیا
کہیں نہ واسطے منصب کے ہیں یہ مجرائی   سلام کر کے کسو سے نہ لاکھ دام لیا
کبھو میں ان کو نہ دیکھا تلاشِ دنیا میں   کبھو نہ فکر و تردد سے کوئی کام لیا
ادھر شروع ہوا صبح نغمۂ بلبل   ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو جس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قطعہ میں بھی بھرپور افسانویت ہے۔

پوچھا اک روز میں سوداؔ سے کہ اے آوارہ   تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں
یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے   کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں
دل کو جن کے ہے تعلق یہ مکاں کیا جانے   عدم و ہستی انہوں کے یکساں ہے کہ نہیں
دیکھا میں قصرِ فریدوں کے درِ اوپر اک شخص   حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

اردو میں اس کی قسم کی قطعہ بند غزلیں بہت کہی گئی ہیں۔ میر تقی میرؔ کے یاں بھی اس کی اچھی خاصی مثالیں موجود ہیں لیکن سوداؔ نے ان قطعات کو جس مقصد کے لئے استعمال کیا اور جس طرح اپنے مشاہدے اور تجربے سے انہیں مکمل تصویریں بنا دیا اس کی مثالیں پوری اردو شاعری میں بہت کم ملیں گی۔

عریانیت سودا نے ہجو نگاری میں فحاشیت اورابتذال کی انتہا کر دی ہے۔ جو ہجویں دہلی میں کہی گئی ہیں۔ ان میں سودا تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں گئے۔ ضاحک اور فاخر مکیں کی ہجویں اردو میں کہی گئیں۔ اور انہیں دونوں کی ہجوؤں میں سب سے زیادہ فحاشیت ہے۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ اردو کا ماحول اس فحاشیت کے لئے سازگار تھا۔ غزل میں سودا نے بہت کم فحش، عریاں اور مبتذل شعر کہے ہیں۔ اور وہ بھی انشا اور جرأت کی معاملہ بندی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اگرچہ اردو میں خارجیت کی ابتدا سودا سے ہوتی ہے۔ لیکن سودا معاملہ بندی کی اس کیچڑ میں نہیں گرے جس نے بہت سے دامنوں کو خراب کیا۔ بلکہ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ سودا کے ہاں معاملہ بندی بہت کم ہے۔ اور فحش اشعار کی تعداد حیرت انگیز طریقہ پر مختصر ہے اور اتنے اشعار خواجہ میر درد جیسے بزرگ کے دیوان میں بھی مل جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے ہاں غزل گوئی کے خاص معیار تھے۔ اور انہوں نے غزل پر ہجو گوئی کا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔ اس کے برعکس میر صرف غزل کے شاعر تھے۔ مگر ان کے ہاں فحش اشعار کی تعداد سودا کے اشعار سے کہیں زیادہ ہے۔ معاملہ بندی کے چند اشعار سنئے۔

ہوا جاتی رہی وعدوں ہی میں تو شک نہالی کے
جواب بھی سو رہو مل کر تو جاڑا ہے دولائی کا

صوت ملی دل کی زباں کو کروگے کیا
گو ہم سے تم نے صحبت شب کی چھپائی بات

پھولوں کی سیج پر جو نہ سوئے تو کیا ہوا
یہ عیش ہے کہ تو ہو بغل بیچ ننگ خواب

آج تو مل گئے تنہا یہ کہو تو بارے
اب نہ ملنے کی مکافات کروں یا نہ کروں

اب چند اشعار ایسے ملاحظہ ہوں جن میں ہلکی سی فحاشی ہے۔ مگر ناگوار نہیں۔

چپکی اٹھ کر میں تجھے رات کروں یا نہ کروں
حق خدمت بھی کچھ اثبات کروں یا نہ کروں

اٹھ جانے میں ہے زور مزا یار سے لڑ کر
ملتے ہیں تو پھر چھاتی سے چھاتی کو رگڑ کر

واہ وا بے تپ کو والے کے
دے ہے تو دھا ہیں دکھا کال

موسم شیب میں بے فائدہ ہے لعب شباب
کب ثمر دیوے ہے جو نخل خزاں پر آیا

فضل حق ہو تو تنزل میں ترقی ہو جائے
قطرہ گوہر ہو صدف سے میں نکلتے دیکھا

تیغ چوبی سے کہاں قبضۂ فولاد ہو نصب
نہ رہے صاحب جوہر کبھو نامرد کے ساتھ

روشن دلوں کا حد سے نہ بڑھ کر قدم پڑے
باہر رکے نہ سایہ سے اپنے چراغ پا

کسی سے ہو نہ علاج رہ اذیت دہر
کہ بند ہو نہ سکے منہ پہ موش کے سوراخ

دیا تیں نقد دل اپنا اب ان خوبوں سے خطر کیا
جو مفلس ہو اسے ان رہزنوں سے ڈر نہیں ہوتا

تمثیل نگاری اس فن میں سودا نے صائب کا تتبع کیا ہے۔ بقول شیخ چاند صاحب نے یہ صنعت زیادہ تر اخلاقی اور حکیمانہ مضمون کے لئے استعمال کی ہے لیکن سودا نے اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کے ساتھ ساتھ عاشقانہ مضامین میں بھی

اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ اس صنعت میں پہلے ایک دعویٰ کیا جاتا ہے اور پھر ثبوت کے طور پر کوئی مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً سودا پہلے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر انسان کی فطرت ہی خراب ہو تو نیک لوگوں کی صحبت کیا اثر کر سکتی ہے۔ اور مثال یہ دیتے ہیں کہ آب گہر سے کبھی رشتہ تر نہیں ہو سکتا۔ یا پہلے مصرع میں کہتے ہیں کہ روشن دل کبھی دبنی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور پھر چراغ کی مثال دیتے ہیں۔ جو کبھی اپنے سائے سے آگے نہیں بڑھتا۔

سودا کے عہد میں اردو ابھی نوزائیدہ تھی۔ یہ سودا کی قدرت الکلامی اور استادی کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے بعض مشکل مضامین ادا کئے ہیں۔ اس صنعت میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زینت دلیل مفلسی ہے تنک کماں کو دیکھ　　نقش و نگار چھٹ نہیں کچھ اس کے خانے میں

میں زمانے کی سخاوت کا نہیں ہرگز مقر　　چھین کب لیتے ہیں کچھ دیکر کسی کو اہلِ جود

دل بے عشق کی دشمن ہے تحریک نفس ناصح　　کرے ہے کام پتھر کا ہوا مینائے خالی سے

امن دو دل کو ہو کجا بہ بساطِ دوراں　　چوٹ کھاتی نہیں وہ نرد جو ہو نرد کے ساتھ

خیال بندی

سودا کے لئے شاعری دردوغم کے اظہار کا ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ شاعری کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کے ہاں خارجیت ہے۔ ان کی غزل میں بے شک وہ تڑپا دینے والا اثر نہیں ہے جو داخلی شاعروں کی خصوصیت ہوتا ہے۔ لیکن غزل کی ہیئت کو جو کچھ انہوں نے دیا ہے۔ ان کے عہد کا کوئی شاعر نہیں دے سکا۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی صرف ان شاعروں کے کلام میں ملتی ہے۔ جو دل سے نہیں دماغ سے شاعری کرتے ہیں۔ جن کا مشاہدہ بہت وسیع ہوتا ہے اور جنہیں زبان و بیان پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ یہ جادو دکھانے کا فن ہے۔ اس میں واردات قلبی، انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف شکوہِ الفاظ استعاروں اور تشبیہات کی مرصع کاری ہوتی ہے۔ معنی یابی اور مضمون آفرینی کے بارے میں محمد حسین آزاد نے بہت جچی تلی رائے دی ہے۔ وہ آب حیات میں لکھتے ہیں "کلام کو رنگین اور استعارہ و تشبیہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے۔ مگر زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب اس طرح ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو یہ بات بہت مشکل ہے۔ شیخ سعدی کی گلستاں کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے۔ نہ اس میں نازک خیالات ہیں نہ کچھ اعلیٰ مضامین ہیں۔ نہ پیچیدہ تشبیہیں ہیں نہ استعارہ در استعارہ فقرے ہیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں صاف صاف باتیں ہیں۔ اس پر آج تک اس کا جواب نہیں مینا بازار اور پنج رقعہ کے انداز میں صدہا کتابیں موجود ہیں۔ اس معاملے میں غور کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بزرگ خیال بندی اور نازک خیالی کے چمن میں ہوا کھاتے ہیں اول ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے نئے مضامین نکالیں جو اب تک کسی نے نہ باندھے ہوں لیکن جب متقدمین کے اشعار سے کوئی بات

پچی ہوئی نہیں دیکھتے تو ناچار انہیں کے مضامین میں موشگافیاں کرتے ہیں۔ اور ایسی ایسی لطافتیں اور نزاکتیں نکالتے ہیں کہ غور سے خیال کریں تو نہایت لطف حاصل ہوتا ہے۔[1]

فارسی میں ناصر علی، غنی اور بیدل کے کلام کو اور اردو میں ناسخ کی پوری شاعری کو اس معنی میں اور مضمون آفرینی نے ڈبو یا۔ سودا کے ہاں خیال بندی فارسی شاعروں اور خاص طور پر بیدل کے واسطے سے آئی۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے یہ اثر ضرور قبول کیا۔ مگر بہت معمولی۔ اس لئے ان کے ہاں اس قسم کے اشعار کی تعداد غزلوں میں بہت محدود ہے۔ البتہ قصائد میں نسبتاً زیادہ ہے۔ اور درحقیقت خیال بندی قصائد ہی کے لئے موزوں بھی ہے۔ اب چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خیال بندی

رطوبت داغ دل میری کی ہے گرداب آتش کا — فسوں عشق نے زہرہ کیا ہے آب آتش کا

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے — دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

گل مرے مشہد پہ کب بھیجے ہے وہ ابرو کماں — طرح غنچہ کے کھلے جب تک نہ پیکاں تیر کا

بسانِ طائر رنگ حنا قدم لے کر — ہر ایک کبک نے پیارے ترا خرام لیا

دیکھا میں جب گلے میں ترے ہار دستگیر — تار نگہ میں اشک کا دانہ پرو دیا

لب لعل بتاں پر سرخی پان ہے کہ جادو ہے — بنا دی شکل طوطی صورت سرخاب آتش پر

گر ہو پانی دل اس کا خوف سے اے شعلہ خو — لگ اٹھے تیری نگاہ گرم سے درپن میں آگ

یہ نہیں دریا کہ جس سے گذرے تو پل باندھ کر — موج چشم عاشقاں سے توڑ پل میں پکی کے پل

---

[1] آب حیات ص/ ۳۹۰-۳۹۱

اُڑ گئی ہے جلوے پہ حسینوں کے مری آنکھ دید اُن کی سے پہونچے ہے بہم بال و پرِ چشم

بہ معنی آشنا مینائے مے ہے پرزِ خاموشی برائے ہرزہ گو گفتار لاطائل ہے شیشے میں

طائرِ رنگِ حنا کی نمط اب اے صیاد ہوں تو میں ہاتھ میں تیرے پہ اڑا جاتا ہوں

خیال پنجۂ مژگاں میں یہ احوال ہے دل کا کہ جیسے صید کو شاہیں کا چنگل مسلتا ہے

شمع رو کہنا اُسے سودا ہے تاریکیٔ عقل شمع کا عکس اس کے عارض پر کلف ہے ماہ کا

حُسنِ تعلیل

اس صنعت میں پہلے شاعر کوئی واقعہ یا حقیقت بیان کرتا ہے۔ اور اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی جو علت پیش کرتا ہے وہ صرف اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً پہلے مصرع میں شاعر اپنے محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے رات تو بے نقاب پھرتا ہے اور دوسرے مصرع میں اس دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے کہ جبھی تو سورج شرم کے مارے پانی میں جا چھپتا ہے۔ حالانکہ رات کو سورج کے چھپنے کے وجوہ کچھ اور ہیں۔ سودا کو یہ صفت بہت پسند تھی اس لئے ان کے کلام میں حسنِ تعلیل کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

چمن نہ تنہا جنہوں کے غم سے ہنوز چھاتی پیکلائے ہے گل رکھے ہے اب تک ہزار جا سے روش بھی سینہ فگار اپنا

دلیل ہے تری شب بے نقاب پھرنے کی چھپے ہے شرم سے جا آفتاب در تہِ آب

دامانِ شفق آج خون آلودہ میں دیکھا چلتی ہے ترے عہد میں شمشیر ہوا پر

تارے یہ نہ سمجھو بہ شبِ تار فلک پر پہنچی ہے مری آہِ شرر بار فلک پر

تنہا نہ شمع روئے ہے سودا کی خاک پر گل بھی تو لوٹتا ہے گریباں کو پھاڑ پھاڑ

شبنم کرے ہے دامنِ گل شست و شو ہنوز بلبل کے خوں کا نہ گیا رنگ و بو ہنوز

کلیوں نے دیکھ شوخی گل چیں کو اس قدر
اتنا لہو پیا کہ ہے پر خوں دہن ہنوز

کس کے ہیں زیر زمیں دیدۂ نم ناک ہنوز
جا بجا سوت ہیں پانی کے تہ خاک ہنوز

یاقوت نہیں ہے وہ ترے لعل سے اے شوخ
جاڈوبی ہے یہ آب میں ہو کر خجل آتش

کہکشاں ہے نام کو لیکن مرے احوال پر
آسماں روتا ہے منہ پہ دھر کے ہر شب آستیں

شب نہ تنہا بے قراری سے مجھی کو کام ہے
نور شمع اس شوخ بن جوں برق بے آرام ہے

لالہ خود رو نہیں ہے خون نے فرہاد کے
جوش میں آکر لگا دی کوہ کے دامن میں آگ

تشبیہات و استعارات

سودا نے تشبیہوں اور استعاروں کو بھی اظہار بیان کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ تشبیہوں کے سہارے سے ایک مفہوم ادا کرتے ہیں۔ ایک مفہوم کے سہارے تشبیہ کا استعمال نہیں کرتے۔ اسی لئے ان کی تشبیہیں بہت سادہ اور پرکار ہوتی ہیں جن کی بنیاد ان کے تجربات اور مشاہدات پر ہوتی ہے۔ سودا تشبیہ کی مدد سے بے جان الفاظ میں روح ڈال کر ایک جاندار تصویر بنا دیتے ہیں۔ محبوب کی نازک اندامی کے لئے اس سے بہتر تشبیہ نہیں ہو سکتی کہ جب محبوب کو پسینہ آتا ہے تو اس کے جسم پر ایسے خراش آجاتے ہیں جیسے موم پگھلنے سے شمع پر۔

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سودا بیاں
شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

شاعر محبوب کی گلی سے بغیر آواز پیدا کئے دبے پاؤں آہستہ آہستہ گزرتا ہے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ اس کی اپنی کوئی منزل اور کوئی جائے قیام نہیں۔ جس طرف راستہ ملتا ہے وہ بڑھ جاتا ہے۔ دیکھئے سودا نے اس کیفیت کو کتنی تشبیہ کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

تری گلی سے گذرتا ہوں اس طرح ظالم
کہ جیسے ریت سے پانی کی دھار گذرے ہے

محبوب جب سفید پیرہن پہنتا ہے تو اس کا حسین گلابی جسم باریک لباس میں سے جھلکتا ہے۔ سودا اس سادہ سی حقیقت کو کتنی خوبصورت تشبیہ کے وسیلے سے بیان کرتے ہیں ؎

سودا نے ان تشبیہات کے بیان سے زندگی کے عام تجربات اور مشاہدات سے بھی کام لیا ہے۔ جب لشکر روانہ ہونے کے لئے تیاری کرتا ہے تو ہر طرف گرد اٹھتی ہیں۔ سودا اس تشبیہ کا بڑا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔

کوچ شاہِ حسن کا ہے وہ غبار خط نشاں — گرد لشکر سے اٹھی وقت سواری بیشتر

یہ حقیقت ہے کہ تشبیہوں نے بعض اشعار کو بے مزہ اور پھیکا بھی کر دیا ہے۔ تو یہ سوداؔ کی غزل کی عام خصوصیت ہے۔ چند تشبیہیں اور استعارے اور ملاحظہ فرمائیے۔

بخشے ہے یوں دل کو میرے تقویت دشنام یار — جوں دوائے تلخ سے پاوے کوئی بیمار فیض
دیکھوں ہوں یوں میں اس ستم ایجاد کی طرف — جوں صید وقت ذبح کے صیاد کی طرف
بجز بن اعضا کا ہے یہ میرے حال — تار شیرازہ بن ہوں جوں اوراق
ٹکڑے تو ابھی لعل کے دل بیچ دھرے ہیں — ہم نے تو ابھی موتی ہی آنکھوں میں بھرے ہیں
جن نے نہ دیکھی ہو شفق صبح کی بہار — آ کر ترے شہید کو دیکھے کفن کے بیچ
حلقہ میں اس کی زلف کے عارض پہ کر نظر — جوں شب میں رہ گیا ہو گرہ کھا کے نورِ صبح
بزم میں وہ شمع رو یارب کرے گا کب ورود — یوں ہوں آتش زیر پا جس طرح سے مجمر میں عود
در آویزہ اس کی زلف اور رخسار سے باہم — جھمکتا ہے برنگ گوہر شب تاب آتش پر

ڈاکٹر گیان چند

اُردو کی آوازیں

سب سے پہلے مجھے یہ معذرت کرنی ہے کہ ایک خاص علمی مضمون کو شخصی انداز میں لکھا چاہتا ہوں۔ چونکہ اس مضمون میں کئی نظریات ایسے ایجاد بندہ ہیں جن سے شاید دوسروں کو شدید اختلاف ہو اس لئے ان اوراق میں میں جا بجا واحد متکلم کا سہارا لئے بغیر چارہ نہیں۔ دوسری معذرت اس بات کی ہے کہ مضمون خاصہ اصطلاحی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اسے کسی قدر عام فہم بنا کر پیش کیا جائے لیکن اس سعی نامشکور میں غیر ضروری اطناب تو ہو جاتا لیکن اس کے باوجود بھی یہ عام پڑھنے والوں کے لئے ناقابل فہم رہتا اسی لئے مجھے یہ کوشش ترک کرکے قارئین کے ایک بہت محدود حلقے پر قناعت کرنی پڑی۔

اس کے بعد ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا ایک مضمون 'اردو مصوتوں کی صحیح تعداد' نیا دور ستمبر ۶۱ء میں اور ایک دوسرا مضمون "اردو کی اصوات اور صوتیے" نقوش جولائی ۶۲ء میں شائع ہوا۔ ان مضامین کی تحریر کے بعد بھی میں اس موضوع پر غور کرتا رہا۔ آوازوں کے وقوع کی نئی نئی مثالیں ملنے سے اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد مئی جون ۶۲ء میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں لسانیات کے اسکول میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ جہاں دو ماہرین صوتیات ڈاکٹر اشوک کیلکر پروفیسر لسانیات آگرہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر سبرامنیم پروفیسر تامل کیرالا یونیورسٹی کے ساتھ کئی طویل نشستوں میں اردو کی آوازوں کے تجزیے کی کوشش کی۔ مزید معلومات کی روشنی میں سابق فیصلوں میں بعض اہم اور دور رس ترمیمات ضروری دکھائی دیں جس کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ خاص طور سے مصوتوں اور نیم مصوتوں کے تجزیے میں کچھ بنیادی تبدیلیاں ملیں گی۔

دلی یونیورسٹی کے رسالہ اردوئے معلی لسانیات نمبر کے دو مضامین میں اردو کا صوتی تجزیہ کیا گیا ہے میرا تجزیہ ان سے مختلف ہے جسے میں بڑے ادب کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرا یہ مسلک ہے کہ کسی زبان کی اصوات کو صوتیوں میں سمیٹنے کے ایک سے زیادہ طریق ہو سکتے ہیں جن میں سے بعض حضرات کو ایک پسند ہوگا تو بعض کو دوسرا۔ یہ کاملان فن کے طے کرنے کی بات ہے کہ کون سا تجزیہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ ہاں اصوات کے تعین میں کئی تاویلوں کی گنجائش نہیں۔ صوتیات کے طالب کا فرض ہے کہ اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں

کو گرفت میں لا سکے یعنی اصوات کی فہرست جتنی جامع اور مفصل ہو خوب ہے لیکن اس کے برعکس صوتیے جتنے کم ہوں اسی قدر سہولت کا حق ادا ہوتا ہے۔

———— ٭ ————

اردو مصمتوں کے پانچ نقشے میری نظر سے گزرے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر زور کی انگریزی کتاب Hindustani Phonetics میں ص ۶۲ پر

۲۔ پروفیسر سروری کی کتاب 'زبان اور علم زبان' میں ص ۵۹ پر

۳۔ جناب سرسوتی سرن کیف کے مضمون 'ہندوستانی صوتیات' مشمولہ نیا دور مارچ ۱۹۶۰ء میں ص ۱۱ پر

۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضمون مشمولہ 'اردو' کے معلیٰ لسانیات نمبر میں ص ۱۱۵ پر

۵۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مضمون مشمولہ اردوئے معلیٰ لسانیات نمبر میں ص ۲۲۳ پر

میرے نزدیک اردو میں جو مصمتے صوتیے کا مرتبہ رکھتے ہیں انھیں ذیل کے نقشے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس نقشے میں میں نے چند خود ساختہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ بعض دوسری اصطلاحوں سے میں مطمئن نہیں لیکن چونکہ انھیں کچھ لوگوں نے استعمال کیا ہے اس لئے سہولت کی خاطر میں نے بھی انہیں لے لیا ہے۔

اردو کے مصمتی صوتیے (Consonantal Phonemes)

	دولبی		لب دنتی		دنتی		لثوی ALVEOLAR		معکوسی		تعقب لثوی PALATO-ALVEOLAR		تالوی PALATAL		نرم تالوی VELAR		پیش حلقی UVULAR		[illegible]
	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع	مسموع	غیر مسموع
اسپھوٹ یا سرودا	پ	ب			ت	د			ٹ	ڈ					ک	گ	ق		
افریکیٹ AFFRICATE													چ	ج					
غنائی		م						ن								نٓ			
پہلوئی Lateral								ل											
بستکی Flapped								ر		ڑ									
صفیری			ف				س	ز			ش	ژ					خ	غ	ہ
نیم مصوتہ				و										ی					

میرے نقشے میں اور دوسرے حضرات کے نقشوں میں بعض جزئیات میں فرق ہے مثلاً

۱۔ بعض حضرات نے ن ۔ ل ۔ ر ۔ س ۔ ز میں سے کچھ کو یا سب کو دنتی آوازوں میں شامل کیا ہے۔ میں نے ڈینیل جونز Danial Jones کی تقلید میں ان پانچوں آوازوں کو لثوی قرار دیا ہے۔ میرا تلفظ بھی اسی کا شاہد ہے۔ واضح ہو کہ پانینی نے [س] کو دنتی آواز لکھا ہے لیکن آج اس کا تلفظ اوپری مسوڑے سے ہوتا ہے۔

۲۔ اکثر حضرات نے چ ۔ چھ ۔ ج ۔ جھ کو اچھوٹ آوازوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ میرے نزدیک ان آوازوں کو الفرکیٹ قرار دینا صحت کے زیادہ قرین ہے۔

۳۔ ف کو بعض نقشوں میں بھی (دولبی) آواز قرار دیا ہے۔ اردو اور انگریزی [ف] صاف صاف لب دنتی ہے۔ آئینے کے سامنے بول کر دیکھ لیجئے۔

۴۔ [و] کو مندرجہ بالا تمام نقشوں میں صفیری آواز ظاہر کیا گیا ہے اور بیشتر میں لب دنتی کی بجائے دولبی۔ دولبی صفیری آواز اسپینی اور وسط جرمانی میں ملتی ہے۔ ہمارے [و] سے مماثل انگریزی میں دو آوازیں ہیں [V] اور [W]۔ [V] ہمارے [و] کی طرح لب دنتی ہے لیکن وہ صفیری آواز ہے۔ یعنی اس کے ادا کرنے میں ہوا بہت تنگ راستے سے جدوجہد کے ساتھ نکلتی ہے۔ اردو [و] نیم مصوتہ یعنی غیر جہدی (Frictionless) ہے۔ اس کے ادا کرنے میں ہوا کا راستہ نسبتاً کشادہ رہتا ہے۔ انگریزی میں [W] دولبی نیم مصوتہ ہے جو اردو میں عام طور سے نہیں پایا جاتا۔ اردو الفاظ میں [و] صرف [U] کے بعد دولبی ہو جاتا ہے۔ I.P.A. کے رسالے میں صریحاً لکھا ہے کہ ہندی [و] لب دنتی نیم مصوتہ ہے۔

۵۔ بعض حضرات نے [ہ] یعنی ہائے ہوز کی آواز کو اردو مصمتوں میں شامل ہی نہیں کیا۔ معلوم نہیں کیوں

یہ جزئیات کی باتیں تھیں ذیل میں کچھ اہم تر امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(۱) میں نے نقوش کے مضمون میں ذیل کی دس منفوس آوازوں کو واحد مصمتہ اور صوتیہ قرار دیا تھا۔

پھ ۔ بھ ۔ تھ ۔ دھ ۔ ٹھ ۔ ڈھ ۔ کھ ۔ گھ ۔ چھ ۔ جھ

ذیل کی پانچ منفوس آوازوں کو مصمتی خوشہ مانا تھا۔

مھ ۔ نھ ۔ لھ ۔ رھ ۔ ڑھ

اس طرح اردو میں کل ۵۰ کے قریب صوتیے قرار پاتے تھے۔ کسی زبان میں اتنے صوتیوں کا ہونا خلاف معمول سا ہے۔ شاید ہمارا صوتیاتی تجزیہ ناقص ہو اس پر ایک بار نظر ثانی کر لی جائے۔

اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تنفس (ھ کاریت یا aspiration) ھ کی آواز ہی کا ایک روپ ہے یعنی پھ - بھ وغیرہ دس منفوس آوازیں اپنے ساتھ کے مقلول مصمتے اور ہائے مخلوط کا مجموعہ ہیں چنانچہ اسی وجہ سے اردو اور انگریزی رسم الخط میں منفوس آوازیں ھ کے شمول سے لکھی جاتی ہیں۔ یہی نہیں خود صوتیاتی رسم الخط میں منفوس آوازوں کو [ھا] سے مرکب ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسپھوٹ آوازوں میں ھ کے ادغام کی نوعیت مھ - نھ - وغیرہ سے مختلف ہے۔ کیوں نہ ہم [ھ] کے تین ہم صوت قرار دے لیں۔

۱- [تنفس] یا ھ کاریت یا aspiration - ھ کی یہ آواز اسپھوٹ آوازوں اور چ - ج کے بعد ان میں ضم ہوکر بولی جاتی ہے۔ دونوں آوازیں ایک ہی رکن کا جزو ہوتی ہیں۔

۲- [ہائے مخلوط] جو م - ن - ل - ر - ڑ کے بعد اور عوامی بولی میں ی (بیاں) و (وھاں)۔ ز (مذہب) کے بعد اس طرح آتی ہے کہ دونوں آوازیں ایک ہی رکن کا جزو ہوتی ہیں مثلاً کمھار - انھیں - کولھو - سرھانے - چڑھا - یہاں ھ کی آواز ماقبل مصمتے سے نہ پوری طرح جدا ہے نہ کا ملاً شیر وشکر ہے۔

۳- [ہائے ملفوظی] جو بقیہ تمام موقعوں پر آتی ہے مثلاً ہار - ہنکنا - کہہ - اطہر - صدہا - جبہر نکہت - آخر الذکر چار مثالوں میں ھ اسپھوٹ آوازوں کے بعد میں ہے لیکن چونکہ یہ اسی رکن میں شامل نہیں اس لئے اسے پہلی شق میں نہیں رکھ سکتے۔

مندرجہ بالا تینوں ہم صورت جداگانہ ماحول میں واقع ہوتے ہیں اس لئے / ھ / کے مختلف روپوں کا تجزیہ تکملی بٹوارے کے تقاضوں کو آسودہ کرتا ہے۔ واضح ہو کہ میں نے بھ - پھ وغیرہ کو دوہرے مصمتے قرار نہیں دیا بلکہ ب - پ کے چند اجزائے ترکیبی (components) میں ایک اور جز و یا وصف تنفس کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح ہم اردو میں دس صوتیے کم کر سکتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ہاکٹ نے Manual of Phonology میں ہماری منفوس آوازوں کو صوتیہ نہ ماننے کی سفارش کی ہے۔

(۳) میں نے / ڈ / اور / ڑ / کو جداگانہ صوتیہ قرار دیا ہے۔ اس کی وجوہ بیشتر میں اپنے بعض مضامین میں لکھ چکا ہوں۔ ان کا خلاصہ ایک بار پھر درج کرتا ہوں۔

اگر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ / ڈ / لفظ کے درمیان آتا ہے یا نہیں تو ہم ان سب مرکب الفاظ کو شمار میں لے سکتے ہیں۔ جن میں ڈ کے بعد وقفہ (open juncture) نہ ہو۔ اس طرح - مڈھ - سڈول - لاڈلا - ڈگڈگی - ڈبڈبانا - ڈگڈگا کر پانی پینا جیسے مرکب یا مرکب نما الفاظ بھی ہمارے جائزے میں شامل ہو جائیں گے۔ دوسری طرف گڈریا - اجڈ - کھنڈ - گڈنڈ - اڈمبر[۱] جیسے الفاظ ہمارے مفید

---

[۱] - شبدوں کا آڈمبر رچ کر - فراق - گل نغمہ ص ۳۰۳

مطلب ہیں۔ گدڑیا اگرچہ مرکب لفظ ہے لیکن لاحقہ کا اضافہ /ڈ/ سے دور ہے۔ ان سب الفاظ میں /ڑ/ جس ماحول میں آتا ہے۔ اسی ماحول میں دوسرے الفاظ میں /ڑ/ بھی ملتا ہے۔ ہمیں اجڈ اور اجڑ کا ایک اتلی جوڑا بھی مل جاتا ہے۔

مقامات کے ناموں سے کسی علاقے کی زبان کا مزاج بڑی خوبی سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ مقامات کے نام اپنی قدامت کے باعث زبان کا اصلی رنگ محفوظ رکھتے ہیں۔ ہردوار میں ایک مقام 'بھیم گوڈا' ہے وہاں کی بولی میں 'گوڈا' گھٹنے کو کہتے ہیں۔ ضلع بجنور میں تین گاؤں کے نام بڈیرن۔ گڈانہ ([illegible]) اور بڈگرہ ([illegible]) ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھڑی بولی کو دو مصوتوں یا ایک مصوتہ اور مصمتہ کے درمیان ڈ کو قبول کرنے سے کوئی بھڑک نہیں۔ یہ اس کے لئے ایک معمول کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'ڈالڈا' جیسے ہندوستانی لفظ اور 'سوڈا' جیسے انگریزی لفظ ہماری زبان میں اس طرح کھپ گئے ہیں کہ کسی کو ان کی صوتی ساخت و بندش میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ /ڈ/ ہر مقام پر اور ہر ماحول میں واقع ہوتا ہے۔

(۳) اردو کی غنائی اصوات کسی قدر تفصیل طلب ہیں۔

اردو مصمتوں میں تین غنائی صوتیے ہیں۔ /م/ن/نٗ (یعنی ङ)/۔ ہندی میں جہاں کہیں نٗ (ण) ہوتا ہے اردو میں ہمیشہ اس کو [ن] میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ مخرج کے اعتبار سے ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ سے پہلے آنے والا [ن] بھی اپنے مابعد کے مصمتے کی طرح معکوسی ہو جاتا ہے۔ لیکن سماعی اعتبار سے انڈا اور گھنٹا کے [ن] اور 'بندا' اور 'بنتا' کے [ن] میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے اردو میں معکوسی آوازوں سے پہلے آنے والے [ن] کو ण کا ہم صوت کہنے کے بجائے /ن/ کا ہم صوت قرار دینا ہی بہتر ہے۔

/م/ یہ صرف دولبی مصمتوں [ب۔ پ] اور لب دنتی آوازوں [ف۔ و] کے ساتھ ہم مخرج ہو سکتا ہے مثلاً امبر۔ شمبھو۔ چمپا۔ ہموار۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ دولبی آوازوں کے ساتھ صرف م ہم مخرج ہو سکتا ہے ن نہیں۔ دنبہ۔ عنبر۔ سنبھل۔ تانبا وغیرہ میں ن لکھنا رسم الخط کا مغالطہ ہے۔ ہم م بولتے ہیں لیکن رسم الخط سے گمراہ ہو کر سمجھتے ہیں کہ ن بول رہے ہیں۔

مندرجہ بالا آوازوں کے پہلے ہم مخرج یا واصل ہونے والا [م] بجائے خود کوئی نئی آواز نہیں۔ چمپا اور جمنا کے م کو مختلف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں لب دنتی آوازوں کے قبل م خود لب دنتی ہو جاتا ہے۔ اس طرح /م/ کے دو ہم صوت قرار دئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ لب دنتی مصمتوں کے قبل آنے والا [لب دنتی م]۔ مثلاً ہموار۔

۲۔ بقیہ سب مقاموں پر آنے والا [دولبی م] مثلاً مال۔ چمپا۔ کم۔

/ن/ اپنے بعد آنے والے بعض مصمتوں کے ساتھ ہم مخرج ہو سکتا ہے۔ ان مصمتوں کے

تعین کے دو اصول ہیں۔

ا۔ مقامِ تلفظ۔ [ن] کو ادا کرنے کے لئے نوکِ زبان مسوڑے کو چھوتی ہے لیکن اگر اس کے فوراً بعد نوکِ زبان سے ادا کیے جانے والا کوئی مصمتہ آتا ہو تو [ن] کا تلفظ بھی اسی مصمتے کے مقام سے کر دیا جاتا ہے۔ نوکِ زبان سے ادا ہونے والی آوازیں دنتی اور تالوئی کے درمیان ہیں۔

ب۔ طریقِ تلفظ۔ [ن] کے ادا کرنے کے لئے نوکِ زبان منھ سے ہوا کا اخراج بند کر دیتی ہے اور حلق سے ناک کا راستہ کھلا رہتا ہے۔ اسپھوٹ اور ایفرکیٹ مصمتوں کا تلفظ اس سے بہت مماثل ہے۔ نوکِ زبان اپنے مقام پر قائم رہتی ہے اور خلائے بینی کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔ ان مصمتوں کے بعد [ن] سے مماثل ترین طریقِ تلفظ صفیری آوازوں کا ہے۔ ن کو ادا کرنے کے لئے نوکِ زبان جس نقطے کو چھوتی ہے صفیری آوازوں کی ادائیگی کے لئے اس سے قدرے علیحدہ ہو کر ایک تنگنائے چھوڑ دیتی ہے۔ باقی تمام مصمتوں کا طریقِ تلفظ ان سے بہت مختلف ہوتا ہے۔

ان دونوں اصولوں کے اجتماع سے ذیل کے مصمتے حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ ت ۔ د ۔ ٹ ۔ ڈ ۔

۲۔ چ ۔ ج ۔

۳۔ س ۔ ز ۔ ش ۔ (ژ سے پہلے ن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔)

لفظ کے درمیان ان حروف سے پہلے آنے والا [ن] ہمیشہ ان کے ساتھ ہم مخرج ہوگا۔

ان کے علاوہ دوسرے کسی مصمتے سے پہلے ن ہم مخرج نہیں ہو سکتا۔ اس طرح [ہم مخرج ن] اور [مختلف المخرج ن] آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں۔ آخر الذکر میں اعلانِ نون اول الذکر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ ہم مخرج ن کی مقامِ تلفظ کے اعتبار سے تین قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح کل ملا کر /ن/ کے چار ہم صوت قرار پاتے ہیں۔

۱۔ دنتی اسپھوٹ اور سینیوں (dentalinals) یعنی ت ۔ د ۔ س ۔ ز ۔ ش سے ماقبل مثلاً سنت ۔ اندھا ۔ انسان ۔ منزل ۔ منشی ۔

۲۔ معکوسی اسپھوٹ یعنی ٹ ۔ ڈ سے ماقبل مثلاً گھنٹا ۔ انڈا ۔

۳۔ تالوئی چ ۔ ج سے ماقبل مثلاً ونچ ۔ رنج ۔

۴۔ منفصل یا مکمل اعلان کا [ن] جو

ا۔ بقیہ تمام مصمتوں کے قبل آتا ہے مثلاً کنبہ ۔ انور ۔ تنکا ۔ انقلاب ۔

ب۔ مصوتوں سے قبل آتا ہے۔ مثلاً نور ۔ بنا ۔

ج۔ لفظ کے آخر میں آتا ہے مثلاً گردن ۔

یہ چاروں ہم صوت آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں۔

نؐ / ڈ / ن کے برخلاف یہ ہمیشہ بعد میں آنے والے نرم تالوئی اسپھوٹوں کے ساتھ ہم مخرج ہوتا ہے مثلاً ڈنگ ۔ پنکھا ۔ سنگ ۔ کنگھا ۔ اردو والے اس آواز کو غلط فہمی سے [ن] سمجھتے ہیں لیکن اس کا مخرج ن سے اس قدر مختلف ہے کہ اسے کسی طرح کھینچ تان کر بھی / ن / کا ہم صوت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسے ن قرار دینا ایسی ہی بے اصولی ہوگی جیسی کھمبا ۔ گمبھیر ۔ سمبت ۔ چمپت کے م کو ن قرار دینے میں ۔ سنت اور سنگ کی غنائی آواز میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا سنت اور سمت میں ۔ / ن / اور / نؐ / کے تضاد کی مثالیں منکا اور ڈنکا ۔ سنکی اور پھنکی جیسے جوڑے ہیں۔

عام خیال یہ ہے کہ نؐ اور دوسرے انوسوار یعنی ہم مخرج غنائی مصمتے صرف مصوتوں کے بعد آسکتے ہیں۔ انوسوار کے معنی ہیں سور یعنی مصوتے کے بعد لیکن ذیل کے الفاظ میں یہ قاعدہ غلط ہو جاتا ہے۔
لنگا ۔ ہنگی ۔ جہنگا ۔ ہنگی ۔ جھنگائی ۔ ہندی ۔

میرا خیال ہے کہ ان موقعوں پر [ہ] لغزیہ (glide) کا فائدہ دے رہی ہے۔

یاکوبسن (Jacobson) نے اپنی کتاب Fundamentals of Language میں ی اور و کے ساتھ ہ کو بھی لغزیہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ[1] بھی انگریزی میں یہ تین لغزے تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری[2] نے 'جیل' کے مسخ شدہ تلفظ 'جہیل' (जह्ल) میں ہ کو لغزیہ قرار دیا ہے۔ جہنگا اور جہندی وغیرہ میں بھی ہ اسی طرح سے آتی ہے۔ اس طرح اردو کے تمام غنائی مصمتوں کو تین صوتیوں / م / ن / نؐ / میں گروہ بند کیا جا سکتا ہے۔

(۴) / ل / اس کے دو ہم صوت ہیں۔

۱۔ معکوسی مصمتوں سے قبل [ل] کا تلفظ بھی ایک حد تک معکوسی ہو جاتا ہے مثلاً الٹا پلڑا میں۔

ب۔ دوسرے موقعوں پر مثلاً لڑکا ۔ عمل ۔ سلمہ ۔

(۵) / و / اس کے دو ہم صوت ہیں۔

۱۔ دو لبی و یعنی [W] یہ [U] کے بعد لغزے کے طور پر آتا ہے مثلاً کوا ۔ جوا ۔ اس قسم کا [و] ہندوستانی زبانوں میں نہایت شاذ ہے۔

۲۔ لب دنتی و [ʋ] بقیہ تمام موقعوں پر مثلاً وعدہ ۔ دوا ۔ ماد ھو

---

[1] سامانیہ بھاشا وگیان (ہندی) طبع ششم ص ۱۰۲
[2] بھاشا وگیان طبع سوم ص ۲۱۲

(۶) /ی/ اس کی دو اقسام معروف عام ہیں۔ اوّل جب کہ یہ دو مصوتوں کے درمیان نیم مصمتہ کے طور پر آتی ہے۔ دوسرے بقیہ موقعوں پر۔ پہلی صورت میں یہ اپنے ماقبل کے مصوتے سے کسی حد تک متعاقب مصوتے کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ماحول کے مطابق اس کی متعدد قسمیں ہو جاتی ہیں جن پر لیبارٹری میں مفصل تحقیق کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک اس کے کم از کم حسب ذیل ہم صوت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ مندرجہ ذیل موقعوں پر آتی ہے (۱) لفظ کے شروع میں مثلاً یار (۲) لفظ کے درمیان ہ کے علاوہ کسی دوسرے مصمتے کے بعد مثلاً دنیا۔ اغیار۔ (۳) لفظ کے آخر میں مثلاً راجیہ۔ /ی/ کی قسم کو بجا طور پر مصمتہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ بلند ترین قسم ہے۔

۲۔ مندرجہ بالا سے برائے نام نیچی ہے۔ یہ اس وقت ادا ہوتی ہے جب اس سے ماقبل [iː] یا اس کے بعد [uː] ہو۔ [iː] کے مابعد بھی متعاقب مصوتوں [o, ɑ, ə, e] کے زیر اثر اس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے مثلاً لئے۔ عاریت۔ کیا۔ جیو میں اس کا تلفظ بعد کے مصوتے کے قریب ہے۔ اسی طرح [uː] کے قبل آنے والی [ی] اپنے ماقبل مصوتہ [ɑ, ɑ, ə, i] سے کچھ نہ کچھ متاثر ہوتی ہے مثلاً قیوم۔ غیور۔ قیود۔ وایو۔ میں

۳۔ ی کی سب سے نیچی قسم ہے۔ اس کے پہلے [o, ɑ, ə, e, u] میں سے کوئی ایک آئے اور بعد میں [ə, ɑ, o] میں سے کوئی ایک مصوتہ ہوتا ہے مثلاً احیا۔ قایم۔ سویم۔ گیا۔ آیا۔ کھویا سخن گویو۔

(۷) مصوتے اردو میں مصوتوں کا معاملہ نہایت پیچیدہ ہے ہندی سے کہیں زیادہ پیچیدہ۔ میں ان تمام مصوتوں کے شمار کی کوشش کروں گا۔ بعد میں انہیں صوتیوں میں گروہ بند کیا جائے گا۔ اپنے مضمون "اردو مصوتوں کی صحیح تعداد" نیا دور ستمبر ۶۱ء میں میں نے اردو میں ۱۳ مصوتوں کی نشان دہی کی۔ عجب اتفاق ہے کہ ترقی اردو بورڈ پاکستان نے اپنے طور پر انھیں ۱۳ مصوتوں کو دریافت کیا۔ اور اردو نامہ میں ان کی فہرست دی۔[1] ان مصوتوں کو طویل اور خفیف کے زمروں میں الگ کر کے صوتیاتی رسم الخط میں اس طرح درج کرتے ہیں۔

طویل			خفیف	
uː		iː	u	i
oː		eː	o	e
ɔː	a	ɛː	ə	ɛ

[1] اردو الفاظ کی رومن املا از شان الحق حقی اردو نامہ بابت اپریل تا جون ۶۱ء ص ۸۱

اس فہرست کو دیکھ کر میرے استاد ڈاکٹر کیلکر کہتے تھے کہ اردو میں خفیف [ɔ] کا وجود بھی ضرور ہونا چاہئے تاکہ اس ڈھانچے میں باقاعدگی آسکے۔ میرے ایک اور استاد ڈاکٹر سبرامنیم پروفیسر تامل کیرالا یونیورسٹی نے میرے تلفظ میں نہ صرف خفیف [ɔ] بلکہ چند اور مصوتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے جو میری گرفت میں آسکے ان کے وقوع کے بارے میں میں نے مزید غور کرکے کچھ اصول بنائے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

[ê] جڑواں مصوتے (diphthongs) کے آخر میں جو خفیف e (مثلاً آئے۔ کھوئے) آتا ہے وہ سہرا۔ سانچہ وغیرہ کے [e] سے مختلف ہے۔ اوّل الذکر کو ادا کرنے میں زبان زیادہ اونچی اٹھتی ہے۔ اور زیادہ آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ اسے ہم [ê] سے ظاہر کرسکتے ہیں۔ ہندی میں اسے ए لکھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا طول بھی سہرا کی [e] سے کچھ زیادہ ہے لیکن دیہات کی ے سے کم۔ اس طرح اسے [e] بھی لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن میں [ê] کو ترجیح دوں گا۔

[ô] مذکورہ بالا مصوتے کی مماثلت پر میں قیاس کرسکتا ہوں کہ آؤ، کھوؤ - کا خفیف [ô] بھی کہر۔ معلّی کے [o] سے زیادہ بلند ہوگا۔ [e] اور [ê] کے طریقِ تلفظ کا اختلاف آئینے میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ لیکن [ô] چونکہ زبان کے پچھلے حصّے سے ادا ہوتا ہے۔ اس لئے اسے دیکھنا ممکن نہیں۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ یہ [o] سے مختلف آواز ہے۔

[ɔ] اردو میں تیسرا اینا مصوتہ خفیف [ɔ] ہے۔ خفیف [o] کے ادا کرنے میں ہونٹ جتنے کھلتے ہیں [ɔ] کے تلفظ میں اس سے کچھ زیادہ کھلتے ہیں۔ [ɔ] لفظ کے درمیان [əh] یا [ə] کے قبل آتا ہے۔ مثلاً کُہر۔ محرم۔ معلّی۔ معطّل۔ بقیہ مقامات پر [o] آتا ہے۔

اس طرح اردو میں کم از کم حسب ذیل ۱۶ مصوتے ہیں۔

طویل		خفیف	
u:	i:	u	i
o:	e:	ô	ê
ɔ:	ɛ:	o	e
		ɔ	ɛ
a			ə

آئیے ان کی صوتیائی حیثیت پر غور کیا جائے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ اردو کے دس مروجہ مصوتے صوتیے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صرف [ê ، e ، ɛ ، ɔ ، o ، ô] پر غور کرنا ہے۔ ذیل کے نقشوں میں ان مخففات کا استعمال کیا گیا ہے۔

c مصمتہ یعنی Consonant　　　v مصوتہ یعنی Vowel

V̄ طویل مصوتہ   V̆ خفیف مصوتہ

f. v آزادانہ تغیر یعنی free variation ۔

[h] اور [ə] اپنی آوازوں ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اب اوّل [ɛ] کے وقوع کا مقابلہ اپنی مماثل آوازوں [ə] اور [ɛ:] سے کیا جاتا ہے۔

	-h #	-hc	-h-	دوسرے موقعوں پر
ɛ	کہہ	محفل	سحر ۔ مہک	—
ə	—	—	f. v	✓
ɛ:	—	—	—	✓

اس طرح [ɛ] بقیہ دونوں مصوتوں میں سے کسی کا بھی ہم صوت ہو سکتا ہے چونکہ یہ [ə] کے ساتھ ایک ماحول میں آزادانہ تغیر میں ہے اس لئے اسے /ə/ کا ہم صوت قرار دیا جائے گا۔

دوسرا نقشہ پیش کرنے سے قبل چند امور کی صراحت ضروری ہے۔

۱۔ فارسی عطف و اضافت کا مصوتہ اگر خفیف ہو تو اس کے بعد وقفۂ اتصال open juncture نہیں ہوتا مثلاً ذیل کے مصرعوں میں

ع دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ع پر جو معشوقی آب و گل میں ہے

ہم دردِ دل اور آب و گل کا تلفظ ایک لفظ کے طور پر کرنے کے لئے مجبور ہیں اس۔ اپنے جائزے میں ان الفاظ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ذیل میں مثال کے طور پر دردِ د جامِ آب۔ شعلۂ و شبنم۔ آب و گل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان سب کا زیرِ بحث مصوتہ خفیف

۲۔ [e] اور [e:] کا تقابلی جوڑا دہ اور دیہہ ملتا ہے۔ اس لئے [e] کے ماحول [e:] کا وقوع تلاش کرنے کی مزید ضرورت نہیں۔

ان مشاہدات کے ساتھ ذیل کے مماثل مصوتوں کا وقوع ملاحظہ ہو۔ یہاں صرف [e] اور [ ] کے وقوع کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

	#-h	-h#	c-hc	c-hv̄	c-v̄	#-və	c-hə	c-c	v-#	v-c	c-ə
[illegible]	احترام	دہ	سہرا	سانحہ	جامِ آب	عوض	محن	دردِ دل	—	—	واقعتاً
[illegible]	—	—	—	—	—	—	—	—	آئے	رائتہ	—
	—	—	بہرا	رہا	—	—	—	مرچ	آئی	آئنہ	—
	—	—	—	—	[illegible]	—	—	—	—	—	ناول

مندرجہ بالا نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ [ê] دو آوازوں [e] اور [y] کے ساتھ تکملی بٹوارے میں ہے۔ مماثلت کی بنا پر ہم اسے /e/ کا ہم صوت قرار دیں گے۔ آخرالذکر /e/ اور /y/ دونوں سے تضاد کی حالت میں ہے اس لئے اسے صوتیہ کی حیثیت دی جائے گی۔

[ɔ ، o ، ô] کا وقوع اس طرح ہے۔ اس نقشے میں صرف انھیں تین مصوتوں کے وقوع کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

	c-həc	c-əc	#hc	c-hc	c—c جب کہ دوسرا مصمتہ ہ نہ ہو	v̄-#	v̄-c	v̆-
ɔ	گہر۔ محرم	معلیٰ	—	—	—	—	—	—
o	—	—	عہدہ	کہرام	آب و گل	—	—	—
ô						ناؤ۔ کیوں	باؤلا	شعلۂ (شبنم)
o:	موہن	—	—	کوہسار	ٹھوکر	ô کے ساتھ f.v	—	ô کے ساتھ f.v
u	—	—	—	—	راہل۔ نذرل	تاؤ	—	بالا مئو
ʊ	—	—	—	—	—	ô کے ساتھ f.v	—	مادھو
ɔ:	شوہر	—	—	—	فی الفور	—	—	—

اس نقشے کے مطابق [ɔ] [o] اور [ô] آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں اس لئے ان تینوں کو ایک صوتیہ /o/ کا ہم صوت قرار دیا جائے گا۔ یہ صوتیہ /o: / u / ʊ / ɔ: / چاروں سے تقابلی بٹوارے میں ہے۔ اس لئے اس کی صوتیاتی حیثیت میں کوئی شبہ نہیں۔ اس طرح ہم سولہ مصوتوں میں ذیل کے ۱۲ کو صوتیہ کی حیثیت دینے پر مجبور ہیں۔

/i:/i/e:/e/ɛ:/ə/a/ɔ:/o/o:/u/u:/

اتنے زیادہ مصوتوں کو صوتیہ قرار دینا قابلِ تشفی نہیں۔ کیوں نہ ہم کسی دوسرے طریقے سے تجزیہ کریں۔

میری تجویز ہے کہ اردو میں طول (length) کو ایک صوتیہ قرار دیا جائے۔ یہ نہ مصوتہ ہے نہ مصمتہ بلکہ ایک وصف کے طور پر دونوں میں ضم ہو کر آسکتا ہے۔ اس طرح طویل مصوتوں کو صوتیہ کا مرتبہ دینے کی ضرورت نہ رہے گی۔ امریکی علما نے انگریزی کے طویل مصوتوں کو جڑواں مصوتہ (diphthong) قرار دے کر صوتیوں کے زمرے سے خارج کر دیا یا کوبسن (Jacobson) نے اپنی کتاب (Preliminaries to Speech Analysis)

میں انگریزی آوازوں کی جو فہرست دی ہے اس میں صرف خفیف مصوتے شامل ہیں۔ ڈاکٹر سبرامنیم نے ملیالم زبان کے صوتیوں کے پارٹ میں طویل مصوتوں کو شامل نہیں کیا۔ ڈاکٹر بابورام سکسینہ[1] کے مطابق قدیم سنسکرت فاضل صوتیات یا ننی نے ا و آ کو ایک ہی صوتیہ قرار دیا تھا اور وہ ماترا (طول) کو ایک علیحدہ صوتیہ تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ بھی اس کے موید ہیں۔ حالانکہ ان دونوں آوازوں میں [ہ] کو روایتی طور پر ہم /ə/ کی طویل شکل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے وہ گہری مماثلت نہیں جو بقیہ خفیف و طویل مصوتوں کے جوڑوں میں ہے کہ جس طرح دوسرے طویل اور خفیف مصوتوں کے مخرج بالکل پاس پاس ہیں اسی طرح ان دونوں مصوتوں کے مخرج ایک دوسرے سے نزدیک ترین واقع ہوئے ہیں۔ [ہ] کو /ə/ کی طویل شکل قرار دینے سے نظام میں باقاعدگی کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تجزیے کے مطابق اردو میں ذیل کے ۷ مصوتے صوتیے قرار پائیں گے۔

/ا/ /ɪ/ /ɛ/ /ɛ/ /ə/ /ʊ/ /o/ /u/

ان میں سے /ɛ/ کے دو ہم صوت ہیں۔ [ɛ] اور [ɛ̂]

/o/ کے بھی دو ہم صوت ہیں [o] [ô]

طول کو صوتیہ قرار دینے سے مشدد مصمتے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

(۸) اردو کے ۱۶ مصوتوں میں سے ۱۳ میں غنائیت کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک ایک مثال ملاحظہ ہو۔

خفیف ۔ سنجالی ۔ سائیں سائیں ۔ گنوار ۔ پہنچ ۔ آنُں ۔ کنواں ۔ طویل ۔ اینٹ ۔ سینگ ۔ اینٹھ ۔ سانس ۔ بھونک ۔ جونک ۔ گھونٹ۔

تین مصوتوں [ə ، ɛ ، ɛ] میں غنائیت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جیسا کہ آگے واضح کیا جائے گا۔ مصوتی غنائیت صوتیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اول اس کی دو اقسام کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ سادہ مصوتی غنائیت یہ مصمتی اسپھوٹ اور مصمتی الفرکیٹ کے علاوہ بقیہ تمام مصمتوں کے قبل ملتی ہے۔

۲۔ مخلوط مصوتی غنائیت۔ یہ مصمتی اسپھوٹ اور مصمتی الفرکیٹ مصمتوں کے قبل پائی جاتی ہے۔ یہ خالص مصوتے کی غنائیت نہیں کیونکہ اس میں متعلقہ غنائی مصمتے کی بھی ہلکی سی جھلک شامل ہوتی ہے۔ اس طرح یہ غنائی مصوتے اور غنائی مصمتے کے درمیان کی چیز ہے۔ اس کے ۶ ہم صوت۔

---

[1] سامانیہ بھاشا وگیان (ہندی) طبع ششم ص ۱۰۱

جن سمیت مصوتی غنائیت کے کل ۷ ہم صوت قرار دئے جائیں گے۔ تفصیل یہ ہے۔
۱۔ م سے مخلوط خفیف مصوتے کی غنائیت۔ یہ صرف [ب - بھ] سے قبل آتی ہے۔ مثلاً طنبورہ۔ سنبھلنا۔
۲۔ م سے مخلوط طویل مصوتے کی غنائیت۔ یہ صرف ب - بھ سے قبل آتی ہے مثلاً تانبا۔ سانبھر۔ تلفظ کے مطابق انھیں تامبا۔ سامبھر لکھنا چاہئے۔
۳۔ ن سے مخلوط خفیف مصوتے کی غنائیت۔ یہ د - دھ - ڈ - ڈھ - ج - جھ سے قبل آتی ہے مثلاً سندلیا۔ بندھانا۔ منڈیر۔ ڈھنڈھورا۔ منجیرا۔ منجھا ہوا۔
۴۔ ان سے مخلوط طویل مصوتے کی غنائیت۔ یہ بھی د۔ دھ - ڈ - ڈھ - ج - جھ سے قبل آتی ہے۔ مثلاً چاندی۔ اوندھا۔ مینڈک - مینڈھا۔ گونجا۔ مانجھی۔
۵۔ نؐ سے مخلوط خفیف مصوتے کی غنائیت۔ یہ صرف گ - گھ سے قبل آتی ہے۔ مثلاً منگانا۔ سنگھاڑا۔
۶۔ نؐ سے مخلوط طویل مصوتے کی غنائیت۔ یہ بھی صرف گ - گھ سے قبل آتی ہے مثلاً گونگا۔ سونگھا۔
۷۔ خالص مصوتی غنائیت۔ یہ بقیہ تمام صورتوں میں ملتی ہے مثلاً آنکھ۔ سانس۔ لڑکوں (مصوتی غنائیت) کے یہ ساتوں ہم صوت ایک دوسرے سے تکملی بٹوارے میں ہیں اور اس طرح ایک صوتیہ کے اجزا قرار پاتے ہیں۔ مصوتی غنائیت کی صوتیائی حیثیت کو قطعی طور پر طے کرنے کے لئے اس کا مقابلہ مماثل آوازوں سے کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہم اقلی جوڑے پیش کریں گے جہاں اقلی جوڑے دستیاب نہیں وہاں مماثل جوڑوں سے کام چلایا جائے گا۔
۱۔ سادہ مصوتہ اور غنائی مصوتہ کا تضاد۔ ساس۔ سانس۔
۲۔ سادہ مصوتی غنائیت اور ہم مخرج ن کا تضاد۔ نہیں (فعل امر) ہنس (ایک چڑیا)
۳۔ مخلوط مصوتی غنائیت اور ہم مخرج غنائی مصمتوں کا تضاد۔
ا۔ سنبھل (فعل امر) سمبھل (ضلع مرادآباد میں ایک قصبہ
ب۔ منڈی (منڈھی ہوئی داڑھی)۔ منڈی (ایک بوٹی)
ج۔ منگا (منگانا کا امر)۔ ننگا
د۔ بھانجی (بھانجی مارنا) بھانجی (بہن کی لڑکی)
مندرجہ بالا مثالوں سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ مصوتی غنائیت ایک صوتیہ ہے۔
(۹) اردو میں اتصال (Juncture) بھی صوتیہ ہے۔ مثلاً ذیل کے دو جملے ملاحظہ ہوں

دوا پیلی ہے۔

دوا پی لی ہے۔

دوسری مثال میں اتصال کا صوتیہ موجود ہے۔

کے صوتیوں کا میں نے مطالعہ نہیں کیا لیکن یہ غالباً تین سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس طرح اردو میں ذیل کے صوتیے قرار پاتے ہیں۔

مصمتے

۱۔ پ ۔ ۲۔ ب ۔ ۳۔ ت ۔ ۴۔ د ۔ ۵۔ ٹ ۔ ۶۔ ڈ ۔ ۷۔ ک ۔ ۸۔ گ ۔ ۹۔ ق ۔
۱۰۔ چ ۔ ۱۱۔ ج ۔ ۱۲۔ م ۔ ۱۳۔ ن ۔ ۱۴۔ ںٚ ۔ ۱۵۔ ل ۔ ۱۶۔ ر ۔ ۱۷۔ ڑ ۔ ۱۸۔ ف ۔
۱۹۔ س ۔ ۲۰۔ ز ۔ ۲۱۔ ش ۔ ۲۲۔ ژ ۔ ۲۳۔ خ ۔ ۲۴۔ غ ۔ ۲۵۔ ھ ۔ ۲۶۔ و ۔ ۲۷۔ ی ۔

مصوتے

۲۸ ئ ۔ ۲۹ ے ۔ ۳۰ ع ۔ ۳۱ ə ۔ ۳۲ ɔ ۔ ۳۳ o ۔ ۳۴ u ۔
۳۵ مصوتی غنائیت ۳۶۔ طول ۳۷ اتصال

ان کے علاوہ اگر تین شر لر کے صوتیے ہوں تو اردو کی جملہ آوازوں کا ۴۰ صوتیوں میں احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

نادم سیتاپوری

ایک قلمی روزنامچہ

اردو زبان میں روزنامچہ نگاری کے رواج کو مشکل سے ایک صدی بیتی ہوگی. جو براہ راست فارسی کی وقائع نگاری سے اخذ کی گئی تھی، اور شخصی حکومتوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ تیزی کے ساتھ ختم بھی ہو گئی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی ریاستوں میں " وقائع نگار" اور " اخبار نویس" رکھنے کا رواج تھا جو ملکی اور غیر ملکی حالات سے اپنے فرمانروا کو باخبر رکھتے تھے اور ان کے " پرچوں" کا ایک باقاعدہ رکارڈ رکھا جاتا تھا۔ مرحوم ریاست بھوپال کے دفتر تاریخ میں جھانسی کی جنگ آزادی کے متعلق بھوپال کے " وقائع نگار" کے بھیجے ہوئے لاتعداد فارسی " پرچوں" کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ تھا، جس کی روشنی میں جھانسی کی جنگ آزادی کا تاریخی تجزیہ کیا جاسکتا تھا. اسی طرح دہلی کی جنگ آزادی کے جیون لال وغیرہ کے روزنامچے بھی ایک نہج سے تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔

گذشتہ ایک صدی کے اندر اردو کے جو روزنامچے اب تک سامنے آئے ہیں ان میں بہت ہی کم " روزنامچے " فن کے اعتبار سے روزنامچے کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان روزنامچوں کی حیثیت عام طور پر ذاتی یادداشتوں سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ جن میں علی العموم خانگی حسابات مقامی کوائف اور اہل خاندان کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں لکھی ہوتی تھیں۔

ایسا ہی ایک روزنامچہ میرے ایک محترم بزرگ قاضی سید الیاس حسین جعفری سیتاپوری لکھا کرتے تھے۔ اور تقریباً نصف صدی تک قاضی صاحب چھوٹی چھوٹی نوٹ بکوں اور پرچوں پر اسی قسم کی یادداشتیں لکھتے رہے —— یہ یادداشتیں دراصل ایک قسم کے اشارے ہوتے تھے جنھیں سامنے رکھ کر قاضی صاحب اپنے حافظہ کی مدد سے ماضی کی یادوں کو تازہ کر لیتے تھے۔

چنانچہ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے انھیں یادداشتوں کو سامنے رکھ کر پورے تین سو چھ (۳۰۶) صفحات پر

مشتمل اپنی ایک آپ بیتی "اپنی کہانی اپنی زبانی" کے نام سے قلمبند کر ڈالی جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اور ان کے چھوٹے بھائی ماسٹر سید ایوب حسین جعفری کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

قاضی سید الیاس حسین جعفری (اکتوبر ۱۸۸۸ء ـــــ مئی ۱۹۵۰ء) نسبی طور پر نیشاپوری سادات کے ایک ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مورث اعلیٰ مخدوم عادل ملک سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں جون پور سے ترک سکونت کر کے رائے بریلی میں آ بسے تھے۔ ان کا مزار رائے بریلی میں میں مرجع خاص و عام ہے۔ مخدوم عادل الملک چھٹی پشت میں مصنف "فتاوائے ظہیری" سید ظہیر الدین کہرامی کی اولاد تھے۔ مخدوم عادل الملک کی نسل میں ایک بزرگ شاہ سید فتح اللہ "ابوالفتح" نے سیتاپور پہونچ کر اسے اپنا وطن بنایا ابوالفتح سرائے کے نام سے ایک محلہ آباد کیا جو اب بھی ان کی یادگار ہے۔

سادات جعفری نیشاپوری کے خاندان میں علمی و ادبی حیثیت سے کئی افراد نے شہرت پائی جن میں غالب دہلوی کے شاگرد حکیم سید محمد شریف طالب سیتاپوری اور مولوی سید نیاز احمد نامی سیتاپوری اپنے دور کے اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ ـــــ اور موجودہ نسل میں ہند و پاک کے نامور ادیب و مصنف سید رئیس احمد جعفری تو ایک خاص شہرت کے مالک ہیں۔

مولوی سید نیاز احمد نامی سیتاپوری جنھیں بھوپال کے بعض تذکرہ نویسوں نے "خیر آبادی" لکھا ہے شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد شیخ مصطفےٰ حسین راسخ کے شاگرد تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کے زمانے میں بھوپال پہونچے۔ ساری عمر ریاست بھوپال کی ملازمت میں بسر کی۔ بیسویں صدی کی پہلی دھائی میں پنشن لے کر سیتاپور واپس آئے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔

مالوہ میں نامی کے شاگردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی جن میں سراج میر خاں سحر بھوپالی مالوہ کے "میر تقی میر" سمجھے جاتے ہیں۔ سحر کا دیوان (بیاض سحر) سر راس مسعود کی کوششوں سے مرحوم ریاست بھوپال نے تخمیناً تیس سال ہوئے جب شائع کیا تھا اب کمیاب ہے۔

قاضی الیاس حسین اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مضافات سیتاپور میں ان کے بزرگ عہد شاہی سے عہدہ قضاء پر فائز تھے۔ اور یہ سلسلہ قاضی صاحب تک جاری رہا۔ ابتدائی تعلیم سیتاپور کے برانچ اسکول میں پائی۔ عربی و فارسی کی تدریس اس دور کے ان اساتذہ سے حاصل کی جنھیں پوری ایک نسل کی استادی کا امتیاز حاصل تھا۔ درس و تدریس کا شغل اس خاندان کا قدیم ورثہ تھا۔ قاضی صاحب کے بڑھائے ہوئے افراد آج ہند و پاک میں ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔ خود قاضی صاحب کے چھوٹے بھائی ماسٹر سید ایوب حسین جعفری مدت العمر یو۔پی کے گورنمنٹ اسکولوں میں ٹیچر رہے۔ یو۔پی کے وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا کی ابتدائی تعلیم میں ان کا بڑا ہاتھ ہے جس کا ذکر انھوں نے اپنی کئی

پبلک تقریروں میں کیا ہے۔

قاضی الیاس ایک مرنج و مرنجان قسم کے سیدھے سادے بے ریا و باوضع انسان تھے اسی لئے معاشی حیثیت سے کبھی آسودہ حال نہ رہے زندگی کے ہر موڑ پر انھیں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قدم قدم پر مصائب و آلام سے دوچار رہے۔ خود دار اور غیور اتنے تھے کہ کبھی حرف شکایت زبان تک نہ آیا۔ اگست سنہ ۱۹۲۲ء میں خیرآباد ضلع سیتاپور کے عربی مدرسہ "نیازیہ" میں بحیثیت مدرس پہونچے۔ اور یہ سلسلہ مئی سنہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔

قاضی الیاس زندگی کے جس پُراسرار حادثے سے دوچار ہوئے وہ ایک حسرت ناک واقعہ ہے ۲۴ مئی سنہ ۱۹۵۰ء کو ایک عزیز کی تعزیت کے لئے خیرآباد سے قصبہ باڑی (ضلع سیتاپور) گئے۔ ریلوے اسٹیشن "سدھولی" پر اترے۔ باڑی یہاں سے صرف دو میل ہے۔ ٹہلتے ہوئے "باڑی" پہونچے۔ تھوڑی دیر قیام کیا اور پھر خیرآباد واپسی کے ارادہ سے سدھولی کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد کیا ہوا — ؟ آج تک کچھ پتہ نہ چل سکا۔ دو تین دن کے بعد مدرسۂ نیازیہ خیرآباد سے اطلاع آئی کہ وہ خیرآباد نہیں پہونچے — تلاش شروع کی گئی مگر آج بارہ سال گذرنے کے بعد بھی کوئی پتہ نہ چل سکا کہ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان — کسی نے قتل کردیا یا زندہ ہیں۔ دشمنی تو ان سے کسی کو کیا ہوسکتی تھی؟ رہزن وڈاکو بھی ان کی صورت دیکھ کر ان کے قریب نہ جاتے۔ پھر آخر وہ کہاں گئے۔ ! کیا ہوئے؟ یہ گتھی آج تک نہ سلجھ سکی۔ !

قاضی صاحب ایک متشدد اور متعصب عقیدے کے سنّی مسلمان تھے۔ جن کے نزدیک انسانیت کی بیشتر قدریں صرف اسی انسان میں نشو و نما پاسکتی تھیں جو اُن کا ہم عقیدہ ہو۔ لیکن ان کا یہ عقیدہ ایک "بے شر" چیز تھی۔ وہ اتنے کم گو، کم سخن اور خاموش آدمی تھے کہ تمام زندگی ان کے اس تشدد و تعصب سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوئی ان کا گھر میرے مکان سے ملا ہوا تھا۔ دور کی کچھ رشتہ داری بھی تھی میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور بہت سے ادبی تاریخی اور روایتی مسائل میں۔ ان سے روشنی حاصل کیا کرتا تھا۔ انھوں نے بہت سے اہم معاملات میں میری رہبری و رہنمائی فرمائی اور سیتاپور کی ادبی شخصیات کے بارے میں بہت سی یادداشتیں لکھوائیں۔ قدیم سیتاپور کی ادبی تاریخ پر ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے مولوی اکرام (مترجم اخوان الصفا) جن کے بارے میں " انسائیکلو پیڈیا آف برٹینکا میں بھی چند سطروں سے زیادہ نہیں ملتیں۔ قاضی صاحب نے سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۳ء میں انھیں (ماہنامہ الناظر لکھنؤ میں ایک مضمون لکھ کر) پہلی بار متعارف کرایا۔ اگرچہ "مذہب" ان کا خاص موضوع تھا۔ مگر ان کے تصنیفی ذخیرے میں ادبی و تاریخی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ ان کی تین چار درجن غیر مطبوعہ تصانیف و تالیفات میں جہاں حدیث و فقہ پر کتابیں ملتی ہیں وہاں بیاض رنگین۔ شمائم خوشگوار، کلیات[1] راسخ۔

(نوٹ نوٹ[1] اگلے صفحہ پر)

جواہر تذکرہ علمائے ہند و مولفہ مولوی رحمان علی (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ) انتخاب مثنوی من و سلوی (مفتی سید محمد عباس مجتہد لکھنؤ) اردو زبان کے محاورات تذکرہ شعرائے سیتاپور، اور تاریخ سیتاپور جیسی دلچسپ اور کارآمد کتابیں بھی ہیں۔

شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی "کاتب" تخلص فرماتے تھے۔ اس صدی کے پہلے قرن میں قاضی صاحب کے مضامین البلال، اودھ اخبار، زمیندار، الناظر (لکھنؤ) اور طریقت (لاہور) وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔

یہ قلمی روزنامچہ قاضی صاحب کی وہی ذاتی یادداشتیں ہیں جنھیں وہ تقریباً چالیس پچاس سال تک ترتیب دیتے رہے۔ اور آخر کار انھیں کو بنیاد بنا کر فل اسکیپ کے تین سو صفحات پر اپنی آپ بیتی (اپنی کہانی اپنی زبانی) لکھ ڈالی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب زیادہ تر ان کے ذاتی اور خاندانی حالات پر مشتمل ہے لیکن اس آپ بیتی میں بہت سے ایسے ضمنی واقعات بھی آگئے ہیں جنھیں ایک عوامی روزنامچہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس میں تاریخ بھی ہے تذکرہ بھی۔ موسمی حالات بھی ہیں اور سیاسی کوائف بھی۔ ــــ بعض ایسے واقعات بھی اس میں نظر آتے ہیں جن سے شاید کم ہی لوگ واقف ہوں مثلاً

۱۔ حضرت مولنا اشرف علی تھانوی کو شعر و سخن سے بھی شغف تھا۔

۲۔ غالب کے ایک غیر معروف شاگرد حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری کا ذکر۔

۳۔ ہندوستانی صحافت کی پہلی تاریخ "اختر شاہنشاہی" کے مولف اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف کے انتقال کی صحیح تاریخ۔

۴۔ سیتاپور کے بعض شعراء کا ذکر ــــ اور سیتاپور کے قدیم شاعروں کا تذکرہ۔

۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کی خریداری پر پابندیاں۔

اس روزنامچہ کو ترتیب دیتے وقت میں نے بعض مقامات پر بہت سی غیر ضروری اور طویل عبارتوں کو حذف بھی کر دیا ہے اور بعض جگہوں پر خود بھی وضاحتی نوٹ لکھ دئے ہیں۔ زیادہ تر "فٹ نوٹ" خود قاضی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں جن کی صراحت میں نے (ا۔ ع) سے کر دی ہے اور اپنے حاشیوں کے نیچے (ن۔ س) لکھا ہے۔

۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء ملاحق یکم شوال سنہ ۱۳۱۸ھ کو ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند ملک عدم کو روانہ ہوئیں۔ تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں تین دن ہڑتال رہی وکیلوں اور حاکموں اور رئیسوں وغیرہ نے غم کے اظہار کے لئے بازو پر کالا کپڑا باندھا اور شہر سیتاپور میں بھی بمقام لال باغ

ــــــــــــــــــــ

۱ فٹ نوٹ پچھلے صفحہ کا منشی شیخ مصطفے الحسین صاحب بلہوری مقیم خیرآباد کے اردو، فارسی اور عربی نظم و نثر کا مجموعہ ہے ان کا تخلص اردو میں راسخ اور فارسی میں شائع تھا۔ (ا۔ ع)

راسخ کو اکثر تذکرہ نویسوں نے خیرآبادی لکھا ہے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ (ن۔ س)

ارباب علم نے نظم و نثر و تحریر و تقریر کے ذریعہ سے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ وفات کی تاریخیں کسی نے اردو میں نظم کیں، کسی نے فارسی اور ہندی میں۔ .... لال باغ اور شفاخانہ کے پھاٹک پر ملکہ کی تصویر نصب کی گئی ـــــــ انتقال سے گیارہویں دن دفن ہوئیں تھیں۔

۹ راگست ۱۹۰۲ء مصاف ۴ رجادی الاول ۱۳۲۰ھ کو ملکہ مذکور کے بیٹے ایڈورڈ ہفتم کا جشن تاج پوشی لندن میں منایا گیا۔ ہندوستان اور انگلستان میں بہت دھوم ہوئی۔

۱۷ رجنوری ۱۹۰۳ء یوم شنبہ، ۱۷ رشوال ۱۳۲۰ھ کو سرکار کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ بلا رورعایت عام طور سے لڑکوں کو چیچک کا ٹیکہ لگایا جائے۔ ان دنوں اس مرض کی زیادتی ہوگئی تھی، اگر کچھ فائدہ ہو سکتا تھا تو فقط ٹیکے سے۔ عبدالقادر صاحب[1] دریابادی ڈپٹی کلکٹر سیتاپور اس کام پر مامور ہوئے۔

اسی ۱۳۲۰ھ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے معتقد حکیم یوسف اپنے مذہب کی اشاعت کی غرض سے پہونچے انھیں دنوں مرزا حیرت[2] دہلوی نے اپنے اخبار "کرزن گزٹ" میں حضرت سیدنا امام حسینؓ کے خلاف بڑی بڑی عبارتیں اور مضامین شائع کرنا شروع کئے۔ شیعہ اور سنی عالموں نے دندان شکن جواب بھی دئے۔ بہت دنوں ان مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔

اسی زمانہ میں مولوی عبدالحلیم صاحب شرر[3] لکھنوی نے حضرت سیدنا امام حسینؓ کی صاحبزادی بی بی سکینہ کے نام سے ایک ناول لکھا جس میں اس بی بی کی شان میں بہت بے ادبانہ الفاظ تحریر

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی کے والد (ن۔س)

[2] ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ شہادت ہوئی یا نہیں؟ ان کو تو اپنا اخبار چلانا اور روپیہ وصول کرنا تھا وہ مطلب حاصل ہوگیا۔ انہوں نے شیعوں سے بھی بحث کی اور قادیانیوں وغیرہ سے بھی۔ ان کو دراصل اخبار کی اشاعت و ترقی منظور تھی (ا۔ح)

مرزا حیرت نے اسی زمانہ میں مولوی محمد امیر الدین اجمیری کو ایک خط میں لکھا تھا ـــ "آپ کا جواب متعلق شہادت مطبوعہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء جو "ریاض الاخبار" و "اودھ اخبار" میں شائع ہوا تھا دیکھا گیا جو کچھ ثبوت آپ نے درج فرمائے ہیں ان کو بدل قبول کرتا ہوں ساتھ ہی اس کے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کو لوگوں نے مفت ابھارا اور نہایت عجلت سے آپ نے کام لیا جو عالمانہ صفت سے بعید تھا۔ میں نہیں معلوم کس پیرایہ میں بحث کر رہا ہوں اب آپ اس کے متعلق میرے جواب میں کچھ نہ لکھئے اور سکوت سے کام لیجئے اس میں آپ کا کیا نقصان ہے۔ .... خطوط کا مضمون عوام سے ظاہر نہ کیجئے اور صبر و تحمل سے کام لیجئے۔ آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔" ۱۲ ررجب المرجب ۱۳۲۳ھ بحوالہ ماہنامہ۔ اصلاح کھجوہ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ (ن۔س)

[3] اردو زبان کے بہت بڑے ادیب تھے۔ بہت ناولیں اور تاریخیں ان کی یادگار ہیں اور مضامین کا ذخیرہ بھی۔ طبیعت میں آزادی زیادہ تھی اس لئے مذہب کے خلاف بھی مضامین اور ناولیں لکھ جایا کرتے تھے۔ (ا۔ح)

تھے اور سراسر غلط مضمون اور بہتان تھا۔ آپ کا بھی علماء کی طرف سے جواب دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے صلاحی بردہ کی مخالفت میں نادلیں اور مضمون لکھے اس کا بھی دندان شکن جواب پایا۔ انھیں ایام میں مرزا یحییٰ گیاوی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور اردو میں ایک کتاب "فرمان" کے نام سے تالیف کر کے مشہور کیا کہ یہ کتاب فصاحت و بلاغت وغیرہ کے اعتبار سے کل آسمانی کتابوں کی ناسخ اور سب پر فائق ہے (نعوذباللہ) انھوں نے اپنا ایک کلمہ بھی ایجاد کیا تھا۔ لا الٰہ الا اللہ۔ یحییٰ عین اللہ۔

"سنہ ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء کے مشاعرے"۔ پہلا مشاعرہ محلہ بنگلہ (سیتاپور) پر منشی امیر[1] حیدر صاحب کے بیرونی کمرے میں منعقد ہوا۔ میر مشاعرہ منشی علی[2] رضا صاحب رضا سیتاپوری تھے۔ یہ طرح دی گئی تھی ؎

آپ نے کیوں مرے ملنے کی قسم کھائی ہے

مشاعرے سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے یہ طرح دے دی گئی تھی اس طرح پر شاعروں نے طبع آزمائی کی۔ ـــــ دوسرا مشاعرہ سید مظفر حسین صاحب وکیل کی کوٹھی میں ہوا اور تیسرا مشاعرہ بھی یہیں ہوا۔ ان دونوں مشاعروں میں صدر مشاعرہ منشی صاحب موصوف (رضا سیتاپوری) ہی تھے۔ طرح بھی یہی تجویز فرماتے تھے۔ اور مشاعرہ سے پہلے ایک اپنی غزل غیر طرح بھی پڑھتے تھے۔ بعد مغرب کے یا عشاء کے بعد مشاعرہ کی ابتدا ہوتی تھی۔ سیتاپور کے علاوہ خیرآباد کے شاعر بھی آیا کرتے تھے۔ شاعروں سے زیادہ سامعین ہوتے تھے۔ ایسے شاعر بھی شرکت کرتے تھے جو غزل نہیں کہتے تھے۔ دوسرے مشاعرے کی یہ طرح تھی ؎

"ہر لب شرکشتہ ہے تیغ ابروئے خمدار کا"

اور تیسرے مشاعرے کی یہ طرح تھی ؎

"نوید عمر دو روزہ ہے ہر لب شر کے لئے"

بعض شاعروں کے نام یہ ہیں جنھوں نے ان تینوں مشاعروں میں اپنی اپنی غزلیں پڑھی تھیں منشی علی رضا رضاؔ۔ منشی حسن رضا ادیبؔ، سید وکیل احمد وکیلؔ۔ سید محمد احمد حزیںؔ۔ سید محمد ذکی ذکیؔ۔ محمد وصی وصیؔ۔ نثار علی نثارؔ۔ محمد رضا رضاؔ۔ حیدر حسین صاحب[3]

---

[1] رانی لکشمی بائی (جھانسی) کے استاد میر محمد آصف شہدی کے پوتے اور سیتاپور کے عمائدین میں تھے۔ آپ کی صاحبزادی آغا شاعر دہلوی سے منسوب تھی۔ اور ابھی تک بقید حیات ہیں۔ (ن۔ س)

[2] "اخوان الصفا" کے مترجم مولوی اکرام علی سیتاپوری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے پوتے اور اپنے دور کے ایک باکمال شاعر تھے اس دور کے تذکروں میں کہیں کہیں آپ کا ذکر ملتا ہے۔ (ن۔ س)

[3] نجم بلگرامی کلکٹری سیتاپور میں ملازم تھے۔ قدر بلگرامی سے قرابت قریبہ تھی اودھ پنچ کے منشی سجاد حسین اور اس دور کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے خاص مراسم رکھتے تھے غالباً سنہ ۲۲ء یا سنہ ۲۳ء میں بمقام سیتاپور وفات پائی۔ (ن۔ س)

بلگرامی انجم۔ سید محمد حیدر حیدرؔ۔ قاضی سید محمد حیدر حیدرؔ۔ سید مظفر حسین صاحب، مولوی سید افضال حسین صاحب نجمؔ۔ منشی علی محمد صاحب نظمؔ۔ منشی عبدالنجیب خاں صاحب نجیبؔ ملیح آبادی۔ حکیم مفتی سید محمد شریف صاحب طالبؔ۔

سیتاپور میں طاعون کی ابتدا۔ ماہ رجب سنہ ۱۳۲۱ھ ملاحق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ء میں اول وبا (طاعون) کی شکایت تامین گنج (سیتاپور) میں ہوکر ختم ہوگئی اس کے بعد بارش کی بڑی شدت ہوئی سیکڑوں مکان گر گئے اور ٹپکنے سے تو کوئی مکان شاید ہی محفوظ رہا ہو۔ .... اس مرض (طاعون) کے شروع ہونے سے پہلے آسمانی گولوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور یہ آوازیں کسی خاص سمت اور کسی خاص وقت کے لئے مخصوص نہ تھیں۔ اور آتش بازی کے گولوں اور ان گولوں میں بڑا فرق تھا۔ مغرب کے بعد سے عشاء تک آسمان بہت سرخ رہتا تھا اور یہ سرخی غیر معمولی سرخی تھی۔ جب تک یہ سرخی رہی۔ طاعون بڑے زوروں پر رہا۔ اور پانی کا ایک قطرہ بھی آسمان سے نہ گرا۔

اسی سال ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۵ء میں سخت سردی پڑی اور اس قدر برف گرا کہ اکثر جگہ تالاب جم گئے اور جو برتن صحن میں کھلے اور پانی سے بھرے رکھے تھے۔ ان میں پانی جم گیا۔ (فصل) ربیع کو بہت نقصان پہونچا۔ دور دور تک برف باری کی ایسی ہی خبریں سنی گئیں۔

اسی سنہ (۱۳۲۲ھ ۱۹۰۵ء) میں میں نے مولوی حاجی حافظ اشرف علی صاحب تھانوی کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا۔ جس میں اپنے نام کا "سجع" موزوں کرنے کی خواہش کی۔ انہوں نے یہ "سجع" موزوں فرماکر روانہ کیا۔

"سید ابرار ز الیاس حسین"

اور اس کا یہ مطلب لکھا کہ "معنی مقصود جس پر مدار حسن سجع کا ہے یہ ہیں کہ حضرت حسین رضی علیہ السلام و حضرت الیاس علیہ السلام کی برکت و فیض سے ابرار کے سردار ہو گئے کیونکہ اولیاء کو انبیاء سے فیض ہونا معلوم ہے اور رعایات لفظیہ ظاہر ہیں۔ اس سے اچھے سجع کی مجھ سے توقع نہ کی جائے۔"

یوم شنبہ۔ ۱۴ر جمادی الثانی سنہ ۱۳۲۵ھ مصادف ۱۶ر جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کو ایک شخص مسمی عبدالقادر تنبور (قصبہ تنبور ضلع سیتاپور) بسوان۔ کھیری ہوتا ہوا سیتاپور آیا۔ اس کے ہمراہ چند جوان اور تھے اس کی عمر تیس سال کی ہوگی۔ اس نے اپنے آپ کو عربی نژاد اور عالم اور وظیفہ خوار حکومت عثمانیہ اور سلطان روم خلیفۃ المسلمین کا فرستادہ ظاہر کیا اور کہا کہ ___ مجھے خلیفہ اسلام تین سو روپیہ ماہوار دیتے ہیں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں ہندوستان میں گشت لگاؤں اور جس مسلمان کی وضع اور لباس اسلام کے خلاف دیکھوں اسے بے تکلف سزا دوں اور تنبیہ کروں۔ مجھے گورنمنٹ ہند نے بھی اس کی اجازت دیدی ہے۔ چند آدمی اور بھی اس کام پر مامور کئے گئے ہیں۔ جو ہندوستان کے مختلف

شہروں میں پھر کر اپنا کام کریں گے کوئی حاکم میرے کام میں مداخلت و مزاحمت نہیں کرتا ہے۔ ان کے ہمراہوں کے پاس چمڑے کے لمبے چوڑے تسمے تھے اس سے وہ لوگوں کو مارتے تھے۔ یہ سب سیتاپور میں محلہ شیخ سرائے کی جامع مسجد میں ٹھہرے۔ چند کاغذ دکھلا کر کہا کہ یہ سلطانی فرمان ہیں جن کی عبارت نامانوس خط میں ہونے کے باعث پڑھی نہ گئی۔ یہ کاغذ تنبور (تمبور) کے تھانہ دار نے ضبط کرکے سیتاپور بھیج دئے تھے یہاں اسے مل گئے۔ سیتاپور کے ڈپٹی کمشنر اور عبدالغنی صاحب سب جج سیتاپور نے کاغذوں کی واپسی کے بعد انھیں فہمائش کی تھی کہ نرمی سے کام لیجئے زیادہ سختی میں شورش پیدا ہو جائے گی۔

اسی سال ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں قحط کے آثار نمودار ہوئے گرمی سخت پڑی اور دھوپ بھی۔ پانی کم برسا۔ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں قحط پڑ گیا۔ سرکار کی طرف سے سڑکوں کی مرمت شروع ہوئی اکثر جگہوں پر تالاب کھودے گئے۔ تقاوی تقسیم ہوئی۔ غریب اور بیکار لوگوں اور پردہ نشینوں کے لئے ایک خاص رقم منظور کی گئی جو قحط کے دور ہونے تک خاص انتظام سے تقسیم کی جاتی رہی۔ سیتاپور کے اتر جانب بڑی لائن بننے کا آغاز ہوا جس سے ہزاروں آدمی کی پرورش کا سامان ہو گیا۔

ہم لوگ ۱۸ شوال (۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء) یوم جمعہ گیارہ بجے دن کو بنارس پہونچے۔ ممانی صاحبہ برادر سید محمد ادریس کے ساتھ پہلے ہی روانہ ہو چکی تھیں وہ ہم لوگوں سے ایک دن پہلے وہاں پہونچ گئی تھیں۔

ماموں سید نیاز احمد صاحب (نامی سیتاپوری) کی یہ خواہش تھی کہ ایک ایک دن جون پور اجودھیا فیض آباد۔ لکھنؤ میں قیام کرتے اور سیر کرتے ہوئے چلیں۔ مگر ماموں صاحب کی رائے اس رائے کے خلاف تھی۔ اسی لئے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر ماموں سید نیاز احمد صاحب (نامی) اصرار نہ فرماتے تو نہ ہم بنارس جا سکتے تھے نہ فاروق۔ جس روز میں سیتاپور سے روانہ ہوا ہوں میرے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ اتنے بڑے شہر میں خالی ہاتھ گیا اور خالی ہاتھ واپس آیا۔ سیر و تفریح خوب ہو گئی وہ بھی سید ضامن حسین صاحب کے چھوٹے بھائی حامد حسین کے سبب سے۔ کیونکہ یہ بنارس کے مشہور مشہور مقاموں سے خوب واقف تھے۔ ہر جگہ لے گئے اگر اگر یہ وہاں موجود نہ ہوتے تو میں سوائے قیام گاہ میں پڑے رہنے کے اور کہاں جاتا؟

بنارس دو حصوں میں منقسم ہے۔ چھاؤنی بنارس۔ جہاں ہم لوگ ٹھہرے تھے۔ کاشی بنارس۔ یہ مقام ہندوؤں کا خاص متبرک مقام ہے کثرت سے مندر ہیں جن میں بہت کچھ کاریگری دکھلائی گئی ہے۔ اور یہاں جوتشی و نجومی کثرت سے رہتے ہیں۔ چھاؤنی ہی کی پوری سیر نہ ہو سکی تو وہاں کیسے جاتے جتنا حصہ دیکھ لیا گیا یہ بھی غنیمت تھا چھ روز کی سیر میں بھی اسی حصہ کے اکثر مقام دیکھنے سے

رہ گئے اور ان کے دیکھنے کی حسرت و تمنا ہی رہ گئی۔

جس روز بنارس پہنچے اسی روز کھانا اور شیرینی کھانے اور چائے پینے کے بعد ہم لوگوں نے بنارس کے چوک کی سیر کی ــــــ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی مسجد اور راجہ رنجیت سنگھ لاہوری کا شوالا اور راجہ جے پور کا رسدگاہ خانہ[1] دیکھا ــــــ عالمگیری مسجد خوب آباد ہے اس کی مرمت بھی ہوتی رہتی ہے۔ شوالا بھی خاص اہتمام سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس میں سنگتراشی کا پورا کمال دکھلایا گیا ہے۔ سنہرا کلس چڑھا ہے اور فرش پر جو کھنٹے (چار پہلی) سرخ و سیاہ پتھر جڑے ہیں اور ہر پتھر پر روپیہ کے برابر گول چاندی چڑھی ہوئی ہے۔ ہم لوگوں نے اس کے اندر جا کر چاروں طرف پھر کر اسے اچھی طرح دیکھا۔ اسی روز سب کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر گنگا[2] کے کنارے کی عمارتوں کا منظر دیکھا اس سے قبل کبھی کشتی میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں (رنجیت سنگھ لاہوری۔ راجہ امیٹھی۔ راجہ جے پور وغیرہ وغیرہ) کی نہایت عمدہ عمارتیں اور مندر دیکھے جن میں خاص خاص صنعتیں دکھائی گئی تھیں۔ زیادہ تر مکان پتھر کے ہیں اور کمتر اینٹوں کے ــــــ بازار خوب آراستہ ہیں مندر تو گلی گلی ہیں ــــــ دوسرے دن "دہورہرہ" کی مسجد دیکھی یہ مسجد گنگا کے کنارے واقع ہے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں بنائی گئی ہے۔ اس کے مینار پر سے بنارس کا سارا شہر نظر آتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ آباد نہیں ہے اور اس میں مہینوں جھاڑو بھی نہیں دی جاتی۔ شاید ہی کبھی کوئی نمازی یہاں آجاتا ہو۔ اس کے خادم و متولی ہندو زر ہیں۔ ہندو مسلمان بے تکلف ننگے پاؤں بلا روک ٹوک مینار پر چڑھ کر شہر کا نظارہ کرتے ہیں اور خادم لوگ ان سے دام وصول کرتے ہیں ــــــ مسجد نہایت وسیع و مضبوط ہے یہاں سونے چاندی کے ورق بھی تیار ہوتے ہیں اور ریشم کے کارخانے بھی ہیں۔ دوپٹے اور ساڑیاں یہاں کی مشہور ہیں۔ یہاں کے جولاہے اکثر دولت مند نظر آتے ہیں۔ ان کے مکان نہایت شاندار ہیں۔ یہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔ جو عموماً تجارت پیشہ ہیں۔ ان کے مکانات قابل دید ہیں۔ یہاں یونیورسٹی بھی ہے اور کالج بھی۔ دہلی اور اودھ کے شہزادے بھی یہاں رہتے ہیں۔ جن کو سرکار سے وظیفہ ملتا ہے۔ نواب محمد علی خاں صاحب رئیس ٹونک بھی یہیں نظر بند تھے۔ اور یہیں قید ہستی سے رہا ہوئے۔

---

[1] یہ وہی رسد خانہ ہے جس کا ذکر "آثار الصنادید" میں ہے اور محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں تعمیر ہوا ہے یہاں پنڈت آگر زائچہ وغیرہ بنایا کرتے تھے۔ (ا - ح)

[2] اس دریا کا پانی نہایت صاف شفاف ہاضم اور ہلکا ہے یہ مشہور ہے کہ اگر یہ پانی کسی برتن میں رکھا جائے تو چاہے کتنے ہی دن گذر جائیں خراب و بدمزہ نہیں ہوتا نہ اس میں کیڑے پڑتے ہیں۔ اکثر ہندو اپنے مردے اس کے کنارے جلاتے اور راکھ و ہڈیاں اس میں ڈال دیتے ہیں۔ (ا - ح)

یہاں کے مشہور شاعر مرزا محمد حسن صاحب فائز سے ملنے کو ہم لوگ خود ان کے مکان پر گئے یہ شیعہ مذہب تھے اور اس وقت ان کی عمر پچاس سال سے زائد ہوگی۔ یہیں سرکاری مدرسہ میں مدرس تھے۔ بہت ہی اخلاق سے پیش آئے۔ یہاں کے اکثر عمائدین واکابرین ان کے شاگرد ہیں۔ بنارس کے حالات سے یہ خوب واقف تھے۔ اردو۔ فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے اور ذہن نہایت اچھا وطبع رسا۔ عروض وقافیہ اور شاعری وانشاء کے نکات و دقائق کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے۔ شعر پڑھنے کا بھی خاص طرز و انداز تھا۔ ماموں سید نیاز احمد صاحب (نامی) نے ان کی زبان سے ان کے اشعار سننے کی ان سے خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے تخمیناً دو گھنٹے اپنا اردو۔ فارسی کا کلام سُنایا جس میں غزلیں بھی تھیں اور رباعیاں بھی۔ مخمس بھی تھا اور مسدس بھی —— ہر کلام کا انداز نیا تھا اور بندش بھی نئی۔ اور جدت وآمد کے سوا آورد کا پتہ تک نہ تھا۔ ہر شعر باقاعدہ سلیس وفصیح اور عروض وقافیہ کے حدود کے اندر تھا رنگینی بھی تھی اور بلاغت بھی —— رخصت کے وقت انھوں نے ماموں صاحب (نیاز احمد نامی) کو اپنا اردو دیوان "تاج سخن ور" یادگار کے طور پر پیش کیا۔ ماموں صاحب (نامی) ان کے اخلاق اور شاعری اور اس علمی تحفہ سے بہت خوش ہوئے۔

دوران گفتگو میں فائز سے بھی اور یہاں کے اکثر مسن ومعمر لوگوں سے ماموں صاحب (نامی) نے اپنے چچا سید نجف علی صاحب سیتاپوری کا حال دریافت کیا تو صرف اسی قدر پتہ چل سکا کہ موصوف بنارس کے محلہ "دولھی پورہ" میں رہتے تھے نواب مرشد آباد کی سرکار میں کسی اچھے عہدہ پر مامور تھے آخری عمر میں نوکری سے سبکدوش ہوکر مطب کرنے لگے تھے۔ لڑکے بالوں کا جھگڑا نہ رکھتے تھے۔ مال دولت زیادہ تھی ان کی وفات پر ان کا سارا مال و متاع ان کے ایک نوکر کے ہاتھ لگ گیا اس سے زیادہ ان کا حال تحقیق نہ ہوا۔

کیفیت مقبرہ شیخ علی حزیں اصفہانی جیلانی۔ شاعروں کے تذکروں اور مختلف تاریخوں میں ان کا مختصر اور مشرح حال پایا جاتا ہے اور ان کے مطائبات و لطائف بھی درج ہیں۔ انھوں نے فارسی زبان میں اپنی سوانح عمری خود بھی لکھی ہے جو کمیاب و نایاب بھی نہیں ہے۔ ان کی قبر بنارس کے محلہ "فاطمان" کے گورستان میں ہے۔ اس محلہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہاں ایک مکان میں حضرت سیدہ فاطمہ زہراؑ کے کچھ تبرکات دفن ہیں۔ جس کے دروازے پر سرخ پردہ پڑا رہتا ہے اس کے اندر مرد نہیں جانے پاتے ہیں۔ اسی مکان کے چبوترہ کے نیچے شیخ (حزیں) کی پختہ قبر ہے یہ مقام اب بالکل ویران وسنسان ہے۔ شیخ کے وقت میں بہت آباد تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ کا مکان بھی یہیں تھا اور انھوں نے اپنی قبر اپنی زندگی میں بنوائی تھی۔ اور تبرکات مذکور الصدر بھی یہ اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اب ان کے مکان کا پتہ بھی نہیں ہے یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی تار

وفات خود کہی تھی۔ مذہب شیعہ رکھتے تھے اور بہت علم دوست و فارغ البال اور متمول و صاحب ثروت اور شریف النسل تھے۔

شیخ علی حزیں نے ہندوستان پہونچ کر پہلے دہلی میں قیام کیا تھا لیکن سراج الدین خاں آرزو سے بگاڑ ہو گیا تو بنارس چلے آئے یہ مقام بہت پسند آیا چنانچہ خود لکھتے ہیں

از بنارس نروم معبد عام است اینجا   ہر برہمن بسر لچھمن و رام است اینجا

دروازے پر دربان رہا کرتا تھا۔ ہر شخص کو اندر جانے کا حکم نہ تھا۔ ایک بار نواب آصف الدولہ ملنے کو گئے تو دربان کے ذریعہ کہلا بھیجا

در درویش را دربان نباید

شیخ نے اندر سے کہلا بھیجا

بباید تا سگ دنیا نباید

اس کے بعد بلا کر ملاقات کی۔ علامہ عبدالجلیل صاحب بلگرامی بھی ملنے گئے دربان نے روکا۔ انھوں نے دربان کے روکنے کی پرواہ نہ کی اور اندر چلے گئے۔ شیخ نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔

دریں بزم رہ نیست بیگانہ را

علامہ نے برجستہ جواب دیا

کہ پروانگی داد پروانہ را

اس برجستہ جواب سے شیخ پھڑک اٹھے اور بہت تعظیم سے بٹھا کر کہنے لگے کہ ایسے ہی ارباب علم کا میں عاشق و شیدا ہوں۔ اس کے بعد بہ عزت و اکرام رخصت کیا۔

جب ان (حزیں) کی قبر تیار ہو گئی اور انھوں نے معماروں سے پوچھا کہ کیا کسر رہ گئی۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور کے تشریف لانے کی دیر ہے؟ اس گستاخانہ جواب سے بجائے ناراض ہونے کے شیخ بہت خوش ہوئے۔

شیخ کی قبر کے تعویذ میں ابھرے ہوئے حرفوں میں عربی جلی خط میں یہ عبارت تحریر ہے۔

العبد الراجی رحمۃ الغفور محمد المدعو بہ علی ابن ابی طالب الجیلانی۔

یہ شعر نستعلیق خط میں سنگ لحد پر سرہانے جلی حرفوں میں تحریر ہے۔

روشن شد از وصال تو شب ہائے تار ما   صبح قیامت است چراغ مزار ما

یہ قطعہ بھی قبر پر لکھا ہے جس کے آخری مصرعہ سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے یہ قطعہ بھی شیخ ہی کا ہے

زباں داں محبت بودہ ام دیگر نمی دانم   ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم   سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا

۱۱۸۱ھ

دمدار ستارے کا طلوع ہونا ـــــــــــ اوّل اوّل ۹ محرم ۱۳۲۸ھ موافق ۱۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو دنیا کے مختلف مقاموں پر یہ تارہ بلا اعانت دوربین کے نظر آیا۔ فی گھنٹہ لاکھ میل کی رفتار سے زمین کی جانب بڑھتا چلا آیا۔ اس تارے کا اوسط درجہ کا قطر ۸۰،۰۰ میل تھا۔ یہ تارہ چھ بج کے ۴۵ منٹ پر شام کو افق مغرب میں جہاں آفتاب غروب ہوتا ہے طلوع ہوتا رہا جس کے نور کی دمک اتنی ماند تھی کہ اس کی دم اُجلے اُجلے بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح نظر آتی تھی۔ تارے کا رخ تو آفتاب کی جانب تھا لیکن اس کی دم جو اوپر کو پھیلتی ہوئی زہرہ تک پہونچتی تھی جنوب کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ پہلے یہ تارہ صبح کو نظر آتا تھا اور آفتاب کی روشنی کے ساتھ ماند پڑ جاتا تھا۔

۱۰ مئی ۱۹۱۰ء تک یہ تارہ اتر اور پورب کے گوشے میں صبح کے وقت طلوع ہوتا رہا۔ اس کے بعد ایک دم پچھم کی طرف آگیا۔ اور چھ بج کر ۴۵ منٹ بعد طلوع ہوتا اور ۸۔۹ بجے غائب ہو جاتا۔ منجموں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ تارہ ۱۸ مئی کو زمین سے ٹکرائے گا عجب نہیں کہ اس کے ٹکرانے سے تمام دنیا میں زلزلہ آجائے۔ یہ مغرب و مشرق اور شمال و جنوب کی طرف اپنا جلوہ دکھاتا اور رخ بدلتا ہوا مئی کے آخر مہینے میں جبکہ وہ پورب سے پچھم کو پہونچا تھا طلوع و غروب ہوتا ہوا غائب و غروب ہوگیا۔ یہ تارہ دنیا کے تمام حصوں میں دیکھا گیا۔ یہ تارہ پچھتر برس کے بعد نکلتا ہے ۱۸۳۵ء کے بعد اس سن میں نکلا۔ اس وقت اس کی دم ۹۶۱۰۰۰۰ میل طویل تھی اس دفعہ کم تھی۔

ایک دمدار تارہ ۱۹۰۷ء میں نکلا تھا جو صبح کو نظر آتا تھا۔ اس کی سات دمیں تھیں ہر ایک دم ستر لاکھ میل لمبی تھی ۱۸۴۳ء کے دمدار تارے کی دم کئی کروڑ میل لمبی تھی۔ ۱۸۴۳ء کے دمدار تارے کا قطر چالیس لاکھ میل کا تھا۔

یکم مارچ ۱۹۱۰ء مطابق ۱۸ صفر ۱۳۲۸ھ کو چٹرجی بنگالی بادرصاحب ڈپٹی کمشنر سیتاپور کی جگہ سیتاپور کا ڈپٹی کمشنر ہوکر آیا۔ کسی بنگالی نے اشتہار دے دیا کہ ۲۹ مئی کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پہ (بم کا) گولہ پھینکا جائے گا۔ چٹرجی بہت ہی حواس باختہ اور خائف ہوئے حفاظت کا بہت بندوبست کیا گیا پھر بھی اس تاریخ میں یہ اپنے بنگلہ پر نہ رہے۔ بشن رج کے بنگلے پر قیام کیا۔ اس کے بعد عرصہ تک ان پر خوف غالب رہا۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء مطابق رمضان شریف ۱۳۲۸ھ کو یہ سیتاپور سے بدل گئے۔

انھیں دنوں سید نظیر احمد وکیل ساکن سیتاپور محلہ قضیارہ نے ایک لکچر دیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو گائے کا گوشت نہ کھانا چاہیے۔ اور نہ ذبح کرنا چاہیئے اس کے ذبح کرنے اور اس کے گوشت کھانے کا اسلام میں کہیں حکم نہیں ہے۔ شارع علیہ السلام نے نہ اسے ذبح کیا اور نہ اس کا گوشت کھایا ہے۔ ایک نہایت طویل مضمون انگریزی اور اردو اخباروں میں بھی شائع کرایا۔ اور ایک کتاب بھی "اسلامی گورکھشا" کے نام سے شائع کرائی۔ (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

ہندوستان اور انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ـــــ ۶ مئی ۱۹۱۰ء مطابق ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ یوم جمعہ رات کو ۱۱ بج کے ۴۵ منٹ گذرنے پر ۶۸ برس کی عمر میں کھانسی اور دمہ اور درد سر کے مرض میں بادشاہ مذکور نے اپنے دار الحکومت لندن میں وفات پائی۔ سات سال انھوں نے حکومت کی ان کے مرنے پر تمام سرکاری محکموں میں عام تعطیل ہوگئی۔

یوم شنبہ ۸ جون ۱۹۱۲ء مصادف ۲۱ جمادی الثانی ۱۳۳۰ھ کی رات کو بارہ بجے اس زور کی آندھی آئی کہ بڑے بڑے پرانے اور مضبوط تناور درخت جڑ سے اکھڑ گئے اس کے بعد پانی خوب برسا، زلزلہ کا جھٹکا بھی محسوس ہوا۔ درختوں کے گر جانے سے بعض راستے اور سڑکیں بند ہوگئیں۔ یہ آندھی درختوں کے حق میں طاعون سے کم نہ تھی۔ اکثر مسجدوں کے منارے اور بلند عمارتوں کے کنگرے بھی گر گئے۔ اس شدت کی آندھی میں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی تھی۔

یوم یکشنبہ ۵ محرم ۱۳۳۴ھ مصادف ۱۴ نومبر ۱۹۱۵ء دو بجے رات کو سید قائم علی[1] صاحب صوبیدار ساکن سیتاپور محلہ فتن سرائے نے ۸۲ سال کی عمر میں امراض جسمانی میں مبتلا ہوکر وفات پائی اور دوشنبہ کو دس بجے اپنے خاندانی قبرستان مولا شاہ کے تکیہ میں دفن ہوئے۔

۱۶ شوال ۱۳۳۴ھ یوم چہارشنبہ ملاصق ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء کو منشی علی رضا[2] صاحب رئیس سیتاپور
[illegible]

سید نظیر احمد وکیل ہندوستانی مسلمانوں میں پہلے شخص تھے اب سے ساٹھ سال پہلے اس کا اندازہ کر لیا تھا کہ آنے والے ہندوستان میں "گاؤکشی" باقی نہ رہ سکے گی ـــــ اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ رضاکارانہ طور پر گاؤکشی سے دست بردار ہوجائیں۔ سید صاحب نے اپنی اس تحریک کو "اسلامی گئو رکھشا" کے نام سے ایک ہندوستان گیر تحریک کے طور پر شروع کیا تھا اور ان کی اس عظیم تحریک کو ہندوستان کے بہت سے سیاسی و سماجی لیڈروں کی تائید حاصل تھی۔ فرقہ پرست مولویوں نے سید صاحب کے خلاف بڑا ہنگامہ کیا۔ سرسید کی طرح کفر کے فتوے دیئے اور تحریک کو ناکام بنانے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اسی لئے یہ تحریک اپنی عظیم افادیت کے باوجود مسلمانوں میں زیادہ مقبول نہ ہو سکی اور مسلم لیگ کے دور ثانی میں تو قریب قریب بالکل ختم ہوگئی یہ صحیح نہیں ہے کہ سید صاحب کی مشہور کتاب "اسلامی گئو رکھشا" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی در اصل یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں نول کشور پریس لکھنؤ نے شائع کی تھی اب کمیاب ہے۔ (ن ۔ س)

[1] سید قائم علی ہند و پاک کے مشہور ادیب اور ناول نگار سید رئیس احمد جعفری کے حقیقی دادا تھے۔ (ن ۔ س)

[2] منشی علی رضا رضا سیتاپوری مولوی اکرام علی مترجم "اخوان الصفا" کے حقیقی پوتے تھے۔ مولوی اکرام علی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز افراد میں سے تھے۔ (ن ۔ س)

محلہ شیخ سرائے نے مختلف امراض جسمانی میں مبتلا ہو کر اپنے مکان پر وفات پائی اور سلیم پور کی کربلا میں اپنی والدہ کے قریب دفن ہوئے یہ اردو فارسی کی انشا اور شاعری میں اپنے معاصرین میں نہایت ہی ممتاز تھے شاعری میں اس طریقہ سے اصلاح دیا کرتے تھے کہ شاگرد کی طبیعت میں روانی اور کلام میں روز بروز ترقی ہی ہوتی چلی جاتی تھی دور دراز مقامات حیدر آباد وغیرہ سے ان کے پاس غزلیں اصلاح کے لئے آیا کرتی تھیں۔ عروض و قافیہ اور شاعرانہ نکات سے خوب واقف تھے نستعلیق اور شفیعہ خط بھی خوب لکھتے تھے۔ رمنا تخلص کرتے تھے۔ وضعداری اور بے تعصبی میں فرد تھے۔ ان کا دیوان مکمل ہو چکا تھا جو ان کی اولاد کی لاپرواہی سے تلف ہو گیا۔ سید ظہور الحسن فروغ سیتاپوری نے یہ تاریخ کہی

"چمن نظم ہو گیا برباد"

یوم سہ شنبہ پانچ بجے شام۔ ۲۵۔ ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ موافق ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو سرسام اور بخار کی شدت میں برادرم سید وکیل احمد (وکیل) نے بمقام بھوپال انتقال کیا۔ سنیوں کے طریق پر ان کی تجہیز و تکفین ہوئی .... اردو نظم و نثر خوب لکھتے تھے۔ بھوپال۔ رام پور۔ اور سیتاپور وغیرہ کے اکثر مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھ کر نامی شعراء سے خراج تحسین وصول کیا تھا۔ بھوپال میں نائب انسپکٹر سائر کے عہدے پر مامور تھے۔

۲۸۔ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ مصادف ۱۶ ستمبر ۱۹۱۷ء یوم یک شنبہ کو مولوی سید افضال حسین صاحب نجم ساکن سیتاپور محلہ قضیارہ نے عرصہ دراز تک پیشاب کے مرض میں سخت علیل رہنے کے بعد سیتاپور میں وفات پائی۔ ان کی ذات پر استادانہ تاریخ گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ کمال یہ اپنے ساتھ ہی لیتے گئے

انھیں دنوں یوم پنج شنبہ ۱۲۔ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو حکیم سید محمد شریف صاحب طالب ساکن سیتاپور محلہ بنگلہ دفعتاً ملک عدم کو روانہ ہو گئے۔ یہ طبابت میں اپنے باپ حکیم مفتی سید اولاد علی صاحب (جرتیح) کے شاگرد تھے۔ اور شاعری میں غالب دہلوی سے تلمذ تھا

---

۱ سید وکیل احمد وکیل سیتاپوری مولوی نیاز احمد نامی سیتاپوری کے اکلوتے صاحبزادے تھے اب سے پچاس سال قبل بھوپال اور رام پور وغیرہ کے مشاعروں میں ڈاکٹر اقبال وغیرہ کے ساتھ شریک بزم ہوتے تھے۔ (ن۔ س)

۲ سلطان الشعراء مولوی افضال حسین نجم سیتاپوری جلال۔ امیر داغ وغیرہ کے معاصر میں تھے فن تاریخ گوئی میں بہت صنعتوں کی ایجاد کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ مرحوم مہاراجہ سر علی محمد خاں آف محمود آباد کے اتالیق و استاد تھے۔ (ن۔ س)

۳ غالب کے غیر معروف شاگردوں میں حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری کا بھی شمار ہے ان کے بارے میں عام طور پر کم ہی لوگوں کو اس نسبت کا علم ہے، میرے کتب خانے میں ان کا نامکمل دیوان موجود ہے۔ (ن۔ س)

ان کی طبیعت نہایت تیز و حاضر تھی اور دواؤں کے افعال و خواص انھیں ازبر تھے۔ اور تشخیص بھی اچھی تھی اردو کی نظم اچھی لکھتے تھے اور جلد ـــــــ یہ بھی اپنا یہ کمال اپنے ساتھ لے گئے۔

۷۔ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ مصادف ۳۔ ستمبر ۱۹۱۹ء یوم چہارشنبہ سے پنڈت جگموہن ناتھ صاحب کشمیری ڈپٹی کلکٹر سیتا پور کے پوتے جگت موہن ناتھ کے پڑھانے پر نوکر ہوا۔ اردو لکھانے اور پڑھانے کا کام سپرد ہوا اور تعلیم کے لئے صرف ایک گھنٹہ طے ہوا۔ چار روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ ان کا بنگلہ بنک گھر (الہ آباد بینک) کے قریب تھا۔ یہ بہت ہی مہذب اور خلیق اور خوش مزاج اور آزاد منش تھے۔ اردو شاعری سے انھیں عشق تھا خود بھی شاعر تھے چاہے کسی حیثیت کا شخص ہو مگر شاعر ہو تو اس سے نہایت بے تکلفانہ پیش آتے اور اس سے ملتے۔

۱۳۳۵ھ اسی زمانہ میں بڑی آب و تاب سے اخبار الہلال کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ایڈیٹری میں شائع ہوا۔ بعض ملازم سرکار اس کی خریداری کے لئے تیار ہوئے لیکن ملازمت کی مجبوریوں کے باعث خود علانیہ اس کے خریدار نہیں ہو سکتے تھے۔ مجھ سے کہا کہ قیمت ہم دیں گے تم اپنے نام سے جاری کرالو ـــــ میں نے منظور کر لیا اخبار جاری ہو گیا۔ انھیں دنوں میں نے "ہمدرد" دہلی کے اخبار میں چند مفید اور اصلاحی مضمون شائع کرائے یہ اخبار بھی ہر دل عزیز تھا اس کے ایڈیٹر مولانا محمد علی صاحب تھے۔ یہ اخبار بہت دنوں جاری رہا۔ اسی زمانے میں "زمیندار" اخبار لاہور کی بڑی دھوم مچی تھی۔ میں نے اس میں مضمون شائع کرائے تھے اور بعض احباب نے یہ اخبار بھی میرے ہی نام جاری کرایا تھا۔ پولیس کے دفتر میں ان لوگوں کا نام اور پتہ لکھا جاتا تھا جو اخبار الہلال یا ہمدرد یا زمیندار کے خریدار تھے۔ میرا نام بھی اس دفتر میں لکھا گیا تھا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء ـــــ ۱۹۔ مارچ ۱۹۲۰ء۔ یوم جمعہ سے خلافت اسلامیہ کے جلسے شروع ہوئے۔ اور خلافت کے جھنڈے اٹھنے لگے۔ ہندوستان بھر میں ایک آگ لگ گئی ہر شہر اور ہر قصبہ میں خلافت کمیٹیاں قائم ہوئیں ہر روز ہر مقام پر جھنڈے اٹھتے اور جھنڈوں کے ہمراہ

۱؎ پنڈت جگموہن ناتھ شوق مولف تذکرہ "بہار گلشن کشمیر" اردو کے ان پرستاروں میں تھے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اردو شعر و ادب کی خدمت میں گذرا ہے۔ سیتا پور میں برسوں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ تقریباً ہر ماہ ان کے یہاں مشاعرے منعقد ہوتے تھے جس میں لکھنؤ، شاہجہاں پور اور خیرآباد وغیرہ کے حضرات شریک ہوتے تھے۔ اندور کے رہنے والے تھے لیکن تمام عمر یوپی میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ آخر زمانے میں شاہجہاں پور کو اپنا وطن بنالیا تھا مگر زیادہ قیام سیتا پور ہی میں رہتا تھا ـــــ (ن۔س)

۲؎ پنڈت جگموہن ناتھ جی کے پوتے چند سال ہوئے امپھال میں کمشنر تھے۔ (ن۔س)

ہندو اور مسلمان اردو اشعار پڑھتے ـــــ اور ہندو بندے ماترم کا اور مسلمان اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ اکثر سرکاری مسلمانوں نے ملازمت سے استعفے دے دیے۔ عام طور پر حیرت انگیز جوش پھیلا تھا۔ اگر یہ جوش و خروش قائم رہتا تو انگریزوں کا ہندوستان میں ٹھہرنا مشکل تھا۔

۴۔ ۲ ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۵۔ مئی ۱۹۲۹ء یوم یک شنبہ کو لو لگنے سے سید ظہور الحسن (عرف گھسیٹے میاں) مولف کتاب "شجرات طیبات"[1] نے سیتاپور میں انتقال کیا۔

۵۔ محرم ۱۳۴۸ھ مصادف ۱۳۔ جون ۱۹۲۹ء یوم پنج شنبہ وقت شام منشی علی محمد صاحب ساکن سیتاپور محلہ شیخ سرائے نے بخار وغیرہ میں انتقال کیا اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑے میں دفن ہوئے جو ان کے مکان سے ملحق ہے۔

۲۴۔ محرم ۱۳۴۸ھ مصادف ۲۔ جولائی ۱۹۲۹ء یوم سہ شنبہ ـــــ کو ماموں حاجی سید محمد اشرف صاحب[2] (اختر الدولہ) مکان واقع محلہ گوڑین ٹولہ (سیتاپور) کے اندر مرے ہوئے پائے گئے یہ خیال کیا گیا کہ انھیں سانپ نے کاٹ کھایا کیونکہ دانت اور ناخن سیاہ ہو گئے تھے۔ ان کے پاس نقد دو ہزار چھ سو روپیہ نکلا جو ان کی لڑکیوں وغیرہ پر تقسیم ہو گیا۔ نئے اور پرانے اخباروں اور رسالوں کا بڑا ذخیرہ نکلا۔

۱۹۳۳ء ۱۳۵۲ھ میں آموں کی ایسی کثرت ہوئی کہ اسّی اسّی برس کے لوگ کہتے تھے کہ ہم نے ایسی کثرت کبھی دیکھی نہ سُنی۔ تخمی آم ایک ایک پیسے میں چار چار سو تک بک گئے۔ بعض باغوں میں کوئی مفت بھی آم کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ جن لوگوں نے باغ کی فصلیں خریدی تھیں انہیں بہت بڑا نقصان ہوا قلمی، بمبئی، سفیدہ۔ فجری۔ دسہری وغیرہ وغیرہ ایسے سستے بکے کہ کبھی اس نرخ پر نہ فروخت

---

[1] سادات سیتاپور کا ایک کارآمد نسب نامہ۔ جس میں سادات رضوی سیتاپور۔ بارہ بنکی، امروہہ اور سادات جعفری نیشاپوری و سادات نقوی و زیدی کے نسبی حالات اس میں ملتے ہیں تقریباً چالیس سال ہوئے جب ریاض پریس کے "امیر المطابع" سیتاپور میں چھپی تھی اب کمیاب ہے۔ (ن۔س)

[2] مولوی اکرام علی (مترجم اخوان الصفار) کے پوتے اور اپنے عہد کے ایک خوش گو شاعر تھے۔ (ن۔س)

[3] اختر الدولہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے ۱۸۸۸ء میں "اختر شاہنشاہی" جیسی تاریخی کتاب تالیف کی تھی۔ ہندوستان بھر کی تمام زبانوں میں یہ شرف اردو زبان ہی کو حاصل ہے جس میں "اختر شاہنشاہی" کے توسط سے ہندوستانی صحافت کا تاریخی تجزیہ کیا گیا ہے۔ تاریخی حیثیت سے یہ کتاب ہندوستانی صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب تک اختر الدولہ کے انتقال کی صحیح تاریخ کا پتہ نہ چل سکا تھا۔ قاضی صاحب نے اس سلسلہ میں بڑی معلومات افزا رہنمائی کی ہے۔ (ن۔س)

ہوئے تھے۔ لوگ ایسے سیر ہوگئے تھے کہ عمداً سے عمدہ آموں کی طرف بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ بازاروں میں ڈھیر لگے رہتے تھے۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ تخمی آموں سے بھری گاڑیاں چھ یا سات آنے میں بک گئیں اور اکثر لوگ دن بھر انتظار کرنے کے بعد جب کوئی خریدار نہ ہوا تو یونہی بازار میں چھوڑ کر چل دیتے تھے۔ صبح کو بھنگی اٹھا کر پھینکتے۔

۳۰۔ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء مصادف ۱۷۔ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۳ھ یوم دوشنبہ۔ تین بجے دن کو تخمیناً بیاسی برس کی عمر ہیضہ اور تخمہ اور فالج کے مرض میں ہندوستان کے بہت مشہور شاعر سابق ایڈیٹر ریاض الاخبار گورکھپور اپنے مکان خیرآباد محلہ قضیارہ میں بیوہ بیوی اور چار بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑ کر سبحان الہند۔ خیام العصر۔ لسان الملک سید ریاض احمد صاحب ریاض نے انتقال کیا۔ دس بجے رات کو اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ہندوستان کے مشہور اردو اخباروں اور رسالوں میں بہت دنوں تک آپ کے حالات لکھے جاتے رہے۔ وفات کی تاریخیں بھی کہی گئیں۔ خیرآباد میں "امتیاز میاں" کی کوٹھی پر ماتمی جلسہ ہوا۔ دیوان "روضہ رضواں" کے نام سے ان کے بھائی سید نیاز احمد صاحب کی کوشش سے شائع ہوا ہے۔ جس کا حجم پانچ جزو کا ہے۔[1]

مرحوم کی مجھ پر خاص عنایت تھی۔ جب میں "مدرسہ نیازیہ" خیرآباد میں مدرس ہو کر گیا تو آپ بہت خوش ہوئے۔ اوّل اوّل تو چند روز میں برادرم حکیم سید انوار حسین صاحب خیرآبادی کے مکان پر ٹھہرا۔ اس کے بعد انھیں (ریاض) کے مکان پر مستقل طور سے قیام کیا۔ بالکل گھر کی طرح رہا۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھانا۔ جس چیز کی ضرورت ہو تو فوراً مانگ لینا۔ بارہ سال تک میں ان کے مکان پر رہا۔ مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ میں کسی غیر جگہ ہوں۔ یہ خود اور ان کے گھر والے مجھ سے نہایت شریفانہ طریقے سے پیش آتے رہے کبھی انھوں نے کوئی دل شکن بات نہ کہی۔ مجھے نہ ایک پیسہ کرایہ کا دینا پڑا نہ مرمت کے لئے ——— اور نہایت آرام سے رہا۔

چند کتابیں علاوہ قاضی صاحب کی تالیفات و تصانیف کے اس "آپ بیتی" میں چند

---

[1] افسوس کہ یہ دیوان میری نظر سے نہیں گذرا۔ ریاض رضوان اور روضہ رضوان کے نام کی مشابہت سے یہ شبہ کیا جاسکتا تھا کہ شاید قاضی صاحب نے غلطی سے "ریاض رضوان" کو "روضہ رضوان" لکھدیا ہو لیکن "روضۂ رضوان" کی ضخامت پانچ جزو لکھ کر قاضی صاحب نے اس خیال کی بھی تردید کر دی کیونکہ "ریاض رضوان" کا حجم تین سو صفحات سے کم نہیں ہے۔ (ن۔س)

کتابوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو زیادہ تر مذہبی یا درسی ہیں۔ اور ان میں سے زیادہ تر وہی مشہور و معروف کتابیں ہیں جو قدیم مدارس و مکاتب میں رائج تھیں۔ البتہ چند کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ خصوصاً آچاریہ نریندر دیو کے والد بابو بلدیو پرشاد وکیل کی "ادیب فارسی" تو ایک زمانے میں فارسی کے ابتدائی اسباق میں بڑی اہمیت رکھتی تھی ــــ مختصراً ان کا ذکر بھی ملاحظہ ہو۔

ادیب فارسی ــــ ۱۸۸۵ء میں بابو بلدیو پرشاد وکیل ہائی کورٹ نے "ادیب فارسی" تالیف کر کے مطبع صبح صادق (سیتاپور) میں چھپوائی تھی۔ اس کے مولفوں میں منجملہ دیگر حضرات کے آپ کے منشی سید تفضل حسین کاکوروی بھی شامل تھے۔ اس کے چار حصے ہیں۔ اگر یہ باقاعدہ پڑھائی جائے تو فارسی میں نہایت اعلیٰ درجہ کی استعداد پیدا ہو سکتی ہے یہ کتاب بھی اب نایاب ہوتی جا رہی ہے۔

مکتوبات محمدی ــــ یہ کتاب بھی اردو میں تھی اور خاص اہتمام سے مطبع صبح صادق (سیتاپور) سے شائع ہو کر ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوئی۔ اور پھر بھی لوگ اس کے مشتاق رہے شفیعہ شکستہ خطوں کے لکھنے پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اس کا اسلوب نہایت عمدہ اور ضروریات پر حاوی اور فوائد سے مملو ہے۔ اس کے چار حصے تھے لیکن آخری دفعہ ۱۹۰۰ء میں فقط پہلا ہی حصہ شائع ہوا اور حصوں کی اشاعت رہ گئی۔ یہ کتاب آٹھ بار چھپی اور اکیس ہزار جلدیں شائع ہوئیں۔ اب نایاب ہوتی جا رہی ہے۔

ایک عجیب تصنیف ــــ مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب رآد ملیح آبادی مدرس مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ نے ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی جس میں چار ہزار شعر آں حضرت صلعم کی تعریف میں کہے ہیں اور حضرات خلفائے راشدینؓ وغیرہما کی تعریف میں اس کے علاوہ ــــ اس میں فعل کہیں نہیں ہے اسم اور حرف ہی ہیں اور نقطہ والا حرف بھی کوئی نہیں ہے۔ مرزا صاحب کا یہ بے مثل کمال ہے یہ کتاب چھپ گئی ہے تقطیع بڑی ہے۔ اس کتاب کو میں نے دیکھا ہے اس وقت اس کا نام یاد نہیں ہے انہوں نے اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن سے ان کی استعداد بخوبی عیاں ہے۔ ان کا عالم ضعیفی ہے مگر دما[غ]

ـــــــــــــــ

لہ بابو بلدیو پرشاد وکیل مشہور سوشلسٹ لیڈر آچاریہ نریندر دیو کے والد اور عربی۔ فارسی کے منتہی تھے۔ اور اردو اور فارسی زبان سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ انھوں نے اپنے تمام لڑکوں کو فارسی کی اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی چنانچہ آچاریہ نریندر دیو جی فخریہ کہا کرتے تھے کہ میں فارسی کا اسکالر ہوں۔ بابو جی اپنے دور میں سیتاپور کے ایک کامیاب وکیل تھے یہیں وفات پائی۔ (ن۔س)

ٹہ اس مجموعہ مکاتیب میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے والد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر اور چند دوسرے ذی علم بزرگوں کے اردو خطوط شامل ہیں یہ مجموعہ اب کم یاب ہے۔ (ن۔س)

بیکار نہیں ہے۔

زمانہ قدیم میں حضرت امیر خسروؒ نے "اعجاز خسروی" فارسی میں لکھی تھی۔ اس میں نقطہ والا حرف کوئی نہیں آیا ہے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں فیضیؒ نے عربی زبان میں قرآن کی تفسیر مسمی "سواطع الالہام" لکھی تھی۔ جس میں نقطہ والا حرف کوئی نہیں ہے۔ انشاء اللہ خاں انشاء نے نواب سعادت علی خاں والیٔ اودھ کے زمانے میں عربی زبان میں قرآن شریف کے نو پاروں کی تفسیر بے نقط لکھی۔ جب نواب مذکور نے قدر افزائی نہ کی تو انہوں نے اس کو تلف کر دیا۔ انھوں نے غلطی کی ان کو پوری تفسیر لکھنی چاہیئے تھی تاکہ فیضی کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا۔ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ پڑھنے والے اور کہنے والے مرزا دبیر نے سولہ سو بند مرثیوں کے اردو میں لکھے جس میں نقطہ والا حرف کوئی بھی نہیں آیا۔

لہ فیضی کی "سواطع الالہام" کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ جب وہ اس تفسیر کی تصنیف میں منہمک تھے تو انھیں خیال آیا کہ ابتداء میں "بسم اللہ" کو کس طرح پر لکھا جائے۔ بہت تلاش و جستجو کے باوجود ان کو اس کا متبادل لفظ نہ مل سکا اسی زمانے میں مخدوم الہدیہ خیرآبادی دہلی پہونچے۔ فیضی کو ان سے خاص عقیدت تھی یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ مخدوم صاحب نے برجستہ فرمایا "لاالہ الا اللہ" لکھ دو اس میں کوئی نقطہ نہیں ہے اور یہ کلمہ بلاشک و شبہ "بسم اللہ" کا قائم مقام بن سکتا ہے۔

مخدوم الہدیہ گیارھویں صدی ہجری کے نامور بزرگوں میں تھے فیضی نے ان کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا جو اب بھی خیرآباد میں موجود ہے۔ اسی پر فارسی کا قطعہ تاریخ بھی نصب ہے۔ (ن۔ س)

ابو محمد سحر

مکاتیب امیر مینائی پر ایک نظر

کشوروں میں لکھ کے خط احباب کو بھیجے امیرؔ
کیسے کیسے طے کئے خامے نے میداں رات بھر

مکتوب نگاری ادب کی بڑی دلچسپ اور کارآمد صنف ہے۔ مشاہیر ادب کے مکاتیب ان کی زندگی اور شخصیت اور ان کے عہد کے علمی و ادبی کارناموں اور سرگرمیوں کے مطالعے کا بعض اوقات سب سے مفید ذریعہ بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ادیب کی ذات میں کچھ خاص صفات کی موجودگی لازمی ہے۔ سب سے پہلے تو اس میں مکتوب نگاری کا ایک فطری ذوق ہونا چاہیئے تاکہ وہ مکاتیب کثرت سے لکھے اور دل لگاکر لکھے۔ دوسرے اس میں یہ حس اور مادہ ہونا چاہیئے کہ وہ دوسروں کے مکاتیب کا جواب لکھنا صرف اخلاقی ذمہ داری نہیں بلکہ ایک دلپسند فریضہ سمجھے اور اس کی ادائگی میں پورے انہماک سے کام لے۔ دوسرے الفاظ میں مکتوب نگاری کے لئے ادیب کو غالبؔ کے ایک مصرعے کے مطابق ذوق خامہ فرسا کا ستم زدہ ہونا چاہیئے۔ کامیاب مکتوب ہونے کے لئے یہ ایک ایسی شرط ہے جو کئی اور شرائط کی جامع ہے۔ کیونکہ ذوق خامہ فرسا کا ستم زدہ ہونا کسی ادیب کے لئے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی، خوش مزاجی، ہمہ گیری اور خلوص نہ ہو۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو کسی ادیب کو زیادہ سے زیادہ مکاتیب لکھنے پر مجبور کرسکتی ہیں۔ اور اس کے مکاتیب کو باعتبار اسلوب ادب و انشا ارکا نمونہ بنانے کے ساتھ ساتھ بہ لحاظ مواد مکتوب الیہ اور دوسرے پڑھنے والوں کے لئے جاذب نظر اور قابل توجہ بنا سکتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو یا تو ادیب کوتاہ قلمی کا گنہگار ہو جائے گا یا اس کے مکاتیب میں بے جان خیریت نگاری اور رسمی اور کاروباری باتوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

مکتوب نگار کی حیثیت سے کسی ادیب کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک اس کی شہرت اور ناموری پر بھی ہوتا ہے۔ مکاتیب کے پیچھے ایک ممتاز ... شخصیت کا ہونا ضروری ہے۔ محض اسلوب کی دلکشی اور انشا کی لطافتیں ہمیشہ کافی نہیں ہوسکتیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مکاتیب کی اہمیت

زیادہ تر ان کے ذاتی پہلو میں ہوتی ہے اور جب تک پہلے سے کسی کی ذات سے دلچسپی نہ ہو اس کے مکاتیب سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں پیدا ہو سکتی۔

مکتوب نگاری کے لئے جن خوبیوں کی ضرورت ہے وہ اردو کے ادیبوں میں سب سے زیادہ غالب کی شخصیت اور مزاج میں جمع ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو کے کامیاب ترین مکتوب نگار ہیں۔ اور خصوصیات کے علاوہ غالب کے مکاتیب کی ایک حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زندگی کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کوئی پہلو ایسا نہیں جو ان کے مکاتیب میں موجود نہ ہو۔ ہر چند یہ مبالغہ ہے لیکن حقیقت سے بہت قریب کہ انھوں نے اپنے مکاتیب میں اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو قلمبند کر دیا ہے۔ اور اس طرح اپنے سوانح نگار کے لئے خود ہی نہایت جامع اور مستند مواد اکٹھا کر دیا ہے۔

بقول حالیؔ " انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف جیسا کہ اس کی بے تکلف خط و کتابت سے ہو سکتا ہے ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ اسی واسطے مکتوب کو نصف ملاقات قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا اب اس کی ملاقات محض اس کی خط کتابت پر منحصر ہے اور بس۔ پس کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک نہایت بالشان حصہ قلمبند کر دینا ہے۔"[۱] غالب کے بعد انیسویں صدی کے کسی اور ادیب پر اگر مولانا حالیؔ کا یہ قول پوری طرح صادق آتا ہے تو وہ صرف امیرؔ مینائی ہیں۔ چنانچہ شبلیؔ نے ان کے مکاتیب کے متعلق بجا طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان سے کوئی چاہے تو ان کی سوانح عمری کا بہت کچھ سامان حاصل کر سکتا ہے۔[۲]

امیرؔ مینائی کے ایک شاگرد ناہد سہارنپوری نے کسی خط میں امیرؔ کی مکتوب نگاری کی تعریف کی تھی۔ اس کے جواب میں امیرؔ، ۷ اپریل ۱۸۹۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تم نے میری انشا پردازی کی ستائش کر کے مجھے اور شرمندہ کیا۔ شرمندگی کے ساتھ تمہاری قدردانی کا جو محض محبت سے ہے، شکر گذار ہوں۔ خطوط جب میں فکر سے اچھے لکھتا تھا وہ ذخیرہ ایک سو کئی جزو کا میرے ایک شاگرد نے جمع کیا تھا۔ سولہ برس ہوئے کہ وہ بیچارہ مر گیا اور اس ذخیرہ کا پتہ نہ لگا۔ پھر کسی نے جمع نہ کیا۔ تین چار شاگردوں نے کبھی کبھی کچھ خطوط کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں۔ وہ جا بجا ہیں۔ بعض

---

[۱] مکاتیب امیرؔ مینائی۔ تبصرے ص ۳۶۵-۳۶۶

[۲] ایضاً ص ۳۶۷

تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کر لی ہیں۔ اور جب سے دفتر امیر اللغات کھولا گیا ہے۔ محرران دفتر بعض مکاتبات لکھ لیتے ہیں۔ یہ سب بھی اگر جمع ہوں تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے مگر کون یہ کام کرے۔ اس قدر ضرور ہے کہ کوئی خوش سلیقہ، فہمیدہ و سنجیدہ آدمی ترتیب دے کہ ان کو یکجا کر دے اور میں ایک نظر دیکھ کر جو مطالب شائع کرنے کے نہ ہوں ان کو نکال ڈالوں تو بنے۔"[۱]

امیر کی زندگی میں تو اس کی کوئی صورت نہ نکلی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے ایک اور شاگرد احسن اللہ خاں ثاقب کو استاد کے مکاتیب مرتب کرنے کا خیال ہوا۔ شروع میں ان کا ارادہ تھا کہ امیر کے صرف وہ مکاتیب شائع کئے جائیں" جن میں کہ ادب کی رنگینی ہو یا فن شعر کے متعلق کوئی نکتہ بحث یا کوئی بات ہو" لیکن حسن اتفاق سے انھیں شبلی جیسا دانائے راز مل گیا جس نے تمام مکاتیب کو بے کم و کاست شائع کرنے کا مشورہ دیا[۲] اور امیر کے مکاتیب کا ایک قابل قدر مجموعہ شائع ہو گیا۔

ثاقب نے امیر کے مکاتیب پہلی بار "خطوط منشی امیر احمد" کے تاریخی نام سے ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں اردو پریس۔ علی گڑھ سے شائع کئے تھے۔ اس کے بعد کچھ نئے مکاتیب صفدر مرزا پوری نے "مرقع ادب" میں شائع کئے جو "خطوط منشی امیر احمد" کے دوسرے ایڈیشن موسوم بہ "مکاتیب امیر مینائی" مطبوعہ مطبع ادبیہ لکھنؤ (۱۹۲۴) میں شامل کر لئے گئے۔ کچھ اور مکاتیب مختلف کتب و رسائل مثلاً سوانح اسلاف مولفہ ولایت علی خاں عزیز صفی پوری (شاگرد غالب) سیرت امیر مینائی مولفہ ممتاز علی آہ، صہبائے مینائی از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، نیرنگ، دہلی، امیر نمبر اور نقوش لاہور، مکاتیب نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ دو غیر مطبوعہ مکاتیب رضا لائبریری رام پور میں راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ کچھ اور غیر مطبوعہ مکاتیب بعض حضرات کے پاس محفوظ بتائے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مکاتیب امیر مینائی میں جو ثاقب کا مرتب کیا ہوا امیر کے مکاتیب کا دوسرا اور آخری ایڈیشن ہے چھوٹے بڑے ۲۳۲ مکاتیب ہیں۔ ان کے تقریباً چالیس مکاتیب اس وقت تک دوسرے کتب و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح ان کے مکاتیب کی مجموعی تعداد بڑھ کر تین سو تک پہنچتی ہے۔ یہ سارے مکاتیب

---

[۱] مکاتیب امیر مینائی۔ تبصرے ص ۱۶۴ - ۱۶۵

[۲] ایضاً   دیباچہ طبع اول از ثاقب ص ۱۰

اکیس سال کے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ امیر کا پہلا مطبوعہ خط ثاقب کے نام ۱۶ر شوال ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۱ر ستمبر ۱۸۸۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ اور آخری مطبوعہ خط داغ کے نام ۲۲ر ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ مطابق ۲۰ر اگست ۱۹۰۰ء کا ہے۔ غیر مطبوعہ مکاتیب جو دست برد زمانہ سے بچ رہے وہ بھی اسی زمانے کے ہیں۔ ۱۸۸۰ء سے پہلے کا ان کا کوئی خط غالباً اب کہیں محفوظ نہیں اور اگر کوئی اس کی ملکیت کا دعویٰ کرے تو بغیر کسی حتمی ثبوت کے اس کی صداقت ہمیشہ مشکوک رہے گی۔ ۱۸۸۰ء کے بعد کے مکاتیب کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سب محفوظ ہیں لیکن ان کا جو حصہ محفوظ ہے بلکہ طبع ہو چکا ہے وہ بلحاظ مکتوب نگار ان کا درجہ متعین کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ ان کے جو مکاتیب تلف ہو چکے ہیں ممکن ہے ان سے ان کے حالات زندگی پر مزید روشنی پڑتی۔ لیکن ان سے ان کی مکتوب نگاری کی خصوصیات میں کسی خاص اضافے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ۱۸۸۰ء سے امیر کی وفات تک کے تمام مکاتیب سادہ نثر میں ہیں۔ اگر ۱۸۸۰ء سے پہلے کے مکاتیب موجود ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ اس صنف میں بھی ان کے مقفیٰ و مسجع طرز تحریر کے نمونے سامنے آجاتے جیسا کہ ان کی دوسری تحریروں میں سامنے آتے ہیں۔

امیر مکتوب نگاری کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ وہ اپنے اعزہ، احباب، تلامذہ اور معاصرین کو کثرت سے مکاتیب لکھتے، ان کے مکاتیب کے متمنی رہتے، مکاتیب آتے تو خوش اور مطمئن ہوتے اور جواب لکھنے کا التزام کرتے۔ کوثر خیرآبادی کو لکھتے ہیں۔

"حکیم صاحب دل کے بڑھانے والے، اگلی صحبتوں کے یاد دلانے والے خطوط آپ کے کم آتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ زیادہ آئیں"۔ [۵۱]

ثاقب کو لکھتے ہیں۔

"خط لکھنے میں بہت دیر نہ فرمایا کیجئے کہ جی افسردہ ہو جاتا ہے"۔ [۵۲]

بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں۔

بہت دنوں سے آپ کی تحریر سعادت خمیر دیکھنے میں نہیں آئی۔ آنکھیں مشتاق ہیں اور دل خلوص منزل ادراک خیریت کے لئے بیچین ہے"۔ [۵۳]

زاہد سہارنپوری کو لکھتے ہیں۔

"ابھی تم ہو اور دونوں جہاں کی لذتیں .... مدت کے بعد محبت نامہ آیا۔ میں نے اس کو سینے سے چمٹا یا آنکھوں سے لگایا"۔ [۵۴]

---

۵۱ مکاتیب امیر مینائی ص ۱۴۸
۵۲ مکاتیب امیر مینائی ص ۲۵۰
۵۳ مکاتیب امیر مینائی ص ۳۴۰
۵۴ مکاتیب امیر مینائی ص ۱۷۳

دوسروں کے مکاتیب سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کے اندازے کے لئے ایک مثال خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ وہ صرف دوسروں کے مکاتیب آنے ہی سے خوش نہ ہوتے تھے بلکہ ان کو اپنے پاس رکھنے میں بھی مسرت محسوس کرتے تھے۔ زاہد سہارنپوری کو لکھتے ہیں۔

"محبت نامہ آیا۔ مسرور کیا۔ مگر غزل اس کی پشت پر ہے۔ لہذا بجوری اس سرمایۂ سرور کو پھیرنا پڑا۔ چیز دے کر پھیر لینا آپ نے کس سے سیکھا ہے۔ یہ روش چھوڑ دیجئے اور آئندہ ایسا ستم نہ کیجئے۔[۱]

اوپر کے ایک اقتباس میں امیر نے اپنے دل کو "خلوص منزل" کہا ہے۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے ان کی مکتوب نگاری کا دھارا نکلا ہے۔ یوں تو ان کے مکاتیب از ابتدا تا انتہا ان کے "دل خلوص منزل" کے آئینہ دار ہیں لیکن جگہ جگہ ان میں اس کی کرشمہ سازیاں ایک بہتے ہوئے دھارے کی موج بلند بال کی طرح نمایاں ہو گئی ہیں۔ اعزہ، احباب، تلامذہ اور معاصرین کے ساتھ خلوص و دردمندی کے اظہار سے امیر کے مکاتیب بھرے ہوئے ہیں۔ ممتاز علی آہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تمہاری جدائی میں گھڑیاں پہاڑ سے دن ہو رہی ہیں کہ کاٹے نہیں کٹتیں۔"[۲]

کوثر خیرآبادی کو رام پور آنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آپ کے قصد وطن سے بہت جی خوش ہوا۔ خداوند تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت سے لائے۔ میں آرزو کرتا ہوں کہ آپ وطن سے مجدد دیدار طلب کے دیکھنے کے لئے رام پور بھی تشریف لائیں۔ خدا کے لئے اب کے ایسا نہ کیجئے گا کہ میں منتظر رہوں"[۳]

لیکن وہ خیرآباد ہی سے واپس چلے گئے۔ رام پور نہ آنے کے عذر میں غالباً انہوں نے مصارف کی تنگی کا ذکر کیا۔ جواب میں امیر لکھتے ہیں۔

پیارے کوثر۔ میں آپ کو خیرآباد خط لکھ کر بہت خوش ہوا تھا کہ اب کے بار میری آرزو ضرور پوری ہوگی مگر افسوس کہ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ مصارف کی نسبت تو اگر آپ مجھے اطلاع دیتے تو میں بکمال طیب خاطر فوراً بھیجتا مگر آپ کا تکلف کب اس کی اجازت دیتا تھا۔

امید وصال تو بعمر دگر افتاد"[۴]

---

[۱] مکاتیب امیر مینائی ص ۱۵۹	[۲] مکاتیب امیر مینائی ص ۲۰۴
[۳] ایضاً ص ۱۳۱	[۴] ایضاً ص ۱۳۳

امیر اپنے مکتوب الیہم کو اپنا کہا جتھا لکھتے، اپنے حال میں ان کو شریک کرتے، ان کا حال معلوم کرتے اور ان کی خوشی سے مسرور اور ان کے غم سے مغموم ہوتے۔ اعجاز رسولپوری کو ان کے جد امجد کی وفات پر لکھتے ہیں۔

"محبت نامہ سعادت شمامہ شعر خبر رحلت غفران مآب جد امجد سامی آیا اور میرے دل کلفت منزل کو جو ناپاب و شاداب مغفورین کے غم سے پہلے ہی بسمل ہو رہا تھا اور بھی تڑپایا۔ ایسی ذات بابرکات کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ جانا سخت صدمۂ جانکاہ ہے۔ اس داغ کا مرہم انا للّٰہ وانا الیہ راجعون کے سوا کوئی نہیں۔"[1]

۱۸۹۵ء میں زاہد سہارنپوری کی اہلیہ کی وفات پر امیر نے بہت کچھ دردمندی دکھائی تھی اور ان کی دلدہی اور تسکین خاطر کے لئے کوئی کمی نہ اٹھا رکھی تھی، یہاں تک کہ انھیں عقد ثانی کا مشورہ دیا۔ ۱۸۹۷ء میں جب انھوں نے امیر کو اس کی اطلاع دی تو ان کو لکھتے ہیں۔

"میں سفر میں تھا اب رام پور پہنچا تو آپ کا خط مسرت نمط پاکر انتہا کا مسرور ہوا۔ یہ دور ایسا ہے کہ برسوں خوشی کی بات نہ دیکھنے میں آتی ہے نہ سننے میں۔ بحمد اللہ کہ آپ نے مژدہ کتخدائی لکھ کر میرے دل افسردہ کو شگفتہ کر دیا۔"[2]

رام پور میں نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد شعرا کا مجمع تتر بتر ہو گیا تھا۔ اکثر شعرا نے دوسرہ ریاستوں میں قسمت آزمائی شروع کر دی تھی۔ جلالؔ کو ریاست بھوپال میں امیر کی کوششوں کی خبر ملی انھوں نے اپنی پریشاں حالی ان کو لکھی اور حال دریافت کیا۔ جواب میں امیر لکھتے ہیں۔

"آپ کا محبت نامہ دیکھ کر طبیعت کو نہایت اثر جار ہوا۔ افسوس یہ پیرانہ سالی اور اس پر یہ خستہ حالی .... یہ مجھے اب تک معلوم نہ تھا کہ مانگرول سے تعلق ترک ہو گیا۔"[3]

بھوپال کے مایوس کن حالات سے انھیں آگاہ کرنے کے بعد اسی خط کے آخر میں ان کو لکھتے ہیں۔

"بایں ہمہ میرے دل پر آپ کی پریشانی کا ایسا اثر پڑا ہے کہ ہرگز تدبیر سے غافل نہ رہوں گا۔"[4]

---

[1] مکاتیب امیر مینائی ص ۳۱۶
[2] مکاتیب امیر مینائی ص ۲۲۳
[3] ایضاً ص ۳۵۹
[4] ایضاً ص ۳۶۰

داغ کو دنیا امیر کا سب سے بڑا حریف سمجھتی ہے۔ ان کے نام امیر کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ باہمی خلوص اور محبت کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے۔

"آج حمید آپ کا ملازم قدیم میرے پاس آیا۔ مجھے اس کے دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ یہاں تھے اور اس یاد کی لذت میں میں نے اسے گلے لگا لیا اور اس کی آنکھوں کو جن سے وہ دس بارہ دن پیشتر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا کرتا تھا میں دیر تک حسرت کی نگاہ سے دیکھا کیا اور بار بار آپ کے حالات اور ضبط اوقات کے کیفیات پوچھا اور سنا کیا۔"[۵۱]

اگر مکتوب نگار کی شخصیت سے عام دلچسپی کے دوسرے اسباب موجود ہوں تو شخصیت کا انکشاف مکاتیب کی ایک اہم خوبی بن جاتا ہے۔ امیر کے مکاتیب پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر ہے۔ خلوص و نیک نیتی، صلح جوئی و رواداری، عجز و انکسار، خودداری و وضعداری اور تسلیم و رضا غرض یہ کہ ان کی شخصیت کے تمام پہلو ان کے مکاتیب کے آئینے میں جلوہ گر ہیں۔ یہ اثر اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس باب میں ان کے چند مکاتیب یا ان کے مکاتیب کے چند اقتباسات کا ذکر کرنا تحصیل حاصل ہے۔ بلا مبالغہ ان کے تقریباً سبھی مکاتیب اس کے ترجمان ہیں۔ تاہم ایک خط سے ان کی صلح جوئی کا نمونہ دیکھئے۔

"اخباروں میں کبھی کسی مہربان کی مہربانی سے جو کچھ چھپتا ہے میں نہ خود کبھی اس کا جواب دیتا ہوں۔ نہ کسی دوست کسی شاگرد کو اجازت دیتا ہوں۔ میرا مشرب یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اگر وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہیئے اور آئندہ احتراز کرنا چاہیئے اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی گئی ہے تو صبر کرنا چاہیئے، رد و قدح میں طول امل ہوگا۔"[۵۲]

اسی طرح ان کے مکاتیب کے بعض ٹکڑوں سے ان کے مزاج کی نفاست و نزاکت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

"ماشاء اللہ غزل اچھی کہی ہے۔ صادی شعر صاف کرکے گلدستے میں بھیجے جائیں۔ کاغذ آپ نے بہت برا اور کھرا اختیار کیا ہے۔ آئندہ سے سفید اور چکنے کاغذ پر لکھا کیجئے۔"[۵۳]

"ترکیب استعمال دوا کی معلوم ہوئی۔ سفوف پھانک لینا آسان مگر یہ عرقیات کا قدح پینا محال۔ کوئی سہل راہ نکالئے۔"[۵۴]

امیر مینائی اخلاق حمیدہ اور صفات پاکیزہ کا مجسمہ تھے۔ ان کی ذات ان کے ملنے جلنے والوں کے

---

۵۱ مکاتیب امیر مینائی ص ۲۸۱ ۵۲ مکاتیب امیر مینائی ص ۱۵۷
۵۳ ایضاً ص ۳۰۰ ۵۴ ایضاً ص ۱۴۵

ایک جیتا جاگتا درس اخلاق تھی۔ اس کی عکس ریزی کی بدولت ان کے مکاتیب میں بھی یہ خصوصیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے مکاتیب اردو میں سلسلۂ اخلاقیات کی ایک کڑی ہیں اور شاید سب سے اہم۔ انھوں نے اپنے مکتوب الیہم پر در پردہ اپنی مقدس شخصیت کی پرچھائیں ڈالنے کے علاوہ کہیں کہیں خلوص اور نیک نیتی سے مغلوب ہو کر کھلے طور پر تلقین اخلاق سے کام لیا ہے اور اپنے مکتوب الیہم کو ایسی باتوں کی ترغیب دلائی ہے جن کو وہ اچھا سمجھتے تھے۔ ان کے خلوص و نیک نیتی کی گہرائی کا اندازہ ان ہی حقیقت انہیں مقامات پر ہوتا ہے۔ کیونکہ مکتوب الیہ کو خوش کرنے کے لئے چکنی چپڑی باتیں اور فقرہ بازی تو ہر ایک کر سکتا ہے لیکن اس کی بھلائی کے خیال سے اس کو ایسی باتیں لکھنا جو اسے دوا کے کڑوے گھونٹ کی طرح انگیز کرنا پڑیں رسمی یا سطحی خلوص و نیک نیتی سے ممکن نہیں۔ حیدر آباد میں "استاد السلطان" ہونے کے بعد غالباً داغ کا میلان عیش و عشرت کی طرف زیادہ ہو چلا تھا۔ امیر کو جب حال معلوم ہوا تو انھوں نے ایک سچے بہی خواہ کی حیثیت سے ان کو ایک نصیحت آمیز خط بھیجا۔ اس خط میں انھوں نے داغ کو عذاب دوزخ ... کی سختیوں تک سے آگاہ کیا اور جس بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اس کے اظہار میں اس کی پروانہ کی کہ مکتوب الیہ کو اس قسم کی واعظانہ باتیں ناگوار گذر سکتی تھیں۔ اس خط کے آخر میں بڑے مناسب پیرائے میں لکھتے ہیں۔

> "پیارے داغ۔ میرے لکھنے کا برا نہ ماننا۔ خوشامد کرنے والے سیکڑوں ہیں۔ ملامت کرنے والوں میں ایک مجھی کو رہنے دو۔ میرا خطاب تمہاری طرف ہے۔ مگر درحقیقت اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں۔ بڑھاپے میں کچھ منعم حقیقی کی نعمتوں کا شکر ضرور کرنا چاہیے۔"[۱]

داغ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "میرا جی یہی چاہتا ہے کہ آپ جس قدر اپنے کمال میں ترقی کریں اسی قدر انکسار اور تواضع میں بھی ترقی کریں اس لئے کہ شجر میوہ دار کی شاخیں ہمیشہ جھکتی ہیں .... دل سوز دوست کا جی جب سلگتا ہے تو وہ دل سوزی کی راہ سے دوست کو اس راہ چلنے سے روکتا ہے جو اس کی بدنامی کا باعث ہو۔ یہ زمانہ بہت غنیمت ہے جہاں تک ہو سکے لوگوں کے ساتھ احسان کیجئے۔"[۲]

مکاتیب میں امیر نے اپنے حالات زندگی اور تصانیف کے متعلق کثرت سے خامہ فرسائی کی ہے

---

[۱] مکاتیب امیر مینائی ص ۲۸۳

[۲] مکاتیب امیر مینائی ص ۲۷۸

ان کی کئی سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں جن میں دو ان کے ایسے شاگردوں کی لکھی ہوئی ہیں جو کافی عرصے تک ان کی خدمت میں باریاب رہ چکے تھے لیکن ان کی زندگی اور علمی و ادبی کاموں کی تحقیق کے لئے اب بھی ان کے مکاتیب ایک نہایت اہم ذریعہ ہیں۔

امیر کو اپنی عمر کے آخری حصے میں شعروشاعری سے نفرت ہو گئی تھی۔ اصلاح کلام کے وہ عاجز تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا جی چراتے تھے۔ لغت کے کام میں بظاہر وہ آخر تک پوری طرح منہمک رہے لیکن ان کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ان کے لئے جنجال ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جس میں انھوں نے مکتوب نگاری سے بیزاری کا اظہار کیا ہو۔ شدید علالت، عدیم الفرصتی یا کسی اور وقتی رکاوٹ کی وجہ سے تاخیر و تعویق ضرور ہو جاتی تھی لیکن مکاتیب لکھنے یا لکھوانے میں کمی نہ ہوتی تھی۔ اکثر ادیب پیرانہ سالی کے سبب سے یا جمعیت خاطر نہ ہونے کی وجہ سے مکاتیب لکھنا موقوف کر دیتے ہیں۔ بعض کے مزاج میں کبھی کبھی اتنی رواقیت بلکہ ماورائیت پیدا ہو جاتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا تو ذکر ہی کیا بڑی سے بڑی بات بھی ان کے لئے لائق اعتنا نہیں رہتی۔ لیکن امیر مکاتیب برابر لکھتے رہے۔ اور انھوں نے اپنی اور دوسروں کی کسی بات کو اتنا حقیر نہیں سمجھا کہ مکاتیب میں نظرانداز کر دیا ہو۔ چنانچہ ان کے مکاتیب میں خاص خاص باتوں کے ساتھ ساتھ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ملتی ہیں جو ان سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتی ہیں۔ اگر آپ ان کے روزمرہ کے واقعات معمول، طور طریق، مشاغل، صحت و علالت اور سفر و حضر کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے ان کے مکاتیب کی ورق گردانی کریں تو ہر امر میں کوئی نہ کوئی کام کی بات ضرور مل جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنے متعلقین، شاگردوں اور معاصرین اور اپنے عہد کے بعض معمولی حالات مثلاً قحط، وبا اور بارش کی کمی یا زیادتی وغیرہ کے بارے میں بھی بہت سی باتیں اپنے مکاتیب میں محفوظ کر دی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک ایسے وقائع نگار ہیں جو باتوں باتوں میں اپنے اپنے مکتوب الیہم اور گرد و پیش کے چھوٹے بڑے واقعات ضبط تحریر میں لاتا چلا جاتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے دلچسپی اور تحقیق کا ایک ذریعہ چھوڑ جاتا ہے۔ چند نمونے دیکھئے۔

"میر ضامن علی جلال آئے اور پچاس روپئے مشاہرے پر نوکر ہوئے۔"[۵]

"حکیم عبدالعلی صاحب دو سو کے ملازم ہوئے تھے اور سو ترقی کر کے تین سو تک انھوں نے جگہ پائی تھی۔ اب یہاں کا رنگ دیکھ کر وہ ہجرت کر گئے۔

.... نواب مرزا خاں داغ سے کارخانۂ اصطبل پہلے نکل گیا تھا۔

---

[۵] مکاتیب امیر مینائی۔ خط بنام ثاقب مورخہ ۳ر جنوری ۱۸۸۱ء ص ۲۴۲

فراش خانہ کی موجودات وہ خود سمجھا کر مستعفی ہوئے۔ استعفےٰ نامنظور اور رخصت دو ماہ کی منظور ہوئی۔ احتمال آنے کا ضعیف ہے۔"[1]

"مجھے یقین نہیں کہ ریاض تم سے خفا ہوں بلکہ مرگ خاتون نے ان کو اپنی زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔"[2]

"سٹک اور نیچے آپ نے لکھنؤ میں منشی ظہور احمد صاحب کو پہنچا دیئے میں دل سے اس کا شکر گذار ہوں"[3]

"فرصت ایسی مفقود ہے کہ رات کے گیارہ بجے تک جان نہیں چھوٹتی"[4]

"وبا کی کثرت اس نواح میں دریافت ہونے سے سخت تشویش ہوئی۔ اس ملک میں ڈیڑھ مہینے سے تمام شہر بلائے تپ و لرزہ میں مبتلا ہے"[5]

امیر ۱۸۸۰ء سے مسلسل امراض جسمانی کا شکار رہنے لگے تھے۔ ۱۸۸۶ء سے انہوں نے امیر اللغات کی تدوین شروع کی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خاں کی وفات سے ان کی روز افزوں مالی پریشانیوں کی ابتدا ہوئی۔ چونکہ ان کے مکاتیب اسی زمانے پر مشتمل ہیں۔ اس لئے ان میں امراض کی یورش، مالی مشکلات، امیر اللغات کی تالیف اور اس کی تکمیل کے لئے سرمایہ نہ فراہم ہونے کے دکھڑوں کی بہتات ہے۔ ان میں سے ایک ایک چیز کا ذکر انھوں نے اس جزرسی سے کیا ہے کہ گویا اپنی مفصل خود نوشت لکھ ڈالی ہے۔ لیکن یہ خود نوشت انتہائی المناک ہے۔ ۱۹ر مئی ۱۸۹۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سوانح اور واقعات روح فرسا سے یہ حالت ہے کہ اب دنیا سے دل سیر ہو گیا ہے۔ کسی چیز اور کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی۔ آٹھ پہر یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بخیر کرے۔"[6]

امیر کے مکاتیب کا ایک بڑا حصہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر ان میں زندگی کے آثار ہیں تو اس لئے کہ کسی چیز سے دلچسپی نہ رہنے کے باوجود وہ بہت سی چیزوں سے دلچسپی لیتے رہے،

---

[1] مکاتیب امیر مینائی خط بنام شاداب رسولپوری مورخہ ۲۷ر شوال ۱۳۰۴ھ ص ۲۳۶

[2] ایضاً ایضاً برسیم مورخہ ۱۵ر جون ۱۸۹۲ء ص ۱۱۰

[3] ایضاً ایضاً کوثر خیرآبادی ص ۱۴۱

[4] ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۲۹

[5] ایضاً ایضاً بشیر ملیح آبادی مورخہ ۱۴ر اگست ۱۸۹۴ء ص ۳۴۱

[6] ایضاً ایضاً کوثر خیرآبادی ص ۱۳۶

اور آخر وقت تک ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی طبعی شگفتہ مزاجی انتہائی روح فرسا حالات میں بھی کبھی کبھی اپنا رنگ دکھاتی رہی۔

امیر کے زیادہ تر مکاتیب شاگردوں کے نام ہیں۔ ان کا طریقہ تھا کہ کلام پر اصلاح دیتے تھے تو ان کے وجوہ سے بھی شاگردوں کو مطلع کرتے تھے۔ کبھی یہ وجوہ اسی کاغذ پر لکھے جاتے تھے جس پر غزل ہوتی تھی اور کبھی علٰحدہ خط میں۔ اکثر شاگرد اور احباب الفاظ و محاورات کی صحت یا کسی اور علمی و ادبی مسئلے پر ان سے استفسار کرتے تھے۔ جن کا جواب وہ لکھ بھیجتے تھے۔ چنانچہ ان کے مکاتیب میں لسانی و ادبی نکات کا بیان کثرت سے ملتا ہے اور چونکہ وہ ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ اس لئے اس خصوصیت نے ان کے مکاتیب کو علمی نقطۂ نظر سے بھی مفید اور وقیع بنا دیا ہے ان کے مکاتیب میں اس قسم کے حصے ان کے ذوق التحقیق، وسعت معلومات اور صاحب نظری پر دلالت کرتے ہیں۔

"تو کی تذکیر و تانیث ہی کیا مگر جس محل استعمال کی رو سے آپ پوچھتے ہیں اس جگہ تو بھی کہیں گے کہ اس نے مجھے تو کہا لیکن اس سے تذکیر و تانیث تو کی نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس جگہ لفظ لفظ مقدر ہوتا ہے۔ جیسے اس نے مجھے عورت کہا۔ دیکھئے عورت کو قطعی مونث ہے وقس علیٰ ھذا۔"[1]

"لفظ ساکا کی اصل ساکھا بمعنی جنگ و جدل ہے۔ میر تقی مرحوم کے شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متوسطین و متاخرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔ بھا کا اصل میں بھاشا ہے اور ہندی میں شا اور کھا کا بدلا ہوتا ہے۔ اردو میں فصحا کی زبان پر بیشتر بھاکا اور کمتر بھاشا مستعمل ہے۔"[2]

"آنچل اور دامن کے جھگڑے میں میری رائے یہ ہے کہ دوپٹے اور اوڑھنی وغیرہ اوڑھنے کی چیزوں میں آنچل کہنا چاہیئے اور قبا، عبا وغیرہ پہننے کی چیزوں میں دامن کہنا چاہیئے۔ مگر شعر مبحوث عنہ کی تصحیح یوں ہو سکتی ہے کہ شاعر نے گوشۂ دامن کو بھی آنچل کہا ہے۔"[3]

"بھانا پسند آنے کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحق الترک ہے یہیں میں ہی کی جگہ بول چال میں چاہے آ جاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گذرا .... بھدنا لفظ نہیں ہے۔ بدھنا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صبا۔

---

[1] مکاتیب امیر مینائی ص ۱۹۱ [2] مکاتیب امیر مینائی ص ۲۳۶ [3] مکاتیب امیر مینائی ص ۳۰۶

شورجس کا ہے وہی حسن جنوں زا دل میں بدھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں[۵۱]

امیر کے تمام مکاتیب سادہ نثر میں ہیں۔ ایک دو جگہ ہم قافیہ فقرے یا جملے ان کے قلم سے نکل گئے ہیں لیکن ان کے پیچھے مقفیٰ عبارت لکھنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں معلوم ہوتی۔ اسلوب تحریر بالعموم صاف اور شگفتہ ہے لیکن جا بجا نہایت مفرس و معرب جملے بھی ملتے ہیں مثلاً

"آپ کا مع الخیر و العافیتہ گھر پہنچ جانا باعث انشراع خاطر ہوا"[۵۲]

"آپ اپنے طور پر عدہ ثمر بکمال احتیاط کہ کاربرد ازان ریل تصرف نہ کرسکیں ہدیتہً مجھے بھیجیں۔ بنظر بے تکلفی تصدیع دی جاتی ہے۔"[۵۳]

"سہارنپور میں کون کون سا میوہ قابل اتحاف رئیس عالی مرتبت ہوتا ہے"[۵۴]

القاب و آداب میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں جیسے

"عزیز از جان اقبال نشان سخن آفریں و سخنداں سلمکم اللہ المنان۔ دعائے سرسبزی نشاطین و سرخ روئی دارین کے بعد مدعا نگار ہوں . . ."

"احسن الاحبا مولوی احسن اللہ خاں ثاقب سلمہم الواہب بعد سلام مسنون اخلاص مشحون کے واضح ہو کہ رافت نامہ مدت کے بعد آیا۔"

"مخدوما و مکرما دام الطافکم۔ بعد سلام سنت اسلام کے واضح خاطر عاطر ہو"

"سعید و رشید ازلی سلمکم اللہ الولی!"

"دلنواز از امیر فقیر سلمکم اللہ القدیر و صحیحکم اللہ عن التبخیر۔"

لیکن اکثر انہوں نے مختصر القاب مثلاً مکرما، شفیقا، دلنواز، مجتبیٰ، سعید کونین، ملاذا، گرامی گوہرا وغیرہ سے مکاتیب کی ابتدا کی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسات میں جو القاب ہیں ان سے یہ القاب بہتر ہیں معنوی اعتبار سے دونوں کی موزونی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن القاب کے اعتبار سے ان کے سب سے اچھے مکاتیب وہ ہیں جن میں انھوں نے بے تکلفی، شفقت یا خلوص سے کام لے کر صرف "پیارے" یا اسی طرح کے کسی اور لفظ سے مکتوب الیہ کو مخاطب کیا ہے اور سلام و دعا وغیرہ بھی سیدھے سادے پیرائے میں لکھی ہے یا صرف خطاب کر کے اظہار مطالب شروع کر دیا ہے مثلاً

"پیارے برہم۔ مدت کے بعد داغ دل کا مرہم آیا۔"

"میرے پیارے کوثر۔ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز نہیں کیا!"

---

۵۱ مکاتیب امیر مینائی ص ۱۴۳ ۵۲ مکاتیب امیر مینائی ص ۱۴۱

۵۳ ایضاً ص ۲۲۰ ۵۴ ایضاً ص ۲۲۶

"پیارے زاہد۔ دعائیں لو"
"میرے پرانے یار پرانے غمگسار حضرت داغ سلامت"
"بندہ نواز بسلام نیاز"

اگرچہ امیر نے بعض اوقات ایک ہی مکتوب الیہ کے لئے مختلف قسم کے القاب استعمال کئے ہیں۔ لیکن وہ القاب لکھنے میں مکتوب الیہ سے اپنے مراسم، اس کے سن وسال بلکہ وضع قطع کا خیال رکھتے تھے۔ بشیر بلیح آبادی کو ملاقات سے پہلے انہوں نے ایک خط میں "سعید رشید سرد سلمکم اللہ الصمد" سے خطاب کیا تھا لیکن جب ان سے ملاقات ہوگئی تو ان کو امیر نے صرف "پیارے بشیر" سے مخاطب کیا تھا۔ اور تبدیلی القاب کا سبب بھی بیان کر دیا۔

"پیارے بشیر۔ ایک نظر تمہارے دیدار فرحت آثار نے ایسا تکلف ہر طرف کر دیا کہ رسمی تکلفات کے القاب لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لئے پیارے بشیر لکھنے پر قناعت کی۔ تمہاری سعادت مندی سے امید ہے کہ اس یگانگی کے الفاظ کو ناپسند نہ کرو گے"[۱]

کبھی کبھی امیر مکتوب الیہ کے خط کے مضمون یا اس سے متعلق کسی اور امر کی مناسبت سے بھی القاب اختیار کرتے تھے۔ داغ نے اپنے کسی خط میں دوستانہ خفگی کا اظہار کیا تھا۔ جواب میں امیر نے ان کو یوں مخاطب کیا۔

حضرت داغ نازک دماغ بسلام لیجئے۔

مولوی نورالحسن نے امیر اللغات حصہ اول پر تبصرہ کیا تھا۔ جو امیر کو بہت پسند آیا تھا۔ ان کو ایک خط میں اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

"سراپا رشد وسعادت مجسم علم ولیاقت عزیز از جان مولوی نورالحسن کو امیر فقیر کے جی سے نکلتی ہوئی دعائیں۔"

مکاتیب کے اسلوب تحریر میں ذاتی لب و لہجہ اور انداز گفتگو کی آمیزش کو جتنی اہمیت دی جائے کم ہے کیونکہ چاہے مکاتیب کو نصف ملاقات کہا جائے چاہے ملاقات کا بدل مکتوب نگاری کے بنیادی تقاضے سب سے زیادہ انھیں عناصر سے پورے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو اس پر ناز تھا کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا اور دوسروں نے بھی اس کو فن مکتوب نگاری میں ان کی منتہائے کمال قرار دیا ہے۔ امیر مینائی کے مکاتیب کے بعض بے تکلف القاب وآداب کی مثالوں میں آپ نے ذاتی لب ولہجہ اور انداز گفتگو کا اثر محسوس کیا ہوگا۔ ان کے مکاتیب کے دوسرے حصوں میں بھی جابجا اس کی کارفرمائی ملتی ہے

[۱] مکاتیب امیر مینائی ص ۳۴۲

"میاں برہم اب جو خط لکھا ہے تو لکھتے رہو۔ پھر ایسا غوطہ نہ لگا نا کہ مہینوں خبر نہ ہو"۔[۵۱]

"مگر اے میری جان سراپا ارمان زاہد۔ ابھی سے دوسرے عقد کی فکر کر۔ تو نام خدا ابھی جوان ہے تیرا بچہ معصوم نادان ہے۔ اس کی پرورش میں جیسی کوشش چاہیے تنہائی میں دشوار ہوگی"۔[۵۲]

"پیارے زاہد۔ اب تو ریل رام پور تک ہوگئی ہے۔ موقع ملے تو کبھی ادھر بھی آنکلو۔ اب تو مدت ہوگئی کہ نہیں دیکھا۔ مجھ کو اپنے دیدار سے مسرور کرو۔ تمھارا جی بھی بہل جائے گا"۔[۵۳]

مکاتیب کی ایک اور خوبی جو ان کی لطافت و دلآویزی کا باعث ہوتی ہے۔ ظرافت کا چٹخارہ ہے۔ غالب کے مکاتیب اس لحاظ سے بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ امیر کے مکاتیب پر متانت اور سنجیدگی کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ لیکن کہیں کہیں ظرافت اور بذلہ سنجی کے اچھے نمونے بھی ملتے ہیں۔

"پیارے برہم لکھ کر پچھتا رہا ہوں۔ برہمی پیارے ہونے کی چیز کہاں ہے کہ میں نے پیارے برہم القاب میں لکھا ہے"۔[۵۴]

ثاقب کو ملازمت میں کچھ ترقی ملی تھی۔ امیر کو اس وقت چاولوں کی ضرورت تھی۔ مبارک باد میں لکھتے ہیں۔

"میں نے سنا کہ کسی قدر آپ کی ترقی ہوئی۔ اگر سچ ہے تو مبارکباد لیجیے اور منہ میٹھا کیجیے۔ منہ میٹھا کرنے کا یہ طریقہ اچھا ہے کہ جس جس قسم کے چاول وہاں اچھے ہوتے ہیں وہ تھوڑے تھوڑے سے بھجوادیجیے۔ قند و شکر یہاں بہت ملتی ہے۔ وہ ملائی جائے گی اور سال بھر میٹھے چاول کھائے جائیں گے"۔[۵۵]

"دامن گلچیں" کے لئے ثاقب سے اردو غزل بھیجنے کی فرمائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اگر اردو زبان میں کچھ موزوں کرنے کا اتفاق ہوتا ہو تو طرح دامن گلچیں میں طبع آزمائی ضرور فرمائی جائے کہ اس کی رونق بڑھے اور ترتیب حروف تہجی میں آپ کے تخلص سے ثائے مثلثہ کا گھر آباد ہو کہ وہ ویران پڑا ہے"۔[۵۶]

مکاتیب میں امیر کے اسلوب تحریر کی دوسری قابل قدر خصوصیات شعریت، تاثیر اور زور بیان ہیں مکتوب نگاری کی اصل غرض و غایت اور اختصار وغیرہ کے دائرے میں ان انشا پردازانہ محاسن کی

---

[۵۱] مکاتیب امیر مینائی ص ۱۱۰
[۵۲] مکاتیب امیر مینائی ص ۲۰۵
[۵۳] ایضا ص ۲۰۶
[۵۴] ایضا ص ۱۰۷
[۵۵] ایضا ص ۲۵۶
[۵۶] ایضا ص ۲۵۲

موجودگی امیر کو اردو کے صاحب طرز مکتوب نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ مختلف مکاتیب سے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

"تم نے بیشک مجھے اپنے دل سے بھلا ڈالا کہ مجھے برسوں یاد نہیں کرتے ہو .... تم سے اور تمہارے خطوط سے تمہاری یاد ہی اچھی۔ اب جو تم نے اپنی ملاقات سے مسرور کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ خدا تمہارے وعدے کو پورا کرے جو تمہارا وعدہ ہے وہی میری تمنا ہے اور اپنی تمنا کو پورا ہوتے میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ اس لئے اس وعدے سے دل کو پوری خوشی نہیں ہوسکتی۔"[۵۱]

"براہ دل سوزی جو کچھ آپ نے خط میں لکھا ہے اس کا شکر ادا نہیں ہوسکتا میں خود سمجھتا ہوں کہ میرے حق میں پاس وضع مضر ہے مگر کیا کیا جائے کہ پاس آبرو سے قطع نظر نہیں ہوسکتی۔ اسباب ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا مصداق ہو رہا ہوں۔ حرکات اضطراری ہوا کرتے تھے۔ یہاں سکون و حرکت سب اضطراری ہیں۔"[۵۲]

تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔ اب تپ تو نہیں آتی۔ خدا کرے جاتی رہی ہو تمہارا حال ہم کس سے پوچھیں۔ تم نے تو ہم سے بولنا بھی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ

ہم بات کے قابل نہ ملاقات کے قابل

تم جو چاہو سمجھو جو چاہو کہو۔ ہم تو تم کو وہی آنکھوں کا تارا ممتاز اور جان سے پیارا ممتاز کہتے اور سمجھتے رہیں گے اور جب تک جئیں گے تمہاری خیر منائیں گے۔

مار ڈالا جو ہمیں تم نے بہت خوب کیا تم کو جی جان سے اللہ سلامت رکھے"[۵۳]

امیر کی نثر نگاری پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ان کی توجہ مقفیٰ اور مسجع طرز تحریر کی طرف تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی کوششوں سے قطع نظر کر کے غدر سے پہلے اردو نثر کا یہی متداول طرز تھا۔ رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کی بدولت لکھنؤ میں خاص طور سے اس کی گرم بازاری تھی۔ غدر کے کچھ عرصے کے بعد اگرچہ غالب کے مکاتیب اور سرسید کے مضامین کی اشاعت سے سلیس نثر کی طرف روز بروز زیادہ توجہ ہوتی جاتی تھی لیکن مقفیٰ و مسجع طرز تحریر کا سکہ اردو نثر کی دنیا سے پوری طرح اٹھا نہ تھا۔ امیر جیسا کہ ان کی غیر مطبوعہ نثر در تعریف قیصر باغ[۵۴] سے

---

۵۱ مکاتیب امیر مینائی ص ۱۱۴

۵۲ مکاتیب امیر مینائی ص ۲۵۰

۵۳ سیرت امیر مینائی از ممتاز علی آہ ص ۳۰۷

۵۴ مخطوطہ ۲۷۴/۱۔ رضا لائبریری۔ رام پور۔

ظاہر ہوتا ہے۔ غدر سے پہلے تو مقفیٰ و مسجع طرز تحریر کے دلدادہ تھے ہی لیکن انھیں غدر کے کافی بعد تک یہ طرز مرغوب رہا چنانچہ ۱۲۹۰ھ میں انھوں نے جب تذکرۂ انتخاب یادگار لکھا تو اس میں یہی طرز اختیار کیا۔ لیکن اس کے بعد وہ اردو نثر کے نئے میلان سے متاثر ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ سے ان کے مکاتیب میں سلیس نثر کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی تحریروں میں مقفیٰ و مسجع طرز تحریر کی مثال صرف ایک مناجات ہے۔ جو خیابان آفرینش مرتبہ ۱۳۰۵ھ کے آخر میں شامل ہے ورنہ باقی تمام تحریریں جدید رنگ میں ہیں۔ امیر نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "مجھے نثر میں مزاد نہیں" [1] لیکن غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ نثر میں وہ اپنے آپ کو اس کمال کا مالک نہ سمجھتے تھے۔ جو شاعری میں انھیں حاصل تھا۔ ورنہ انھوں نے نثر کافی لکھی ہے اور اچھی لکھی ہے۔ ان کی نثر میں معنوی اور ادبی محاسن ہیں۔ خصوصاً ان کے مکاتیب اور امیر اللغات حصۂ اول کا دیباچہ انیسویں صدی کے ربع آخر کی اردو نثر کے قابل قدر نمونوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔

---

[1] مکاتیب امیر مینائی۔ ص ۳۶۰

جاوید نہال

مُنتخبُ الفوائد

خلیل علی اشکؔ کی ایک نایاب کتاب

خلیل علی خاں اشک فورٹ ولیم کالج کے بدنصیب منشیوں میں ہیں، بدنصیب اس لئے کہ ان کی کتاب داستان امیر حمزہ کو شہرت دوام اور قبول عام نصیب تو ہوا، لیکن ادبی دنیا میں ان کو وہ مقام اور شہرت نہ مل سکی۔ جس کے وہ مستحق تھے۔ اور اکثر لوگ ان کے نام سے بھی ٹھیک طور پر واقف نہیں ہیں۔ ان کی کتاب داستان امیر حمزہ اب بھی اکثر لوگوں میں اتنی ہی مقبول اور مرغوب ہے، جتنی مختصر کہانیاں اور ناول، میر امّن کے قصہ چہار درویش کی طرح لوگ اب بھی جیتے کی شکل میں اسے پڑھتے، پڑھواتے اور سنتے ہیں۔

خلیل علی خاں بھی مظہر علی خاں ولاؔ اور حیدر بخش حیدریؔ کی طرح زود نویس اور محنتی ادیب تھے۔ ان کی تالیفات فورٹ ولیم کالج کی دوسری تالیفات کی بہ نسبت کہیں زیادہ ضخیم و حجیم ہیں۔ واقعات اکبر[۱] کا مخطوطہ تقریباً ۹۵۶ اوراق یا ۲ ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کالج میں غالباً اس سے زیادہ ضخیم اور مفید کتاب نہیں لکھی گئی، مگر یہ خلیل علی خاں اشک کی کم نصیبی کہی جاسکتی ہے کہ داستان امیر حمزہ کے ماسوا ان کی دیگر عمدہ اور معلومات افزا کتابیں شائع نہ ہو سکیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے نہ تو خلیل علی خاں اشک کا حال ہی لکھا ہے اور نہ ہی ان کی بعض اہم اور قابل قدر کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

کالج کے دیگر منشیوں کی حیات اور ان کے ترجموں اور تالیفات کا تھوڑا بہت حال تو قدیم اور جدید

---

[۱] واقعات اکبر: اکبر اعظم کے دست راست علامہ ابوالفضل کی مشہور تصنیف اکبر نامہ کا ترجمہ ہے۔ خلیل علی خاں اشک نے ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں اس کا ترجمہ مکمل کیا۔ اس میں اکبر کی ولادت سعادت، ہمایوں کی مراجعت اور دلی سلطنت پر تمکن کے ساتھ عہد اکبری کے تاریخی واقعات مفصل لکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ۲ ہزار صفحات پر مشتمل اشک کا یہ مخطوطہ شائع نہ ہو سکا۔ اس کے خاتمہ پر کالج کی مہر بھی ثبت ہے۔

تذکروں میں مل جاتا ہے، لیکن اشک کی حیات گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ ان کی زندگی کے حالات جو بعض کتابوں میں ملتے ہیں، وہ صحیح بھی نہیں ہیں اور ساتھ ساتھ گمراہ کن بھی، خلیل علی خاں اشک نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تالیف "انتخاب سلطانیہ اردو"[1] میں اپنا اور اپنے خاندان کا حال لکھا ہے۔ بہتر ہے کہ پہلے ان کا حال ان کی زبانی سنا جائے۔

"حمد و نعت کے بعد یہ احقر العباد محمد خلیل علی خاں اشک فیض آبادی کہ تولد اس کا شاہ جہاں آباد دلّی ہے لیکن سن تمیز کو فیض آباد میں آکر پہونچا اور علم و ادب موافق اپنے حوصلے کے تقید (تاکید) سے بزرگوں کی اور صحبت سے امیروں اور وزیروں کی اس خطہ حسن افزا میں کہ رشک فردوس ہے۔ تحصیل کیا اور اکثر محفلوں میں شہزادوں کے (کی) معزز رہا۔"

"سن ۱۲۰۹ ہجری میں آب و خور ملک میں بنگالے کے کھینچ لایا۔ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ کے اور عصر میں صاحب عدل مارکویس ولزلی دارالحکومت کلکتہ میں وارد ہوا۔ ..... لیکن احوال یہاں کا دیکھ کے اکثر لوگوں سے ترک ملاقات کر کے خانہ نشینی اختیار کی۔ ایک روز مخدوم زادہ والاشکوہ خلف الرشید قاضی القضات قاضی محمد نجم الدین خاں صاحب مولوی سعید الدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ صاحب عالیشان نے لکھنؤ سے شاعر بلوائے ہیں۔ چنانچہ ان میں مرزا کاظم علی صاحب کہ جوان تخلص کرتے ہیں، یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس سے دل کو نہایت خوشی حاصل ہوئی کیونکہ احقر نے انہی کے فیض کلام سے شعر و شاعری کا اور فن سخن آوری کا حاصل کیا تھا۔ اسی وقت بے تامل ان کی خدمت میں جاکر حاضر ہوا ...... انہوں نے ارشاد کیا کہ تعجب ہے کہ تم اس شہر میں ہو اور مسٹر گل کرسٹ سے ملاقات نہ کرو کہ جوہر شناس گوہر لفظ معانی ہیں اور فن نکتہ دانی میں لاثانی .... چنانچہ اپنے ہمراہ لیجا کر ملازمت کروائی۔ صاحب عالی قدر ملاقات کے وقت گفتگو سے اس احقر کے نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ہمارے لئے قصہ امیر حمزہ کا ریختہ میں ترجمہ کرو۔ بموجب فرمانے کے احقر اس کام میں مشغول ہوا اور چند داستانیں لکھی تھیں کہ سبب سے زمانے کی ناتواں بینی کے طبیعت پر گرانی گذری۔ پھر آکر خانہ نشین ہوا اور گوشۂ عافیت کو اختیار کیا۔ یہ احوال سنکر مولوی سعید الدین صاحب نے لے جاکر خداوند نعمت ہربرٹ ہرنگٹن صاحب عالی جاہ سے ملازمت کروائی جنہوں نے کہا کہ تمہاری خاطر کونسل ہی لکھینگے۔

---

[1] انتخاب سلطانیہ اردو، خلیل اشک کی تصنیف ہے۔ ۱۲۲۹ھ میں اشک نے ماروانت رکٹس صاحب کی فرمائش جدید مدرسے کے لئے یہ کتاب لکھی۔ دلّی کی ابتدا سے شاہ عالم کے عہد کے تاریخی واقعات افسانوی انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ شاہ معز الدین مشام یعنی شہاب غوری کی تاریخ سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ دلّی کی وجہ تسمیہ بھی اس کے قبل لکھی ہے۔ سلطانیہ اردو کا قلمی نسخہ ۱۵۴ اوراق پر مشتمل ہے۔

اور سب دفتر امیر حمزہ کے قصے کے تصنیف کرو چنانچہ انہی کی شفقت بے پایاں سے سبب روزگار ہوا۔ اور پھر مسٹر جان گلکرسٹ صاحب نے احقر کو مانگ لیا[1]"

خلیل علی خاں اشک کی اس مختصر خود نوشت سوانح حیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خلیل علی خاں اشک دلی میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کی زندگی کا بیشتر حصہ فیض آباد اور پھر بنگالہ (غالباً مرشد آباد) میں گذرا۔ اور یہ کہ وہ مرزا کاظم علی جوان کے تلامذہ میں سے تھے۔ مولوی اکرام علی مولف اخوان الصفا سے ان کا رشتہ نہیں تھا۔ مولوی اکرام علی یا ان کے بھائی کے ساتھ خلیل علی خاں اشک کا دور کا بھی رشتہ ہوتا تو اپنے کسی بھی مخطوطہ میں اس کی طرف وہ کم از کم ہلکا سا بھی اشارہ ضرور کرتے۔

انتخاب سلطانیہ اردو کے دیباچہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اشک شروع میں کلکتے کے ادبا و شعرا سے متاثر ہوا تھے۔ کاظم علی جواں کی سفارش پر ان کو کالج میں ملازم ضرور رکھ لیا جاتا ہے مگر کالج کے دیگر بااختیار منشیوں اور شاید میر منشی بہادر علی حسین سے ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ اور پہلی بار چند مہینوں کے اندر ان کو چھٹی دیدی گئی تھی، اور جب دوسری بار ہرنگٹن صاحب کی سفارش پر ان کو دوبارہ ملازمت ملی تو انہوں نے داستان امیر حمزہ مکمل کی۔ اور اس سے فراغت پانے کے بعد انہوں نے واقعات اکبر انتخاب سلطانیہ اردو قصہ رضوان شاہ اور منتخب الفواید جیسی مفید اور پُر از معلومات کتابیں ترتیب اور تالیف کیں۔ مگر یہ اردو ادب کی بدقسمتی تھی کہ داستان امیر حمزہ کے سوا ان کی کوئی دوسری کتاب چھپ کر منظر عام پر نہ آ سکی۔

واقعات اکبر اور منتخب الفواید چھپ جاتیں تو اردو ادب کے سرمایہ میں بڑا اضافہ ہوتا ہے۔ "واقعات اکبر" کا ذکر تو تذکروں میں مل جاتا ہے۔ مگر اشک کی منتخب الفواید کے بارے میں شاذ و نادر ہی کہیں کوئی ذکر کیا گیا ہو۔ اس مضمون میں اشک کی اس مفید کتاب پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

دراصل منتخب الفواید خلیل علی خاں کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہ ان کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ محمد منصور ابوالفرح خلیل کی ضخیم فارسی تالیف کا ترجمہ ہے۔ اشک نے اس کی اردو میں تالیف و ترجمہ کا حال دیباچے میں خود لکھا ہے:-

"اس احقر العباد محمد خلیل علی خاں کہ تخلص جس کا اشک ہے سن ہجری بارہ سو چھبیس کے درمیان مطابق ۱۸۱۱ء کے وقت میں محمد اکبر بادشاہ غازی خورشید فلک حکومت کے عہد میں، صاحب عدل و داد، آبادی ملک امراد عادل جہاں باذل زماں امیر الامرا زبدۂ نوئنان عظیم الشان نواب اشرف الاشراف لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز متعلق کشور ہند کے اور حکومت میں خداوند نعمت کپتان شیلر صاحب دام حشمتہ کی انتظام میں افلاطون زماں مسیحائے وقت صاحب عالیشان ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ انتخاب سلطانیہ اردو، ق۔ن ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کا اور گل کرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی ص ۱۳۷

دام دولتہ کے کتاب اوصاف الملوک و طرق خردہم کو کہ سلطان شمس الدین التمش کے حکم سے جس کو محمد منصور سعید ابوالفوح خلیل نے بمشقت تمام بڑی جدوجہد سے ہزاروں کتابوں کا انتخاب کرکے تالیف کیا تھا۔ زبان اردو میں موافق محاورے کے واسطے مدرسہ عالیہ کے ترجمہ کیا ازبسکہ بعضے بعضے علم و کسب جو مولف نے بیان کئے ہیں اس کے مطالب کو قلمبند کرکے ان میں جس جس فن میں ترجمہ کو بھی دخل تھا۔ مطابق اپنے حوصلے کے تزاید کیا۔ لیکن اتمام اس نسخے کا بارہ سو چھبیس ہجری میں ہوا۔ اس خاطر نام اس کا منتخب الفوائد رکھا کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی پائی۔

رباعی (قطعہ تاریخ)

آیا تھا خیال سن کے رنگین یہ کلام　　تاریخ کا پہنچائے اس کا انجام
آداب کا پا بڑھا کے ہاتف بولا　　رکھ منتخب الفوائد اس کا نام[۱]

۱۲۲۶ ہجری

جیسا کہ دیباچے سے ظاہر ہے منتخب الفوائد میں بادشاہوں کے اوصاف، خصایل اور عدل و انصاف اور طریق حکومت سے متعلق سبق آموز کہانیوں کا خزانہ سمٹا ہوا ہے۔ یہ حکایتیں مذہبی رنگ میں بیان کی گئی ہیں۔ جو قاری کے ذہن کو بہت جلد متاثر کرتی ہیں۔ منتخب الفوائد ۳۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ اشک نے اپنی تالیف کی فہرست اس انداز سے ترتیب دی ہے۔۔

باب	صفحات	باب	صفحات
(۱) کرم و حلم اور عفو کے بیان میں	۹ — ۶۰	(۱۰) تیغ بازی کا بیان	۳۶۱ - ۳۷۵
(۲) عدل و تربیت کا بیان	۶۱ — ۹۶	(۱۱) اور ہتھیاروں کا احوال	۳۷۶ - ۳۹۳
(۳) رحمت و شفقت کا بیان	۹۶ — ۱۲۲	(۱۲) لشکر کشی کا بیان	۳۹۳ - ۳۹۹
(۴) جس سے بادشاہوں کو غافل رہنا لازم نہیں ہے	۱۲۲ — ۱۳۸	(۱۳) لشکر اتارنے کا احوال	۳۹۹ — ۴۰۸
(۵) وزیر اختیار کرنے کا احوال	۱۳۸ — ۱۵۹	(۱۴) ایلچی اور جاسوس بھیجنے کا احوال	۴۰۸ - ۴۲۱
(۶) نامہ بر اور تحفہ بھیجنے کا احوال	۱۵۹ - ۱۹۱	(۱۵) شبخوں بھیجنے کا احوال	۴۲۸ - ۴۲۹
(۷) مشورت کرنے کا احوال	۱۹۲ - ۲۰۵	(۱۶) کمین کرنے کا احوال	۴۲۹ — ۴۴۰
(۸) گھوڑے کے اوصاف اور فضیلت میں	۲۰۵ - ۳۲۸	(۱۷) جنگاہ کے دریافت کرنے کا حال	۴۴۰ - ۴۴۷
(۹) تیر اندازی کا احوال	۳۲۸ - ۳۶۰	(۱۸) صفوں کو درست کرنے کا احوال	۴۴۹ - ۴۵۷

---

[۱] ملاحظہ ہو دیباچہ قلمی نسخہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ

باب	صفحات
(۱۹) صف آرائی کا احوال	۴۵۸-۴۶۴
(۲۰) سپہ سالاروں کی ہشیاری کا احوال	۴۶۴-۴۷۱
(۲۱) لڑائی شروع کرنے کا احوال	۴۷۱-۴۸۷
(۲۲) لڑائی میں نماز پڑھنے کا احوال	۴۸۷-۴۹۸
(۲۳) معلومات میں حرب کی	۴۹۸-۵۱۳
(۲۴) سپاہ مختلفہ کے دریافت کرنے کا حال	۵۱۳-۵۲۷
(۲۵) جہاد کی فضیلت کا احوال	۵۲۸-۵۴۰
(۲۶) خراج لینے کا احوال	۵۴۰-۵۵۲
(۲۷) قلعہ گیری کا احوال	۵۵۲-۵۷۸
(۲۸) لشکر کی مددگاری کا احوال	۵۷۸-۶۰۳
(۲۹) جس کی شناخت بادشاہوں کو لازم ہے	۶۰۳-۶۰۹
(۳۰) سزا دینے کا احوال	۶۰۹-۶۱۴
(۳۱) مجربات استادان قدیم کا.....	۶۱۴-۶۱۸
(۳۲) مرگ سے ڈرنے کا احوال	۶۱۹-۶۲۳
(۳۳) خنجر بازی کا بیان	۶۲۳-۶۳۹
(۳۴) ان نعمتوں کا بیان جو بادشاہوں کے لئے ضروری ہیں	۶۳۹-۶۵۵

منتخب الفواید کی اس طویل فہرست میں گھوڑوں کا بیان سب سے طویل ہے اور تقریباً ۱۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ گھوڑے کے باب کا ترجمہ خلیل علی خاں اشک نے بڑی محنت سے کیا ہے اور حسب ضرورت کمی بیشی کرکے دلچسپی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو پوری کتاب مفید، دلچسپ اور پند و نصائح میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور مذہب اور اخلاق کے بیش بہا موتی اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔ مگر اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بادشاہ سے لیکر معمولی سپاہی، تونگر سے لیکر ادنیٰ فقیر کے لئے عبرت اور سبق کے موتی بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اور ان موتیوں سے انسان اپنے دامن کو بھرے اور ان انمول نصائح پر کاربند ہو تو حیات انسانی کو وہ معراج حاصل ہو جائے گی۔ جس کے لئے اس کی تخلیق ہوتی ہے۔

منتخب الفواید کا پہلا باب بادشاہوں کے کرم و حلم اور عفو کے بیان میں ہے، اس سے کتاب شروع ہوتی ہے۔

"چنانچہ آیہ کلام اللہ ہے کہ جس کا ترجمہ یوں ہے کہ کھانے والے غصہ کے اور بخشنے والے آدمیوں کے حق تعالیٰ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو، یہ آیہ بہشت کے ایک دروازے پر لکھی ہوئی ہے جو کوئی دنیا میں اس آیت پر عمل کریگا قیامت کے دن اس دروازے سے بہشت کے اندر جائے گا روایت معتبر ہے کہ جب پیغمبر علیہ السلام کو رسالت ہوئی۔ وحی نازل ہونے لگی، حکم جناب ایزدی سے نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کا آیا۔ پیغمبر اسلام نے لوگوں سے پوشیدہ نماز پڑھی اور بندگی کرنی شروع کی۔ کیونکہ جب تک اسلام کو ایسی قوت نہ ہوئی تھی کہ آشکارا نماز پڑھتے۔ جہاں کہیں مکان خالی گوشے کا دیکھتے نماز ادا کرتے، ایک دن نماز پڑھتے تھے کہ مکہ کے کافروں نے دیکھا

کہ پیغمبر علیہ السلام نماز میں مشغول ہیں، جس وقت حضرت مسجد میں گئے۔ ان ناپاک بت پرستوں نے نجاست حضرت کی گردن مبارک پر ڈال دی۔ جناب فاطمہ علیہ السلام یہ حالت دیکھ کر بہت روئیں اور وہ نجاست گردن مبارک سے جناب پیغمبر کی اٹھا کر پھینک دی، اس طرح کی بے ادبیاں کفار اکثر کرتی تھیں (کرتے تھے) اور پیغمبر علیہ السلام کرم و حلم کے سبب عفو فرماتے تھے، جب ظلم ان کا حد سے گذرا، جناب پیغمبر نے درگاہ ایزدی میں گریہ و بکا کیا اسی وقت حضرت جبریل اور مکائیل ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے سلام فرمایا ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ آپ ارشاد کریں ہم ان کو بجالائیں ....

جناب پیغمبر نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دعا طلب کی اے بار خدایا قوم اور امت کو مری راہ راست دکھاؤ کہ یہ نہیں جانتے، حضرت جبرئیل و مکائیل یہ کرم و حلم دیکھ کر کمال تعجب میں آگئے [۵]"

کرم، حلم اور عفو کا باب خاصہ طویل اور مفید ہے اور اس باب میں متعدد نصیحت آموز حکایتیں بیان کی گئی ہیں، بعض امیر المومنین حضرت علیؓ بعض حضرت ابو بکر صدیقؓ بعض حضرت عثمانؓ اور بعض حضرت عمرؓ سے روایت ہیں۔ ہر حکایت نصیحت سے پُر ہے اور ہر میں یہ بات لوگوں کو ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ کرم، حلم اور عفو ایسی صفات ہیں جو ذہن انسانی کو صیقل کرتی ہیں، اور اسے اعلیٰ مرتبہ بخشتی ہیں۔

دوسرا باب عدل اور نظام حکومت سے متعلق ہے۔ اس باب کی تمام حکایتوں میں بادشاہوں کو راہ نجات دکھائی گئی ہے۔ نظم و نسق چلانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ اور ان کو عدل و انصاف کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی بادشاہ کو ابدی زندگی اور دائمی شہرت ملتی ہے جو انصاف کے پُر خار راستے پر قدم جما کر سفر جاری رکھتا ہے، جس کے انصاف کی ترازو کے باٹ برابر ہوتے ہیں۔ اور جو انصاف کے لئے اپنی بادشاہت بھی قربان کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور کسی قیمت پر بھی انصاف کا خون ہونے نہیں دیتا، اور وطن اور قوم کی ترقی آزادی اور خوشحالی کے لئے وہ عظیم سے عظیم قربانی دینے میں تامل نہیں کرتا۔ ایثار کے جذبے سے معمور دل کو ہی معراج حاصل ہوتی ہے۔ ظالم اور جابر حکمراں کی ناؤ چند دنوں کے اندر قہر خداوندی کے طوفان میں ڈوب جاتی ہے۔ اس باب میں کئی عمدہ، موثر اور مفید حکایات بیان کی گئی ہیں۔ جو حضرت رسول صلعم اور خلفائے دین سے روایت ہیں۔ حضرت عمر عبد العزیزؓ امیہ خاندان کے سب سے زیادہ عادل، پارسا اور خدا ترس خلیفہ گذرے ہیں، ان کے دل میں خدا کا خوف، ان کا انصاف اور اپنی

---

[۵] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ص ۱۶

رعایا کے لئے جذبۂ ایثار، یہ سب ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اس خدا ترس خلیفہ کی ایک حکایت نقل کی گئی ہے۔

"سید عبداللہ کہتا ہے کہ جب عمر عبدالعزیز مدینہ کا حاکم ہوا ایک کشتی بھرا ناج بکنے کو آیا۔ محمد عبداللہ شرقی نے اس کو منع کیا اور اس کے بیچنے سے باز رکھا۔ کہا پیغمبر علیہ السلام سے میں نے سُنا ہے کہ جو بادشاہ یا امیر واسطے تجارت کے غلہ مول لے اس ارادہ پر کہ پھر رعیت کے ہاتھ بیچے وہ رعیت منفرد ہلاک ہوگی۔ یہ سنکر فرمایا کہ تمام غلہ کو خیرات کردو۔ اور فرمایا کہ کشتی کے بھی تختے نکال لو اور غریبوں اور فقیروں کو دیدو" [۱]

منتخب الفوائد میں حکمرانوں کے عدل وانصاف سے متعلق متعدد حکایات درج کی گئی ہیں۔ جو اتنی دلچسپ ہیں کہ ایک حکایت کو بھی چھوڑ کر آگے بڑھنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ نصیحتوں کی دولت سے پُر یہ حکایتیں آج بھی حکمرانوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہو کر ایک حکمراں اپنی سلطنت میں خوشحالی کے پھول کھلا سکتا ہے۔

اس کتاب میں ہتھیار، لڑائی اور گھوڑے اور کسب علم کے احوال دلچسپ اور معلومات افزا بھی ہیں اور محیر العقول بھی، ہتھیار اور لڑائی کے باب کی ہر حکایت الشان کو امن وشانتی کی زندگی گذارنے اور جنگ سے نفرت کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ ان حکایات میں جو پیغمبر اسلام اور خلیفۂ دین سے روایت ہیں بتایا گیا ہے کہ وہی خلیفہ یا حاکم عظیم المرتبت اور نامور ہوتا ہے جسے اپنے ملک اور اپنی قوم کی پُرمسرت زندگی سے الفت ہوتی ہے۔ جو جنگ اور خوں ریزی سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ ان میں جنگ سے حتی الامکان بچنے پر زور دیا گیا ہے۔ آج بھی ساری دنیا جنگ کے تصور سے ہی کانپ رہی ہے۔ آج بھی قومیں جنگ سے نفرت کر رہی ہیں اور امن وشانتی کی زندگی بتانے پر زور ڈال رہی ہیں۔ اپنی سلطنت میں امن وامان برقرار رکھنے کے لئے بادشاہوں کو یہ نصیحت بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ ہمیشہ ایسے وزیر مقرر کرو جو دانا و بینا ہوں، جنگ کرنے اور رعیت کا خون چوسنے کی ترغیب نہ دیتے ہوں۔

"نوشیرواں کہتا ہے کہ وزیروں میں بدترین خلائق وہ ہے کہ بادشاہ کو تحریص لڑائی کی دے یا لڑائی پر چڑھا لے جائے۔ ہر ایک کام اور خرچ ہو، ہمیشہ طمع زر و مال کی رکھتا ہو اور لڑائی کے وقت اپنی جان بچانے کی فکر میں رہے" [۲]

حضرت سلیمان، بہرام گور، سکندر ذوالقرنین کی بھی حکایات نقل کی گئی ہیں۔ یہ حکایتیں بڑی محنت

---

[۱] ملاحظہ ہو مخطوطہ ص ۱۰۳

[۲] ملاحظہ ہو کتاب ہذا ص ۱۵۱

اور کاوش سے جمع کی گئی ہیں۔ جن میں بار بار یہی لکھا گیا ہے کہ ایک فرماں روا کو خونریزی اور لڑائی سے آخر آخر تک گریز کرنا چاہیئے۔ اور جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد مفتوح حکمرانوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی دلچسپ اور معلوماتی حکایت درج کی گئی ہے۔

"سلیمانؑ جب کسی لڑائی پر جاتے تھے، آصف برخیا کو اپنے ساتھ لے جاتے اس واسطے کہ وزیر کافی اور کارداں عالم تھا۔ دوسرے یہ کہ ولی صاحب کمال تھا۔ اس کے ذکی کراماتوں میں سے ایک یہ تھی کہ جس وقت بلقیس (سبا) حضرت سلیمان کی خدمت میں روانہ ہوئی لشکر کثیر لیکر اپنے شہر سے نکلی اور اپنے تخت کو سات حجروں کے اندر رکھوایا۔ اور سب دروازوں میں مہر کی۔ ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کو یہ خبر دی، سلیمانؑ نے فرمایا کہ چاہیئے کہ وہ تخت قبل اس کے آنے کے یہاں ہو، دیو عفریت نے آکر عرض کیا کہ جس روز سے حضرت تخت حکومت اور مسند تخت پر بیٹھے ہیں، میں حکم بردار ہوں۔ اگر حکم ہو تو بندہ جاوے اور اس تخت کو لے آوے کہ کسی طرح اس میں خلل نہ آوے کوئی عدد جواہر کا برباد نہ ہو، فرمایا مجھے اس سے بھی جلد چاہیئے۔ یہ فرما کر طرف آصف کے دیکھا اور کہا یہ کام تمہارا ہے، آصف اس وقت اٹھا اور دو رکعت نماز ادا کی، جبکہ اس سے فارغ ہوا طرف آسمان منہ کر کے دعا طلب کی۔ جناب عزت نے اسی وقت اس کو مستجاب فرمایا، اس وقت آصف نے طرف سلیمان کے دیکھا اور کہا دیکھو خدا نے فرشتوں کو بھیجا ہے کہ تخت بلقیس کا اٹھا کر زمین کی راہ سے لا دیں یہ بات تمام کی تھی کہ فرشتوں نے وہ اس کا تخت زمین کے قلعہ سے نکال کر حضرت سلیمانؑ کے آگے رکھ دیا۔ اس دعا کے احوال میں جو آصف نے پڑھی تھی اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ یا حیی و قیوم پڑھا تھا اور بعضے کہتے ہیں کہ یا ذوالجلال والاکرام، غرض جب تخت پہنچا حضرت سلیمان نے چاہا کہ عقل و کیاست و ہوشیاری بلقیس کی آزمائش فرمائیں۔ حکم کیا کہ اس تخت سے ایک تختی جواہر کی کم کر دو اور تخت کو پھیر کر رکھو۔ دیکھیں پہچانتی ہے یا نہیں۔ لوگوں نے حسب ارشاد وہی کیا، جب بلقیس آئی اور حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ مسلمان ہوئی، سلیمان علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ یہ تخت تیرا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اگر کہتی ہوں کہ میرا ہے تو میں اس کو سات در بند میں رکھ کر آئی ہوں اور اگر کہتی ہوں کہ میرا نہیں تو شاید میرا ہو تو جھوٹی ہوں گی۔ کچھ سوا اس کے نہ کہا کہ صورت اس کی اس تخت کی سی ہے۔ حضرت سلیمان نے اس کی عقل پر آفرین کی اور نکاح باندھا اور اس کے دارالملک کی طرف روانہ فرمایا، اس واسطے ہر بادشاہ کو

لازم ہے کہ اہل سلاح سے اتفاق رکھے اور ان پر احسان کرے.....[۱]

ہتھیاروں کی فضیلت کے باب میں جو حکایتیں لکھی گئی ہیں وہ سخت کوشی اور عرق ریزی کے بعد ہی جمع کی گئی ہیں۔ منتخب الفوائد کے مولف ابو الفرج خلیل نے ہتھیار کی ساخت، اس کے استعمال کے آغاز کی حکایت دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

"دریافت کیا چاہئے کہ پہلے سلاح کو حضرت آدمؑ اپنے کام میں لائے اس کا احوال اس طرح ہے کہ جب جناب باری نے حضرت آدمؑ کو بہشت میں بھیجا کہ نعمت برخورداری بہشت سے حاصل کرے۔ شجاعت، مردانگی جو اس کی ذات میں تھی حرکت میں آئی حضرت آدمؑ اس سے کمال تعجب میں تھے۔ یہ کیا کہ جبرئیل ان کے پاس تشریف لائے حضرت آدم نے حضرت جبرئیل سے اس حرکت کا احوال پوچھا یہ کیا ہے حضرت جبرئیل نے کہا یا آدم یہ حرکت شجاعت مردانگی ہے۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ اسباب اس کا کیا ہے کہا کہ ایک ساعت صبر کر کہ میں اسباب اس کا تجھے دکھاؤں۔ اس وقت فرمان ایزدی سے گیا۔ اور خزانے سے عرش کے ایک کمان لایا کہ یاقوت احمر کی تھی اور چلّا اس کا مروارید کا اور تین تیر یاقوت زرد کے کہ سریاں ان کی زمرد کی اور پیکان نیلم کے تھے۔ آدم علیہ السلام کو دیا اور کمان کھینچنا، شست باندھنا اور تیر لگانا سکھایا کہ تیر اس طرح مارتے ہیں۔ حضرت آدم نے پہلا تیر بہشت کے کوے پر مارا۔ خطا ہوا، حضرت جبرئیلؑ ہنسے اور حضرت آدم شرمندہ ہوئے اور دوسرا تیر مارا کہ تین شہ پر کوے کے گر پڑے، چنانچہ تین طرف تیر کے جو پرگیری ہوتی ہے اس کی ابتدا اس سے ہوئی ہے.......[۲]

تیر و کمان کی ابتدا اور آدم کی تربیت کے بعد تیر اندازی، تیغ زنی اور چوگاں بازی کی اقسام اور صفتیں بالتفصیل بتائی گئی ہیں۔ بقراط کا قول نقل کیا گیا کہ تیر اندازی اور چوگان بازی سے بہتر کوئی ہنر نہیں ہے۔

اگلے زمانے میں جب توپ اور بم ایجاد نہیں ہوئے تھے تو اس وقت تیر اور نشانہ باز تیر انداز جنگ جیتنے کا بڑا ذریعہ ہوتے تھے۔ تیر سے ایک بادشاہ کی شکست اور اس کے لشکر جرار کی پسپائی کی حکایت ناصحانہ انداز میں بیان کی گئی ہے:

"کہتے ہیں کہ جب امیر سبکتگین نے قلعہ کرویز کا محاصرہ کیا تھا ترکوں نے اس لڑائی میں کمال سستی کی۔ امیر لشکر کی یہ حالت دیکھ کر مارے غصہ کے پیادہ ہوا اور آپ قلعے کی جو چلا کہ فتح کرے۔ ایک حکم انداز نے قلعے کے اوپر سے ناوک کا تیر مارا کہ اس جگہ شہید ہوا کہ لشکر وہاں سے پھرا.....[۳]

---

[۱] ملاحظہ ہو ص ۵۸۵ [۲] منتخب الفواید، ق ۱۶۷، ورق [۳] ملاحظہ ہو قلمی نسخہ ص ۳۴۲۔

ایسی ایسی حکایتیں اور روایتیں کئی کئی بیان کی گئی ہیں۔ ہر اولوالعزم بادشاہ، بہادر سپاہی اور حوصلہ مند شخص کو تیر اندازی کا ہنر سیکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

یوں تو منتخب الفواید کے تمام باب دلچسپ اور سبق آموز ہیں، مگر سب سے دلچسپ اور مفید باب گھوڑے کی فضیلت کے بیان میں ہے۔ گھوڑوں کی فضیلت اور خوبیوں، ان کی اقسام کا دلچسپ حال ملتا ہے۔ مصنف نے گھوڑے کی وجہ آفرینش کا حال مفصل اور انتہائی دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

"جناب امیرالمومنین یہ روایت جناب رسول خدا کی زبان سے فرماتے تھے کہ روایت روایات متن میں سے مشہور ہے کہ جناب ایزد سبحانہ تعالیٰ نے چاہا کہ گھوڑا پیدا کرے باد جنوب سے فرمایا کہ میں تجھ سے ایک خلقت پیدا کروں گا کہ اس پیشانی میں سفیدی ہو اور اس سے عزت و زیبائش ہو، میرے دوستوں اور اہل طاعت کو اور ذلت دشمنوں کو، ہوا نے جواب دیا جو مرضی تیری، پس جناب حق تعالیٰ نے باد جنوب سے گھوڑا پیدا کیا اور فرمایا کہ خیر و برکت تیری پیشانی کے بالوں میں میں نے رکھی ہے۔ تیری سواری کو غنیمت جانیں گے۔ تجھ میں خاصیت غنیم کے روبرو جانے کی اور دشمن کے مقابل سے بھاگنے کی دی ہے اور تجھے فراخ روزی پیدا کیا ہے اور مبارک دیدار اور سب چارپایوں پر تجھے فضیلت دی ہے اور تیرے خاوند کو تجھ پر مہربان کیا ہے کہ بھاگنے اور پکڑنے کے وقت بے بال و پر اڑو گے۔ اور میں آدمی پیدا کروں گا کہ تمہاری پیٹھ پر تکبیر و تسبیح کریں گے اور جو کوئی گھوڑے کی پیٹھ پر تکبیر یا تسبیح کرے گا اور اس کی آواز وہ سنے گا وہ بھی اسی طرح کرے گا..... الخ"[1]

"..... اور جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تمام اشیا اور حیوانات کو آدم علیہ السلام کے روبرو حاضر کیا اور فرمایا یا آدم جن چیزوں میں جس کو چاہتا ہو لے۔ حضرت آدم نے گھوڑے کو لیا۔ اس وقت جناب باری نے ارشاد کیا کہ یا آدم جس چیز کو تم نے پسند کیا اس سے تیرے اور تیری فرزند کی عزت ہے اور یہ تیرے فرزندوں کے پاس رہیں گے......"[2]

گھوڑوں کی وجہ تخلیق بیان کرنے کے بعد گھوڑوں کی اقسام، تعریف اور خصوصیات بالتفصیل بیان کی گئی ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر نے دنیا میں مختلف رنگ و روپ اور نسل کے گھوڑے پیدا کئے جو حضرت آدم کی اولاد کے لئے بے حد کارآمد ہیں۔ اور وفادار ہیں۔ بعض گھوڑے مالک کے لئے اقبال مند ہوتے ہیں۔ بعض صرف جنگ

---

[1] کتاب ہذا ص ۲۰۷ [2] ص ۲۰۸

اور معرکہ آرائیوں کے لئے ہوتے ہیں۔ بعض اتنے منحوس ہوتے ہیں کہ اپنے آقاؤں کی شان و شوکت اور آن بان کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوتے ہیں۔ مولف نے گھوڑوں کے خوش قسمت، منحوس یا مفید یا مضر رساں ہونے کی پہچان ان کے ایال بتائے ہیں۔

اس بیان میں مختلف اقسام کے چھ گھوڑوں کے پنسل اسکیچ (لکیری خاکے) بھی دئے گئے ہیں۔ ان خاکوں میں مختلف رنگ کی پنسلوں سے رنگ آمیزی بھی کی گئی ہے۔ پنسل کی بنی ہوئی تصویریں فنکارانہ ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اشک کے لئے یہ تصویریں کالج کے یورپین آرٹسٹوں نے بنائی ہیں، اس میں گھوڑوں کی متعدد بیماریوں اور ان کے علاج کے بھی طریقے مفصل لکھے گئے ہیں۔

گھوڑوں کی فضیلت اور اقسام کا بیان ظاہراً تو خشک نظر آتا ہے، اور طویل بھی ہے لیکن اشک کے جاندار انداز بیان اور آسان اسلوب نے ان میں بلا کا زور بھر دیا ہے، اور پورا باب بے حد دلچسپ ہو گیا ہے۔ اور پڑھتے وقت کسی قسم کی جھنجھلاہٹ یا اُب نہیں ہوتی۔

نامہ بر اور تحفہ بھیجنے کا باب بھی خاصا دلچسپ اور موثر ہے۔ اس باب کی کہانیوں میں بتایا گیا ہے کہ حکمرانوں کو احتیاط سے نامہ بر اور قاصد کا انتخاب کرنا چاہئے۔ ذی ہوش اور باشعور نامہ بر اپنے مالک کے مشکل سے مشکل کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا ہے۔ اس میں ایک حکایت طارخ کی ہے۔ جو حضرت علیؓ کی طرف سے پیغام لیکر حضرت معاویہ کے پاس جاتا ہے۔ حضرت معاویہ کا بیٹا فاسق یزید اسے زک دینے اور ذلیل کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتا ہے۔ لیکن طارخ اپنی ذہانت سے پانسہ اپنے اور حضرت علیؓ کے حق میں پلٹ دیتا ہے۔ اور معاویہ اور یزید دونوں ہی ذلیل ہوتے ہیں ــــــ،

حصول تعلیم کے متعلق بھی بڑی جاندار حکایت بیان کی گئی ہے۔ اور لوگوں کو کہا گیا ہے کہ حصول علم میں کبھی کوتاہی نہیں برتنی چاہئے، خیرات، زکوٰۃ میں بے پروائی نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ انسان کی نجات کی سیڑھیاں ہیں:

"پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب فرزند آدم دنیا سے رحلت کرتا ہے تمام اعمال خیر اور نیکیوں کے منقطع ہو جاتے ہیں۔ مگر تین چیز۔ ایک یہ کہ واسطے مسلمانوں کے خیرات و تعف جو اس نے مقرر کیا ہے کہ بعد اس کے بھی جاری ہے۔ دوسرے علم و تصنیف کہ لوگ پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں کہ ثواب اس کو ہو یا فرزند اہل ہو کہ بعد اس کے دعائے مغفرت کرے جو کہ حلال ہے۔ حساب اس کا قیامت میں لیں گے اور جو کہ حرام ہے عذاب کریں گے، لازم ہے کہ بدکام سے پرہیز کرے کہ اس کا مواخذہ قیامت میں ہووے گا۔" [۵]

اس طرح ہر باب کے متعلق ناصحانہ حکایات درج ہیں۔ جاسوس بھیجنے، افواج کی صف آرائی اور شب خون مارنے کے متعلق بے حد مفید اور جنگی نقطۂ نظر کارآمد باتیں ان کہانیوں میں ملتی ہیں۔

---

[۵] دیکھئے قلمی نسخہ ص ۴۴۹۔

منتخب الفواید کی آخری حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے، حضرت موسیٰ کو پیغمبری اور خدا کی تجلّی ان کی سادہ لوحی اور معصومیت کی وجہ سے ملی تھی۔ جب پہلی بار انہیں یہ معلوم ہوا کہ خدا نے اپنے کروڑوں بندوں میں سے ان کو ہی اپنا قاصد اور پیغمبر مقرر کیا ہے تو وہ حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈوب گئے تھے اور کوہِ طور پر بیٹھے مناجات کرتے تھے۔ اور دریافت کرتے تھے کہ اے معبود تجھے میرا کون سا عمل پسند آیا جو پیغمبری عطا ہوئی۔

"حضرت موسیٰ نے کوہ سینا پر مناجات کی اور اپنی درخواست کے بعد عرض کیا، بار خدایا بندۂ موسیٰ سوال رکھتا ہے اور چاہتا ہے پوچھے لیکن شرم میں غرق ہے، فرمان آیا، موسیٰ جو پوچھتا ہے مجھ سے پوچھ جو مانگتا ہے مانگ۔ کہا بار خدایا تیرے موسیٰ سے کون سا عمل ایسا سرزد ہوا اور طاعت کی کہ پیغمبر کیا، اور شرف رسالت ومکالمت کا عنایت فرمایا۔ آواز آئی یا موسیٰ یاد ہوگا کہ ایک وقت تو بکریاں شعیب کی چرا رہا تھا، اور پھرتے وقت چھوٹے بچے بکریوں کے اپنی ماں سے جدا ہو کر پیچھے رہ گئے تھے تو نے آواز دی تھی کہ آ کر اپنی ماؤں سے ملیں، وہ اس آواز سے ڈرے اور دشت کی طرف بھاگے تو ان کے پیچھے دوڑا، اس طرح تو نے ان کو پکڑا کہ ہرگز ان کو اپنا پکڑنا معلوم نہ ہوا اور تو نے (انہیں) پیار کیا اور کہا کہ اے بچو تم اپنے تئیں اور مجھے ماندہ کیا۔ مانند بے رحم گڈریوں کے ان کو نہ مارا، اسی سبب میں نے یہ کرامت ارزانی فرمائی۔ پس جناب باری نے بکلام وزبان فرمایا، اے موسیٰ سُن قسم ہے مجھے اپنے عزّ وجلال کی اگر تو اس پیر سے پاؤں آگے بڑھاتا اور پل پر پہلے جاتا اور اس کی حرمت نہ کرتا پیغمبروں میں سے تیرا نام نکال ڈالتا حضرت موسیٰ اس بات سے کانپ گئے، آواز آئی بڑوں کی بڑی حرمت کر اگرچہ وہ کافر ہو، لازم ہے کہ بادشاہ و وزیر اور سپہ سالاران لشکر بلکہ تمام خلائق اس پر عمل کرے (کریں) کہ نیک بختی اور ادب حاصل ہو۔[1]

خلیل علی خاں کی یہ مفید اور کار آمد کتاب اس حکایت پر ختم ہوتی ہے۔ یہ ضخیم وحجیم ہونے کے باوجود یہ عمدہ اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ خلیل کی منتخب الفوائد شائع ہوجاتی تو اردو کے کلاسیکی ادب میں کلیلہ ودمنہ (خرد افروز) اخلاق ہندی (ہتوپدیش) گلستان، بوستان (سعدیؒ) اور بہارستان جامی سے اس کی افادیت اور اہمیت ہرگز کم نہ ہوتی، منتخب الفوائد بھی گلستان بوستان اور خرد افروز کے ڈھنگ پر لکھی گئی ہے، لیکن اس پیران کی کتابوں کی بہ نسبت مذہبی رنگ زیادہ گہرا اور نمایاں ہے، اور اس کے ہر باب کی ہر حکایت ناصحانہ ہونے کے ساتھ

---

[1] دیکھئے ق، ن، ص ۶۵۵

حضرت پیغمبرؐ خلفائے راشدین یا اصحاب سے عبارت ہے، مذہبی اور اخلاقی پند و نصائح کے علاوہ فرماں رواؤں کے ضوابط نظم و نسق، طریق انصاف اور انداز جہانداری اس کتاب کی افادیت اور اہمیت کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ خلیل علی خاں کا یہ عظیم کارنامہ بھی اس کی دوسری مفید اور جان دار تالیفات واقعات اکبری اور انتخاب سلطانیہ اردو کی طرح چھپ کر منظر عام پر نہ آسکا۔ یہ کتاب چھپ جاتی تو لوگوں میں مقبول بھی ہوتی اور ساتھ ساتھ اردو ادب کے سرمایہ میں ایک قیمتی جواہر کا اضافہ ہوتا۔ اشک کی منتخب الفواید ۶۵۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور سائز ۷ × ۹ ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کا یہ خطی نسخہ، جو ہمارے سامنے ہے، کسی کم تعلیم یافتہ کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بہت ساری غلطیاں ہیں، لفظ کے املے تک غلط لکھے گئے ہیں۔ انصرام کو انسرام لکھا گیا ہے، اسباب کو ہر جگہ واحد اور نے کا بھی استعمال کہیں کہیں غلط ہوا ہے۔ اس کتاب کی زبان گو سیدھی سادی اور عام فہم ہے۔ لیکن باغ و بہار سے لگا نہیں کھاتی، کہیں کہیں عبارتیں مبہم اور پیچیدہ لکھی گئی ہیں۔ اور جملوں کی تعقید کی وجہ سے سلاست کے ساتھ مطلب کا بھی خون ہو کر رہ گیا ہے۔ زبان اور انداز بیان کی ان بعض خامیوں اور کوتاہیوں سے قطع نظر خلیل علی خاں اشک کی یہ نایاب تالیف قدیم اردو ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے، اور اسے اردو ادب کی خوش قسمتی یا اتفاق زمانہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کا کم سے کم ایک غیر مطبوعہ نسخہ تو دست برد زمانہ سے بچ رہا ہے۔

سخاوت مرزا

شاہ عبدالقادر کرنولی کا ارشاد نامہ

حضرت شاہ فی الحال قادریؒ کرنول علاقہ آندھرا کے مشہور بزرگ تھے اور صوفی شاعر تھے۔ دکنی ادب میں آپ کی کئی تصانیف یادگار ہیں۔ آپ کے دکنی دیوان اور چکی نامہ و شادی نامہ وغیرہ کے متعلق میرا ایک تفصیلی مضمون رسالہ اردو پاکستان ۱۹۵۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

آپ کے حالات کسی تذکرہ میں ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ البتہ بعض کتابوں میں کچھ حوالے ملتے ہیں۔ مولف شرف الانساب نے آپ کو فاروقی از اولاد حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر لکھا ہے۔ مگر آپ نے ایک شعر میں خود کو سید ہونا بیان کیا ہے۔ مولف خزانہ رسول خانی نے اپنی ایک تالیف خزانہ فیض میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب سے میری ملاقات کرنول میں ہوئی تھی اور اسی کتاب کے حاشیے پر کرنول کے بعض صوفیا کرام کے تاریخہائے وفات بھی درج ہیں۔ جن میں شاہ فی الحال کا قطعہ وفات بھی ہے جو یہ ہے ؂

بود فی الحال شاہ و کرنول۔ رفتہ بجولیش کرد خویش (قبولہ)

سال درویش قادری گفتہ۔ گفت ہاتف کہ "یافت جائے بہشت"

۱۲۱۲ھ

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے ۱۲۱۲ھ میں وفات پائی اور نواب ہمت بہادر خاں متوفی ۱۱۶۵ھ اور نواب رن مست خاں ۱۱۶۵ھ ـ ۱۲۰۶ھ اور نواب الف خاں ثانی کے اوائل عہد میں واصل بحق ہوئے۔ آپ شاہ میر قدرت اللہ عرف شاہ کنکال کے مرید و خلیفہ اور سید شاہ کمال الدین بخاری (۱۲۲۴ھ) صاحب العرفان کے معاصر تھے۔ آپ کے صاحبزادے شاہ قدرت اللہ عرف شاہ فی الفور بھی بڑے صاحب دل اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔

ہم یہاں آپ کی ایک اور تصنیف ارشاد نامہ "مخطوطہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ" سے روشناس کراتے ہیں جو تصوف کے اسرار و معارف سے مملو ہے۔ اور بڑے پایہ کی ہے جس کو کچھ صوفیا ہی کما حقہ سمجھ سکتے ہیں۔ ہم نے حاشیہ میں کچھ اصطلاحات و الفاظ کی صراحت بھی کر دی ہے۔ آپ کی زبان دکنی ہے۔ دکنی اصطلاحات، محاورے اور روزمرہ پر مبنی ہے۔ اور یہ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل کی ایک صوفیا

مختصر مثنوی ہے۔ اور دلچسپ ہے۔ اس کا کوئی اور نسخہ نظر سے نہیں گزرا۔ اس لئے یہ پوری مثنوی ہدیۂ قارئین کی جاتی ہے۔ جو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی عنایت سے موصول ہوئی تھی۔

المعروف بہ

ارشادنامہ شاہ عبدالقادر فی الحال قادری قدس سرہٗ

اوراق ۲۔ تقطیع ۶ × ۸ مسطر ۱۱۔ جملہ اشعار ۔ یہ تصوف کی لطیف مثنوی ہے جس میں ایک عجیب دلکش انداز میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث قدسی کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق کی ترجمانی فرمائی ہے۔ ہم یہاں معہ لغات دکھنی (بعض خاص توضیحات کے ساتھ اس مختصر کو بیاں زیب قرطاس کرتے ہیں:۔

چکنی رین[1] کی نپٹ گھال گھول سو یاں[2] پوت ظلمت کی لیتی بٹول
ادک چھند[3] بھری چلبلی نار راد یکایک پکاری سویاں پوت لیو
اندھارا[4] اتھا سو اوجالا ہوا اسی پوت کا جوت مالا ہوا
تلک ایک سپاہی[5] صبح کا نکل ستیا اوس کوں مغرب کے دریں جبکل
فلک پر چڑیا جب علم عین[6] کا کیا راج یاراں چندر سین کا

---

[1] چکنی رین کی ۔ رات کی چلبلی البیلی، مراد معشوق حقیقی، جو ظلمات در ظلمات (بحر ظلمات) یعنی مرتبہ غیب الغیب میں تھی جہاں خود کو خود کی خبر نہ تھی۔ نہ آسمان تھا نہ تارے، نہ زمین۔ نہ جماد نہ نبات نہ جن و انسان (کسی کا وجود نہ تھا۔ اس اندھیری رات میں، ایک سویاں پوت والی، کی طرح دکن میں بعض تلنگنیں ایک بڑے گدڑی نما تھیلے میں تمام منہیار کا سامان، سوئیاں پوت، صابن آئینے، لیس، اسنو، ظروف چینی، چائے کے سٹ، کھلونے وغیرہ لیکر نکلتی ہیں۔ اور ایک خاص انداز خراماں خراماں، عجیب ترنم آواز سے پکارتی ہوئی نکلتی ہیں۔ یعنی اردو زبان میں اس طرح ایک دلکش صدا لگاتی ہیں " سوئیاں پھوٹیاں ودٹیاں لیو" جو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے، شاد صاحب نے وہی خاص تشبیہ سے یہاں کام لیا ہے۔ جو ملکی اور انوکھی ہے۔ سوئی پوت والی کا تھیلا گو یا مختلف چیزوں کا ایک خزانہ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ شاہد حقیقی جب اپنے ظہور کا مشتاق ہوا تو اس نے اپنے ظہور کے لئے اس بحر ظلمات میں سے اپنے گوناگوں حقائق عالم کو ٹٹورا۔ اور پہلے انا خودی کا احساس پکار کہ " میں ہوں " تو وہیں تو کا ظہور ہوگیا [2] روک بیعد [3] چھند بھری عیار و مکار، پُر فن، چلبلی شوخ معشوق نے یکایک آواز لگائی، کہ سو کوئی سوئیاں اور پوت لینے والا ہے یعنی میرا خریدار ہے؟ بقول حضرت عطار ؒ ؎

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہوا[1] سلطان عالم کا جب آفتاب　　ستاراں کے فوجوں کوں دینے جواب
بجے[2] نوبتاں شاہ کے جو کدھن　　چھنا چھن، چھنا چھن، چھنا چھن چھن
علی اللہ علی اللہ علی اللہ عللل ؟　　کہ سبحان حی الذی لم یزل
ہوئی حاملہ جب رین حبشنی　　بوقت صبح طفل رومی جنی
کہ دیسے میں اک مرد درویش آ　　کھڑا در پہ سلطان کے کہ ندا
کہا بایزید گھر سوں تو باہر (بہار؟) آ　　کہ کر فیض باطن کا منجہ پر ندا ؟[5]
کہے بایزید[6] مرکو چالیس سال　　ہوئے اے جواں شور مت کراتاں
اول جو میں تھا جاہل اجنبی　　نبی میں[9] فنا ہو، ہوا ہوں نبی
کہ ای شیخ[8] نی تو میکا ان نبی　　نبی چھموں میں دیکھا ہوں ذات آپنی
فنا فی اللہ ہو کر بقا باللہ ہو　　بھی مرکر جیتا ہوں ارے نیک خو
ہوا ہوں میں چار[11] منازل میں مکیں　　اپس[12] نفس قاتل ؟ کا قاتل ہوں میں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

عطارؒ[3] حق تعالیٰ چوں بے عبارت و حرف　　با عدم گفت نکتہائے شگرف

جامیؒ[3] عدم آمد ز ذوق آں سخناں　　بفضائے وجود رقص کناں

[4] یعنی لفظ کن سے کائنات وجود پذیر ہو گئی۔ پوت سے مراد تجلی ظاہری کے جگمگاتے موتی کا اجالا۔ [5] سیاہی صبح سے مراد حقیقت محمد [6] عین کا علم سے مراد وحدت کا مرتبہ انا مشہود۔ نور و وجود، یہ سب استعارے تصرف کا

---

[1] جب آفتاب طلوع ہوا تو ستارے غایب ہو گئے [2] آفتاب عالم تاب کی شہنشاہیت کی نوبت بجنے لگی [3] رین و رات کو حبشن سے تشبیہ دی ہے۔ [4] طفل رومی ہے مراد آفتاب سارڈ کا۔ [5] سلطان سے مراد سلطان بایزید کو تو مرکر چالیس سال ہو گئے تو کیوں شور مچاتا ہے اور بایزید کو زندہ سمجھ کر یہ شور مچاتا ہے۔ [6] میں اب بایزید کہاں ہوں میں تو فنا فی النبی والرسول ہو چکا۔ معلوم ہوا کہ تھانہ بھون کے ایک مشہور بزرگ نے نیز شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے اسی طرح حالت وجد میں ادعا کیا تھا [8] صوفیائے کرام کے پاس ایک حدیث چلی آتی ہے۔ الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ۔ [9] یعنی نبی میں فنا ہو کر نبی آنکھ سے حق کو دیکھا ہوں۔

[10] وزن ٹوٹتا ہے [11] پہلے مصرع کی توضیح ہے [12] چار منازل، ناسوت، ملکوت، جبروت و لاہوت کا مکین ہوں۔ [13] اور اپنے نفس کا قاتل ہوں، یا اپنے نفس جلاد کا قاتل ہوں ؟

کیا مردہ باتاں کیا ہوں سو میں   نہ دیکھا جہاں میں ، سنیا ہوں نہ میں
نکل بھار آ، گھر سوں اے پاک ذات   مری داد دے کر تو کر با مراد
اسی وقت سلطان باہر نکل   کھڑے آکے درویش کے اوا گل
جو یہ بھید پایا سو حق (کا) مرید   وگرنیں تو شیطان کا زر خرید
کیا آ ، نہیں میرے مرشد کو دیکے انیں خبر   جو باتا کتے تم اے عالی گہر
کہے او نھیں سے پیر تو نیں مرید   تو ہے صرف نادان او دیو پلید
تب اس راز حق کے دیئے سب خبر   کہے بایزید اے پسر سربسر
جو باطن ہوا ہے او ظاہر ہے او   جو ناظر ہوا ہے سو حاضر ہے او
خدا کوں ہے صورت نہیں بہی کسے   یہی شکل اللہ تیرا گھر بسے
جو خال صحیح ہے سو حال صحیح   یہی راز ایاں اے مرد صح (صحیح؟)
خدا ہے فنا ہور دنیاں فنا   شرابا طورا کو پیتے رہنا
خدا ہے بقا ہور دنیاں بقا   بقا میں بقا جب محیط ہو رہا
بقا کو فنا بولنا ہے خطا   یہی عقل کل ہے یو بھید اں سدا
خدا مت مرد کر کہا ہے ہمن   ہمیں چپ مریں کیوں جو ہوے وطن

۱؎ یہ عجیب و غریب معاملہ ہے؟ کیسے مردہ بھی باتیں کرتا ہے ۲؎ اگل = روبرو۔ آگے ۳؎ اوس سنے۔ ۴؎ فرمایا کہ نہ تو وہ پیر (کامل ہے) اور نہ تو مرید، ۵؎ ظاہر و باطن حاضر و ناظر سب حق ہی ہے۔ ۶؎ خدا کو صورت ہے اور کسی اور کو نہیں؟ بقول ان اللہ خلق آدم علی صورتہ۔ امیر مینائی ؎ یہ جو صورت ہے تری صورت جاناں ہے یہی۔ صورت سے مراد صفت اسم ظاہر یعنی وہ صورت سے پاک ہے اور پھر ہر صورت سے ظاہر ہے ۷؎ خال (دکنی) قال کی خرابی، دکنی قاف کو خ بولتے ہیں۔ جیسے پنجابی قاف کو کاف قال صحیح ایک اصطلاح ہے۔ یعنی معرفت کی باتیں جس کے سننے ہی سے ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ۸؎ مراد مرتبۂ غیب الغیب، فناء الفنا۔ کنہ ذات کا مرتبہ ہے جس کا ادراک ناممکن ہے۔ خود کی خود کو خبر نہیں اور دنیا بھی فنا یعنی حادث ہے مگر اس فنا اور اس فنا میں زمین کا فرق ہے۔ ۹؎ بظاہر عجیب و غریب بات فرمائی ہے کہ خدا کو بھی بقا اور بندہ کو بھی؟ مگر دراصل شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے دنیا کو بلحاظ معلومات الٰہی باقی کہا ہے۔ بقول الاعیان ثابتۃ۔ ۱۰؎ بقا یعنی عالم کو مسلوب العلم نہیں کہہ سکتے؟ ۱۱؎ ہمارا وطن تو عالم غیب ہے۔ بقول مولانا روم ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند   از جدائی ہا شکایت می کند

۱۲؎ بقول اقبال ؎ ابھرتا ہے مرمر کے نقش حیات۔ یا بقول

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام   ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

وطن[1] ہے ہمارا سو ذات خدا — ہمیں کیوں رہیں گھر سے اپنے جُدا
نہیں موت ہر شی کوں[2] ہمنا کہاں — ہمیں خوش رہیں گے یہاں اور وہاں
جہاں سب ہے مطلق ہے مظہر[3] تمام — نہیں موت ہر شئے[3] کوں اے نیک نام
یہ سلطاں اوسکوں نصیحت کئے — شراباً طہورے کا خم[4] بھر دے (کذا)
جو کوئی غوث کے گھر کا بندہ ہوا — دنیا دین میں سچ او زندا ہوا
جو حفظ مراتب کا ہے آشنا — وہی پیر ہے کل جہاں کا سیاہ[5]؟
خدا ایک ہے، اے مدارج تمام — کہے بایزید اس کوں سن اے غلام
دنیاں ہے بقا اس میں نیں کوئی موا — یو تحقیق کر پیر کن[6] جلد آ[7]؟
جو کوئی قدرت[8] اللہ کا ہیگا مرید — وہی اس زمانے کا ہیگا مرید
جو ارشاد نامہ کہا سو تمام — ہوا حال فی الحال[9] بس والسلام

نوٹ:- پہلے صفحہ کی پیشانی پر یہ عبارت ہے۔ "من تصنیف قدرت اللہ شاہ"؟ یقیناً غلط ہے۔

---

[1] ہمارا وطن تو عالم غیب ہے۔ بقول مولانا روم رح ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　از جدائی ہا شکایت می کند

[2] بقول اقبال ؒ

ابھرتا ہے مرمر کے نقش حیات

یا بقول

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام　　ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

[3] بقول صوفیاء کرام ہر شئے مظہر اتم ہے ورنہ تجزی لازم آئے گی۔

[4] مراد تجدد امثال ہا عہ قم (دکنی)، خُم (گھڑا) مصنف

[5] سیاہ = سیاح۔ جہانگشت، جہاندیدہ۔

[6] کن = پاس

[7] آ،　　[8] شاہ قدرت اللہ مرشد

[9] فی الحال، شاہ عبدالقادر المعروف بہ شاہ فی الحال۔ کرنولی (دکن)، تفصیل کے لئے ملاحظہ: میرا مضمون مندرجہ رسالۂ اردو کراچی نمبر ۶۔ ۱۹۵۹ء

[10] موتوا قبل ان تموتو سے ہے جس سے بقاء و دوام حاصل ہو جاتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رح نے اسی موت سے بحث کی ہے۔ جس کو سیدھے سادے اشعار میں شاہ صاحب نے بیان فرمایا ہے۔

قاضی معراج دھول پوری

بیخود بدایونی کی رام کہانی

بیخود اور راقم سطور کی زبانی

بیخود بدایونی کا پورا نام عبدالحیٔ تھا۔ ۱۷ محرم ۱۲۷۴ھ مطابق ۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اپنے قدیم وطن بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آپ کی نسبت پدری حضرت قاسم ابن محمدؒ کے واسطے سے حضرت امیرالمومنین ابی بکر الصدیقؓ پر منتہی ہوتی ہے۔ اور سلسلۂ مادری عم النبی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر۔ آپ مذہباً سنی وحنفی اور مشرباً قادری وچشتی ہیں۔

والدۂ بیخود کا انتقال اُن کی ولادت کے وقت ہی ہوچکا تھا۔ پرورش وتربیت کا بار اُن کے والد مولوی غلام سرور کے دوش پر رہا جو ہر طرح ان کی راحت ومسرت کو اپنے آسائش وآرام پر مقدم سمجھتے رہے۔ نیز جنھوں نے ان کو فارسی عربی پڑھانے کے لئے بڑی بڑی تنخواہوں پر معلم و استاد رکھے اور بڑے ناز ونعم سے ان کو پالا پوسا۔

عبدالحیٔ بیخود بدایونی کو قدرت کی جانب سے "آنکھیں حسن طلب، دل درد آشنا، طبیعت نزاکت پسند اور مزاج آزادی کا جو" مرحمت ہوا تھا چنانچہ "کسی علم وفن کی تحصیل تکمیل کو نہ پہنچی" بالآخر "بغیر پڑھے لکھے نام کا مولوی بن کر پڑھنے لکھنے کو خیرباد کہا" نیز آئندہ بھی زندگی کی راہوں میں یہ خصوصیات اکثر حائل رہیں۔

"نسبت ازلی اور قدرتی لگاؤ نے (ان کو) چودہ پندرہ برس کی عمر میں دیوانوں کا دیوانہ بنادیا" شعر کہنے لگے اور تھوڑے ہی عرصہ میں کلام کا ایک بڑا ذخیرہ مجتمع کرلیا۔ خود ہی منتخب ومصلح کی حیثیت سے

لہ۔ پیام یار لکھنؤ ۱۸۹۳ء و ۱۸۹۴ء کی فائل کے بعض شماروں میں بیخود بدایونی کی غزلیات شائع ہوئی ہیں۔ عنوان میں نام کے ساتھ ان میں کہیں کہیں لفظ "محمد" بھی شامل ہے۔

سلہ۔ واوین کے اندر کی عبارات اور الفاظ بیخود کے خودنوشت حالات مشمولۂ دیوان سے ماخوذ ہیں۔

اپنے اشعار میں حک و اصلاح کا کام بھی انجام دیتے رہے۔ اس وقت کے خیالات کا اندازہ اس وقت کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے جن کو بیخود نے خود بسلسلۂ حالات قلم بند کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

ہو چکی کیسی رسوائی مری — شہرہ ہے ہنگامہ آرائی مری
وحشیاں دہر کا سرخیل ہوں — خانہ بربادی میں شک سیل ہوں
بیوفا میری وفا کے ہیں گواہ — فتنہ گر طرز ستم کے داد خواہ
ابتدا سے جان پر کھیلا کیا — ہائے مجھ ناکام نے کیا کیا کیا
تھک کے بیٹھا ناز اٹھاتا ہی رہا — چپکے چپکے غل مچاتا ہی رہا
جا بجا قصہ مرا مشہور ہے — اہل وجد و حال تک مذکور ہے
دے گئیں نام اس قدر بدنامیاں — کام کی نکلیں مری ناکامیاں

منقولِ الصدر اشعار دیوان کے متن سے خارج ہیں۔ 'کھیلا کیا'، 'کیا کیا کیا' کی زمین میں ایک غزل شامل دیوان ہے مگر اس میں اوپر نقل کردہ مطلع درج نہیں۔ گویا اس زمانے کا ایک شعر بھی بیخود نے مطبوعہ دیوان میں نہیں رکھا۔ اندراج اشعار کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس لاابالی خرامی و بے باک روی کی بدولت شعر گوئی کا شوق آزار بن کر رہ گیا اور جتنا یہ آزار مزمن ہوتا گیا اتنا ہی اس سے چھٹکارا پانا غیر ممکن چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزلیات و ہفوات کا ایک ذخیرہ فراہم ہو گیا"۔ اسی دوران میں ایک مجلس عزا میں شریک ہونے کا آپ کو موقع ملا جس میں میر یاد علی نام ایک لکھنوی ذاکر نے میر انیس کا مرثیہ پڑھا جو فصاحت و بلاغت کی جان تھا۔ اس نے بیخود کو مرثیہ گوئی کی طرف مائل کر دیا۔ میر صاحب کے مرثیئے میں دہلی کی زبان پر افتخار کیا گیا تھا جس سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو "بناوٹ پر سادگی کو، آورد پر آمد کو، لفاظی پر چیزے دگر کو، واہ واہ پر آہ کو، ترجیح دینا پڑی جو اکثر اساتذۂ دہلی کا حصہ رہا ہے۔"

"الحاصل میر یاد علی صاحب کی مرثیہ خوانی نے بیخود کو مرثیہ خواں بنایا اور میر انیس صاحب مرحوم کی بالطبع تحریک اساتذۂ دہلی سے تلمذ حاصل کرنے" کے شوق کا باعث بنی۔ مگر اب یہ تردد دامن گیر حال ہوا کہ حضرات دہلی میں سے کس کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا جائے۔ "زخم خوردہ دل نے حضرت مجروح کی طرف مائل کیا۔ جذب کلام نے مجذوبانہ حضرت سالک کی جانب کھینچا، حضرت حالی کے حالیہ اشعار نے اشارہ کیا کہ قال کو حال کا رنگ دینا چاہو تو ادھر متوجہ ہو۔ فصیح الکلام بہادر حضرت داغ کی معجز بیانی و گرمیٔ کلام نے ایما کیا کہ اگر شعر کے ذریعہ سرد مہروں کے دلوں میں آگ لگانی مدنظر ہو تو اس طرف آؤ"۔ ابھی یہ مسئلہ کہ شاگردی کس کی اختیار کی جائے زیر غور ہی تھا کہ بیخود کے خالہ زاد بھائی قاضی حافظ حاجی محمد عنایت حسین نواب محمد علی خاں صاحب بہادر والیٔ ٹونک کی معیت میں لاہور گئے۔ وہاں سے واپسی پر اپنے خالو یعنی والد بیخود سے ملنے کے لئے سہارنپور میں قیام کیا اور بیخود کی موجودگی میں ان کے بڑے بھائی سے حالی کی ملاقات کا تذکرہ بھی

فرمایا۔ نیز مولانا کے مندرجہ ذیل اشعار سنائے ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　　اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی　　　دل ہی نہ چاہے جب تو زباں میں اثر کہاں
حسن یہ مرے ہیں قمر ہے بتا ہی کچھ اور　　　تم سے جہاں میں لاکھ سہی تم مگر کہاں[۱]

ولہ ایضاً

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　　　وقت آیا مری رسوائی کا
آپ نے کس لئے پہلو بدلا　　　کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا　　　کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا[۲]

مولانا کے منقول الصدر اشعار سے بیخود نے خصوصی اثر لیا اور وہ حلقۂ تلامذۂ حالی میں داخل ہو گئے۔ لکھتے ہیں کہ "ہائے حسنِ کلام بھی کیا چیز ہے کہ مدتیں گزر گئیں، زمانہ بدل گیا، ہزاروں واقعات نسیاً منسیاً ہو گئے مگر وہ چند شعر نہیں بھولتے جنھوں نے بیخود تشنۂ مذاقِ سخن کو بیخودی کے درجے سے متجاوز کر کے حضرتِ ممدوح کے تلامذہ میں داخل کیا تھا"

"حصولِ تلمذ کے بعد" جیسا کہ وہ خود رقمطراز ہیں "بیخود بے پرواخرام برسوں غزل گوئی میں مصروف اور ان مشاغل میں مشغول رہا جو عاشقانہ کلام کی بدولت یا ابتدائے شباب کے طفیل میں درپیش و مہیا ہو جاتے ہیں اور جن کی تفصیل اب ممکن و مناسب نہیں معلوم ہوتی" بالآخر "شفیق باپ نے جب یہ رنگ دیکھے تو ذلت تمام و کوشش تمام تردداتِ خانہ داری میں مبتلا کر دینا اس کے مرض آزادہ خرامی و بیراہ روی کا علاج سمجھا۔ چنانچہ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۰ھ دسنہ ۱۸۷۳ء میں یہ بارِ گراں اس کے سرِ شوریدہ پر رکھا گیا جو کہنے اور دیکھنے کو پھولوں کا ایک خوشنما سہرا تھا مگر جس سے مقصود یہ تھا کہ سر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ اس ابتلا اور انقلاب کی بدولت اس کی طرز و روش اور طبیعت میں بالکل نہیں تو بہت کچھ فرق ضرور آ گیا۔"

"متاہل ہونے کے بعد جب ذرا از خود رفتگی کی رفتار کمی پر آئی" تو اعزاز و معاش پیدا کرنے کی ضرورت

---

[۱] یہ پوری غزل نو اشعار پر مشتمل ہے اور مولانا کے کلامِ قدیم سے متعلق ہے۔ صاحب خمخانۂ جاوید نے پوری غزل انتخاباً نقل کی ہے۔ دیوان میں دوسرے شعر کا مصرعۂ ثانی "دل چاہتا نہ ہو تو زبان میں اثر کہاں" اور تیسرے شعر کا مصرعۂ ثانی "عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں" درج ہے۔ خمخانۂ جاوید میں یہ مصرعے دیوان کے مطابق ہیں۔

[۲] یہ پوری غزل ۱۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور مولانا کے کلامِ قدیم سے متعلق ہے۔ دیوان میں مطلع کے دوسرے مصرع میں "آیا" کی جگہ "پہنچا" مرقوم ہے۔ اور دوسرے شعر کا پہلا مصرع "تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا"

محسوس ہونے لگی۔ اس وقت تک الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کے لئے انگریزی دانی کی شرط نہ تھی لہذا بمدد و توجہ اپنے بھائی مولانا حافظ اعجاز احمد وکیل چھ ماہ میں مشروط الامتحان قوانین یاد کر کے ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں امتحان وکالت پاس کر لیا۔ "وارفتہ مزاج" اور "آزاد طبیعت" پہلے سے تھی ہی پیشہ بھی آزاد ملا، جس کے بہانے سے کئی شہروں اور قصبوں کی ہوا کھائی۔ مگر شاعری کے شوق و بزم عیش و نشاط کے ذوق نے کہیں دل نہاد ہو کر کام نہ کرنے دیا۔ "آخر ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔" تو آنکھیں کھلیں اور طرزِ زندگی کا کلیتاً بدلنا ضرور ہوا لیکن نہ آنکھیں بس میں تھیں نہ دل قابو میں بقول استاذی حضرت حالی مدظلہٗ ؎

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت　　مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا　　عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت "

چنانچہ اسی مصلحت سے سنبھل میں وکالت شروع کی کہ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا قصبہ تھا۔ خیال ہوا کہ "بیقرار دل یہاں" نچلا ہو کر بیٹھے گا" سنبھل ہی کے دوران قیام میں حالی کا "مسدس مد و جزر اسلام"[1] ان کی نظر سے گزرا جس کو مولانا کی "عاشقانہ شاعری کا مقطع یا ترک فرمانے کا اشتہار سمجھنا بے جا نہیں ہے کیونکہ در حقیقت ہوا بھی یہی یعنی اس کے بعد نہ حضرت ممدوح قدیم روش سخن گوئی پر گامزن ہوئے نہ ان کی اصلاح یا ان سے استفادے کا موقع یا شرف آپ کے دلی نیازمند بیخود کو ملا۔ گویا۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

مذکورالصدر واقع کے بعد جس کو بیخود نے "حسرت ناک" کہا ہے۔ "کئی مہینے عجب افسردہ مزاجی اور انتہا کی پژمردہ خیالی میں گزرے مگر حسن اتفاق یا طالع کی یاوری سے انھیں دنوں میں نواب فصیح الملک بہادر مرحوم دہلوی کا پہلا[2] دیوان طبع ہو کر نظر افروز ہوا" نیز داغ کے شاگرد رشید منشی محمد عظمت علی خاں صاحب عظمت رامپوری ایک تقریب کے سلسلے میں سنبھل آئے۔ انہوں نے اپنے استاد کے مفصل حالات گوش گزار کئے کلام سے پہلے ہی بیخود متاثر ہو چکے تھے۔ حال سن کر اور بھی گرویدہ ہو گئے نیز ان کی شاگردی قبول کر لی۔

مولانا قاضی محمد شمس الاسلام صاحب مرحوم بدایونی العباسی بیخود کے حقیقی ماموں تھے اور نواب کلب علی خاں صاحب بہادر والیٔ رامپور کے معتمد مصاحب تھے نیز وہاں تشریف فرما تھے۔ بیخود نے بارہا وہاں پہنچ کر اپنے استاد داغ سے شرفِ ملازمت حاصل کیا۔ اور حضوری میں رہ کر اصلاح بھی لی۔ ان کی طرز و روش دل میں ایسی چبھی کہ سابقہ سارا کلام نظری کر دیا مگر ابھی فیضیاب ہونے کی مہلت کافی نہیں ملی تھی کہ "دل و جان، غارت گر ہوش و خرد، دشمن[3] مستخر سنبھل میں بھی سر اٹھاتے نظر آئے، معاذ اللہ توبہ ؎

---

[1] یہ مسدس ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کی تصنیف ہے اور اسی سال منطبع ہوا ہے۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں مولانا نے اس پر نظر ثانی کر کے ۱۶۱ بندوں پر مشتمل ایک ضمیمے کا اضافہ کیا۔ نیز "قدیم مسدس میں جستہ جستہ تصرف" بھی۔

[2] داغ کا پہلا دیوان "گلزار داغ" ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں پہلی بار "مطبع انوار محمد لکھنؤ" میں چھپا تھا۔

[3] حالا کا جملہ بجنسہٖ نقل کر دیا گیا ہے۔ اصلاً یہ "دشمن دل و جان، غارت گر ہوش خرد" ہوگا جو سہو کتابت سے غالباً کچھ کا کچھ ہو گیا۔

دید کا بھی ہے کیا برا لپکا　　　نہیں رہتی ذرا قرار سے آنکھ"

ناچار ۱۲۹۵ھ میں سنبھل نیز وہاں کے احباب کو خیرباد کہہ کر بخود وطن پہنچے اور بمشورہ احباب چند دنوں شاہجہانپور میں وکالت شروع کر دی جہاں ان کے برادر نسبتی مولوی محمد رضی الدین صاحب بسملؔ بھی وکالت کرتے تھے۔ نیز منشی محمد سجاد حسین صاحب مرحوم مدہوشؔ بدایونی[1] بھی وکیل عدالت ضلع تھے۔ دونوں کی مہر و محبت نے ان کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ شاہجہانپور وطن معلوم ہونے لگا۔ لیکن بایں ہمہ احباب کی زیادتی اور دیگر مشاغل کی وجہ سے شعر گوئی کا موقع زیادہ نہ مل سکا بالآخر وکالت سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اور کسی دیسی ریاست میں ملازمت کرنے کا خیال دامن گیر ہوا۔ چنانچہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں سروہی پہنچے۔ جہاں وہ جوڈیشنل افسر مقرر کر دئے گئے۔ اب آپ کا نیاز مند بجود گل زمین وطن سے ہزاروں حسرتیں لاکھوں ارمان ساتھ لے کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا ؎

کوسوں تک الٹے پاؤں چلا آہ میں غریب　　　جب تک مری نظر سے نہ پنہاں وطن ہوا

احباب کے جلسے، اعزہ کے مجمعے، ہم نواؤں کی باتیں، دلرباؤں کی ملاقاتیں، اچھی اچھی سیریں، پیاری پیاری صورتیں وغیرہ وغیرہ گویا ایک خواب تھا جس کا بڑا حصہ ذہن سے اتر گیا ہو اور کوئی واقعہ یا کوئی بھولی بسری بات دل کو بے چین رکھنے کے لئے یاد رہ جائے و للہ در القائل ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا　　　دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

سروہی میں انجام دہی خدمات سرکاری سے جو وقت بچتا تھا وہ یا تو جدائی وطن پر افسوس کرتے گزرتا یا مشغلۂ شعر گوئی میں بسر ہوتا۔ چنانچہ دیوان بیخود میں جو کلام شامل ہے وہ زیادہ تر اسی زمانے کا ہے۔ تاہم کام کی کثرت یا قلت اطمینان کی وجہ سے اتنا موقع وہاں بھی نہ ملا۔ کہ اس کو استاد کی خدمت میں بھیج دیا جائے اور اصلاح ہو جائے تو ترتیب وار صاف کر لیا جائے۔ لہٰذا مسودوں کا ایک منتشر دفتر مجتمع ہوتا رہا۔ آخر ربیع الاول ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں سروہی سے مستعفی ہو کر بخود جودھپور آ گئے۔ یہاں کچھ ایسا انقلاب دیکھا کہ طبیعت کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "زمانے کی گردش، اسباب و ارباب زمانہ کی بے ثباتی و کم التفاتی جو اب تک قصوں کہانیوں اور شاعرانہ مضامین میں لکھی یا سنی تھی اب آنکھوں دیکھ لی۔"

دو ڈھائی مہینے جودھپور میں امیدواری اور انتظار ایفائے وعدہ کی زحمت اٹھائی جو "قاضی ظہور احمد صاحب ڈپٹی جودھپوری جیسے زکی الطبع، صحیح المذاق، نکتہ رس، معنی شناس کی صحبت، مہمان نوازی اور ایک شرمیلے رسیلے مزاج قاضی زادے میاں قادر بخش صاحب کی زیباحرکاتی کی بدولت ملازمت سے بہتر و خوشتر تھی۔" آخر ماروار اسٹیٹ میں اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کچھ زمانہ گذرنے پر رئیس اور وزیر ریاست پنڈت سکھ دیو پرشاد قدر شناسی سے اختیارات سماعت بھی بڑھا دئے گئے۔ کچھ اطمینان و راحت بھی اور جگہوں کے مقابلے میں میسر آ

---

[1] تلامذۂ غالب میں ان کو غالب کا شاگرد بتایا گیا ہے۔

جتنا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا سب کو یک جا کر کے استاد کی خدمت میں بھیجا۔ اور وہاں سے واپس آنے پر مرآت الخیال دم ۱۸۹۵ء تاریخی نام رکھا۔

مجموعے کی ترتیب کے بعد چونکہ یہ شغلہ لوازم منصبی کی کثرت سے گویا بالکل ترک ہو گیا تھا۔ "بلرہا جی میں آئی کہ اس کو چھپوا کر احباب و ارباب مذاق کے سامنے پیش کر دیا جائے مگر ناچار دل کی دل ہی میں رہ رہ گئی۔ وجہ یہ کہ کبھی منکوحہ سابقہ سے خانہ ویرانی کی پریشانی رہی۔ اور کبھی کیا بلکہ بعد نکاح ثانی ہمیشہ بیماری و تیمارداری کی بدولت خلجان و بے اطمینانی"، غرض "اس الجھیڑے کے ہاتھوں زمانہ کی رفتار ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۰ء تک پہنچ گئی اور بیخود اور اس کا برا بھلا کلام یوں کا یوں ہی پڑا رہا۔ کسی نے نہ جانا وہ کون ہے، کہاں ہے، کسی نے نہ پوچھا کیا ہے، کیسا ہے مگر شکر کہ جس طرح زمانۂ قیام شاہجہانپور۔ وطن میں مکرمی سید کفایت علی صاحب علوی ہاپوڑی تحصیلدار ریاست الور، مخدومی حافظ محمد اسماعیل صاحب مراد آبادی وکیل شاہجہانپور، معظمی مولوی سید حسن صاحب مراد آبادی وکیل ضلع مراد آباد شفیقی و عزیزی مولوی سید عنایت احمد صاحب حیرت بدایونی سپرنٹنڈنٹ پولس ریاست گوالیار، برادر اعز و اکرم مولوی غلام شبیر صاحب حسرت، اخ معظم و اشفاق مجسم مولانا حافظ محمد عبد العلام صاحب مرحوم محوی کے سامنے پیش ہوتا رہا تھا۔ اسی طرح عہد ملازمت سروہی میں مکرم سراپا اکرام سید صغیر حسین خاں صاحب صغیر واسطی البہیروی نواب حیدر علی خاں صاحب حیدر شاہجہانپوری، مولانا حافظ سید محمد حسن صاحب بسمل خیرآبادی سفیر ریاست ٹونک مقیم آبو اور بیخود کے پیارے عزیز یار دوست افتخار الشعراء اعتبار الملک مولوی سید افتخار حسین صاحب مضطر کی حسن شناس نگاہیں اس کی غزلوں پر پڑتی رہیں اور مناسبت و موزونیت قائم رہ گئی۔"

"جودھپور میں بجز قاضی ظہور احمد صاحب کے نہ کوئی ہم نوا تھا نہ کوئی ہم مذاق۔ لیکن کبھی کبھی معظمی و محبی حکیم محمد بہاؤالدین خاں صاحب بہار اور شفیقی نواب عبداللہ خاں مرحوم مطلب تخلص کے جودھپور میں آنے اور ان کے سوا مکرم سراپا کرم منشی نثار حسین صاحب نثار لکھنوی مالک و مہتمم "پیام یار"[1] کے چند مرتبہ تاجرانہ تشریف لانے اور کئی کئی ماہ تک قیام فرمانے سے سخن گوئی کا مشغلہ اور ملکہ قائم رہنے کے سوا تمام مجموعہ انتخابی نقطوں سے بھی مزین ہوتا رہا۔"

"ناظرین ایسے استاد کی اصلاح، اتنے احباب کی صلاح و مشورت پر بھی آپ کے بیخود نے قناعت نہ کی، بلکہ جب آخر مرتبہ رامپور گیا اور محسود الاساتذہ نظیری نظیر جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا تو عدم انطباع کا باعث دریافت فرمانے پر یہی عرض کیا کہ جب تک کوئی نقاد سخن محبت و مروت، خاطر و رعایت سے قطع نظر فرما کر پھیکے اشعار نظری نہ کر دے۔ اس وقت تک اپنا کلام شائع کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

---

[1] پیام یار ۱۸۹۳ء و ۱۹۱۲ء کی فائل کے بعض شماروں میں بیخود کا کلام شائع ہوا ہے۔ عہدے کے لحاظ سے اس وقت وہ "اسسٹنٹ مجسٹریٹ مارواڑ تھے۔"

"الحمد للہ کہ ممدوح الصدر نے اس خیال کو پسند فرمایا ہی نہیں بلکہ یہ محنت بھی گوارا فرمائی اور تقریباً پانچ چھ ماہ کے بعد مجموعۂ کلام ان کے انتخاب سے مشرف ہوکر بذریعہ ڈاک آیا۔ ورنہ بیخود تو اس خیال میں تھا کہ جو شخص بدایوں میں پیدا ہوا، جس نے سہارنپور یا ضلع سہارنپور میں ہوش سنبھالا جس کی عمر کا عمدہ اور بڑا حصہ رنج واندوہ یا علاقہ سروہی وجودھپور کے اہلِ زبان سے سر معزنی کرنے میں بسر ہوگیا وہ بیچارہ شعر کیا کہے گا۔ اور کہے گا تو اس کی بکواس پر کان ہی کون رکھے گا۔"

"غرض اس کم جرأتی اور پست ہمتی کا برا ہو کہ باوجود سالہا سال کی بری بھلی مشق ایسے مسلم الثبوت اور مقبول انام استادِ وقت کی اصلاح ایسے ایسے ماہرانِ فن کے انتخاب، بیسیوں احباب کی تاکید کے نہ آپ کا بیخود صاحبِ دیوان بن سکا نہ کسی رئیس یا ریاست سے کوئی شاعرانہ خطاب یا لقب حاصل کر سکا۔"

"ریاست یا رئیس کا اگر قابو میں لانا مشکل تھا تو زمانے کی دیکھا دیکھی اپنے ہی منہ میاں مٹھو بن کر ابو الکلام یا ابوا... وابوالبیان جیسے القاب کا پچھلا لگا کر اپنے نام یا تخلص کی لفظی یا اعدادی عزت ووقعت بڑھا کر نادان دل کو ابلہ فریبی سے خوش کر لینا تو ممکن تھا مگر آپ کا دون حوصلہ بیخود یہ بھی نہ کر سکا بلکہ اس سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ ادھر ادھر سے چند نومشق مبتدیوں، وہ یہ بھی نہ سہی تو ملازمت و پرورش کے امیدواروں کو گھیر گھار کر نام کا استاد بن بیٹھے یا اپنے شوق نہیں تو بعض احباب ومالکان مطابع کی تاکید واصرار سے بالالتزام کسی اخبار یا رسالے میں تھوڑی بہت غزلیات بھیج کر اپنی شہرت یا تشہیر کا سامان فراہم کرتا رہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ جب او اشناس اور حسن پسند آنکھوں نے مشاہیر اساتذہ کے کلام کو انتخاب کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا تو قوت منفعلہ نے پھر چٹکی زنی کی کہ تیرے کلام پر جو انتخابی صاد ہوئے اور تعریف کے ڈونگرے جو بعض موقعوں پر برس گئے ہیں، کیا وہ رعایت ومحبت سے کلیتاً خالی ہوں گے۔

"ناظرین سچ عرض کرتا ہوں کہ اس خیال کا آنا تھا اور برسوں کے جمع کردہ سرمایہ کا بڑا حصہ تلف ہو جانا ؎

نازک خیالیوں میں سبک سب ہیں ہم ہوئے　　جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے

غرض اس دھن میں نصف سے زیادہ اشعار کو پھیکا سمجھ کر نظری کر دیا اور باقی کو اہلِ مذاق و ندیم احباب کے واسطے رہنے دیا با ایں ہمہ ایک زمانہ گزر گیا مگر اس کو بالترتیب اور بعد الطباع پبلک کے سامنے پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ جب کسی عزیز یا دوست نے اصرار کیا تو کوئی نہ کوئی عذر کر کے ٹالتا ہی رہا۔ مگر بقول افتخار الشعراء مضطر ؎ یہ سچ کہا ہے کہ ہونی ضرور ہو کے رہے ہے۔ یعنی اگرچہ اب بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے ہٹتا ہے لیکن فرمائش وتقاضائے احباب سے مجبور ہو کر اسی بے حلاوت نظم کو اس بے نمک نثر کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ مصمم ہوگیا ہے۔ بشرطیکہ خواستۂ ایزدی بھی ہو ورنہ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

"فرمائشِ احباب کے سوا ایک امر یہ بھی اس تصمیم کا باعث ہوا کہ اکثر غزلیں جو باظہار شوق مانگ مانگ کر لی گئیں ان میں سے بعض کے مالک اور ہی لوگ بن بیٹھے ؎

---

[۱] اس سے مراد خود نوشت حالات ہیں جو دیوان کے آغاز میں شامل ہیں اور جس کے اکثر اجزا مضمون ہذا میں جوں کے توں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب کے ۱۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

فلک نے لوٹ کے لٹوا دیا حسینوں سے سمجھ لیا کسی مردے کا اس نے مال مجھے

ہوشیاری دیکھئے کہ بعض حضرات نے اپنے نام سے چھپوا بھی دیا تاکہ کسی وقت بیخود کے دعوئ ملکیت کی تردید میں کام آئے۔ علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بیخود اور اس کے خواجہ تاش بھائیوں کی ایک ہی زمین میں تصنیف کی ہوئی غزلیں مغنیوں کی زبانوں تک پہنچ کر اس طرح مل گئیں کہ کوئی شعر بیخود کا اور کوئی کسی کا اور شعروں کے بعض الفاظ بھی حافظہ و قلتِ استعداد کی بدولت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئے۔ انہیں وجوہ سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر زمانہ اور ابنائے زمانہ کا یہی رنگ ڈھنگ ہے تو چند روز میں کل مجموعے کی ملکیت سے دست بردار ہونا نہ پڑے"۔

"وہ غزلیں جو دوسروں کے ناموں سے مشہور ہو گئی ہیں اس ترتیب میں بقدرِ معلومات خارج کر دی گئی ہیں اور کوئی رہ گئی ہو تو ہرچہ باداباد۔ کیونکہ تمام پرچے اور کل اخبار بیخود کی نظر سے نہ گزرے ہیں نہ گزریں"۔

"اس رام کہانی سے ناظرین کی سامعہ خراشی و باصرہ آزاری کرنے کے بعد اس قدر گزارش اور باقی ہے کہ طبیعت کی مضبوطی، زبان کی صفائی، فکر کی بلند پروازی، خیال کی رسائی وہ نعمتیں ہیں۔ جو ازل کے دن ہی علی قدر قسمت تقسیم ہو چکیں۔ ان میں ترقی کرنا بیخود رنجور کے امکان میں نہ تھا۔ البتہ اس کا کام ہے کہ ترتیب کے وقت غیرت کا خون نہ بہائے حمیت کو خیرباد نہ کہہ بیٹھے، من می گویم کا ادعا نہ کرے، خوب می نویسم کا مدعی نہ بنے اور جس تلاش و انتخاب، غور و تعمق کی نگاہ دوسروں کے کلام پر پڑتی ہے اس وقت بھی ملحوظ رکھے چنانچہ حتی الوسع یہی کیا ہے اور کامل امید ہے کہ آپ طولِ کلام سے سرگراں ہو کر نظم کی طرف توجہ فرمائیں گے تو بیخود خود فراموش کو اس بارے میں ضرور صادق القول پائیں گے کیونکہ اس نے اس وقت بھی صرف آپ کی طبیعت کو منغض نہ کرنے، آپ کی نگاہ کو انتخاب کی تکلیف نہ دینے کے خیال سے صدہا شعر جو بلحاظ جگر کاوی کلیجے کے ٹکڑے اور آنکھوں کے تارے تھے خزف ریزوں کی طرح خاک میں ملا دئے ہیں۔ اور پھر بھی یہی سمجھتا ہے کہ دیوان نہیں بلکہ اپنے واسطے سرمایۂ رشتن اور عیب جو یا اعتراض دوست حضرات کی طبع آزمائی کے لئے ایک وسیع میدان مرتب و مہیا کیا ہے۔ بقول کسی کے ؎

عیب کے دیکھنے والے تو بہت ہیں لیکن اب یہاں حسن و شناسان سخن تھوڑے ہیں

اگر اس کی بھی داد نہ ملے تو واللہ سخت بیداد ہے"۔

"حاصل شعر و شاعری جو تاثیر ہے اور درد اس کی نسبت اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ ؎

شمع ہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا تا دل و دیدہ خونابہ فشانم دادند

اب دعا اور التجا یہ ہے کہ آپ لوگ بیخود سراپا نیاز کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں اور اس کی غلطیوں کو پردہ پوشی کے دامن میں چھپائیں ؎

بر کریماں کارہا دشوار نیست"

مذکورہ بالا حالاتِ بیخود میں زیادہ حصہ ان کے خود نوشت حالات مشمولہ دیوان سے جوں کا توں منتقل کر دیا ہے کہ وہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے جس بلند مقام پر فائز ہیں اس کے مطابق ان کے حالات متداول و عام نہیں۔ وجہ اس

کی بطور نتیجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شہروں کے شاندار ادبی ماحول سے دور، دور افتادہ ریاستوں میں رہے جہاں کے شعراء اور باکمال حضرات رئیس ریاست تک رسا ہو جانے ہی کو معراج کے مرادف سمجھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتے تھے۔ نہ ملک کے ادبی حالات سے ان کو کوئی سروکار تھا اور نہ نشر و اشاعت کی ہی طرف ان کی کوئی توجہ۔ حلقۂ احباب بھی ایسے حضرات کا محدود رہا کرتا تھا۔ چنانچہ بیخود بھی انہی صورت حالات میں رہے۔ اور کما حقہٗ روشنی میں نہیں آئے۔ تذکرہ نویسوں کو باوجود جستجو ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ صاحب شعر الہند نے لکھا ہے کہ میر و جلال کی طرح تلامذۂ داغ کا سراغ بھی نہیں مل سکا۔ موصوف نے اس کے لئے مولوی علی احسن مارہروی سے بھی خط و کتابت کی کہ وہ تلامذۂ غالب میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا بالآخر خمخانۂ جاوید کے اندراجات پر ان کو اکتفا کرنی پڑی:

حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیخود میں اوائل عمری سے وہ تمام خصوصیتیں موجود تھیں جو لوازم عشق و محبت سے ہیں۔ نیز آئندہ زندگی میں جن واقعات کا پیش آنا۔ انہوں نے بالتصریح یا بالاشارہ بتایا ہے ان سے بھی ان کی مظہرہ خصوصیات مترشح ہوتی ہیں۔ چنانچہ کلام میں بھی تمام و کمال ایسے ہی واقعات و حوادث اور تجربات پیش کئے گئے ہیں۔ بہت کم ایسے اشعار ہیں جن کو روایتی کہا جا سکتا ہے بلکہ ان میں بھی انہوں نے اپنے خصوصی طرز و انداز کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں کہ ان کی "طبیعت میں برجستگی، شوخی، صفائی اور مضمون آفرینی بلا کی ہے۔ اپنے استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ۲۵۔ ۳۰ برس کی مشق اور فکر کی رسائی نے فن سخن میں ایک عمدہ اور اعلیٰ رتبہ ان کے کلام کو بخشا ہے۔ عاشقانہ مضامین نہایت خوب کہتے ہیں۔ دنیائے شاعری میں آپ کا نام بہت کچھ شہرت پا چکا ہے۔ کلام میں روانی، صفائی بلا کی ہے۔ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ٹپکتی ہے جو بے ساختہ دل میں چٹکی لے لے[۱]

داغ کے بعد ان کی جانشینی کے مسئلے نے ایک ادبی جھگڑے کی صورت اختیار کر لی تھی چنانچہ اس سلسلے میں بمقام دہلی متعدد جلسے منعقد کئے گئے جن کی کارروائی نشر و اشاعت کے ذریعہ حلقۂ علم و ادب تک بھی پہنچائی گئی۔ رسالہ "اصلاح سخن لاہور" ماہ مئی و جون ۱۹۰۸ء سے اس کے متعلق واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ اس میں دلچسپی لینے والوں میں سید مظفر علی سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور مرزا منیر الدین ضیا گورگانی دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں داغ کی حیات میں بھی اس مسئلے کا زیر بحث آنا بیان کیا جاتا ہے چنانچہ ایک صاحب[۲] نے زبانی مجھ سے یہ روایت بیان کی کہ جب فصیح الملک کے سامنے اس سوال کو پیش کیا گیا تو انہوں نے جواب میں "بیخودین" فرمایا یعنی ان کی نظر میں بیخود بدایونی اور بیخود دہلوی دونوں جانشینی کے اہل تھے مگر میرے نزدیک

---

[۱] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۴۵۱

[۲] مدراس کے منشی وجاہت حسین جھنجھانوی تھے۔ جن کو فصیح الملک داغ دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔

یہ روایت احتمال سے خالی نہیں کیونکہ ٹکسالی زبان کے مالک، مسلم الثبوت استاد کا فارسی کے لفظ کو بصیغۂ تثنیہ استعمال کرنا قیاس میں نہیں آتا۔ نیز آنریبل میجر برکت اللہ صاحب جودھپوری وزیر احتساب سے دریافت کرنے پر یہ پتہ بھی چلا کہ "بیدل جودھپوری" "بیخود بدایونی کی زندہ یادگار ہیں" جنہوں نے اب پاکستان کی سکونت اختیار کر لی ہے۔ بدورانِ قیام جودھپور موصوف بزم ادب جودھپور کے صدر تھے ان کا نام غالباً شیخ محمد رضائے حسنین ہے [۱] اور صدیقی حنفی قادری ابوالبرکاتی ابوالحسینی بدایونی ان کی متعدد نسبتیں۔ یہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں [۲]

پیش نظر نسخۂ دیوان بیخود (مرات الخیال) نامکمل معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کے کل صفحات ہیں ۲۲۷۔ صفحہ ۲۲۸ حاشیہ کشید کیا ہوا بیاضی ہے جس سے غالباً غزلوں اور دوسری اصناف سخن میں حد فاصل قائم کرنا مقصود ہے پس قیاس ہوتا ہے کہ آگے کے صفحوں میں قطعات تاریخی، قصائد اور اس قسم کے دوسرے اشعار شامل ہوں گے جو موجودہ نسخے سے نکل گئے ہیں۔ کیونکہ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے سوائے غزلوں کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ وہ دو ریاستوں کے متوسل رہے جہاں قصائد و قطعات تاریخ وغیرہ کہنے کی نوبت ضرور آتی رہی ہوگی۔

سلسلۂ حالات ایک مقام پر آغاز دیوان میں تصویر کا شامل ہونا بھی معرضِ اظہار میں لایا گیا ہے۔ مگر وہ اس نسخہ میں موجود نہیں گویا حصۂ مابقی کی طرح مفقود ہو گئی۔

بیخود اپنی وفات واقع ماہ نومبر ۱۹۱۲ء / ۱۳۳۰ھ تک ریاست جودھپور میں بعہدۂ فوجداری مجسٹریٹی ممتاز رہے اور وہیں راہی ملک بقا ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر پچپن ۵۵ سال کی تھی۔ ان کے انتقال سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں جب خمخانۂ جاوید جلد دوم شائع ہوئی تو انہوں نے اس پر ایک گرانقدر تقریظ نثر و نظم میں حوالۂ قلم کی جس میں بانداز دلچسپ زبانوں کے عروج و زوال کا ذکر کرتے ہوئے اردو زبان کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز درمیانی ایک مقام پر مندرجہ ذیل قطعہ بھی لکھا ہے ؎

انسان کی حالت بھی بدل جاتی ہے — اور اس کی طبیعت بھی بدل جاتی ہے
صورت سیرت مزاج کس کا بیخود — بس حد ہے کہ قسمت بھی بدل جاتی ہے

(خمخانہ جاوید جلد دوم تقاریظ ص ۱۰)

---

۲۵۲ [۱] سیرت الصالحین ص۱۷ [۲] از مرزا ابراہیم بیگ چغتائی المتخلص بہ میرزا نیز جائزۂ زبان اردو شائع کردہ انجمن ترقی اردو

[۳] بیخود بدایونی کی تاریخ وفات کی مجھے بڑی جستجو تھی کئی احباب کو خط لکھے لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ بالآخر جناب محمد عبداللہ صاحب بیدل بیکانیری ریٹائرڈ جج بیکانیر نے اس سے مجھے آگاہ فرمایا جس کے لئے میں موصوف کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ راقم سطور نے عیسوی تاریخ پر مشتمل مادہ "خلد ماًبت بیخود بدایونی" (۱۲ عیسوی ۱۹) اور "رخصت بیخود" (۱۲ ۶ ۱۹) بہم پہنچایا ہے۔

آخر تقریظ میں لالہ سری رام جی کی تعریف و توصیف پر مشتمل منقول الذیل قطعۂ تاریخ بھی موزوں کیا ہے۔ جس کے مصرعۂ آخر میں مادۂ تاریخ ۱۹۱۱ء کا حامل الفاظ میں لایا گیا ہے۔ قطعہ یہ ہے۔

مرجع علم و ہنر لالہ سری رام ایم اے — دہلوی مسکن و رنگین رقم و سحر بیان
صاحب جاہ و حشم منبع احسان و کرم — فلک مہر و عنایات کے مہر تاباں
جن کا ہر ایک یہ ظاہر ہے حسب اور نسب — جن کے اوصاف گرامی ہیں زمانے میں عیاں
نیک خو نیک سیر نیک منش نیک نہاد — اہل دل اہل وفا اہل ولا اہل زباں
برتے برتائے ہوئے شیوۂ ارباب کمال — دیکھے بھالے ہوئے اصحاب سخن کے دیواں
ان کی تصنیف نہ ہر شخص کو ہو کیوں مطبوع — اس کی تعریف ہو کس طرح نہ مقبول جہاں
دہر فانی سے فنا ہو گئے جتنے شعراء — ان کے ناموں کی بقا کا ہے یہ اچھا ساماں
جن کو مہلت ہے ابھی خلق میں زندہ ہیں لوگ — ان کو یہ جنس گراں مایہ مبارک ارزاں
اندراج اس قدر اشخاص کا کچھ سہل نہ تھا — انتخاب اس قدر اشعار کا کب تھا آساں
نظم سے رائے زنی اہل سخن کی نسبت — وہ بھی اس طرح کہ جو راست ہے بے ریب و گماں
کس نے کی جس سے ہوا ہو نہ کسی کو شکوہ — کس نے کی جس میں تصنع کا نہ ہو نام و نشاں
نثر دلچسپ وہ جس پر دل نثار نثار — منتخب شعر وہ جس پر شعرا خود قرباں
خوبیاں سب یہ مولف ہی کا حصہ ہیں غرض — ہیں یہی معرکۂ نظم کے مرد میدان
کس کو فرصت ہے زمانہ میں جو اس طرح رہے — سالہا درپے تصنیف عیاں اور نہاں
کس کو ہمت ہے زمانے میں جو یہ صرف اٹھائے — اور ہمت بھی اگر ہو تو یہ مقدور کہاں
کیا لکھے بیخود مغموم صفت در خور شوق — کہ نہ قابو میں طبیعت ہے نہ کہنے میں زباں
وہ طبیعت ہے نہ وہ دل ہے وہ دن ہیں نہ وہ سن — جن میں دشواری مشکل بھی نظر میں آساں
اب تو بس ترک سخن عین سخن فہمی ہے — اب تو لساں وہی ہے جو کرے کف لساں
یہ دعا ہے کہ رہے شاد مولف اس کا — اور یہ خمخانہ رہے دہر میں با مہر و نشاں
فکر تاریخ اگر ہے تو یہ لکھ دے بیخود — کہ رہے خمخانہ یہی فرح دہ پیر و جواں

۱۰ ۶ ۱۹ (تقاریظ ص۱۳ و ص۱۴)

بیخود بدایونی کے منقولۂ بالا اشعار الطباع دیوان ۱۳۲۹ھ / ۱۹۰۹ء کے بعد کے ہیں لہٰذا ان کو نقل کر دینا مناسب معلوم ہوا نیز ان سے ان کی بعض دیگر خصوصیات کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ الطباع دیوان کی تاریخ پر مشتمل دیوان بیخود کا دوسرا نام "میخانۂ بیخود" بھی ہے۔ ٹائٹل پر یہ اور تاریخ تدوین کا حامل "مرآت الخیال" دونوں نام مندرج ہیں۔ "یہ مستنصر پریس دہلی میں باہتمام سید مستنصر علی" طبع ہوا ہے۔ کاغذ اس کا سفید ۱۳ ۱۲ ھ

تائیٹل بہیج دیدہ زیب و رنگین ہے۔ ۶x۹x½ اس کا سائز ہے نیز "تمام حقوق کاپی رائٹ محفوظ ہیں"
تقریظ محولۂ بالا میں بیخود کا دوسرا قطعۂ تاریخ مطابق ذیل درج ہے ؎

سراپا لطف مخدومی سری رام ہر اک جانب ہے جن کا آج شہرا
خیال آیا انھیں تالیف کا جب تو لکھا تذکرہ یہ شاعروں کا
بظاہر سہل تھا یہ کام لیکن سمجھ ہوتی تو یہی دشوار بھی تھا
ہزاروں شاعروں کے خط کتابت ہزاروں بار جوابوں کا تقاضا
جوابوں کی رسیدیں سب کو دینیں کلاموں کا پرکھنا جمع کرنا
ہر اک شاعر کے کچھ حالات لکھتے بہ آئین خوش والفاظ زیبا
مرے مخدوم والا منزلت نے یہ سب کچھ کر دکھایا اور سب اچھا
لکھوں سالِ اشاعت اس کا بھی یہ میرے دل میں بھی رہ رہ کے آیا

تو نکلے تین سن ایک مادے میں
یہ خمخانہ ہے اب بے مثل لکھا

۶۷ بکرمی ۱۹

منقولہ قطعے کا مصرعۂ آخر بکرمی سمیت ۱۹۶۷ کا حامل ہے۔ نیز "یہ خمخانہ ہے اب" سے سال ہجری ۱۳۲۹ اور "یہ خمخانہ ہے اب بے مثل" سے عیسوی سن ۱۹۱۱ اخذ ہوتا ہے۔ جس کی تشریح قطعے کے ذیل میں کردی گئی ہے۔ صاحب ترجمہ کی لکھی ہوئی ایک تقریظ، عاشق دہلوی کے دیوان مطبوعہ "مطبع قدوسی دہلی" ۱۸۹۰ء مطابق ۱۳۰۷ھ (ص ۲۰۹ تا ۲۱۲) میں بھی شامل ہے۔ مولوی محمد اقبال حسین عاشق دہلوی مرزا غالب کے شاگرد تھے[1] اور بسالِ مذکور بیکانیر میں معتمد ریاست کے عہدے پر مامور تھے۔ نیز بیخود بدایونی سروہی میں بعہدہ جوڈیشنل افسری خدمات انجام دے رہے تھے۔ دیوان میں ان کے دوش بدوش دیگر معاصرین کے علاوہ سید محمد حسین بسمل خیرآبادی معتمد ریاست ٹونک (ص ۲۰۸) اور ان کے برخوردار خورد سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی نائب و قائم مقام وکیل ریاست ٹونک (ص ۲۱۲ تا ۲۱۶) کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔ ان سب کا رنگ افسانوی ہے کہ اس وقت یہی طرز مقبول عام تھی۔ چنانچہ بیخود نے بھی اسی رنگ میں گل افشانی کی ہے۔ داغ دہلوی اور مولانا حالی وغیرہ کئی معتدد شعراء کے تاریخی قطعات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

---

[1] "تلامذۂ غالب" از تصنیف جناب مالک رام صاحب ایم اے۔

انجمن کی چند مطبوعات

گاندھی اور نہرو کی راہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۵٫۰۰
گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۷٫۰۰
اردو غزل (جدید ایڈیشن)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۹٫۰۰
دیمک کی کہانی	ڈاکٹر عبد البصیر خاں	۲٫۰۰
شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵٫۰۰
کچھ ذرے کچھ تارے	آنند نرائن ملا	۲٫۵۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۲٫۰۰
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲٫۰۰
نئے ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۵٫۰۰
غالب	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۶٫۰۰
الایام (اردو ترجمہ)	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۴٫۰۰
انتخاب دیوان مومن	حامد حسن قادری	۳٫۵۰

شعرا کے انتخابات

مخدوم ۔ سکندر علی وجد ۔ جیب احمد صدیقی ۔ شاد عارفی ۔ فراق گورکھپوری ۔ اختر انصاری
اثر لکھنوی ۔ جاں نثار اختر ۔ یگانہ چنگیزی ۔ اختر شیرانی ۔

(ہر انتخاب کی قیمت ۷۵ نئے پیسے)

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ

شمارہ نمبر (۱)

۱۹۶۲ء

اُردو ادب

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

آلِ احمد سرور

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ	دس روپے
قیمت فی پرچہ	دو روپے پچاس نئے پیسے

(کوہ نور پریس دہلی)

اُردُو اَدب

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مرزا عبدالقادر بے دل	کوثر چاند پوری	۵
۲	شعراء ٹونک کا ایک قدیم تذکرہ	نادم سیتاپوری	۱۹
۳	فرہنگ مصادر اُردو	مفتوں کوٹوی	۲۸
۴	امریکی شاعری	محمد لیسین	۳۴
۵	حیات گارسین دتاسی	ڈاکٹر ثریا سلطانہ	۵۱
۶	عبدالرؤف پرتو	سخاوت مرزا	۶۴
۷	رسالہ ادیب الہ آباد	سید بشیر الحق دسنوی	۷۹
۸	اسعد الاخبار	محمد عتیق صدیقی	۸۵
۹	تبصرہ		
۱۰	اقبال کے آخری دو سال	محمد عتیق صدیقی	۱۳۱

مرزا عبد القادر بیدل

(کوثر چاند پوری)

مرزا کے والد کا نام عبد الخالق تھا۔ وہ سپاہی پیشہ تھے۔ اور ابھی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ترکوں کے ایک مشہور قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جس کو برلاس کہتے ہیں، بیدل ۱۰۵۴ھ میں بمقام اعظیم آباد (پٹنہ) پیدا ہوئے، لفظ "انتخاب" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ ان کی سکونت محلہ چھوٹی پٹن دیبی میں تھی۔ مرزا کم عمری ہی میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے اور اپنے چچا مرزا قلندر کی سرپرستی میں پرورش پانے لگے۔ جس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا ہے وہ کم سن ضرور تھے مگر اتنے نہیں کہ باپ کی موت کے حادثہ کو محسوس نہ کرتے چنانچہ انھوں نے اس سانحہ سے متاثر ہو کر کچھ اشعار بھی کہے تھے، ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔

خورشید خرامید و فروغے بہ نظر ماند   دریا بکنار دگر افتاد و گہر ماند

لیکن اس شعر سے مرزا کے فکر و خیال کی جس پختگی کا اظہار ہوتا ہے، وہ کم سنی میں پیدا نہیں ہوا کرتی، ہو سکتا ہے کہ باپ کی موت کا اثر ان کے شعور پر رہا ہو۔ اور شعر و سخن میں کافی تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنے جذبات کو منظوم کیا ہو۔

پانچ سال میں کلام مجید ختم کرنے کے بعد عام مسلمان بچوں کی طرح انھیں عربی شروع کرائی گئی، چنانچہ دس سال کی عمر میں فقہ ختم کر کے شرح جامی پڑھنے لگے۔ اسی دوران میں ان کے چچا قلندر بیگ اس مدرسہ میں گئے۔ جہاں مرزا پڑھا کرتے تھے جس وقت وہ پہونچے ہیں، دو طالب علموں میں کسی علمی مسئلہ پر مباحثہ ہونے لگا۔ قلندر بیگ نے اندازہ کیا کہ جس طالب علم کو شکست ہو رہی ہے وہ شرمسار ہوتا جا رہا ہے اور جو جیت رہا ہے اس میں کبر و غرور کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے، قلندر بیگ نے ان دونوں کیفیات کا اندازہ کر کے مرزا سے کہا کہ بس اٹھو ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جس کا انجام محض انفعال ہو یا نخوت۔ مرزا اپنے چچا کے ساتھ آ گئے اور اسی روز سے ان کا زیادہ وقت فقراء کے ساتھ گذرنے لگا۔

مرزا شروع ہی سے ذہین اور موزوں طبع تھے، حسن پرستی کا ذوق بھی رکھتے تھے، ان کے ساتھ مدرسہ میں ایک لڑکا پڑھا کرتا تھا جو اپنے منہ میں لونگ رکھنے کا عادی تھا، بات کرتے وقت اس کے سانس میں لونگ ہی کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ مرزا نے یہ رباعی اسی واقعہ کے متعلق کہی ہے۔

---

[1] جام جم سکھر جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۶۸۔

یارم ہرگاہ در سخن می آید بوئے عجبے کہ از دہن می آید
ایں بوئے قرنفل است یا نکہت گل یا رائحۂ مشک از ختن می آید[1]

حسین دوست سنبھلی کے "تذکرۂ حسینی" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب مرزا کی عمر ۱۰ برس کی تھی۔ اگر وہ اس صغر سنی میں ایسی رباعیاں کہہ سکتے تھے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ضرور قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی۔ تذکرہ حسینی مرزا کی وفات کے صرف تیس سال بعد یعنی ۱۱۶۳ھ میں مکمل ہوا ہے۔ حسین دوست دہلی ہی میں رہتے تھے۔ ان کی روایت کو بالکل غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔

مرزا نے فن شعر میں مولانا کمال کی شاگردی اختیار کی۔ "نشتر عشق" اور جبرتی کی ریاض الافکار کا بیان یہی ہے، لیکن سرخوش کے "کلمات الشعرا" اور سید محمد بلگرامی کی تبصرة الناظرین" اور "سفینۂ خوش گو" یا مصحفی کے "عقد ثریا" میں یہ روایت نہیں ملتی۔ علامہ آزاد نے بھی "ماثر الکرام" یا "خزانۂ عامرہ" میں تلمذ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

"ریاض الافکار" میں مرزا کا ابتدائی تخلص رمزی لکھا ہے۔ سفینۂ خوش گو" اور "نشتر عشق" میں رمزی مرقوم ہے، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ مرزا گلستاں دیکھ رہے تھے کہ یہ مصرعہ نظر سے گذرا:

بیدل از بے نشاں چہ گوید باز

اسی وقت اپنا تخلص تبدیل کر کے بیدل رکھ لیا۔ غلام علی آزاد نے مرزا کو عظیم آبادی لکھا ہے۔ آزاد بیدل کے ہم عصر تھے، ان کے بیان کو غلط کہنا مشکل ہے لیکن خود مرزا کے شاگرد بندرابن داس خوش گو نے تورانی الاصل اکبر آبادی الوطن لکھا ہے، طاہر نصیر آبادی نے "لاہوری" بتایا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

"آں نیز از لاہور است"

خوش گو نے اس کی تردید کرتے ہوئے انھیں اکبر آبادی ظاہر کیا ہے، مصحفی عقد ثریا میں لکھتے ہیں:

"در بلدۂ عظیم آباد از گلستان عدم درین تماشا گاہ خرامیدہ و خود را در بلاد ہند انداختہ"

تذکرہ عقد ثریا تو خیر بیدل کی وفات کے ۶۴ سال بعد لکھا گیا ہے۔ لیکن آزاد کے ماموں سید محمد جو بیدل کے معاصر تھے اور ان کی صحبت میں بیٹھ چکے تھے۔ انھوں نے بھی محض اس لحاظ سے انھیں شاعر شاہ جہاں آباد لکھا ہے۔ کہ وہ دہلی میں سکونت رکھتے تھے اسی لحاظ سے خوش گو نے اکبر آبادی لکھ دیا ہوگا۔ کیوں کہ مرزا کا قیام اکبر آباد میں بھی رہا تھا۔ جہاں تک ان کی ولادت کا سوال ہے، آزاد اور مصحفی کا بیان بالکل صحیح ہے جس کی تائید "عقد ثریا" اور جبرتی کے مجموعۂ مکاتیب" ریاض الافکار" سے بھی ہوتی ہے۔

مرزا نے اکیس[2] سال کی عمر (۱۰۷۵ھ) میں اپنا وطن چھوڑا[3]، ان کی نشوونما (بقول آزاد) ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ہوئی،

---

[1] تذکرۂ نشتر عشق قلمی از حسین قلی خاں عظیم آبادی۔ [2] نگارئی ۱۹۵۹ء

زیادہ تر شاہجہان آباد میں سکونت رہی۔ "سفینۂ خوش گو" سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبرآباد میں بھی قیام رہا۔ آغاز شباب میں شاہزادہ محمد اعظم بن اورنگ زیب کی نوکری میں رہے۔ اور منصب بھی حاصل کیا۔ مرزا کے ایک واقف کار نے شاہزادے سے ان کی شاعری کا ذکر کیا تو شاہزادہ نے کہا کہ ہماری مدح میں قصیدہ لکھیں تو مزید عزت افزائی کی جائے، مرزا کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مدحیہ قصیدہ لکھنے سے بالکل انکار کر دیا۔ اور اصرار کے باوجود اپنی رائے تبدیل نہ کی۔ بلکہ نوکری چھوڑ کر دہلی میں قیام کر لیا اور کیفیت یہ ہو گئی کہ خود اُمراء ان کے آستانہ پر حاضر ہونے کو فخر سمجھنے لگے۔ یہ سلسلہ اورنگ زیب کے آخری عہد حکومت سے لے کر محمد شاہ کے اوائل جلوس تک جاری رہا جس زمانہ میں اورنگ زیب دکن کی مہمات میں مصروف تھا۔ مرزا کو مجبوراً دہلی چھوڑنا پڑی۔ کیوں کہ دہلی کے اطراف میں سخت فساد برپا ہو گیا تھا اور وقت ایسا نہ تھا کہ سکون کے ساتھ وہاں زندگی بسر کی جا سکتی۔ چناں چہ بیدل اپنے بال بچوں سمیت متھرا چلے گئے، جس کو اورنگ زیب نے اسلام آباد سے موسوم کر دیا تھا۔ بیدل کو متھرا کی حسین، مقدس اور تاریخی سرزمین سے وہی محبت تھی، جو ایران کے مشہور شاعر شیخ علی حزیں کو بنارس کی رومانی فضا سے تھی۔ فرق اتنا ہے کہ حزیں آج بھی بنارس کی آغوش میں ابدی نیند سو رہے ہیں اور بیدل کو جو متھرا ہی میں زندگی بسر کر دینے کی آرزو رکھتے تھے۔ جاٹوں کی چیرہ دستیوں کے باعث ساحل گنگ پر دائمی آسودگی کا موقعہ نہ مل سکا۔ اور جس خطے کو وہ محبت کی سرزمین سمجھتے تھے۔ اس سے دور ہو جانا پڑا۔ متھرا کی نسبت انہوں نے کہا تھا۔ ؎

در زمینے کہ محبت اثرے کاشتہ است — گرد اُو خرمنِ چندیں طپش انداختہ است

متھرا سے ان کی یہ گرویدگی مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں تھی، بلکہ خالص شاعرانہ اور متصوفانہ حیثیت سے تھی۔ اورنگ زیب نے متھرا کا نام ضرور بدل دیا تھا مگر بیدل کو نام سے غرض نہ تھی وہ اس خطہ کو اپنے نظریۂ شاعری کے پیش نظر پسند کرتے ہوں گے۔ ورنہ ناموں کی یہ تبدیلی ایک شاعر کے لئے جو خالق و مخلوق کے تعلق کو نہایت اور لانہایت کا سا تعلق خیال کرتا تھا کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی تھی، گذشتہ تاریخ بیدل کے سامنے تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جہانگیر نے بھی شراب کو "رام رنگی" سے موسوم کیا تھا۔ لیکن وہ شراب کی مقبولیت اور ہمہ گیری کا ساتھ نہیں دے سکا، اور جلد ہی حافظہ سے محو ہو گیا جب کہ شراب اپنے اسی پرانے نام سے آج تک رندانِ بادہ آشام کو مست و بیخود بنا رہی ہے۔ پھر متھرا کی جگہ "اسلام آباد" کیوں کر مقبول ہو سکتا تھا۔ وہاں کی فضاؤں سے کنہیا جی کی بانسری کی مدھر تانیں کیوں کر فنا ہو سکتی تھیں، ایسے سکے جو عوام کی مرضی کے خلاف رائج ہوتے ہیں ان کی عمر زیادہ نہیں ہوا کرتی، جلد ہی وہ بازاروں میں اپنا اثر و نفوذ کھو دیتے ہیں، بیدل محض اپنی طبعی رواداری اور شاعرانہ وسیع المشربی کی بنا پر متھرا کی سکونت پسند کرتے تھے۔ لیکن جاٹوں نے ان کی یہ تمنا پوری نہ ہونے دی اور وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ گھر کا سامان بہلیوں پر لدوا کر دہلی کی طرف چل پڑے۔ اور ۲۷ جمادی الاول ۱۰۹۶ھ (مطابق ۱۳ مئی ۱۶۸۵ء) کو جب وہ عمر کی بیالیس منزلیں طے کر چکے تھے دہلی پہونچ گئے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے اپنے مخلص نواب شکر اللہ خاں کو خط لکھا جس میں متھرا چھوڑنے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے باقی زندگی دہلی ہی میں گذارنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ شاعر تھے شاعرانہ ماحول اور قدرتی مناظر کی خوبصورتی کے دل دادہ تھے چاہتے تھے کہ شہر کے ہنگاموں سے دور لب ساحل کوئی پُر فضا جگہ رہنے کو مل جائے، نواب شکر اللہ اس وقت دہلی میں نہ تھے۔ بیراٹ کے اطراف میں جاٹوں

نبرد آزمائی میں معروف تھے، وہ اور ان کے تینوں بیٹے یعنی نواب لطف اللہ خاں، نواب شاکر خاں اور نواب کرام اللہ خاں بیدل سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ آخر نواب شکر اللہ اور ان کے بیٹے نواب شاکر خاں نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایک عمدہ موزوں مکان تلاش کر کے پانچ ہزار میں خرید لیا۔ بندرابن داس خوش گو جن کو مرزا کی شاگردی کے علاوہ ان کی رفاقت کا شرف بھی حاصل تھا، اپنے "سفینہ" میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"بدار الخلافۂ شاہ جہاں آباد رسیدہ کنج عزلت گزید۔ نواب شاکر خاں
و نواب شکر اللہ خاں بیرون دہلی دروازہ و شہر پناہ در محلہ کھیکریان برکنار گذر گھاٹ لطف علی
حویلی بمبلغ پانچ ہزار خریدہ نذر نمودند و وجہ یومیہ مقرر کردند کہ تا روز مرگ بایشاں می رسید۔ بقیہ عمر
دراں مکاں بہ فراغ سی و شش سال اوقات عزیز بسر برد۔"

بیدل پورے اکتیس سال تک شمالی ہند کے مختلف شہروں میں بھٹکتے رہے تھے اور کسی جگہ مستقل قیام کا موقع نہ ملا تھا اس لئے خوش گو کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ انھوں نے عمر کے بقیہ ۳۶ سال اسی مکان میں گذار دیئے جو ساحل جمن پر نہایت پُر فضا مقام پر واقع تھا۔ اور جہاں بیٹھ کر انھیں موجوں کے اضطراب کو دیکھ کر زندگی میں حرکت و جنبش کی اہمیت کا رشتہ تلاش کرنا تھا، اسی رشتہ کو پاکر وہ ایسے اشعار کہنے پر قادر ہوئے۔

موج دریا را بساحل ہم نشینی مشکل است ‍ ‍ ‍ ‍ بیقراراں نذر منزل کردہ اند آرام را

لیکن زندگی ہمیشہ وقت کے اشاروں پر رقص کیا کرتی ہے۔ جو ایک مستقل بے قراری کا شکار ہے۔ دراصل اسی بے قراری اور اضطراب کا نام حیات ہے۔ بیدل خانہ بدوشی کی زندگی سے تنگ ضرور تھے، مگر ایسا شاعر جس کا محبوب بھی بقول اقبال "صاحب خرام" ہو اور جو "خرام کاشتن" کی ایک نئی ترکیب کا موجد ہو وہ اپنی زندگی میں سکون کیوں کر لا سکتا تھا چنانچہ وقت نے ایک آخری جھٹکا اور دیا۔ ۱۱۳۱ھ میں فرخ سیر سادات بارہہ کے ہاتھوں نہایت بے دردی کے ساتھ قتل ہوا۔ مرزا پر اس اندوہ ناک حادثہ کا شدید اثر پڑا، اگرچہ امیر الامرا سید حسین علی خاں سے بھی وہ گہرا ربط رکھتے تھے۔ جنانچہ جس زمانہ میں وہ ممالک دکن کے انتظام میں مصروف تھا۔ انھوں نے دہلی سے یہ دو شعر لکھ کر اسے بھیجے تھے۔

اے نشۂ پیمانۂ قدرت بچہ کاری ‍ ‍ ‍ ‍ ہستی اثری یا پئے تاراج خماری
مے در قدح گل بسری جام بدستی ‍ ‍ ‍ ‍ رنگ چمنی موج گلی جوش بہاری[1]

لیکن فرخ سیر کو جس سفاکی سے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے پیش نظر مرزا کو شدید قلق ہوا۔ اور اس کا اظہار بھی اس تاریخ میں ہو گیا:

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند ‍ ‍ ‍ ‍ صد جور و جفا ز راہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جستم فرمود ‍ ‍ ‍ ‍ سادات بوے نمک حرامی کردند

---

[1] خزانہ عامرہ/سرو آزاد ص ۱۴۹

سیدوں کے اقتدار اور ان کے جاہ و جلال کو دیکھتے ہوئے بیدل کی یہ بہت بڑی جسارت تھی جسے ان کی فن کارانہ حق گوئی پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے۔ اس کے نتائج بہت خراب ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ اس جواب سے ظاہر ہے جو عظمت اللہ بے خبر کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اور جس سے بیدل کی تاریخ کا ردِ عمل نمایاں ہے:

باشاہِ سقیم انچہ شاید کردند　　از دستِ حکیم ہرچہ آید کردند
بقراطِ حزد نسخہ تاریخ نوشت　　سادات دوا ش[۱۱۳۱] آنچہ باید کردند[۱]

بے خبر کی مرزا سے ملاقات بھی تھی جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب "سفینۂ بے خبر"[۲] میں کیا ہے۔ اس کے باوجود بیدل کی تاریخ کے جواب میں تاریخ لکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سیاسی حالات کی رو سے ضروری تھا کہ بیدل نے سادات کے کردار کی جو تصویر پیش کی تھی اس کی صفائی کی جائے اور فرخ سیر کے قتل کو ایک ملکی ضرورت اور حالات کا تقاضا بتایا جائے۔ اس رجحان سے پتہ چلتا ہے کہ اربابِ اقتدار نے بیدل کی اس جرأت اور حقیقت نگاری کو ضرور ناپسند کیا ہوگا۔ یہ سادات کے عروج کا زمانہ تھا۔ مسلسل کامیابیوں اور بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے انھیں مغرور بنا دیا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود امیر الامرا اگرچہ علم دوست اور قدر شناس بھی تھا، پھر بھی سادات کو بیدل سے مخاصمت پیدا ہوگئی اور بیدل ۷۷ سال کی عمر میں ایک بار اور تبدیلِ سکونت پر مجبور ہوئے۔ اور دہلی چھوڑ کر نواب عبد الصمد خاں کے پاس لاہور چلے گئے۔ ۶ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ (مطابق ۹ اکتوبر ۱۷۲۰ء) کو امیر الامرا، سید علی حسن خاں دکن میں مارا گیا۔ اور اس کی موت کے ساتھ ہی سادات کا آفتابِ اقبال بھی غروب ہوگیا۔ ان کے اقتدار پر ایسی کاری ضرب لگی کہ پھر وہ پنپ ہی نہ سکے۔ اور جس طاقت نے انھیں بادشاہ گری کی صلاحیت دی تھی وہ ہاتھ سے نکل گئی۔ اورنگِ حکومت بلا شرکتِ غیرے محمد شاہ کے زیرِ نگین آگیا۔ اور فرمانروائے دہلی کے پورا اختیارات اسے حاصل ہوگئے۔ بیدل کے لئے یہ موقعہ بہت اچھا تھا۔ وہ خطرہ ٹل گیا تھا جس کے خوف سے انہوں نے دہلی کی سکونت ترک کی تھی۔ چناں چہ پھر دہلی آکر وہ اپنے اسی مکان میں آباد ہوگئے۔

بیدل حقیقی شاعر تھے اور واقعات کا اثر قبول کرنے میں کافی حساس تھے۔ انھیں کسی سے ذاتی مخالفت نہ تھی۔ بلکہ حالات اور واقعات کے مشاہدے سے جس قسم کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہوتا تھا وہ اسے نظم میں منتقل کر دیا کرتے تھے۔ سادات پر نمک حرامی کا جو الزام انھوں نے لگایا تھا وہ بھی اس وقت کے حالات ہی کا اثر تھا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی مذہبی تعصب یا تنگ نظری کا شکار تھے۔ ان کی حقیقت پسندی، رواداری اور بے باکی نیز انصاف پژوہی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ امیر الامرا کے قتل کو بھی وہ ایک قسم کا ظلم ہی خیال کرتے تھے۔ چناں چہ ایک روز وہ نواب نظام الملک آصف جاہ کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ نواب حسن علی خاں کا قاتل محمد امین خاں[۳] بھی آگیا۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ نواب کے پاس بغیر داڑھی مونچھ کا ایک قلندر بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا "کون ہے؟"

---

[۱] سروِ آزاد ص ۱۴۹　[۲] سروِ آزاد ص ۱۵-۱　[۳] محمد امین خاں نے امیر الامرا کے قتل کی سازش ضرور کی تھی لیکن اصل قاتل جس نے دھوکہ سے امیر الامرا کو قتل کیا تھا [illegible] حیدر خاں تھا۔ نور اللہ خاں نے اسے بھی موقعہ ہی پر مار ڈالا تھا۔ سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۳۲۔

نواب نے جواب دیا "مرزا بیدل"۔
محمد امین خاں نے کراہت کے ساتھ کہا "داڑھی مونچھ منڈا رکھی ہے کیا اسی کا نام درویشی ہے"۔
محمد امین خاں نواب آصف جاہ کا عزیز تھا اور ان کے دکن جانے کے بعد وزیر بھی ہو گیا تھا۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کس مرتبہ کا آدمی تھا۔ لیکن مرزا نے بلا جھجک جواب دیا :

"ریشِ خود را تراشیدہ ام دل کسے را نخراشیدہ"

محمد امین خاں اس طنزیہ اشارے پر بگڑ گیا اور غصے میں خنجر پر ہاتھ ڈالا۔ مرزا بھی بہت مضبوط اور تنومند آدمی انھوں نے بھی تکمہ تان لیا۔ نواب آصف جاہ نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی اور مرزا کی بڑی دل جوئی کی۔[1]

لاہور سے دہلی آنے کے بعد مرزا زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکے۔ عمر بھی کافی ہو چکی تھی، اور خانہ بدوشی کے مصائب صحت پر خراب اثر ڈالا ہوگا۔ دہلی آنے کے چند روز بعد ہی تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر ۷۹ سال کی عمر میں ۴ صفر ۱۱۳۳ھ بق ۵ دسمبر ۱۷۲۰ء) کو بیدل دنیا سے رخصت ہو گئے "ماثرالکرام" میں تاریخ وفات ۳ صفر ۱۱۳۳ھ لکھی ہے مگر وہ صحیح بندرابن داس خوش گو لکھتے ہیں :

"قصہ مختصر در سال ہزار و سی و سوم در ایام کہ ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ بادشاہ غازی بر سادات بارہہ مظفر و منصور شدہ حضرت بیدل را در ماہ محرم عارضہ تپ رو داد۔ یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر شش گھڑی روز برآمدہ ہمائے روح پر فتوح آں زندہ بہ عیش سرمدی از آستانۂ تن بال و پر افشاندہ بر ساکنانِ عرش معلیٰ سایہ انداخت و بوصالِ حقیقی کامیاب گردید رحمۃ اللہ علیہ۔"

خوش گو نے یہ دو تاریخیں کہیں۔ پہلی یہ ہے :

یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر

دوسری تاریخ اس رباعی سے نکلتی ہے۔

افسوس کہ بیدل از جہاں روئے نہفت — واں جوہر پاک در تہ خاک بخفت
خوش گو چو ز عقل کرد تاریخ سوال — از عالم رفت مرزا بیدل گفت
۱۱۳۳ھ

آزاد بلگرامی نے بھی تاریخ وفات کہی

سرور سر کردۂ ارباب سخن — از عم آباد جہاں خرم رفت
گفت تاریخ وفاتش آزاد — میرزا بیدل از عالم رفت
۱۱۳۳

سراج الدین علی خاں آرزو، عطاء اللہ عطا، اور بیدل کے دوسرے شاگردوں نے بھی تاریخیں نظم کر کے اپنا غم ظاہر کیا۔ کی خواہش کے مطابق ان کو گھر کے آنگن ہی میں دفن کیا گیا۔

---

[1] تذکرہ حسینی ص ۵۰

خوش گو لکھتے ہیں کہ:

"درہماں حویلی کہ چبوترہ برائے قبر از مدت دہ سال راست کردہ بودند بخاک سپردند"

آزاد رقم طراز ہیں کہ:

"در صحن خانۂ خود مدفون گردید"

اشدرام مخلص کی ایک قلمی تحریر جو حسب روایت ڈاکٹر عبدالغنی صاحب ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کے پاس موجود ہے۔ اس میں مخلص لکھتے ہیں۔

"درسال یک ہزار و یک صد و سی وسہ ودیعت حیات سپردند و در صحن حویلی قبر ایشان است"

یہی بات حسین قلی خاں عظیم آبادی نے بھی "نشتر عشق" میں لکھی ہے۔

بیدل نہایت قناعت پسند بزرگ تھے۔ ۱۱۳۳ھ میں انہیں نواب نظام الملک آصف جاہ نے دکن بلایا۔ وہ مرزا کے شاگرد بھی تھے اپنا کلام انھیں کو دکھایا کرتے تھے۔ غشیات مرزا میں چند رقعات بھی حسین قلیچ خاں کے نام ہیں جو آصف جاہ کا قدیم خطاب تھا۔ آصف جاہ مرزا کی بڑی عزت کرتے تھے جب وہ دہلی میں نواب کے یہاں جاتے نواب استقبال اور مشایعت کرتے تھے اور مسند پر بٹھلاتے تھے۔ اگر مرزا ان کی طلبی پر دکن چلے جاتے تو ظاہر ہے کہ وہاں انھیں ہر قسم کا عیش و آرام حاصل ہوتا مگر وہ نہ گئے اور جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش   من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

مرزا نہایت قوی الاعضا اور بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ جوانی میں سات سیر اور بڑھاپے میں ڈھائی سیر غذا کھاتے تھے۔ ان کی آہنی جریب کا وزن ۳ سیر شاہ جہانی تھا[1]۔ اور اس کا نام بولاس (شاخ نازک) تھا۔ اچھے صحت مند لوگ بھی بمشکل دونوں ہاتھوں سے اٹھا سکتے تھے۔ زہد و اتقا کے باوجود ریش و بروت صاف رکھتے تھے۔

مرزا کی موت ایک عالم اور شاعر کی موت تھی۔ اور اس عظیم شخص کی موت تھی جس کی ذات سے اردو شعر و سخن کو ابتدائی روشنی ملی، دہلی کے امرا، شعرا اور عوام پر اس کا گہرا اثر پڑا اور سال بہ سال ان کی یاد کا دن عرس کی صورت میں منایا جانے لگا یہ رسم عرصہ تک جاری رہی اور دہلی کی ادبی و شعری فضا پر اس کے کافی اثرات پڑے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ یہی اثرات تھے جو آگے چل کر غالب اور اقبال کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ عرس کی مجلسیں ہر سال صفر کے مہینے میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ بیدل کے ماموں زاد بھائی مرزا عباداللہ کے بیٹے محمد سعید کو سجادہ نشین مقرر کیا گیا تھا۔ وہی عرس کا اہتمام کرتے تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ عرس کے موقعہ پر مرزا کا کلیات جس کو انہوں نے اپنے زمانۂ حیات ہی میں لکھوا لیا تھا۔ مزار کے پہلو میں رکھدیا جاتا تھا یہ کلیات ۹۹ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ آزاد لکھتے ہیں کہ:

"کلیاتش لفظاً و نثراً مابین نود و صد ہزار بیت است[2]"

اس کا اندازہ اس تفصیل سے کیا جاسکتا ہے:-

---

[1] شاہ جہانی سیر، ۹۱۵ تولہ کا تھا۔ [2] خزانہ عامرہ ص ۱۵۳۔

(۱) کلیات نظم و نثر ایک لاکھ سے زیادہ ابیات (۲) مثنوی عرفان چار ہزار بیت (۳) طور معرفت تین ہزار بیت (۴) ساقی نامہ دو ہزار بیت (۵) تنبیہ المہوسین ایک ہزار بیت (۶) ترجیع بند فخر الدین عراقی کے جواب میں ہزار بیت (۷) صنائع و بدائع سات ہزار بیت (۸) چہار عنصر ۱ ہزار بیت " تذکرہ سرخوش " میں کلیات کا وزن ۵ اسیر مرقوم ہے۔

کلیات کے ساتھ ہی قبر کے قریب بیدل کا عصا بھی تبرک کے طور پر رکھا جاتا تھا عرس کا افتتاح بیدل کی غزل سے کیا جاتا تھا۔ یہ غزل کلیات ہی میں سے پڑھی جاتی تھی۔ اس کے بعد تمام شعرا اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ "سفینۂ خوش گو" میں ۱۱۴۷ھ تک عرس کے حالات لکھے گئے ہیں۔ ۱۱۵۱ھ (مطابق ۱۷۳۹ء) نادر شاہ کی یورش کے باعث دہلی میں زبردست ہنگامہ برپا ہوا اسی دوران میں نظام الملک آصف جاہ دکن سے دہلی آئے ان کے ساتھ نواب درگاہ قلی خاں بھی تھے جو اردو اور فارسی کے نہایت صاحب ذوق شاعر تھے نثر پر بھی قدرت رکھتے تھے چنانچہ دہلی کے مجلسی اور معاشرتی حالات پر مشتمل ایک کتاب بھی فارسی میں تصنیف کی تھی جس کا نام "مرقع دہلی" تھا۔ نظام الملک شاعر بھی تھے اور بیدل کے شاگرد بھی، ان دونوں نے بیدل کے عرس میں بہت دلچسپی لی۔ نواب درگاہ قلی خاں کی تحریر کے مطابق صفر کی تیسری تاریخ کو عرس منایا جاتا تھا اور دہلی کے شعرا جن میں بیدل کے شاگرد بھی شامل ہوتے تھے۔ نیز دوسرے ارباب ذوق ان کی روح کو ثواب پہونچانے کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ قبر کے ارد گرد مجلس ترتیب دی جایا کرتی تھی۔ ان کا کلیات جو بہت خوشخط لکھا ہوا تھا حلقہ کے درمیان رکھ دیا جاتا تھا شعر خوانی کا افتتاح اسی میں سے ہوتا تھا۔ کلیات کے عنوان پر یہ رباعی مرقوم تھی۔

اے آئینۂ طبع تو ارشاد پذیر — درکسب فوائد تنائی تقصیر
مجموعۂ فکر ما صلائے عام است — سیری کن و صحت تسلی برگیر

اس کے بعد تمام شاعر اپنے مرتبہ کے مطابق تازہ کلام حاضرین کو سناتے تھے۔ غزل خوانی کا آغاز بیدل کے شاگرد رشید معنی یاب خاں کے کلام سے ہوتا تھا۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

" حلاوت طرفہ بحصول می پیوندد و انبساط خاص بحضار عائد می گردد۔

گل محمد معنی یاب خاں جن کا تخلص شاعر تھا بیدل کے ممتاز شاگرد تھے۔ بیدل ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ استاد کے انتقال کے بعد بھی ان کے متعلقین کی خبر گیری پوری توجہ سے کرتے رہے، عرس کی رونق انہیں کی ذات سے تھی۔ ۱۱۵۷ھ میں یہ بھی چل بسے۔

محمد سعید کی نسبت نواب درگاہ قلی خاں نے لکھا ہے کہ بیدل کے برادر زادے جو معنیٔ بیگانہ کی طرح مرزا کی نسبت معنوی سے ناآشنا ہیں حاضرین کی خاطر تواضع اور شمع و چراغ کا انتظام نہایت سرگرمی سے کرتے ہیں۔ ان کی معاش کا مدار ان معجونوں اور گولیوں کی فروخت پر ہے جو مرزا بیدل نے اختراع کی تھیں اور کیمیا کے زمرے میں شمار کی جاتی تھیں اور دہلی بھر میں مشہور تھیں۔ سراج الدین علی خاں آرزو جو بیدل سے نسبت تلمذ رکھتے تھے عرس میں بطور خاص شریک ہوا کرتے تھے چنانچہ مجمع النفائس میں عرس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لہ نگار جنوری و فروری ۱۹۶۵ء کلیات کی ایک لاکھ سے زائد ابیات میں غالباً ان جملہ کتابوں کے اشعار بھی شامل ہیں۔

"کلمات قش روز وفات او کہ چہارم از شہر صفر باشد و ہمیں تاریخ وفات او ست و مردم ہندوستان آں معنی چراغاں کنند و طعام پختہ بخلائق دہند و عرس نامند و پیوستہ زیارت کردہ میشود"

آنند رام مخلص لکھتے ہیں

"قبر ایشان زیارت گاہ معتقداں و ہر سال محفل عرس منعقد می شود۔"

بیدل کی شاگردوں کی وفات کے بعد بھی تقریباً بیس سال تک عرس کا سلسلہ جاری رہا۔ مجموعۂ نغز کے مصنف نے بیدل کی اولاد میں مرزا فضل اللہ کا ذکر کیا ہے جو پانی پت میں سکونت رکھتے تھے غالباً دہلی کے ہنگاموں سے تنگ آکر مرزا محمد سعید یا ان کی اولاد دہلی سے پانی پت میں منتقل ہو گئی ہو۔ بعد کا زمانہ اگرچہ دہلی کے لئے شدید سیاسی انقلاب کا تھا نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے سلطنت مغلیہ کی بنیادیں ہلا دی تھیں پھر مرہٹوں اور روہیلوں کی چیرہ دستیوں نے ان کا رہا سہا اقتدار بھی ملیامیٹ کر دیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں اور مغلیہ خاندان کی پردہ نشین خواتین کو برہنہ رقص کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن مرزا کے عرس کی رسم ان تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود جاری رہی۔ عرس ہی میں ایک مرتبہ مولانا ندرت کشمیری نے سودا کی ہجو میں ایک فارسی غزل پڑھی تھی جس کا مطلع یہ تھا؛

خونِ معنی تا رفیع بادہ پیما ریختہ   آبروئے ریختہ از جوش سودا ریختہ

سودا نے اسی غزل کو مخمس کی شکل دے کر ندرت ہی پر الٹ دیا۔

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو انصرام ہو   بحر میں جس کی ہر طرح شعبۂ خاص و عام ہو

اس طرح ۱۱۸۶ھ (مطابق ۱۷۷۲ء) تک عرس کے انعقاد کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی ۵۲ سال تک بیدل کا مزار ارباب شعر و سخن کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اور ہندوستان میں عرب کے سوق عکاظ کی یاد اس سے تازہ ہوتی رہی، لیکن نیرنگیٔ زمانہ دیکھیے کہ غالب کے عہد میں بیدل کے مزار کا کہیں نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ جیسا کہ غالب کے اس شعر سے ظاہر ہے:

گر ملے حضرت بیدل کا خطِ لوحِ مزار   اسدؔ آئینۂ پردازِ معانی مانگے

۱۳۵۹ھ میں خواجہ حسن نظامی مرحوم نے مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی نشان دہی پر نظام دکن کی عطیہ رقم دو ہزار کے خرچ سے مزار کو دوبارہ تعمیر کرا کر یہ کتبہ لگا دیا تھا۔

مرقد عبدالقادر بیدل تاریخ وفات ۱۱۳۳ھ اس کی ضروری تعمیر و ترمیم اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع دکن کی توجہات شاہانہ سے ۱۳۵۹ھ میں کرائی گئی۔

لیکن خوش گو، آزاد، حسین قلی خاں اور مصحفی کے بیانات کی رو سے مزار غلط جگہ بنایا گیا ہے۔ اصل جگہ خوش گو کی تحریر کے مطابق شہر پناہ اور دہلی دروازہ کے باہر تھی اور پرانے قلعہ کی نسبت دہلی دروازے سے زیادہ قریب تھی ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کے خیال میں اصل مزار اور خواجہ صاحب کے تعمیر کردہ مزار کے درمیان تین ۳ میل کا فاصلہ ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اس سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ غالباً ۱۹۵۴ء میں کابل سے یہ آواز بلند کی گئی تھی کہ بیدل کا مزار کابل میں ہے۔

لیکن یہ دعویٰ بالکل بے حقیقت ثابت ہوا مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیدؔل وہاں بہت زیادہ مقبول ہیں ان کی غزلیں کابل ریڈیو پر پڑھی جاتی ہیں اور محفلوں میں بھی بیدؔل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کابل کے کتب خانوں میں بیدؔل کے نادر قلمی کلیات بھی موجود ہیں۔

بیدؔل دراصل فارسی کے شاعر تھے۔ اردو میں ان کے صرف تین شعر ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ ریختہ کو اپنی جولانگاہ خیال بنانا پسند کرتے تو کلیات میں اردو کا دیوان بھی ضرور شامل ہوتا جس میں ہزاروں اشعار ہوتے، اردو میں وہ اظہار خیال کی اچھی خاصی استعداد رکھتے تھے۔ ان کی اس خصوصیت پر تعجب بھی نہ ہونا چاہئے۔ کیوں کہ بہار ان کا وطن تھا جہاں ان کی پیدائش تک اردو نے ترقی کے کچھ مراحل طے کر لئے تھے۔ اور اس طرح مرزا بچپن ہی میں اس زبان سے مناسبت پیدا کر چکے تھے۔ خود مرزا کی تحریریں ثابت کرتی ہیں کہ وہ بہار کے زمانۂ قیام ہی میں اردو سے آشنا ہو چکے تھے۔ وہاں بھی اس وقت اردو ریختہ ہی کے نام سے موسوم تھی۔ مرزا نے سنہ ۱۱۰۰ھ میں ترک وطن کیا جب ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی اپنی فطری ذہانت کے باعث وہ اس عمر میں اچھی طرح اردو سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اسے مستقل طور پر اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بنایا، اور محض تفنن کے طور پر طبع آزمائی کی۔ بہرکیف یہ امر مشتبہ نہیں ہے کہ اردو کا ذوق بیدؔل اپنے وطن ہی سے ساتھ لائے تھے۔ جون پور تیموری حملوں کے بعد مشرقی سلاطین کی توجہ سے اسلامی مرکز بن چکا تھا اور وہاں کی فضا اردو کی نشو و نما کے لئے بالکل ہموار ہو چکی تھی۔ بیدؔل نے اسی فضا میں آنکھ کھولی تھی۔ اور وہاں کے رہنے والوں سے اردو کے ایسے اشعار بھی سنے تھے جو دوہوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ دہلی کے دوران قیام میں انہوں نے اردو کے یہ اشعار کہے جو اکثر تذکروں میں مل جاتے ہیں اور کافی صاف ہیں۔

شہرۂ حسن سے ازبسکہ وہ محجوب ہوا　　　اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں　　　اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا　　　پردے سے یار بولا بیدؔل کہاں ہے ہم میں

تذکرہ طور کلیم میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۱۳۳ھ میں جب ولیؔ کا دیوان دہلی آیا تو اور شاعروں کے علاوہ بیدؔل نے بھی تقلید کی لیکن ایسی صورت میں جب سنہ ۱۱۳۳ھ ہی میں بیدؔل کا انتقال ہو چکا تھا۔ تقلید کے امکانات کہاں تھے، ۴ صفر سنہ ۱۱۳۳ھ کو بیدل دنیا سے رخصت ہوئے جو سال کا دوسرا مہینہ تھا ایسی صورت میں کیوں کر یقین کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ولیؔ کی تقلید کی ہو۔ اس کے برخلاف خود ولیؔ نے مرزا کے شاگرد سعد اللہ گلشن کے توسط سے ان کا اثر قبول کیا، آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے

"شمس (ولی دکنی) دلّی میں آئے یہاں سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے شاید ان سے شعر میں اصلاح
لی ہو مگر دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً ان کے اشارے سے کی"

اس کے علاوہ گلشن کے مشورے سے انہوں نے فارسی ترکیبوں سے بھی فائدہ اٹھایا اور انھیں اپنے کلام میں داخل کیا۔

اس امتزاج کا جو اثر پڑا وہ ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

دہلی آنے سے قبل کا رنگ:

تجھ بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کیا کرنا — اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یہ سنسار کیا کرنا

دہلی آنے اور گلشن کے مشورے کو قبول کرنے کے بعد ولی کی غزل کا انداز یہ ہو گیا۔

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن — باعثِ خمیازہ آغوش ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

زندگی جام عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں

بہر حال بیدل نے ولی کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ خود ولی دکنی ان سے متاثر ہوئے اور اردو غزل پر بھی بیدل نے اپنے تلامذہ کے ذریعہ گہرا اثر ڈالا اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اردو کے سرا بھارتے ہوئے پودے کی آبیاری انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔ اردو پر بیدل کے اثرات جن مختلف شخصیتوں کے توسط سے پڑے، ان میں شیخ سعد اللہ گلشن (جن کو تخلص بیدل ہی نے عطا کیا تھا) سراج الدین علی خاں آرزو، نواب امیر خاں انجام رائے انند رام مخلص، شاہ فصیح افصح، محمد امین منصبدار بادشاہی شامل ہیں۔

سراج الدین علی خاں آرزو کے متعلق آزاد کا خیال ہے کہ

"خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہونچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خاں آرزو کے عیال کہلائیں گے"

یہ اعتراف اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا ابتدائی بلکہ اولین حلقہ بیدل ہیں۔ آزاد نے بیدل کے اثرات کا بیان کرتے ہوئے شاہ حاتم کا نام بھی لیا ہے جن کو اردو شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور سودا نیز سعادت یار خاں رنگین انھیں کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور بیدل کا انتقال ۱۱۳۳ھ میں ہوا۔ شاہ حاتم امیر خاں انجام شاگرد بیدل کے مصاحب تھے اس لئے ان کا بیدل سے متاثر ہونا بالکل قرین قیاس ہے بیدل کے اثرات یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ غالب اور اقبال تک پہونچتے ہیں، غالب نے فارسی میں بھی ان کے اثر کو قبول کیا ہے۔ اور اردو کے ابتدائی کلام پر تو بیدل کے نقوش بہت واضح ہیں، غالب نے بیدل سے روشنی حاصل کرنے کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے — مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب — ساز بر رشتہ پے نغمۂ بیدل باندھا

اگرچہ ریختہ میں وہ بیدل کے طرز کو نباہ نہیں سکے اور انھیں اسی سلسلہ میں اعتراف عجز کرنا پڑا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

درحقیقت اردو اس دور میں بیدل کی معنی آفرینی، جدت طرازی اور بلند خیالی کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی، اسی لئے غالب نے ریختہ میں ان کا اتباع کرکے چھوڑ دیا۔ اور وہ اشعار بھی اپنے منتخب دیوان سے نکال دیئے جن میں بیدل کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس کے باوجود ان کا جو دیوان متداول ہے اس میں بھی اکثر اشعار میں بیدل کا اثر غالب ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں

اس قسم کے اشعار کی تعداد زیادہ ہے' غالب نے بیدل کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے' بیدل کا ایک شعر ہے

آب گہریم و خونِ یاقوت — داریم بروئے خود چکیدن

غالب کہتے ہیں

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

اقبال بیدل کو مفکر شاعر اور استادِ کامل کہتے ہیں' ایک بار انھوں نے غلام حسین شاکر ساکن گوجرانوالہ کو لکھا تھا کہ اپنے بیان میں حسن پیدا کرنے کے لئے بیدل کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے علاوہ اقبال کی ایک نمایاں شاعرانہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی میں جمود اور بے عملی کے قائل نہیں بلکہ حرکات اور جنبش کے دلدادہ ہیں۔ یہ چیز یقیناً انھیں بیدل کے مطالعہ سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ خود ایک جگہ بیدل کے اس وصف کا ذکر کرتے ہیں۔

" بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے یہاں تک کہ اس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے' بیدل نے ایک شعر میں "خرام کاشت" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ گویا سکون کو بھی بشکل حرکت دیکھا ہے۔"

(ملفوظات اقبال)

اردو میں بیدل کا کوئی دیوان نہیں' لیکن شاہ حاتم سے غالب اور اقبال تک شاعروں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ جو اردو پر بیدل کے اثرات کی شہادت دے رہی ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مرزا بیدل فارسی کے شاعر ہیں اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کا اظہار اسی زبان کی شاعری میں ہوتا ہے۔ ان کا کلام ایک خاص کیفیت کا حامل ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ بہت بڑے شاعر ہیں کہ ان کا ایک خاص نظریہ اور پیغام بھی ہے' جو ان کی نظم اور نثر دونوں پر چھایا ہوا ہے۔ بیدل کے یہاں زبان کی چاشنی نہیں اور ہجر و وصال کے وہ عام خیالات بھی نہیں جن کا تعلق مادی عشق سے ہے' وہ عشق کا سوز اور اس کی تپش ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کا عشق دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک آواز ہے جسے باہر لانے کے لئے بہت وسیع الفاظ' نئی تراکیب اور نئے اسلوب کی ضرورت ہے مرزا کی شاعری انھیں الفاظ' تراکیب اور اسلوب کی حامل ہے وہ اپنے خیالات کی طوفانی رفتار کو شعر کے پیکر میں ڈھالنے کے لئے نئی نئی ترکیبیں اختراع کرتے ہیں اور اہل زبان کی تقلید کے پابند نہیں رہے۔ قدم قدم پر ان زنجیروں کو توڑتے ہیں جو روایت کے نام سے پیروں میں پڑی ہوئی ہیں۔ خیالات کی نوعیت کے ساتھ اسلوب بیان اور طرز ادا کا بدل جانا ضروری ہے۔ اگر کوئی فن کار اس قسم کی تبدیلی پر قادر نہیں تو اسے فن کار ہی نہیں کہا جا سکتا۔

علامہ آزاد لکھتے ہیں

مرزا معنی آفرین بے نظیر است اما عبارت بطور خود دارد و بطور جمہور نیز فراواں جاہا سخن در رشتۂ تعلق کشیدہ[1]

جمہور کے راستہ سے ہٹ جانا ہی بیدل کے لئے مصیبت بن گیا۔ اور ان کی اختراعات ناقدین پر گراں گذرنے لگیں۔

[1] سرو آزاد ص ۱۵۰۔

لیکن بیدل کے یہاں آورد اور تصنع کی افراط نظر آئی اور خیالات کی بلندی ان کی نظر میں معمہ بن گئی، وہ نہ سمجھ سکے کہ بیدل تخئیل کے شاعر ہیں زبان کے نہیں۔ خیالات بہت بلند ہو جاتے ہیں تو الفاظ کی ترکیب اور اسلوب بیان میں پیچیدگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا اپنے خیالات کی بلندی کے پیش نظر الفاظ اور ترکیبوں میں ابداع و اختراع سے کام لیتے ہیں جسے عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان خیالات تک معمولی دماغوں کی رسائی نہیں ہو سکتی اور آسانی سے مہمل کہہ دیا جاتا ہے۔ مرزا نے اپنے بڑے لڑکے کی وفات پر ایک مخمس مرثیہ کے طور پر لکھا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے

ہرگز دو قدم خرامی کاشت　　از انگشتم عصا بکف داشت

اس میں "خرام کاشت" کی ترکیب کو ناپسند کیا گیا ہے حالانکہ اس میں بڑا حسن ہے مگر زمانہ وہ تھا جب ارباب علم پر اہل فارس کی تقلید کا جنون سوار تھا۔ اور روایت سے ہٹنا ادبی کفر تھا کسی ایسے محاورے کو قبول ہی نہ کیا جاتا تھا جو اہل زبان کے خلاف ہو، اختراع اور جدت کے دروازے بند تھے۔ لیکن مرزا نے ان پابندیوں کو جگہ جگہ توڑ کر ثابت کر دیا کہ فن اس وقت تک پھیلتا اور بڑھتا ہی نہیں جب تک ان پابندیوں سے آزاد نہ ہو جائے۔ یہ مرزا کی قدرت کلام اور بلند خیالی کا اعجاز تھا کہ انھوں نے اختراع کا دروازہ کھول دیا۔ بیدل اس صحت مند روایت کی ابتدا نہ کرتے تو مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے فن کار اس رفعت پر نظر نہ آتے جہاں اب ہیں اور اردو شاعری محض دلچسپی کا ایک ذریعہ ہوتی۔ اس دور میں مرزا کی اس روش کو ناپسند ضرور کیا گیا لیکن پسند کرنے والے ارباب علم بھی موجود تھے۔ چناں چہ سراج الدین علی خاں آرزو نے ان تصرفات کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے رسالہ "داد سخن" میں دلائل سے ان کی صحت کو ثابت کر دیا تھا، اس زمانے کے قواعد فصاحت کی پابندی کے ساتھ بھی بیدل نے بیشمار شعر ایسے کہے ہیں جن پر زبان تحسین خاموش نہیں رہ سکتی۔ اس قسم کے اشعار کا انتخاب کیا جائے تو ایک ضخیم دیوان مرتب ہو سکتا ہے۔ مرزا نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدہ غرض ہر صنف میں زور طبع دکھایا ہے۔ وہ نثر میں بھی ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔ مرزا تصوف کے شاعر ہیں اور اس قسم کی شاعری میں ان کا ایک خاص نظریہ ہے، بقول علامہ آزاد انہوں نے کم استعمال ہونے والی بحور میں بھی نہایت قدرت اور شگفتگی کے ساتھ غزلیں کہی ہیں۔ چنانچہ یہ غزل بحر کامل میں ہے جو انہیں بہت مرغوب تھی۔

من تنگ دل چہ اثر برم از حضور ذکر دوام او　　چو نگیں نہ شد کہ فرو روم بخود از خجالت نام او

دو دماغ دیدہ کشودنی نہ سیر فسانہ شنودنی　　ہمہ ربودہ غنودنی بکنار رحمت عام او

اسی طرح اور بہت سی غیر متداول بحور میں انھوں نے بڑی شگفتہ غزلیں کہی ہیں، ان کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ یعنی وہ مشکل اور دشوار خیالات کو نہایت آسانی سے بیان کر دیتے ہیں۔ اور معمولی مضمون کو بھی اپنے ڈھالے ہوئے الفاظ اور نادر تراکیب سے بلند کر دیتے ہیں۔ انہیں یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ بہت وسیع مضمون کو کم الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔

بیدل نے نظم اور نثر کے ہزاروں صفحات اپنے پیچھے چھوڑے ہیں لیکن ناممکن ہے کہ اس بڑے دفتر میں سے ایک مصرعہ یا ایک فقرہ بھی ایسا تلاش کیا جا سکے جس میں ان کا حقیقی رنگ موجود نہ ہو۔

ابھی چند بار بیدل کے فلسفہ شعر اور ان کے پیغام کا ذکر کیا جا چکا ہے، یہی فلسفہ اور پیغام ان کا شاعرانہ جذبہ ہو گیا

تھا ان کی پوری شاعری اسی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ نثر پر بھی یہی جذبہ محیط ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خالق و مخلوق کا تعلق ہست اور لانہایت کا سا ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ، جو ایک پر تو ہے اسی ایک آفتاب کبریائی کا اپنے اصل مکان اور فطری مرکز تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہے۔ اور یہ ساری تلاش و جستجو صرف ایک حیرت ہے۔ ایک حیرانی ہے ابدی، اور ایک بے چارگی و بے کسی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

بیدل کی تصانیف کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کے چار دیوان بھی تھے۔ جو یقیناً کلیات میں شامل ہوں گے۔ ان کے نام یہ تھے (۱) پنج ہزاری (۲) چہار ہزاری (۳) امرائے نام دار۔ پنج ہزاری اور چہار ہزاری غالباً اشعار کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔ ویسے ان سے منصب کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ مرزا کی اولاد کا ذکر کہیں نہیں ملا۔ البتہ خرام کا کاشت والے شعر کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ان کے ایک مخمس کا شعر ہے جو بڑے لڑکے کی وفات پر مرثیہ کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور لڑکے بھی ہوں گے۔ مرزا محمد سعید ان کے بھتیجے تھے اور وہ یا ان کی اولاد پانی پت منتقل ہو گئی تھی۔

آخر میں مرزا کے فارسی کلام کا ایک مختصر انتخاب پیش کرتا ہوں۔

چہ بار کلفتی اے زندگی ہم چو حباب — تمام آبلہ بر دوش کردہٗ مارا
چشم وا کردم و طوفانِ قیامت دیدم — زرنگی روز جزا نیست کہ من می دانم
مدعی درگذر از دعوئ طرز بیدل — سحر مشکل کہ بہ کیفیت اعجاز رسد
چہ مقدارِ خوں در عدم خوردہ باشم — کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم
شاد باش اے دل کہ آخر عقدہ ات وا می شود — قطرہ ما می رسد جائے کہ دریا می شود
مشت خاکم عشق نادانستہ صیدم کردہ است — اے حیا آہم مکن از ننگ صیاد دم مپرس
من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش — اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش
ادب چہ چارہ کند شوق چوں فضول افتد — بجائے عذر دل آوردہ ام قبول افتد
تو کریم مطلق و من گدا چہ کنم جزایں کہ نخوانیم — درے دیگرم بنما کہ من بکجا روم چو برانیم
مستِ عرفان را شراب دیگرے درکار نیست — جز طواف خویش دورِ ساغرے درکار نیست
سر گرانی لازم ہستی بود بیدل کہ صبح — تا نفس باقی است صندل بر جبیں مالیدہ است
نگہ گر نہ شد قابلِ روئے دوست — فغاں می رسانم بجائے کہ اوست
ماہم از گلشن دیدار گلے می چیدیم — ہر کجا آئینہ بینید مرا یاد کنید
ہر جا بروں جوشیدہٗ خود را بخود پوشیدہٗ — در نور شمعت منفعل فانوسی پیراہنت
در نو بہارِ لم یزل جوشید از باغ ازل — نہ آسماں گل در بغل یک برگ سبز گلشنت
بیدل نتواں برد غم از خطِ جبینم — نقاشِ عرق ریز حیا نقش مرا بست
نہ دام دانم و نے دانہ ایں قدر دانم — کہ دل بہر چہ کشد التفات صیاد است

شعرائے ٹونک کا ایک قدیم تذکرہ

نادم سیتاپوری

"سنہ ۱۸۵۷ء کا خونیں ہنگامہ نواب وزیر الدولہ کے عہد حکومت (سنہ ۱۲۷۳ھ) میں ہوا۔ دہلی پر جو کچھ گزری۔ سب جانتے ہیں کہ شرفاء و اہل کمال کے لئے زمین سخت اور آسمان دور کی حالت تھی جس کا جدھر منھ اٹھا جان بچا کر بھاگا۔ اللہ اللہ کر کے یہ ہنگامہ ایک سال سے کچھ عرصہ کے بعد ٹھنڈا ہوا اور آخری مغلیہ سلطنت کا آخری ٹمٹاتا چراغ بھی اس تھپیڑے سے بجھ گیا۔ علماء و ادباء کے لئے کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ نواب وزیر الدولہ میں جتنی سکت تھی انکو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بہتوں کو بلاکر ٹونک میں رہنے کی جگہ دی معاشیں مقرر کیں۔ نواب صاحب (وزیر الدولہ) نے حضرت مولانا سید احمد بریلوی مرحوم کے ساتھیوں کو بھی سرحد سے بلاکر ٹونک میں بسا لیا تھا۔ اسی طرح ٹونک میں ارباب کمال کا اچھا خاصا مجمع ہوگیا۔ دینیات کے بڑے بڑے علماء اور زبان و ادب کے بڑے بڑے ماہرین ٹونک میں جمع ہوگئے۔ لالہ عصمت رائے بلگرامی، منشی بہادون لال مصنف امیر نامہ، رائے برج لال شاہجہاں آبادی۔ سید تفضل حسین خاں خیرآبادی، محمد عمر خاں مصطفےٰ آبادی (صاحب عمدۃ الاخبار) سید حمید الدین حمیدی حافظ عبد الرحمٰن خاں دہلوی، فخر زماں مولانا ارشاد حسین خیرآبادی، مرزا سلیمان اسد لکھنوی، مولانا امام الدین، حکیم سید انور علی حسینی، خان مکرم حیدر علی رامپوری وغیرہ۔

"ایک زمانہ تھا کہ یہ سب لوگ ٹونک میں موجود تھے۔ شہر میں بارہ چودہ مدرسے تھے جن میں اردو فارسی عربی اور دینیات کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ مشہور شعراء میں سے مولوی الٰہی بخش نازش خیرآبادی شاگرد حضرت امیر لکھنوی) کو ایک ہزار اور جناب انور کو دو ہزار تنخواہ ملتی تھی ——"

(صفحہ ۲۴۴ "جائزہ زبان اردو" (حصہ اول) مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند دہلی) سنہ ۱۹۴۰ء)

لیکن اس تاریخی عظمت کے باوجود ٹونک کی علمی اور ادبی تاریخ کا دامن بہت کچھ خالی ہی نظر آتا ہے۔ ٹونک کی خالص ادبی اور علمی سرگرمیوں کا آغاز نواب امین الدولہ وزیر الملک محمد ابراہیم علی خاں بہادر نصیر جنگ کے عہد حکومت میں ہوا —— اور یہی زمانہ ٹونک کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا عہد شباب کہا جا سکتا ہے۔ نواب محمد ابراہیم علی خاں خود بھی صاحب تصنیف و تالیف تھے ان کی ترتیب دئے ہوئے چار فارسی کے تذکرے خدا بخش لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں محفوظ ہیں جن کا ذکر فہرست نسخ خطی فارسی "مراۃ العلوم" (جلد اول) مطبوعہ صادق پور پریس پٹنہ سنہ ۱۹۲۵ء کے مخطوطات میں بصراحت ذیل کیا گیا ہے۔

(۱) نمبر ۷۲۲ "خلاصۃ الکلام" مولفہ نواب امین الدولہ وزیر الملک علی ابراہیم خاں بہادر المتخلص بہ خلیل۔

"مصنف ایں کتاب انتخاب اشعار را صرف بہ مثنویات محدود ساختہ و دیگر اشعار مثلاً قصاید و غزلیات وغیرہ را ترک نمودہ۔" جلد در دو جلد (ص ۴۲ مراۃ العلوم)

(۲) نمبر ۲۰۱/۵۔۶ "ایں جلد ثالث است از حرف "ط" تا حرف "ی" جلد ثالث غائب است۔"

(۳) نمبر ۲۲۲/۹۔۹ "ایں کہ منتخب از اصل کتاب است صرف مشتمل بر احوال شعرا است و انتخاب اشعار متروک است۔ از کتبخانہ نواب سید ولایت علی خاں و نواب سید خورشید نواب (ص ۴۳ مراۃ العلوم)

(۴) نمبر ۲۲۸/۸ "در ذکر احوال شعرائے متقدمین و متاخرین کہ اسمائے اوشان بقید حروف تہجی مندرجہ است و باعرفی شیرازی کہ در تحت حرف العین مذکور است" (ص ۴۴ مراۃ العلوم)

ان تذکروں اور انتخابات کے علاوہ اسی کتب خانے میں منشی بساون لال شاداں بلگرامی دبن سنگھ رائے بلگرامی کے "امیر نامہ" کا ایک قلمی نسخہ بھی محفوظ ہے۔ "خدا بخش لائبریری" میں ان مخطوطات کی موجودگی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ٹونک کے قوانین صحیح معنوں میں اس ادبی اور علمی ورثہ کی قدر نہ کر سکے جسے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں پناہ لینی پڑی۔ ان فارسی تذکروں پر جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اب تک کسی قسم کا تحقیقی کام نہیں کیا گیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہی ہے کہ یہ مخطوطات محفوظات کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

مطبوعہ تذکروں میں ٹونک کا ایک غیر معروف اردو تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جس کے ذکر سے اب تک اردو تذکروں کی تمام فہرستیں خالی نظر آتی ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ تذکرہ دراصل ٹونک کی سرکاری تاریخ "تواریخ محمدی" (حدیقہ راجستان ٹونک ۱۳۱۵ھ) میں ایک ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے۔ جسے ایک ریاستی تاریخ کا نام دینے کے باوجود بھی مشکل سے تاریخ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس تاریخ کا ایک بڑا حصہ فرمانروایان ٹونک کے ایسے سرمایہ دارانہ مشاغل سے بھرا پڑا ہے جنھیں اس دور کے درباری ماحول میں خواہ کچھ بھی مقبولیت کیوں نہ حاصل ہو۔ تاریخی حیثیت سے ان کو کوئی بھی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

اردو کا یہ تذکرہ جسے اسی تاریخ ٹونک کا آخری حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ٹونک کے ایک طرحی مشاعرے کی روداد سے منسوب ہے جو ماہ صفر ۱۳۱۴ھ (مطابق جولائی ۱۸۹۶ء) میں امین الدولہ وزیر الملک نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل والئ ٹونک نے منعقد کیا تھا۔ مصرعہ طرح تھا ؎

نہیں منظور لب یار کو صحبت میری

"بزم خلیل" کے زیر عنوان اسی مشاعرے کی روداد بیان کرتے ہوئے مولف تاریخ ٹونک نے لکھا ہے۔

"بزم مشاعرہ بمکان جناب صاحبزادہ محمد شہر علی خاں بہادر شہ‍رر بوقت نو بجے شب منعقد ہوئی فی الحقیقت اس ریاست میں محفل مشاعرہ اس قدر دھوم دھام سے آج تک نہیں ہوئی۔ جملہ شعرائے نامی گرامی شریک جلسہ صحبت ہیں اپنا اپنا رنگ سخن دکھا رہے ہیں۔ اول ہر ایک شاعر کے حال کی کیفیت۔ زاں بعد صورت کی وجاہت من بعد نتیجۂ طبع کی حالت درج ہے۔ ابتداء

میں کلام طرح و غیرطرح اہل خاندان و غزلہائے غیرطرح شعرائے سحر بیاں اعلیٰ قدر مراتب
اس غرض سے درج تذکرہ ہیں کہ غزلہائے معلوم کا سلسلہ علاوہ اہل خاندان کے جو آخر میں
بقید حروف تہجی قرار دیا گیا ہے منقطع نہ ہو۔"

(صفحہ ۳۵۰ و ۳۵۱ "تواریخ محمدی" مطبوعہ ستارہ ہند پریس آگرہ سنہ ۱۹۰۱ء)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اس قسم کے تذکروں کا عام رواج تھا۔ نولکشور کا شائع کردہ مشہور تذکرہ "گلدستۂ سخن" بھی اسی رنگ کا ایک تذکرہ ہے جس میں مصرع گیسوئے ستمگر کیسو کی طرحی غزلوں کو جمع کر کے ایک تذکرے کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ اب کمیاب ہو چلا ہے۔ مگر تذکروں کی صف میں اسے آج بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس تذکرہ میں اس دور کے قریب قریب تمام مشاہیر شعراء کے مختصر حالات اور ہم طرح غزلیں شامل ہیں جن کی تعداد کئی سو تک پہونچ گئی ہے۔ اس تذکرے کو نسبت تو ایک مخصوص مشاعرے سے دی گئی ہے۔ لیکن جتنے افراد شامل تذکرہ کئے گئے ہیں ان سب کی طرحی غزلیں اس میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔ خصوصاً ٹونک کے شاہی خاندان میں بیشتر ایسے افراد کا ذکر کیا گیا ہے جن کی غزلیں طرح میں نہیں ہیں اور کئی افراد ایسے بھی ہیں جن کی فارسی غزلیں پیش کی گئیں ہیں۔ شاہی خاندان کے علاوہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو کسی نہ کسی نہج سے ریاست ٹونک کے سلسلہ ملازمت سے منسلک تھے یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ٹونک کی علمی اور ادبی سرگرمیاں فرمانروایان ٹونک ہی تک محدود تھیں اور اس دور میں جتنے پڑھے لکھے افراد ٹونک میں موجود تھے، اسباب کچھ بھی ہوں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مالوے میں بھوپال کے بعد وہ ٹونک کے دامن علم و فضل ہی سے وابستہ تھے۔ ٹونک اپنی شعری اور ادبی کچھ پہلو کے لحاظ سے نصف صدی تک سب سے اہم اور ممتاز حیثیت رکھتا تھا اور اسی خصوصیت کی وجہ سے ٹونک کا یہ قدیم تذکرہ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایک ایسی قابل ذکر چیز ہے جس سے ٹونک کی ادبی انجمن خیزیوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس تذکرے (بزم خلیل) میں ۸۵ شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام پیش کئے گئے ہیں جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) خلیل ——— نواب محمد ابراہیم علی خاں (امین الدولہ۔ وزیر الملک۔ صولت جنگ) فرمانروائے ٹونک۔ اردو فارسی۔ ہندی اور عربی کلام کے غیرطرح نمونے درج کئے گئے ہیں۔

(۲) فیروز ——— صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں (خلف وزیر الدولہ بن امیر الدولہ بانیٔ ریاست ٹونک) نائب ریاست صرف ایک غیرطرح اردو غزل درج کی گئی ہے۔

(۳) رسا ——— صاحبزادہ عبد الرحمٰن خاں (صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں کے بھائی) طرح میں غزل ہے۔

(۴) فدا ——— صاحبزادہ محمد خاں۔ غیرطرح اردو غزل درج ہے۔

(۵) وانی ——— صاحبزادہ محمد عبد الرؤف خاں (ابن صاحبزادہ احمد یار خاں آئی بن نواب امیر الدولہ بانیٔ ریاست ٹونک) صاحب دیوان اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ طرح میں غزل ہے اور ایک فارسی کی تضمین بھی۔

(۶) سعید ——— صاحبزادہ محمد سعید خاں (ابن حافظ عبد الکریم خاں شرق بن نواب امیر الدولہ) طرح میں غزل ہے۔

(۷) شمشیر جنگ ——— صاحبزادہ محمد خاں (خلف صاحبزادہ فیض محمد خاں بن نواب الدولہ) اردو کی غیرطرح غزل شامل ہے

(۸) محمود ـــــ صاحبزادہ محمود خاں تہور جنگ (خلف صاحبزادہ نصیر محمد خاں بن نواب وزیر الدولہ) اردو کی غیر طرحی غزل۔

(۹) صفی ـــــ صاحبزادہ محمد صفی اللہ خاں الملقب بہ "سید القوم" (ابن نواب یمین الدولہ بن وزیر الدولہ) اردو کی غیر طرحی غزل۔

(۱۰) رفیق ـــــ صاحبزادہ محمد رفیق خاں (خلف اصغر نواب یمین الدولہ) اردو کی غیر طرحی غزل۔

(۱۱) اشرر ـــــ صاحبزادہ محمد شیر خاں (ابن محمد عبدالرحیم خاں شرف بن محمد جلال خاں بن نواب امیر الدولہ) ایک غزل طرح میں اور دو غیر طرحی غزلیں۔

(۱۲) عاشق ـــــ صاحبزادہ احمد سعید خاں (خلف اکبر محمد سعید خاں) ان کو خواجہ حالی۔ مرزا داغ اور ظہیر دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ طرح میں غزل ہے۔

(۱۳) احسان ـــــ صاحبزادہ محمد احسان اللہ خاں (تلمیذ احمد سعید خاں عاشق) طرحی غزل ہے۔

(۱۴) حنیف ـــــ صاحبزادہ محمد حنیف خاں (خلف شمس الامراء نظام الملک صاحبزادہ محمود خاں) بسمل خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی سے افتخار تلمذ حاصل تھا ـــــ اردو کی غیر طرح غزل شامل تذکرہ ہے۔

(۱۵) وفا ـــــ صاحبزادہ محمد حسن خاں (خلف اصغر اعتماد الملک صاحبزادہ محمد خاں) ناظر سکندر آبادی کے شاگرد تھے ایک فارسی اور ایک اردو دیوان ان کی تصانیف میں ہے۔ اردو کی غیر طرح غزل درج تذکرہ ہے۔

(۱۶) شمیم ـــــ صاحبزادہ محمد عبدالکبیر خاں (خلف اکبر صاحبزادہ محمد منیر خاں نبیرہ نواب وزیر الدولہ) اردو کی غیر طرح غزل درج ہے۔

(۱۷) صابر ـــــ صاحبزادہ محمد ایوب خاں (خلف صاحبزادہ محمد امان خاں) طرح میں غزل ہے۔

(۱۸) افسر ـــــ کرنل صاحبزادہ محمد عبدالرحمٰن خاں (ابن عمدۃ الملک صاحبزادہ احمد یار خاں) طرحی غزل درج ہے۔

(۱۹) رنگین ـــــ صاحبزادہ محمد عبداللطیف خاں۔ طرح میں غزل ہے۔

(۲۰) شیدا ـــــ صاحبزادہ محمد حمید اللہ خاں۔ طرح میں غزل ہے۔

(۲۱) سحر ـــــ صاحبزادہ محمد شفیع خاں۔ اردو میں کم کہتے تھے۔ ہندی کے اچھے "کوی" تھے۔ "تلک کامود" کی ایک ٹھمری اور ہولی وغیرہ نمونہ کلام کے طور پر درج کی گئی ہے۔

(۲۲) آرزو ـــــ صاحبزادہ محمد یونس خاں۔ طرحی غزل شامل تذکرہ ہے۔

(۲۳) اشرف ـــــ صاحبزادہ اشرف احمد خاں۔ طرح میں غزل ہے۔

(۲۴) ظہور ـــــ صاحبزادہ ظہور احمد خاں۔ طرح میں غزل ہے۔

(۲۵) عیش ـــــ صاحبزادہ محمد عبدالشکور خاں۔ حافظ عالمگیر خاں کیف کے شاگرد تھے۔ طرح میں غزل کہی ہے۔

(۲۶) یاس ـــــ صاحبزادہ محمد الیاس خاں۔ طرح میں غزل ہے۔

(۲۷) حمید ـــــ صاحبزادہ محمد عبدالحمید خاں (خلف صاحبزادہ عبدالمجید خاں رسا) غیر طرحی غزل شامل تذکرہ ہے۔

(۲۸) زار ـــــ صاحبزادہ محمد نور خاں۔ غیر طرح غزل درج ہے۔

(۲۹) انور ——— صاحبزادہ محمد انور خاں ـــ غیر طرح نعت شامل تذکرہ ہے۔ (عمر ۱۴ سال)

(۳۰) حافظ ——— صاحبزادہ حافظ محمد واحد نور خاں۔ غیر طرحی غزل درج تذکرہ ہے۔ (عمر ۱۴ سال)

(۳۱) نور ——— صاحبزادہ محمد حبیب نور خاں (عمر ۱۲ سال) غیر طرح غزل ہے۔

(۳۲) صابر ——— صاحبزادہ محمد صابر علی خاں وکیل۔ طرحی غزل شامل تذکرہ ہے۔

(۳۳) خاور ——— صاحبزادہ محمد مجید اللہ خاں ـــ تدبیر الدولہ مظفر علی خاں اسیرؔ لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ غیر طرح غزل درج ہے۔

(۳۴) ضبط ——— صاحبزادہ محمد حبیب اللہ خاں (صاحب دیوان) سیف الدین خاں سیفؔ کے شاگرد تھے۔ طرح میں غزل ہے۔

(۳۵) شائق ——— صاحبزادہ محمد یوسف علی خاں۔ طرح میں غزل ہے۔

(۳۶) واقف ——— صاحبزادہ عبدالغفار خاں۔ ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ طرح میں غزل ہے۔

(۳۷) موزون ——— صاحبزادہ محمد حسن رضا خاں۔ غزل طرحی درج تذکرہ ہے۔

(۳۸) اسد ——— نواب محمد سلیمان خاں لکھنوی۔ غیر طرح غزل۔ ان کا ذکر تذکرے کے دوسرے جزو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

(۳۹) بسمل ——— حافظ سید محمد حسین خیرآبادی (ملک الشعرا لسان الملک) امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ غیر طرحی غزل شامل تذکرہ ہے۔ انہوں نے ابتدا مشق سخن غالب سے کی تھی۔

(۴۰) مضطر ——— سید محمد افتخار حسین خیرآبادی (افتخار الشعرا اعتبار الملک۔ اقتدار جنگ) بسمل خیرآبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ امیر مینائی سے افتخار تلمذ تھا۔ غیر طرح غزل شامل تذکرہ ہے۔

(۴۱) فصیح ——— کپتان سید نور الدین احمد (فصیح الملک) غیر طرح حمد درج تذکرہ ہے۔

(۴۲) گرامی ——— حکیم محمد سلطان محمود خاں (سلطان الشعراء مسیح الدولہ۔ اعجاز الملک) مترجم نظم صولت فاروقی فارسی غزل شامل ہے۔

(۴۳) رشکی ——— مولوی عبدالصمد خاں۔ فارسی کے شاعر تھے۔ فارسی ہی کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے صرف دو تین غیر طرح اردو اشعار لکھے گئے ہیں۔

(۴۴) سیماب ——— حکیم سید احمد علی مولف گلدستہ خرد و مترجم تزک جہانگیری۔ فارسی کے شاعر تھے فارسی غزل درج ہے۔

(۴۵) اسعد ——— سید سعید احمد "مترجم امیر نامہ"۔ اردو کی غیر طرحی غزل اور ایک فارسی غزل شامل تذکرہ ہے۔

(۴۶) معجز ——— قاضی حکیم عبدالحلیم خاں۔ یہ بھی فارسی میں کہتے تھے۔ فارسی ہی کی غزل درج ہے۔

(۴۷) جری ——— نواب سلطان احمد خاں عرف نواب بہادر (اسد لکھنوی کے صاحبزادے) غیر طرحی غزل شائع کی گئی ہے۔

(۴۸) ممتاز ——— منشی ممتاز الدین۔ مطبع محمدی ٹونک کے منتظم تھے۔ اردو کی غیر طرح غزل درج تذکرہ ہے۔

(۳۹) اثر ــــ فدا احمد خاں۔ (ابن حکیم احمد حسین خاں دہلوی) ان کی بھی غیر طرحی غزل شامل ہے۔

اس کے بعد تذکرہ کا دوسرا حصہ حروف تہجی سے شروع کیا گیا ہے۔ جس میں زیادہ تر متوسلین و ملازمین دربار ٹونک کی ہم طرح غزلوں کا انتخاب اور حالات درج ہیں۔ صرف نواب محمد سلیمان خاں اسد لکھنوی کا تفصیلی ذکر و بار شامل کیا گیا ہے۔ میں اسی ترتیب کے ساتھ ان افراد کا مختصر تذکرہ درج کر رہا ہوں۔

۱۔ اسد ــــ نواب محمد سلیمان خاں لکھنوی۔ مکرم الدولہ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں (والیٔ بریلی) کے پوتے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں نے خاں بہادر خاں کی بغاوت کے جرم میں ان کے سارے خاندان کی پنشن بند کردی۔ ٹونک پہونچے۔ عرصہ تک ٹونک کے شاہی خاندان کو رموز شاعری سکھانے پر مامور رہے۔ اس کے بعد بحیثیت ایجنٹ ریزیڈنسی سیہور پر متعین کئے گئے۔ ٹونک کے بہت سے افراد فن شعر میں آپ ہی کے حلقہ تلامذہ سے منسلک تھے۔

۲۔ احسن ــــ حافظ آغا جان دہلوی (ابن میرزا نور اللہ بیگ کابلی) اتفاقیہ شریک مشاعرہ ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا ذکر بھی شامل تذکرہ کیا گیا۔

۳۔ ارمان ــــ سید عبدالرحمن خلف سید حمید الدین رعنا۔ نظامت مال ٹونک میں ملازم تھے۔ احمد سعید خاں عاشق کے شاگردوں میں تھے۔

۴۔ افغان ــــ محمد خاں۔ کپتان محمد اختر بلند خاں مصطفےٰ آبادی جاگیردار کے پوتے تھے۔

۵۔ تمکین ــــ محمد ابراہیم خاں (تلمیذ منشی محمد ابراہیم خاں رمز)

۶۔ ثاقب ــــ مولوی نجم الدین احمد بدایونی ساکن ریاست بڑودہ تلمیذ مرزا داغ دہلوی و ظہیر دہلوی شریک مشاعرہ تھے اس لئے ان کا ذکر بھی کیا گیا۔

۷۔ جوہر ــــ منشی عبدالحکیم خاں سیاہہ نگار نظامت سائر ریاست ٹونک۔

۸۔ حسن ــــ منشی علی حسین خاں۔ ریاست ٹونک میں ملازم تھے۔

۹۔ حسرت ــــ مولوی عبدالوحید خاں (ابن مولوی عبدالغنی سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد دکن)

۱۰۔ خرد ــــ سید نیاز احمد۔ شاگرد اسد لکھنوی۔ ٹونک کے رہنے والے تھے۔

۱۱۔ راقم ــــ خواجہ میرزا قمرالدین خاں (عرف خواجہ مرزا خاں دہلوی) مترجم بوستان خیال۔ صاحب دیوان یہ بھی شریک مشاعرہ تھے۔

۱۲۔ رمز ــــ منشی محمد ابراہیم خاں۔ شاگرد سید نیاز احمد خرد۔ اردو و فارسی کے دو دیوان موجود تھے۔

۱۳۔ رعنا ــــ سید حمید الدین (سررشتہ دار نظامت مال ٹونک) صاحب دیوان تھے۔

۱۴۔ راغب ــــ محمد سعید خاں۔ احمد سعید خاں عاشق کے شاگرد تھے۔

۱۵۔ سیف ــــ سیف الدین خاں تلمیذ اسد لکھنوی۔

۱۶۔ سراغ ــــ محمد حضرت نور خاں پہلے صاحبزادے رفیع الدین خاں (دانش) سے اصلاح لیتے تھے ان کے

بعد مرزا داغ کے شاگرد ہوئے۔

۱۷۔ اِستِما ـــــ مولوی امیر حسن خاں مدرس مدرسہ ٹونک۔ فارسی زیادہ کہتے تھے۔ اردو میں برائے نام غزلیں ہیں۔
۱۸۔ سوزِ ـــــ منشی لچھمی سہائے شاگرد اسد لکھنوی۔
۱۹۔ شاکر ـــــ احمد علی خاں ڈپٹی کلکٹر ریاست جے پور۔ غالباً شریک مشاعرہ ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا ذکر بھی کیا گیا۔
۲۰۔ شاد ـــــ منشی جگن ناتھ پرشاد اہلمد نظامت مال ٹونک۔ محمد ابراہیم خاں رمز کے شاگرد تھے۔
۲۱۔ طپش ـــــ لالہ امراؤ لال۔ جمع خرچ نویس محکمہ نظامت سائر ٹونک۔ شاگرد حکیم سید محمد اصغر علی آبرو مولف تذکرہ۔
۲۲۔ ظہیر ـــــ سید ظہیر الدین حسین (مصنف قصہ ممتاز) سابق داروغہ ماہی مراتب شاہ دہلی۔ حال ملازم سرکار ٹونک عمر تخمیناً ۶۵ سال صاحب دو دیوان۔ شاگرد حضرت ابراہیم ذوق دہلوی خلف اکبر صلاح الدولہ مرصع رقم خاں سید جلال الدین حیدر خاں مرحوم بخط نسخ استاد بادشاہ دہلی۔
۲۳۔ مولوی عنایت حسین خاں رام پوری شاگرد شیخ امداد علی بحر لکھنوی۔ دو دیوان ہیں۔
۲۴۔ عشق ـــــ سید برکت علی (بن سید محمد علی بھوپال)
۲۵۔ غمگین ـــــ شیخ محمد۔ منشی محمد ابراہیم خاں رمز کے شاگرد تھے۔
۲۶۔ فہم ـــــ امین الدین خاں۔ سید محمد ناظر حسین ناظر سے شرف تلمذ تھا۔
۲۷۔ قمر ـــــ حافظ محمد نصرت اللہ خاں (عرف محمد احمد خاں) محمد ابراہیم خاں رمز کے شاگردوں میں تھے۔
۲۸۔ کلامی ـــــ سید محمد عبد الرزاق حسنی۔ ملک الشعراء الہی بخش نازش خیرآبادی سے افتخار تلمذ حاصل تھا۔ مثنوی "صمصام الاسلام" (ترجمہ فتوح الشام) ان کی یادگار ہے۔
۲۹۔ کیف ـــــ حافظ عالمگیر خاں۔ دو دیوان موجود ہیں۔
۳۰۔ گوہر ـــــ منشی شیخ احمد۔ محافظ دفتر ٹونک۔ شرف تلمذ منشی محمد ابراہیم خاں رمز سے تھا۔
۳۱۔ مائل ـــــ حافظ حمید اللہ خاں صوبہ دار۔
۳۲۔ مشتاق ـــــ مشتاق احمد عطار۔ شاگرد اسد لکھنوی۔
۳۳۔ ماہر ـــــ غلام قادر خاں شاگرد محمد ابراہیم خاں رمز۔
۳۴۔ ناظر ـــــ سید محمد ناظر حسین سکندر آبادی۔ جیلر صدر جیل ٹونک۔ دو دیوان یادگار چھوڑے۔
۳۵۔ یاس ـــــ سید شرف الدین احمد شاگرد رشید حکیم سید سعید احمد اسعد۔ مدرسہ ناصریہ میں مدرس تھے۔
۳۶۔ آبرو ـــــ حکیم سید محمد اصغر علی دربار ٹونک کی باوقار شخصیت حکیم سید انور علی حسینی رام پوری کے صاحبزادے بہت سی طبی اور غیر طبی کتابوں کے مصنف ـــــ!

زیر بحث تاریخ ٹونک اور تذکرہ "بزم خلیل" بھی انھیں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ آبرو درباری "داؤں و پیچ" کے ایک مشاق کھلاڑی معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ "تاریخ ٹونک" کے ایک ایک لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تاریخ

کی ترتیب و تدوین کا مقصد تاریخی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے کہیں زیادہ اپنا شخصی اور ذاتی پروپگنڈہ تھا یہی وجہ تھی کہ آبرو نے ٹونک کی ہر ایسی شخصیت کو دبانے کی کوشش کی ہے جس میں ذرا بھی ابھرنے کی سکت و صلاحیت پائی جاتی تھی۔

اعتبار الملک حکیم سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی کے ذکر میں اس حقیقت کو قطعاً نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ وہ والیٔ ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل اور شاہی خاندان کے بیشتر افراد کے استاد تھے۔ اسی طرح اپنے ہم پیشہ حکیم سید عابد علی کوثر خیرآبادی کے ذکر کو بھی بالکل چھوڑ دیا۔ جو نہ محض ایک اچھے درباری طبیب تھے بلکہ اپنے دور کے ایک صاحب فن شاعر بھی ——!

اسی طرح مضطر خیرآبادی کے بھانجے ناظر حسین اختر گوپاموی۔ سید فخرالدین احمد مائل خیرآبادی۔ سید کرامت علی طلش۔ منشی عبدالوحید قیس فتح پوری وغیرہ کا نام بھی اس تذکرے میں کہیں نظر نہیں آتا جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ یہ تاریخ و تذکرہ درباری رقابتوں اور باہمی چشمک کی چھاؤں میں مرتب کیا گیا تھا۔ جس کا مقصد مورخانہ فرائض کی ادائی یا تذکرہ نویسی کی ذمہ داریاں پوری کرنے سے کہیں زیادہ اپنی خدمات کو نمایاں کرنا تھا۔

ان دانستہ یا نادانستہ خامیوں کے باوجود اس کتاب نے بعض تاریخی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے نواسے حافظ سید محمد حسین بسمل خیرآبادی کا ذکر تو ایک آدھ تذکرے میں مل جاتا ہے لیکن ان کے سن وفات پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ آبرو نے صفحہ ۲۳۷ میں لکھا ہے۔

"اس سال (۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) میں ملک الشعرا لسان الملک حافظ محمد حسین صاحب بسمل نے اس جہان فانی سے ملک جاودانی کو انتقال کیا۔

اسی طرح بسمل کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وفات سے کچھ زمانے پہلے وہ ریاست ٹونک کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ ملک الشعرا مولوی الٰہی بخش نازش کے بارے میں لکھا ہے ——

"اسی سال (۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء) میں مولوی الٰہی بخش صاحب نازش تخلص خلف مولوی محمد صالح صاحب خیرآبادی شاگرد رشید تدبیرالدولہ مدبرالملک منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی رشتہ دار منشی سید تفضل حسین خاں صاحب وارد دارالریاست ہذا ہو کر بعہدہ وکالت ریزیڈنسی دارالخیر اجمیر سرفراز فرمائے گئے۔ بعد ازاں بعہدہ وکالت ایجنسی میواڑ مامور ہوئے۔ زاں بعد اس خدمت سے استعفیٰ دے کر حاضر در دولت ہوئے۔ حضور نواب وزیرالدولہ بہادر نے بہ مزید قدردانی ہزار روپیہ سالانہ مولوی صاحب کا بطور پنشن مقرر فرمایا اور یہ سالانہ ۱۲۸۹ھ تک کہ یہی سال وفات مولوی صاحب کا ہے ملتا رہا۔ یہ شخص فن شعر و سخن میں اپنے وقت کا استاد کامل تھا۔ مضامین و بندش و مذاق شعر سے کما حقہ بہرہ حاصل تھا چنانچہ ان کے اکثر اشعار بزبان فارسی و اردو مولف نے منتخب التواریخ"

مولفہ خود میں لکھے ہیں۔" (ص ۴۶)

تنازش علامہ فضل حق خیرآبادی کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ عرصہ تک اپنے چچا علامہ فضل امام خیرآبادی کے ساتھ دہلی میں رہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب اس خاندان پر "جرم بغاوت" کی کالی گھٹائیں منڈلائیں تو یہ ٹونک پہونچے اور مرتے دم تک اسی ریاست کے دامن علم و فضل سے وابستہ رہے۔ ٹونک کی علمی اور ادبی تاریخ کا یہ عہد زریں نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے عہد حکومت میں شروع ہوا، اور غالباً ان کی وفات کے بعد ہی ختم ہوگیا۔ اسی زمانے میں قطب الدین احسن مارہروی "ریاض سخن" کے نام سے ایک شعر و سخن کا گلدستہ نکالتے تھے۔ مضطر خیرآبادی کی کوششوں سے ان کی رسائی دربار ٹونک میں ہوئی۔ اور جون ۱۸۹۵ء میں "ریاض سخن" "ریاض خلیل" بن گیا۔ چنانچہ احسن نے اس تبدیلی کا جو اعلان کیا تھا اس کی سرخی تھی۔

"ہوا ریاض سخن آج سے ریاض خلیل"

اس گلدستہ میں شعرائے ٹونک کے علاوہ دوسرے شعراء کی غزلیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ ابتداء میں احسن مارہروی کا لکھا ہوا ایک آدھ قصیدہ نواب ابراہیم علی خاں خلیل (والیٔ ٹونک) کی شان میں ہوتا پھر ملک الشعراء مضطر خیرآبادی کی غزل ــــــ

تذکرہ "بزم خلیل" گوناگوں خامیوں کے باوجود شعرائے ٹونک کا یہ پہلا اردو تذکرہ ہے۔ اس سے پہلے ٹونک میں جو تذکرے لکھے گئے اول تو وہ فارسی میں ہیں دوسرے غیر مطبوعہ ــــــ اس کے علاوہ جہاں تک میرا خیال ہے ان قلمی تذکروں میں ان تمام مشہور و معروف شعراء کا ذکر شامل ہوگا جن کے اذکار فارسی کے دوسرے تذکروں میں موجود نہیں۔

فرہنگ مصادر اردو

اردو کا ایک بیش بہا خزانہ

مفتوں کوٹوی

"فرہنگ مصادر اردو" مولوی محمود عالم خاں صاحب قیصری کی قلمی محنت و کوشش کا نتیجہ ہے۔ بقول شاد میرٹھی فرہنگ و لغات لکھ دینا اتنا مشکل کام نہیں جتنا مشکل کام تلفظ و استعمال کا لحاظ اور معانی و مفاہیم کے ثبوت میں جگہ جگہ سے شہادتیں بہم پہونچانا ہے۔ یہ کام اس وقت اور بھی جانکاہ ہو جاتا ہے جب اساتذہ کے دواوین کھنگال کر تمثیل و نظیر کے طور پر مختلف اشعار پیش کئے جائیں، اول تو ان اہل زبان مستند شعراء کا انتخاب جن کی زبان سند کا درجہ رکھتی ہو۔ پھر ان کی نگارشات و تخلیقات کی فراہمی مزید برآں سمندر میں غوطے لگا کر دُرِ مقصود حاصل کرنا ــــــــ یہ کام خواہ کوئی کرے اپنی اپنی محنت و کاوش تک ضرور قابل توصیف و لائق تحسین ہے۔ ایسے لوگوں کا اس ادب پر زبردست احسان ہے جس ادب کے لئے ان کی یہ مساعی جمیلہ ظہور میں آئیں۔ ان کی صلاحیت و محنت ضبط و حوصلہ، کوشش و تندہی جگر کاوی و دماغ سوزی ہرگز ہرگز نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ ایسی ہستیاں ہی ادب کے خزانوں میں اپنے علمی سرمایوں سے اضافہ کرتی ہیں۔ اور اس کی رونق و زینت میں مزید تابناکیاں بڑھاتی ہیں۔ اس فرہنگ میں جناب قیصری نے مصادر کا لازم و متعدی ہونا بھی درج فرمایا ہے۔ اور فصیح و غیر فصیح ہونا بھی۔ معانی و مفاہیم بھی لکھے ہیں۔ اور تمثیل و نظیر میں مسلمہ اساتذہ کے اشعار بھی تحریر فرمائے ہیں۔ اس سے مفہوم کی توضیح کے علاوہ صحت تلفظ کا بھی تیقن ہو جاتا ہے۔ اخیر میں ان شعراء سے بھی متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن کا کلام بہ طور سند اس فرہنگ میں شامل کیا گیا ہے۔ اردو میں کئی فرہنگ و لغات موجود ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ آئندہ اس طرف توجہ دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

علمی تحقیق و تجسس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا، خواہ موضوع ایک ہی ہو یا مختلف ــــ ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کے مصداق ہر مصنف کی تصنیف ایک جداگانہ نوعیت و حیثیت رکھتی ہے۔ کئی فن کار ایک ہی عنوان پر طبع آزما

کریں تو بھی طبیعت و مزاج کے اختلاف کے باعث تخلیقات میں یکسانیت نہ مل سکے گی۔ طرحی مشاعرے اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ جہاں ہر شاعر ایک ہی زمین اور ایک ہی قافیہ و ردیف میں اپنے مخصوص رنگ کی ایسی مختلف غزل پیش کرتا ہے جو دوسری غزلوں سے علیحدہ پہچانی جا سکتی ہے ——— سعی و کوشش کا انجام نتیجہ میں یکسانیت لئے ہوئے ہو تو بھی یہ یکسانیت سعی و کوشش کی قدر و قیمت نہیں گھٹا سکتی، نتیجہ تک پہنچنے کے ذرائع، اور ان ذرائع میں مشکلات و موانعات کا مقابلہ، اس مقابلہ میں ثبات و استقلال نہ صرف عزم و حوصلہ کی شہادت بہم پہونچاتے ہیں۔ بلکہ خلوص و خدمت کے جذبات کی نشاں دہی بھی کرتے ہیں۔ ہر کارواں کا عزم سفر۔ انداز سفر اور جوش سفر جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ خواہ کارواں ایک ہی منزل کی طرف بڑھ رہا ہو۔ بہرحال اردو پرستوں کی خدمت میں فرہنگ مصادر اردو کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، جن سے جناب قیصری کی خدمت و محنت کا پتہ چل سکے گا۔ یہ فرہنگ اچھی ضخامت کا ایک مجموعہ ہے۔ جو ابھی قلمی صورت میں ہے۔ اور طباعت سے محروم ——— ہمارا اردو ادب اتنا خوش قسمت کہاں ہے کہ اس کا ہر فن کار اور خدمت گذار روشنی میں آچکا ہو۔ اور اس کے خون جگر سے بنائے ہوئے نقوش سے عوام مستفیض و متعارف ہو چکے ہوں۔ اکثر ہمارے ادباء گمنام ہیں اور ان کی تخلیقات بھی انھیں کے ساتھ قعر گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔ اُفقِ اردو پر جتنے ستاروں کی جگمگاہٹ سے ہم روشناس ہو چکے ہیں۔ وہی سب کچھ ہماری نظروں کی جلوہ گاہ نہیں ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہماری محرومی قسمت کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے۔!

مولوی محمود عالم خاں صاحب قیصری اکیاسی سالہ مرد بزرگ ہیں۔ اور ہمارے قدیم تہذیب و شرافت کی ایک دل کش یادگار۔ شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ وکیل بھی ہیں۔ عربی کے عالم ہیں۔ اور فارسی کے فاضل۔ پچیس سال کی کد و کاوش سے مسند امام احمد کی باقاعدہ ترتیب و تدوین کی۔ ان کے دیوان کا نام "خیابان قیصری" ہے۔ موقع ہوا تو اس رسالہ کی کسی آئندہ اشاعت میں آپ ممدوح سے قلمی تعارف حاصل کر سکیں گے۔ ان دنوں باراں ضلع کوٹہ (راجستھان) میں مقیم ہیں۔ ایک عرصہ سے وکالت و طبابت کے ذریعہ اپنی عمر کے آخری ایام یہیں بسر فرما رہے ہیں۔ خدا ایسے حضرات کا سایہ تادیر قائم رکھے۔'

صرف پندرہ مصادر بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں ؎ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

(۱) آنا۔ مصدر لازم۔ بہ معنی آمدن۔ خلاف جانا۔ اپنی جگہ سے حرکت کرنا۔

داغؔ ؎	نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہدو	کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے
آتشؔ ؎	ترا کیا کام اب دل میں غم جاناں آتا ہے	نکل اے صبر اس گھر سے کہ صاحب خانہ آتا ہے
داغؔ ؎	نہ آئے بھی وہ تو منھ کو چھپائے مرے آگے	اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے

آتش ؎ عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے ہوائے گل سے ہم کس وادیٔ پرخار میں آئے

اپنے اصلی معنی کے علاوہ محاورہ کے اور بہت معنی دیتا ہے، جیسے آگے بڑھنا، موجود ہونا، سامنے آنا۔ دکھائی دینا۔ تعظیماً تشریف لانا، حملہ کرنا، مستعد ہونا۔ دیگر محاورات ـــــــ دل آنا بہ معنی عاشق ہونا، منھ آنا بہ معنی منھ میں آبلے ہونا۔ آنکھ آنا بہ معنی آنکھ دکھنا، آشوب کرنا۔ چت آنا۔ بہ معنی چت گرنا۔ رستے رستے آنا وغیرہ

(۲) آنکنا:۔ متعدی۔ فصیح۔ بہ معنی اندازہ کردن۔ جانچنا۔ قیمت لگانا۔ تخمینہ کرنا، کوتنا۔

بیخود دہلوی ؎ ابھی اتنی نظر کہاں ان کو جنس دل کا ہے آنکنا مشکل

" ؎ مول لیتے اسے کونین سے بھی کچھ کم میں نہ دیا آنکنے والوں نے چکانے ہم کو

مولوی عزیز الرحمٰن حبیب اثر الہ آبادی ؎ مبصر جوہری نے میرا اشک انفعال اثر وہ تاج سلیماں سے زیادہ قیمتی آنکا

(۳) اترنا، اوترنا:۔ لازم۔ فصیح۔ اوپر سے نیچے آنا۔ کسی جگہ ٹھہرنا، مقام کرنا۔ کم ہونا۔ گھٹنا۔ پار ہونا۔ سڑنا بگڑنا۔

داغ ؎ الٰہی کیا کریں ضبط محبت ہم تو مرتے ہیں کہ نالے تیر بن بن کر کلیجے میں اوترتے ہیں

امیر مینائی ؎ برنگ شمع اترتی نہیں کبھی شب غم ہزار آئے پسینہ بخار باقی ہے

دل اترنا۔ پار اترنا۔ سر اترنا۔ تصویر اترنا۔ روپیہ اترنا۔ قرضہ اترنا۔ بدن سے یا عمر سے اترنا۔ ہاتھ یا پاؤں یا اور عضو اترنا۔ دودھ اترنا۔ نرخ یا بھاؤ یا دام اترنا۔ نگاہ یا آنکھ اترنا۔ دل یا طبیعت سے اترنا۔ بازاری محاورہ میں کسی غیر عورت سے جماع کرنا۔

(۴) اتارنا } متعدی۔ فصیح۔ کسی چیز کا اوپر سے نیچے لانا۔ برخلاف چڑھانا نیچے سے اوپر نکالنا۔
اوتارنا } کم کرنا۔ تراشنا۔ وارنا۔ علیحدہ کرنا۔ ٹھہرانا۔ اخذ کرنا۔ جوڑ کا اپنی جگہ سے ہٹانا۔ نقل کرنا۔ بھگتانا۔ وغیرہ۔

داغ ؎ تری شمشیر پہ خم نے ہزاروں سر اوتارے ہیں یہی تو گھاٹ ہے بحر محبت کے اوتارے کا

راسخ ؎ پوست کندہ یہ کہتے ہیں ناخن ہم اتاریں گے زخم کے چھلکے

امانت ؎ نقش و تعویذ سے آسیب ہے مارا جاتا یہ وہ جن ہے جو نہیں سر سے اوتارا جاتا (عشق)

مظہر الہادی سہیل ؎ ہوا بے باک کھلتے کھلتے یار آہستہ آہستہ اتارے وصل میں پھولوں کے ہار آہستہ آہستہ

دیگر محاورات:۔ سر اتارنا۔ ہاتھ اتارنا۔ نظر سے اتارنا۔ تصویر اتارنا۔ نقشہ اتارنا۔ صدقہ اتارنا۔ قورپے کا تارا اتارنا۔ گھر اتارنا۔ برچھی اتارنا۔ چھت اتارنا۔ آسمان کے تارے اتارنا۔ کپڑے اتارنا۔ روپیہ یا قرضہ اتارنا۔ بھوت اتارنا۔ کڑھائی اتارنا۔

(۵) اتروانا، اوتروانا:۔ متعدی المتعدی۔ فصیح

میر حسن ؎ زنانی سواری اوتروا کے ساتھ پکڑ اس گل نوشگفتہ کا ہاتھ

آتش ؎ فسوں گر کوئی ان مطرب بچوں سے کیا فزوں ہوگا سر مجلس اوترواتے ہیں شیخ و شاب کا جوڑا

جرأت ؎ بام پہ چڑھ کر نہ ہر اک سے لڑاؤ آنکھ جی — تن سے کیا منظور ہیں اب سر اتروانے کئی
شوق ؎ ہٹ گئے سب زنانہ کروایا — باغ میں ان کو لا اتروایا
بحر ؎ پریاں بھی میں نے سر سے اتروائیں بارہا — او ترانہ اس سے زلف کا سایہ کسی طرح
صابر ؎ صدقے سائے ترے اوپر سے اوتروانا تھا — گنڈے تعویذ ترے واسطے میں لاتا تھا

(۶) اچکنا، اوچکنا:۔ لازم۔ فصیح۔ بہ معنی ربودن۔ اوپر ہی اوپر لے لینا۔ چھین لینا۔ لپکنا۔ جھپکنا۔ اچھلنا کودنا۔ لے دوڑنا۔ لے بھاگنا۔ بلند ہونا۔

یکتو ؎ اس کے قامت کو قیامت سے بھلا کیا نسبت — بہت اچکی جو کبھی یہ تو کمر تک آئی
رنگین ؎ چھٹی کے بعد یہ ڈھویا مرے کا جھن جولائی ہے — ندیدی ہو بیا تم زیچ میں سے جو اچکتی ہو
آتش ؎ یہی رہا ذقن یار دیکھ کر افسوس — اچک کے گرتے ہم اس میں اگر کنواں ہوتا
داغ ؎ گر رسائی چاہتی ہے اور تو اپنا عروج — اے عامل جا کسی اچکی ہوئی تقدیر سے
میر ؎ خوش سواری و خوش جلو، خوش راہ — باگ اچکے تو پھر نہ ٹھہرے نگاہ
ناسخ ؎ جب اوچکتی ہے طبیعت بہر مضمون بلند — طائر سدرہ کے آجاتے ہیں شہپر ہاتھ میں
ظفر ؎ منہ لگائے کوئی کیا ایسے اچکوں کو ظفر — ہیں جو کم بخت نوالے کو اچکتے منہ سے

(۷) بانٹنا:۔ متعدی فصیح ـــــــ تقسیم کرنا۔ حصے کرنا۔

امیر — بانٹا تمام خلق کو اللہ نے وہی — جو کچھ بچا ہوا تری خلقت سے نور تھا
انیس — گل ہائے جراحت کو عجب حسن سے بانٹا — نکلی نہ کوئی شاخ نہ الجھا کوئی کانٹا
میر — پلکوں سے تیری ہم کو کیا چشم داشت یہ تھی — ان برچھیوں نے بانٹا باہم جگر ہمارا
آزاد — جا بجا ساتھ کھلونوں کے مٹھائی بانٹے — کہیں آنا کہیں پیسہ کہیں پائی بانٹے

(۸) باندھنا:۔ متعدی۔ فصیح۔ کھولنے کے برخلاف۔ بہ معنی بستن۔ بندش کرنا۔ جکڑنا۔ گانٹھ دینا۔ گرہ لگانا۔ لٹکانا وغیرہ۔

داغ ؎ بیٹھو بھی مرے قتل پہ کیا باندھو گے تلوار — دیکھوں تو سہی باندھنی آتی ہے کمر بھی
رنگین ؎ پارسا رنڈی کو مت گن زینہار — تو گدھے کو باندھ گو ہے جو ریار
خواجہ امین ؎ دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے — بلبل کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے
انیس ؎ گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں — اک پھول کا مضمون ہو سو رنگ سے باندھوں
انشا ؎ سب اس کو سرو باندھتے ہیں تو اس کو تاڑ باندھ — بوسہ کی گر ہوس ہے تو گردِ اس کے باڑ باندھ

محصول باندھنا۔ قانون باندھنا۔ خیال باندھنا۔ سیدہ یا نشانہ باندھنا۔ مضمون باندھنا۔ لڈو باندھنا۔ ہاتھ باندھنا۔ صف باندھنا۔ بہتان باندھنا۔ بال باندھنا (ہندو عورات) نکاح باندھنا۔ استرہ کی دھار باندھنا

تلوار کی دھار یا کڑھائی باندھنا۔ وقت باندھنا۔ درخت یا کڑے سے باندھنا۔

(۹) بدکنا :۔ لازم۔ فصیح۔ پورب میں بچکنا۔ بھڑکنا۔ چونکنا۔ اچٹنا۔ ڈرنا۔ سہمنا۔

نذیر احمد خاں صاحب :۔ اور فرمایا کہ یہ احمق مکھی اور مچھر کے نام سے بدکتے ہیں۔"

ترجمۃ القرآن حاشیہ حمائل صفحہ ۱۴

حالی ؎ تجھ سے بھی جو ہیں وحشی بدکتے / پھر پھر کے تجھ کو جاتے ہیں تکتے

اسمٰعیل ؎ ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار / اپنے سایہ سے بدکتا بار بار

(۱۰) بھانا :۔ لازم۔ فصیح۔ اچھا معلوم ہونا۔ مرغوب ہونا۔ پسند ہونا۔ بھلا لگنا۔ دل میں کھبنا۔

نسیم دہلوی ؎ بے صنم بھائی ہے کب اپنے دل یہ فصل برشکال / قہر ہے آفت ہے ہم کو دیکھنا برسات کا

میر حسن ؎ یہ دو دل کو اک جا بٹھاتا نہیں / کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

آتش ؎ ہنسنا ہی خوش آیا نہ ہی رونا مرے دل کو / میٹھا ہی نہ بھایا نہ سلونا مرے دل کو

جان صاحب ؎ گوٹے کناری سے نہ مجھے ہے کرن سے شوق / کپڑا سفید بھاتا ہے اور سادہ پن سے شوق

امیر ؎ داور محشر کو بھائی میری اس کی چھیڑ چھاڑ / چھیڑ کر پوچھا مکرر کیا ہوا ؟ کیوں کر ہوا ؟

داغ ؎ ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے / بر بلا سے ہنسی تو آتی ہے

مثل ؎ دل میں بھاوے مونڈ ہلاوے

(۱۱) تیورانا :۔ لازم۔ فصیح۔ چکرانا۔ غش آنا۔ عالم غشی طاری ہونا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجانا۔ سر پھرنا۔ ڈگمگانا۔

انیس ؎ تیورا کے آپ سانس جو سینہ میں اڑ گئی / اتنے میں اور فرق پہ تلوار پڑ گئی

امیر ؎ اس فتنۂ دوراں نے جو دی آنکھ کو گردش / چکر کبھی آیا کبھی تیورا گئیں آنکھیں

داغ ؎ خورشید میرے سامنے یا شمع طور ہے / آنکھیں جو تیورا گئیں یہ کس کا نور ہے

دبیر ؎ رستہ میں نقاہت سے جو تیوراؤں گی بابا / یا فاطمہ کہہ کر میں سنبھل جاؤں گی بابا

(۱۲) کچلنا :۔ متعدی۔ فصیح۔ مسلنا۔ دلنا۔ ملنا۔ روندنا۔ پیلنا۔ پیسنا۔ پامال کرنا (۲) مارنا۔ پیٹنا۔ بھرکس نکالنا۔ بھرکس نکالنا۔ خوب پیٹنا۔

رنگین ؎ پاؤں کے نیچے تو اس کے سر کو مل / تجھ سے جتنا ہو سکے اس کو کچل

انیس ؎ لڑنے میں سمجھتا تھا فرس دل کا اشارا / رہوار نے کچلا اسے ٹکر سے جسے مارا

صابر ؎ خود رفتگی سے ہوتی ہے تہدید سرکشی / دیوانے سر کچلتے ہیں تلووں سے خار کا

میر ؎ اس سیہ زلف کا خیال نہ چھوڑ / سانپ کے سر ہی یاں کچلتے ہیں

(۱۳) لپکنا :۔ لازم۔ فصیح۔ (۱) دوڑنا۔ جھپٹنا (۲) اچکنا۔ نیچے گرنے نہ دینا۔ (۳) بیچ میں اچک لینا

چھپنا (۴) پھوڑے کا ٹیس مارنا۔ چسکنا، کھولنا۔ ٹیسنا، جلنا (۵) بجلی کوندنا۔ چکنا۔ لپکنا (۶) دھڑکنا۔ پھڑکنا۔ پھدکنا۔ کودنا (۷) چھلانگ مارنا۔ زقند بھرنا۔ پھاندنا۔ پھلانگنا (۸) حملہ کرنا وغیرہ

داغ ؎ پتہ کھڑک گیا تو وہ لپکا اسی طرف — دیکھی تمام رات عجب پاسباں کی سیر
تکمیل ؎ پھر ایک کے بعد ایک لپکا — قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
مسکین ؎ جست کی اس نے کیا کہوں کیسے — شیر لپکے غزال پر جیسے
عاشق ؎ کلیجہ رشک سے پکتا ہے دل جلتا ہے حسرت سے — ادھر پھوڑا لپکتا ہے اُدھر شعلہ لپکتا ہے
حیرت الہ آبادی ؎ وحشیو! مژدہ علامت ہے بہار آنے کی — خود بخود ہاتھ لپکتا ہے گریباں کی طرف

(۱۴) نُچنا:۔ لازم۔ فصیح۔ کھسوٹا جانا۔ نوچا جانا۔ کھُسٹنا۔

آتش ؎ شمع کے شعلہ کو جب گلگیر نے منہ میں لیا — پر نُچا آنکھوں نے دیکھا مرغ آتش خوار کو
نشاط ؎ یارب سدا سہاگ کی مہندی رچا کرے — پتے نچیں کبھیں نہ ہے آفت ارنڈ پر
میر ؎ نعل چڑے سینہ کو کوٹا بھرے نچے پر خاک ملی — میر کیا ہے میں نے نہایت دل جلنے کا ماتم بھی
قلق ؎ بال نچتے ہیں مرے تار گریباں نہ سمجھ — دست وحشت کہیں ہوتا ہے گریباں سر پر
میر ؎ نچیں جبہہ عاشق اگر دست پائیں — خدا نہ دے ان کو جو سر کھجائیں

(۱۵) ہونا:۔ لازم۔ فعل ناقص۔ ترجمہ شدن۔ بودن بہستن (۱) ہست ہونا۔ پیدا ہونا۔ (۲) ظاہر ہونا (۳) واقع ہونا (۴) موجود ہونا (۵) کہا جانا وغیرہ

داغ — دنیا میں مزا عشق سے بہتر نہیں ہوتا — یہ ذائقہ وہ ہے کہ میسّر نہیں ہوتا
مصحفی — میں خستہ تمام ہو چکا اب — جا درد کہ کام ہو چکا اب
آغا ؎ — نگاہوں میں اقرار سارے ہوئے ہیں — ہم ان کے ہوئے وہ ہمارے ہیں
حیا ؎ — بہار عشق پہ طرہ ہوئی ہوائے بہار — سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا
مومن ؎ — در پہ در ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے — وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے
شیفتہ ؎ ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام — بد نام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

امریکی شاعری

محمد یٰسین

انگریزی اقتدار کے ساتھ انگریزی زبان بھی کرۂ ارض کے مختلف گوشوں میں پہونچی اور ان ممالک کے ادب و معاشرہ پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ ممالک متحدہ امریکہ، کینڈا اور آسٹریلیا کے علاوہ ہندوستان جیسے ملک میں بھی مغربی تہذیب و تمدن کو عام کرنے میں انگریزی زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں اردو، ہندی، اور بنگلہ ادب نے جدید انگریزی ادبی رجحانات و میلانات سے استفادہ کیا اور شاعری، ڈرامہ، تنقید، انشائیہ اور تاریخ نگاری میں نئی منزلیں طے کیں۔

ممالک متحدہ امریکہ، کینڈا اور آسٹریلیا میں خود انگریز اور یورپین قومیں جاکر آباد ہوگئیں۔ چنانچہ ان کا انگریزی زبان و ادب سے براہ راست رابطہ رہا اور نئے ماحول میں انگریزی نے بھی چولا بدل کر قومیت کے بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ علاقائی ادب کو جنم دیا۔ اس سلسلہ میں امریکی ادب بالخصوص قابل ذکر ہے جس نے پچھلی دو صدیوں میں عالمی ادب کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ امریکی ادب کے متعلق اکثر نادان یہ غلطی کرتے ہیں کہ یہ بھی امریکی پروپگنڈہ کا ایک جز ہے لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ ۱۸۲۰ء میں "سڈنی اسمتھ" نے البتہ یہ کہا تھا کہ دنیا کے چاروں گوشوں میں کون سے لوگ امریکی کتابیں پڑھتے ہیں؟ لیکن یہ الزام آج صحیح نہیں اس لئے کہ سائنس، فلسفہ، عمرانیات، قانون، سیاسیات و معاشیات اور تاریخ کے مضامین کے علاوہ خود انگریزی ادب پر جتنی کتابیں یہاں شائع ہو رہی ہیں وہ انگلینڈ میں ممکن نہیں۔ پھر ان کا اپنا ادب بھی سنجیدہ حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے۔ ایمرسن، تھورو، وٹمین، ہاتھرن اور ہمنگوے سے بے نیازی انگریزی ادب کے ایک نہایت صالح اور معتمد عنصر سے محرومی ہے۔

دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح امریکہ میں بھی ادبی مساعی شاعری سے شروع ہوئیں لیکن ابتدا سے ہی امریکی شاعروں نے خود کو انگریزی شاعری سے منفرد کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومانی تحریک سے امریکہ میں بالکل مختلف نوعیت کی شاعری معرض وجود میں آئی جس کی سب سے ممتاز خصوصیت اس کی جمہوری لَے اور فکری سادگی و سہل ہے۔ امریکی شاعری کی باقاعدہ داغ و بیل رومانی تحریک سے پڑی۔ نیو کلاسکل مدرسہ کی خشک تعقلیت کے خلاف یورپ میں جو ادب پیدا ہوا اس میں فنکار کی انفرادیت کو مدرسہ کی غلامی پر ترجیح حاصل ہے۔ اس نئی شاعری

نے انسانیت کے راگ گائے جس سے خیالات و احساسات کو نیا آہنگ ملا۔ اور انسان اور فطرت (NATURE) قریب تر ہو گئے۔ لیکن امریکی شاعری میں وہ تخیل، تصور پرستی، پیغمبرانہ شان اور حزنیہ عنصر مخصوص روح عصر کے باعث نہیں پیدا ہو سکے۔ جس سے انگریزی یا یورپین شاعری ممتاز ہے۔ اس کے مختلف وجوہ ہیں۔

یورپین رومانیت فرانسیسی بغاوت (FRENCH REVOLUTION) سے پہلے ہی فروغ پا چکی تھی۔ اس لئے اس میں ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے اور آزادی کے ترانوں کو گانے کا موقع ملا۔ یہاں فرد کی آزادی کا مطالبہ اسی شد و مد سے کیا گیا جس طرح اسے مصنوعی تہذیب سے نکال کر فطرت کی گود میں اس کی انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا جذبہ موجود تھا۔ چناں چہ روسو، ہیوگو، ورڈسورتھ، شیلی اور بائرن کی شاعری مختلف طریقوں پر رومانی شاعری کی ترجمانی ہے۔ امریکہ میں اگرچہ "فرنیو" (FRENEAU) جیسے شاعروں کے یہاں بائرن کی آواز بازگشت موجود ہے۔ لیکن حصول آزادی، جمہوری نظام اور معاشی خوشحالی کے باعث وہ مخصوص شاعری یہاں معدوم ہے جس سے ہم عام طور پر واقف ہیں۔ امریکہ زبردست قدرتی ذرائع کا ملک ہے۔ جہاں شہنشاہی استبداد کی نوبت کبھی نہیں آسکی۔ نو آبادی دور میں بھی لوگ فارغ البال رہے اسی لئے امریکی رومانیت میں یورپین رومانیت کے برخلاف رجائیت اور خود آسودگی (SELF COMPLACENCY) کے عناصر غالب ہیں۔

سیاسی و معاشی اثرات کے ساتھ مذہب کا اثر بھی امریکی شاعری پر واضح رہا۔ جہاں یورپین مفکروں نے بدعت، خدا بیزاری اور باغیانہ جذبات کو شہ دیا۔ وہاں کٹر مذہبی پادریوں (PURITANS) کے زیر اثر امریکہ میں لہو لعب اور جنسی موضوعات کی سخت مخالفت کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں برجر (BURGER) اور بائرن (BYRON) کی شاعری ناپید ہے۔ ایمرسن اور تھورو کی مذہبیت مسلم ہے۔ لیکن وہٹمین (Whitman) کی لعن طعن محض اس بنیاد پر ہوئی کہ اس نے مروجہ اخلاقی و مذہبی اقدار سے انحراف کیا۔

یورپین رومانیت کی ایک خوبی احیائے ماضی (REIRVAL OF THE PAST) بھی تھی اس لئے کہ حال کی کثیف و مادی دنیا سے ماضی کی رنگینیوں کی تلاش فرار کا بہترین ذریعہ تھی۔ امریکہ میں بھی اس سمت میں تجربے ہوئے لیکن ان کا ماضی محض نو آبادیاتی دور میں آزادی کی جنگ اور شہنشاہی قوتوں کی شکست تک محدود ہے۔ اسی لئے یہاں کیٹس (KEATS) اور کولرج (COLERIDGE) کی شاعری کہیں نہیں پیدا ہو سکی اور نہ عہد وسطیٰ کے غازیانہ کارناموں کو نظم کیا جا سکا۔ "لانگ فیلو" (LONG FELLOW) کی کوشش بھی کچھ زیادہ مفید نہیں ثابت ہو سکیں۔ امریکہ چوں کہ اقوام عالم میں سب سے نو عمر ملک ہے لہٰذا امریکنوں کو اپنی قومیت کا شدت سے احساس رہا ہے۔ اسی خیال نے انھیں کچھ فرضی اور کچھ اصلی اساطیر و دیو مالا اور عوامی تلمیحات گڑھنے پر مجبور کیا۔ ان تمام کوششوں کے باوجود امریکی رومانیت کچھ سطحی اور رجائی قسم کی رہی۔ اس شاعری کا اپنا رنگ اور مزاج ہے۔ اور اس مخصوص لے نے آئندہ شاعری کو بھی متاثر کیا۔

انیسویں صدی :-

EDGAR ALLEN POE (1809-1849) :-

"پو" کی ادبی اہمیت کے متعلق اب بھی نقادوں میں اختلاف ہے اس لئے کہ ٹینی سن نے اسے "جدت پسند امریکی جینئس" کہا تھا۔ فرانسیسی شاعر بودلیئر (BAUDELAIRE) بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے لیکن ایمرسن نے اسے "SINGLE MAN" سے زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن اس سے انکار نہیں کہ یورپی دنیا نے سب سے پہلے پو کی تصانیف سے ہی امریکی ادب کی انفرادیت تسلیم کی۔

پو کے نزدیک فن کا مقصد مسرت ہے حقیقت نہیں اسی لئے اس کے یہاں "فن برائے فن" اور رمزیاتی تحریک (SYMBOLISM) کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں۔ وہ "برائنٹ" (BRYANT) اور ٹینی سن کی شاعری کا دلدادہ تھا اور فطرت و مافوق الفطرت کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر نئی شاعری کا بانی ہوا بنیادی طور پر پو کی شاعری غنائی (LYRIC) ہے اس لئے کہ وہ شاعری میں جذبات و احساسات کی شدت کا قائل تھا جو رزمیہ شاعری میں کبھی ممکن نہیں۔ اس نے بائرن اور کولرج کی تقلید بھی کی لیکن بہت جلد اپنی انفرادیت حاصل کر لی۔ اپنی نظم "TO SCIENCE" میں اس نے خواب کو حقیقت پر ترجیح دی ہے۔ "ROMANEE" میں فن اور جذبہ کی تطبیق ہے اور "ISRAFEL" میں کولرج کے "قبلا خان" کی طرح ماورائی حسن کا تصور موجود ہے۔ اسی طرح "El Drado" میں فنکار کے تخیلی تکمیل کی کوشش کو نظم کیا گیا ہے۔

پو کی شاعری میں خواب و خیال کا عنصر غالب ہے۔ اس کی بیشتر نظمیں اس کے فنی نظریات کی حامل ہیں۔ جن میں رومانی عنصر شدت سے سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "مریضانہ رومانیت (MORBID RAMANTICISM)" کے پیشروؤں میں شمار کیا گیا ہے۔ جس سے فرانسیسی شاعر "بودلیر" نے اپنی ایمائی شاعری کا نمونہ حاصل کیا۔ فرانسیسی نقادوں نے پو کو داخلی کیفیات کا شاعر بتایا ہے اور اس لحاظ سے اسے بجا طور پر جدید رومانیت کا امام کہا گیا ہے۔

James Russel Lowell (1819-91)

اگرچہ "لاول" نہ تو پو کے پایہ کا شاعر تھا اور نہ اس میں وہ تخلیقی صلاحیتیں تھیں لیکن اس کے یہاں شاعرانہ درک اور تنقیدی شعور ضرور ملتا ہے۔ وہ بھی پو کی طرح شاعری کا مقصد انبساطی خیال کرتا ہے اور اپنی حد تک کامیاب بھی ہے۔ اس کی ابتدائی نظموں میں ایک نشاطی کیفیت ملتی ہے جو بعد ازاں اخلاقیت میں بدل گئی چونکہ آخری دور میں اس نے یہ سوچا کہ خدا نے شاعروں کو "متبرک وحسین" روایات کو زندہ رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے اس لئے اس نے اپنی شاعری کی ساری نہج ہی بدل دی۔

لاول کے یہاں "انسانیت نوازی" (Humanism) کا بختہ شعور ملتا ہے جو اسے [illegible]

سے نزدیک کر دیتا ہے۔ اس نے یورپین اور انگریزی کلاسیکی شعرا کا مطالعہ کیا تھا اور ورڈسورتھ و ٹینی سن کی شاعری کا ہمیشہ مداح رہا۔ اس کے نزدیک سچا شاعر وہ ہے:

Who utter wisdom from the central deep, and listening to the inner flow of thing, Speak to age out of Eternity.

[جو دل کی گہرائیوں سے حقائق کا انکشاف کرے اور مظاہر کی داخلی کیفیات کو ابدی شکل دے]

ابتدائی کلام میں اگرچہ لاول کے یہاں رومانی عناصر غالب ہیں لیکن اس کی تنقیدی مزاج کے باعث آخری دور کے کلام میں غنائیت اور اخلاقیت کی بجائے فکر و تجزیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نے سائنس سے بے نیازی نہیں برتی بلکہ میتھو آرنلڈ کی طرح سائنسی دور میں بھی قدیم عقائد اور روحانی اقدار کا حامل رہا۔ لیکن اس کی بہترین شاعری مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی جس میں "Harvard Commemoration" اور "under the old Elm" زیادہ مشہور کارنامے ہیں۔ ان دونوں نظموں میں شاعر نے آزادی، ہیرو پرستی اور تصوریت (Idealism) کو مذہبیت اور خود آسودگی پر ترجیح دی ہے۔

لاول اپنی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے مشہور رہا۔ وہ شاعر، مصلح، مدیر، مقرر، پروفیسر، نقاد، سیاستداں سب کچھ تھا۔ اسی لئے شاعری پر اس نے وہ توجہ نہیں کی جس سے اسے امریکی شاعروں میں صف اول میں جگہ مل سکتی۔ لیکن اس کے خلوص اور وطن دوستی سے مجال انکار نہیں۔ وہ انگریزی ادب کو اپنے ہم وطنوں کے درمیان عام کرنا چاہتا تھا تاکہ انسانی زندگی کی فکری، احساسی اور جمہوری پہلوؤں پر زیادہ سے زیادہ روشنی پڑ سکے۔ اس طرح اس کی اہمیت تو انگلستانی نشاۃ الثانیہ (New England Renaissance) میں ایک عظیم انسانیت نواز کی حیثیت سے مسلم ہے۔

"لانگ فیلو" (H.W. Longfellow 1807-1882) :-

لانگ فیلو کی ذہنی تربیب میں واشنگٹن ارونگ کی لطیف رومانیت کا زبردست حصہ ہے۔ دونوں کے نزدیک یورپ امریکی تہذیب کا گہوارہ تھا اور یورپین مشاہیر کی خوشہ چینی سے امریکی ادب کا دامن وسیع کیا جا سکتا تھا۔ یورپ کے دو دوروں سے لانگ فیلو نے انگلستان کے علاوہ فرانس، اسپین، اٹلی اور جرمنی کے ادب اور فن پاروں سے استفادہ کیا لیکن اس پر سب سے زیادہ اثر جرمن رومانیت کا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام کی فطری سادگی اور اخلاقی تاثر میں جرمن رومانیت کی جھلکیاں بھی ہیں۔ "VOICES OF THE NIGHT" جو ۱۸۳۹ء میں منظر عام پر آیا، شاعر کی غنائی نظموں کا پہلا مجموعہ تھا جس میں مبہم حسرت مندی اور لطیف رومانیت غالب ہے لیکن انھیں نظموں میں "A PSALM OF LIFE" بھی شامل ہے جو خواب و خیال کی بجائے ولولۂ حیات سے مملو ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے

انیسویں صدی ... کا شاعر ہے کیوں کہ اس کی بیشتر نظمیں جن میں The village.
EDGAR POE (1809-1849) 'A Rainy Day' 'Excelsior' اور Resignation وغیرہ
"پو" کی ادبی اہمیت کے ندگی گھریلو مسرت اور رضائے الٰہی کا سبق دیتی ہیں۔
امریکی جینس" کہا تھا۔ فرانسیسی شاعری میں "بیلڈ" (BALLED) کو بھی داخل کیا۔ یہ صنف ہندوستانی ہے لیکن ایمرسن نے اسے "عوامی گیتوں پر مشتمل قصہ ہوتا ہے۔ جس میں بہادری، محبت اور رشک و حسد ... میں دنیا نے سب سے پہلے عورات کو نظم کیا جاتا ہے۔ رومانی تحریک کے ساتھ یورپ میں اسکاٹ، کولرج، برجر (Burger) اور شیلر (SCHILLER) وغیرہ نے اس فن کا احیا کیا چنانچہ ان کی تقلید میں لانگ فیلو نے بھی خالص امریکی بیلڈ لکھنے کی کوشش کی جن میں "The Song of Hiawatha" (1847) اور "The Courtship of Milestandish" مشہور ہیں۔

غنائی نظموں اور "بیلڈ" کے علاوہ لانگ فیلو نے "سانیٹ" بھی لکھے جن میں دردمندی اور گھلاوٹ کے ساتھ خلوص و تجربہ کی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ لانگ فیلو کے یہاں ایک قسم کی فراری کیفیت نمایاں ہے جس میں حقائق سے گریز اور حال کی تلخیوں سے بیزاری کا جذبہ کارفرما ہے۔ غالباً اسی لئے اس کے یہاں ازمنہ وسطیٰ کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شاعری میں فکر و خیال کے واضح اقدار بھی شامل ہیں جو ہمیں عہد وکٹوریہ کے شاعروں کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن لانگ فیلو "ٹینی سن" (TENNYSAN) اور "براؤننگ" (BRAVNING) کے پایہ کا شاعر نہ تھا۔ اس کے یہاں نہ وہ عظمت ہے اور نہ کائناتی بصیرت وہ آج بھی محض اپنی غنائی نظموں اور عوامی گیتوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

"ایمرسن" (R.W. Emerson 1803-1882)

امریکی شاعروں میں وھٹمین (WHITMAN) کے ساتھ اگر کسی نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی تو وہ ایمرسن ہے جس کی خوشہ چینی ابتدائی دور میں علامہ اقبال جیسے شاعر نے بھی کی۔

ایمرسن پادری گھرانہ میں پیدا ہوا اور ہارورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہا۔ جہاں اس نے اپنے فلسفہ ماورائیت (Transcendentalism) کی تلقین کی۔ یورپ کے دورہ کے دوران اس کی ملاقات ورڈسورتھ، کولرج اور کارلائل جیسے مشاہیر سے ہوئی جن کا اثر اس کی ادبی زندگی پر دیرپا رہا۔ امریکہ واپس آکر اس نے "ماورائی سماج" (Transcendental club) قائم کی جس میں تھورو، لانگ فیلو اور لاول جیسے اہل قلم بھی شامل تھے۔

"فطرت" (nature) اور "آزادی" ایمرسن کی تمام ادبی تصانیف کا محور ہیں۔ اس نے اپنے مضامین NATURE (1833) اور THE AMERICAN SCHOLAR (1837) سے فطری و ذہنی آزادی کا پیغام دیا اور قدیم و فرسودہ روایات سے ادب اور سماج کو پاک کرنے کی تلقین کی۔ اس کی نظموں کا مجموعہ ۱۸۴۶ء میں

منظر عام پر آیا جو اس کے مضامین کا تتمہ ہے۔ ایمرسن کی نظموں اور مضامین میں وہی فلسفیانہ عنصر غالب ہے جو اس کی شخصیت کی ما بہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ اس نے اگرچہ ماورائی فلسفہ کی باقاعدہ تلقین نہیں کی لیکن اس کی نظریات سے ایک لائحہ عمل ضرور تیار ہوتا ہے۔ جو اس کی مذہبی تربیت، رومانی میلانات اور صوفیانہ مسلک کا نتیجہ ہے۔ اس کی شخصیت میں جہاں جرمن و انگریز ماورائیوں کا حصہ ہے وہاں وید (VEDA) اور گیتا (GITA) کے اثرات بھی کچھ کم وقیع نہیں۔ غالباً اسی لئے نقادوں نے اسے "برہمن جدید" (NEO BRAHMIN) کے خطاب سے نوازا ہے۔

ایمرسن کی شخصیت کا اظہار شاعری میں اسی خوبی سے ہوا ہے جیسے نثر میں۔ چنانچہ اس کے انشائیہ نثری شعریت کی بہترین مثال ہیں۔ اس کی نظم "BRAHMA" میں کثرت الوجود کا احساس غالب ہے اور "THE PROBLEM" میں شان خداوندی اور "WOOD NOTES" میں فطری پاکیزگی و توانائی نمایاں ہے۔ مرثیہ (THRENODY) ایمرسن کی بیحد دلگداز نظموں میں شمار کی جاتی ہے جس میں اس نے اپنے پہلے بچے کی موت کا نوحہ کیا ہے۔ اس کا مقابلہ ہم اقبال کی نظم "والدہ کی یاد میں" سے کر سکتے ہیں۔ اقبال نے ایمرسن کی نظم (GOOD BYE) (رخصت اے بزم جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں) اور LARDS' COMMAND (خدا کا فرمان) کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

ایمرسن امریکہ کے نمائندہ شعراء میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس کے جمہوری و انسانی پیغامات تمام بنی نوع آدم کا ورثہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے خیالات و افکار میں تضاد اور "شر" سے چشم پوشی ہے لیکن وہ اپنی لطیف رومانیت صوفیانہ مسلک اور جمہوری رجائیت کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا۔

"تھورو" (THOREAU (1817-1862))

ایمرسن کے زمرہ تلامذہ میں تھورو کی شخصیت سب سے زیادہ وقیع ہے۔ وہ ایک آزاد منش صوفیانہ مزاج کا آدمی تھا جو ظاہر پرستی اور فرسودہ مذہبیت سے یکساں طور پر خائف رہا۔ مرتے وقت جب کسی نے اسے جنت کی یاد دلائی تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ "ایک وقت میں ایک ہی دنیا کافی ہے" (ONE WORLD AT A TIME) سیاسیات میں بھی اس کا منفرد نظریہ تھا چنانچہ تمام بنی نوع آدم اس کے نزدیک ایک قوم ہیں جنھیں چینی، تاتار اور تین بنتے وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا لیکن اپنی تصور پرستی کے باوجود وہ حکومت کے خلاف بغاوت کا حامی تھا۔ اس کا مشہور مقالہ "CIVIL DISOBEDIENCE" گاندھی جی جیسے رہنما کے لئے بھی محرک رہا۔

تھورو "فطرت" اور "افکار" کا رسیا ہے۔ دیگر ماورائیوں کی طرح وہ مظاہر سے زیادہ حقائق کا طالب تھا اور مادیت پر روحانیت کو ہمیشہ ترجیح دیتا رہا۔ چناں چہ روسو، ورڈسورتھ اور ایمرسن کی طرح اس کا بھی خیال ہے کہ فطرت ہمیں پاکیزگی، توانائی، مسرت و بصیرت بخش سکتی ہے۔ لیکن وہ فطرت کے علاوہ مطالعہ و مشاہدہ کا بھی قائل تھا جس کے بغیر کائنات کا عرفان ناممکن ہے۔ اس کی شاعری یونانی تراکیب اور ہند و افکار کی مرہون منت

[illegible]

ان کی شخصیت کا پورا بار زمین پر پڑتا ہے" اس کی نظموں میں "دعا" (A Prayer) خاص طور سے اس کی انسانی ہمدردیوں کی ترجمانی ہے:۔

THAT MY WEAK HAND MAY EQUAL MY FIRM FAITH AND MY LIFE
PRACTISE MORE THAN MY TONGUE SAITH;

"کہرہ" (Haze)، "دھواں" (SMOKE) اور "تحریک" (ENSFNIETION) بھی قابل غور تخلیقات ہیں۔ رومانی شاعروں کی طرح اس نے بھی فطرت کو مادیت سے فرار کا بہترین ذریعہ سمجھا اور اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں ہندوستانی جوگیوں کی طرح والڈن کے جنگل میں نروان کا عملی ثبوت دیتا رہا۔ ایک دفعہ اس نے سرمستی کے انداز میں کہا تھا کہ:۔

"MY LIFE HAS BEEN THE POEM I WOULD HAVE WRIT
BUT I COULD NOT BOTH LIVE AND UTTER IT."

وھٹمین (Whitman, 1819-1892)

امریکی نشاۃ الثانیہ میں ایمرسن اور وھٹمین کی بلند پایہ شخصیتیں اپنی شاعرانہ و عارفانہ رنگ و آہنگ کے باعث دنیائے ادب میں اپنا مقام تسلیم کرا چکی ہیں۔ وھٹمین نہ صرف انیسویں صدی امریکی شاعری بلکہ رومانی ادب میں ایک مخصوص حیثیت کا مالک ہے۔ امریکی زندگی کی مختلف النوع تجربات و مشاہدات کے ساتھ اس نے اسکاٹ کی شاعری اور بائیبل، یورپین اساطیر، یونانی ڈراموں اور کلاسیکی ادب کا بھی غائر مطالعہ کیا۔ وہ خود تعقلیت (ENLIGHTEMENT) کا علمبردار تھا اور کائناتی آہنگ کا پیرو۔ اس کے مجموعہ کلام (1855) "LEAVES OF GRASS" میں ایک رومانی شاعر کی انفرادیت بھی ہے اور نئے دور کا پیغام بھی۔ لیکن اس کی صاف گوئی نے دوسرے مشاہیر کو اس کا دشمن بنا دیا اور اسے فحش نگاری کا ملزم ٹھہرایا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک وھٹمین اس مجموعہ پر نظر ثانی کرتا رہا۔ اور 1880ء کا ایڈیشن اس کا آخری پیغام کہا جا سکتا ہے۔

وھٹمین کی شاعری بنیادی طور پر رومانی و ماورائی ہے جس میں ایمرسن کا اثر غالب ہے۔ اس کے خیالات بھی ایمرسن کی طرح بے ربط، غیر مسلسل اور بے ترتیب ہیں۔ لیکن اس "جنون" کے پس پردہ ایک جینئس کا ذہن کارفرما تھا۔ ایمرسن کے زیر اثر اس کی شاعری کا لب و لہجہ بھی رجائی ہے۔ وہ خود تندرست و صالح نظریہ حیات اور کائناتی آہنگ کا علمبردار تھا۔ اس سے پہلے کسی امریکی شاعر نے زندگی کی اس ربودگی کا اظہار نہیں کیا تھا:

O Life immense in passion, pulse and power,
Cheerful — for freest action formed under the laws divine.

یہی وہ رجائیت ہے جس نے اس کے یہاں کائنات میں ہر شے کو عظمت بخشی۔ گھاس کی پتیاں اور ستاروں کی گردش اس نظام میں یکساں اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے اخلاقی و جمالیاتی اقدار کے ساتھ جنسی جذبات بھی کچھ کم مسرت زا نہیں۔ وھٹمین بہت حد تک زندگی اور اس کی مسرتوں کا شاعر ہے۔ اس کے یہاں جسم و روح کی بالیدگی کے ساتھ ابدیت اور نمو کا تصور موجود ہے۔ اس کی "اناپرستی" اور "ملاقائیت" کے باوجود

میں آفاقی شاعری کے بہترین نمونے اس کے کلام میں مل جاتے ہیں۔
وہٹمین کی شاعری امریکی قومیت اور رومانیت و ماورائیت کا نقطۂ عروج ہے۔ اس نے نہ صرف روایتی عروض وشاعری سے آزادی حاصل کی بلکہ خیالات کی دنیا میں بھی ایک ہلچل مچادی۔ جدید امریکی شاعری معنوی و صوری اعتبار سے اس کی مرہون منت ہے۔ اس کا پیغام اپنی تمام ماورائیت کے باوجود "ارضیت" سے مملو ہے اور اس کے نغموں میں عام انسانی تاثرات کی دھنیں سنی جاسکتی ہیں۔ وہٹمین مذہب میں معرفت اور سیاست میں جمہوریت کا قائل تھا۔ لیکن شعروشاعری کی دنیا میں اس نے تصورپسندی (Idealism) کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی شاعری مادی امریکی سماج کے لئے کھلی ہوا کے نئے دریچے کھولتی ہے۔

بیسویں صدی:-

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں امریکی شاعری میں کوئی واضح تبدیلی نہیں نظر آتی۔ اس لئے کہ "کارل سینڈبرگ" (Carl Sandburg) اور "رابرٹ فراسٹ" (Robert Frost) کا لہجہ ان کے پیشروؤں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان کے یہاں بھی وہی خودآسودگی اور امریکی جمہوریت سے ہم آہنگی ملتی ہے جو ایمرسن وٹھورو کا خاصہ تھا لیکن جنگ عظیم اوّل نے اس دنیائے خواب وخیال کو بالکل تہس نہس کردیا۔ اور ادیبوں اور شاعروں میں شدید خارجیت یا شدید انفرادیت کے میلانات عام ہونے لگے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری "ٹوٹے اصنام" کا مرثیہ اور جدید زندگی کی کھوکھلاپن کا بہترین مرقع تھی۔ اس نے حقیقت نگاری سے ردعمل کے طور پر کلاسیکی ماضی اور اکیتھولک مذہب کی گذشتہ عظمتوں کا سہارا لیا اور دوسرے فنکاروں نے بھی زندگی کی پیچیدگی کے پیش نظر پیکرنگاری (Imagism) اور رمزنگاری (Symbolism) تکنک اپنائے۔ جنگ عظیم اول کے بعد امریکی ادیبوں کا ایک گروہ فرانس اور یورپ جاکر "واداِئی تحریک" سے متعلق رہا جو ایک عجیب وغریب "نشاطیت" کے علمبردار تھے۔ امریکی اصطلاح میں انھیں "Lost Generation" کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے امریکہ سے بے رخی برتی اور براعظم یورپ میں عرصہ تک گمراہ پھرتے رہے لیکن دوسری جنگ کے بعد انہوں نے امریکی زندگی سے مفاہمت کرلی اور جرمن نازیزم وروسی اشتراکیت کے خلاف قومی مورچہ میں شامل ہوگئے۔ امریکی شاعری میں اس روح کی جھلکیاں بخوبی نمایاں ہیں۔ ہم نے تاریخی اعتبار سے جدید شاعری کو مختلف دبستانوں میں تقسیم کرکے مشاہیر کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) "روایتی انسانیت پسندی" (Traditional Humanism)

"ایڈون آرلنگٹن رابنسن (1869-1935) (Edwin Arlington Robinson

"رابنسن" کی شاعری امریکی ادب میں کوئی نئی آواز نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے ہم عصر رابرٹ فراسٹ کے ساتھ روح عصر کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود روایتی شاعری اور کلاسیکی اعتدال کا علم بردار۔ وہ نہ قدامت پرست ہے اور نہ انقلاب پسند، بلکہ اس کی شاعری روایت اور جدت کا امتزاج ہے جو حقیقت دوما

کا لطیف و صحت مند رنگ لئے ہوئے ہے۔

اگرچہ رابنسن نے ۱۸۹۶ء میں ہی چند نظمیں لکھی تھیں، لیکن ان کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ وہ مستقل معاشی پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ مارچ ۱۹۰۵ء میں پریسیڈنٹ روزولٹ کی سرپرستی نے اسے نئی زندگی دی۔ اور وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہو سکا۔

رابنسن کی نظم نگاری میں "کرداروں کا مطالعہ" نہایت اہم ہے۔ اس نے وکٹوریہ کے مشہور انگریز شاعر رابرٹ براؤننگ کی طرح افراد کی داخلی و خارجی زندگی کی عکاسی کے لئے ڈرامائی خود کلامی، قصہ نگاری اور بیانیہ طرز اختیار کیا۔ ان کرداروں میں بیشتر تو وہ ہیں جنھیں وہ اپنے بچپن سے جانتا تھا۔ اور ان کے دیہاتی ماحول کے پس منظر میں ان کے خد و خال نمایاں کرتا ہے۔ لیکن کچھ کردار براؤن، ہملٹن، نپولین، شیکسپیر اور سنٹ پال (St. Paul) کی طرح برگزیدہ ہستیاں بھی ہیں۔ ان مطالعوں میں اگرچہ کوئی تاریخی بصیرت نہیں ملتی لیکن شاعر کا اسلوب بیان نہایت منفرد ہے۔

کرداروں کے مطالعہ کے علاوہ رابنسن نے کنگ آرتھر اور اس کے غازیوں (Knights) کا روایتی افسانہ بھی نظم کیا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے میلوری، اسپنسر، ٹینی سن وغیرہ نے اس قصہ کو موضوع سخن بنایا ہے۔ لیکن امریکی شاعر نے کچھ جدتیں بھی کی ہیں۔ اس کے نزدیک آرتھر کے گول میز (Round Table) کی تباہی اس کی اخلاقی کمزوریوں سے زیادہ باہمی نفاق و رنجش کے باعث ہوئی۔ رابنسن نے ان افسانوی کرداروں کی حرکات و اعمال کو نفسیاتی طور پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کے خیالات و احساسات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ (۱۹۱۷) "Merlin" اور (۱۹۲۰) "Lancelot" میں جو المیہ رنگ ہے وہ "Tristram" میں بھی نمایاں ہے لیکن یہاں المیہ "تکمیل آرزو" کا نتیجہ صریح ہے اس لئے کہ عاشق و معشوق اپنی محبت میں کامیاب ہو کر ہی موت کو لبیک کہتے ہیں۔ از منہ وسطی کے ان قصوں کے علاوہ رابنسن نے "نفسیاتی قصے" بھی نظم کئے جن میں جدید انسانوں کی شعوری و لاشعوری زندگی کا خاکہ اسی طرح ملتا ہے جیسے ہنری جیمس کے مختصر ناولوں میں۔ یہاں حرکت و عمل سے زیادہ ذہنی و داخلی زندگی کی عکاسی ہے۔ Cavenders House (۱۹۲۹) اور (۱۹۳۱) Matthias کے علاوہ (۱۹۳۵) King Jasper اس سلسلہ میں اہم کارنامے ہیں۔

رابنسن امریکی شاعری میں داخلی رومانیت کے ساتھ فکری عناصر بھی شامل کرتا ہے۔ اس نے روایتی اصناف ــــــ ڈرامائی خود کلامی، بیلڈ (Ballad)، سانیٹ (Sonnet) اور رزمیہ (Epic) میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اس کا اسلوب بیان بالکل انوکھا ہے۔ فکر و احساس کے امتزاج کے ساتھ اسلوب کی سادگی قابل لحاظ ہے۔ اگرچہ اس کے یہاں قنوطیت کا احساس شدید طور پر ملتا ہے۔ لیکن وہ ہارڈی کی طرح قنوطی ہرگز نہیں کیونکہ اس کی شاعری میں حیات و کائنات کا جو عرفان ہے وہ ہمارے تجربات و مشاہدات

سے ہم آہنگ ہے۔

رابرٹ فراسٹ (ROBERT FROST):-

رابنسن کی طرح فراسٹ بھی روایتی شاعری کا دلدادہ ہے۔ ہارورڈ کے دوران قیام میں اس نے کلاسیکی شاعری بالخصوص دیہی شاعری (Pastorals) کا عمیق مطالعہ کیا۔ اور ایمرسن کے فلسفہ و پیغام کے ساتھ براؤننگ کی ڈرامائی خود کلامی کو بھی اپنے شاعرانہ مزاج کا جزو بنالیا۔ انگلستان میں سیاحت کے دوران اس نے (۱۹۱۳) "A Boys Will" اور (۱۹۱۴) "NIRTH OF BOSTON" تصنیف کی جن میں اس کی روایت پرستی اور کلاسیکیت نمایاں ہیں۔

رابرٹ فراسٹ بنیادی طور پر نیو انگلینڈ اور اس کے دیہات و مضافات کا شاعر ہے۔ کیونکہ ابتدائی کلام کے بعد اگرچہ (۱۹۱۶) MOUNTAIN INTERVAL، (۱۹۲۳) NEW HAMPSHIRE اور (۱۹۳۶) FURTHER RANGE وغیرہ میں اس کا مطمح نظر وسیع تر ہوتا گیا۔ لیکن وہاں بھی یہیں اسی خطہ ارض کی ندیاں، جنگلات، کھیت اور کسان اپنی سادگی اور جاذبیت سے اپنی طرف گرویدہ کرتے ہیں۔ فراسٹ کی شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت اس کی غنائیت (LYRICISM) ہے۔ اس کی بیشتر نظمیں جذبہ و احساس کی شدت اور زبان کی سلاست کے باعث شیلی اور کیٹس کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نقادوں نے اسے بیسویں صدی میں سب سے بڑا امریکی غنائی شاعر تسلیم کیا ہے۔ آخری دور میں اگرچہ فراسٹ کی غنائیت مدھم ہوگئی تھی اور اس کے کلام پر فکری و اخلاقی عناصر غالب ہونے لگے تھے لیکن ان کا نشاطی لہجہ بدستور قائم رہا۔

فطرت نگاری کے ساتھ فراسٹ کی شاعری میں ڈرامائی اور بیانیہ خوبیاں بھی نمایاں ہیں۔ "NORTH OF Boston" میں شاعر نے نیو انگلینڈ اور اس کے خطہ عقبی کو اس کے سیب کے باغات، چراگاہوں، فارموں، ندیوں اور جھیلوں سے نئی رونق بخشی ہے۔ دیہاتی ماحول کی اس عکاسی کے باعث فراسٹ "روح عصر" سے بھی بے نیاز نہیں۔ اس کی بیشتر نظمیں امریکی زندگی، تجارتی میلان اور ادبی جنون کا مزاحیہ و فکر انگیز نقشہ پیش کرتی ہیں۔ "Birches" میں حقیقت اور تخیل کا دلچسپ امتزاج ہے۔ اسی طرح "Departmental" میں امریکی تنظیم اور معاشی نظم و نسق کا خاکہ ہے۔ (۱۹۴۵) "A masque of Reason" اور (۱۹۴۷) "A masque of mercy" میں اس کی ڈرامائی خوبیاں واضح ہیں۔ ان نظموں میں ہمیں قدیم اخلاقی ڈراموں کی طرح تماشہ گاہ ہستی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

فراسٹ کی شاعری میں روایت اور جدت، رومانیت اور کلاسیکیت کے ساتھ حقیقت و تخیل کا دلچسپ امتزاج ملتا ہے۔ وہ کلاسیکی اعتدال اور اصول زریں کا نمائندہ ہے۔ اسی لئے وہ ایک طرف جدید شاعری میں تجربات اور جدتوں سے احتراز کرتا ہے تو دوسری طرف فن کو جذباتیت، شدید انفرادیت اور بے صنفی (Formlessness) سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

(۲) "پیکر نگار شعراء" (The Imagiste):-

اگرچہ رابنسن اور فراسٹ کے یہاں قدیم شاعری کا نیا انداز ضرور ملتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے امریکی شاعری میں زبردست تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ نئی شاعری کے علمبرداروں میں سب سے اہم پیکر نگار شعراء ہیں جن کا فن ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان اپنی انقلابیت اور اظہار کے مختلف النوع وسائل کے باعث گذشتہ شاعری سے منفرد ہے۔ فرانسیسی رمز نگاروں اور چینی و جاپانی شاعری سے استفادہ کرکے انگریزی و امریکی شاعروں نے ایزرا پاؤنڈ Ezra Pound کی سرکردگی میں جو ادبی گروہ بنایا وہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

پیکر نگاروں کے خاص اصول حسب ذیل ہیں :-

(۱) موضوعات کا آزادانہ انتخاب اور براہ راست اظہار (۲) اختصار و ایجاز بیان (۳) جدت اسلوب۔

(۴) اصول پیکر نگاری یعنی خیالات کا تاثراتی اظہار (۵) ارتکاز (concentration)۔

اس مخصوص شاعری کی "بے صنفی" (Formlessness) اور بے ہنگم تاثراتی انداز نے پاؤنڈ جیسے شاعر کو اس تحریک سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا۔ لیکن امریکہ میں چند فنکاروں نے اپنی انفرادیت قائم کرلی۔

"آمی لاویل" (Amy Lowell):-

مس لاول قوت و قابلیت کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ وسیع مطالعہ اور یورپ کی سیاحت سے اس کے یہاں جو زور و اثر اور تنوع ہے وہ پاؤنڈ کے علاوہ کسی اور پیکر نگار شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ پاؤنڈ کے میدان سے ہٹ جانے پر ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک وہ مستقل اپنی شاعری اور تنقید سے پیکر نگار۔ تحریک کی سرکردگی کرتی رہی۔ اس کی تصنیف (Tendencies in modern American Poetry 1917) اس لحاظ سے اہم کارنامہ ہے۔ شاعری میں اس کے دو مجموعے "Sword Blades and Poppy Seeds (1914)" اور "Men, women and Ghosts (1916)" نمائندہ تصانیف خیال کئے جاتے ہیں۔

لاول کی نظموں میں جدید تہذیب کے انتشار و پراگندگی کے علاوہ معاشرتی زندگی کی بے کیفی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ "Mid-day and Afternoon" جیسی نظموں میں شہری ہنگاموں اور کثافتوں کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ "Patterns" لاول کی مشہور نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ جس میں شخصی خواہشات اور سماجی رسوم و عقائد کی پابندیوں کی کشمکش موجود ہے۔

"ہلڈا ڈولٹل" (Hilda Doolittle)

ہلڈا کو نقادوں نے "کامل پیکر نگار" کہا ہے کیونکہ اس کی نظمیں کلی طور پر مصورانہ (Pictorial) ہوتی ہیں۔ اور اصولی معروضیت کے باوجود اپنی آہنگ و تاثر کے باعث زیادہ قابل قبول ہیں۔ "سمندری دیوتا" (Sea-gods) اور "Hymen" "Lethe" "طویل غنائیہ نظمیں ہیں لیکن" "ایک مسلسل کوشش ہے جس کا مقابلہ ملٹن کے "کومس" (Comus) سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ہیئت، رنگ اور تناسب

پیکر نگاری کی بہترین مثال ہیں۔

"جان گولڈ فلیچر" (John Gould Fletcher)

پیکر نگار شاعروں میں فلیچر کی انفرادیت مسلّم ہے۔ اس لئے کہ اپنے رفقاء میں اس نے جمالیاتی رنگ کو سب سے زیادہ تنوع بخشا ہے۔ اس کی نظم (۱۹۱۵) "Irradiation" سراسر مصوری معلوم ہوتی ہے۔ جس میں خیالات و احساسات کو بڑی چابکدستی کے واضح کیا گیا ہے۔ (۱۹۱۶) "Goblins and Pagodas" اگرچہ جدید شاعری میں محض ایک تجربہ ہے لیکن یہاں فنکار نے مصوری اور موسیقی کو شاعری سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ہیئت، رنگ اور آواز کے ساتھ بے ہنگم اور پیچیدہ خیالات کو جس خوبی سے فلیچر نے بٹھایا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے۔ مگر نظم بذات خود عام پڑھنے والوں کے لئے ایک مسئلہ ہے اور اس کی تشریح "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں۔ نظم میں تشبیہات اور مشرقی علائم ضرور موجود ہیں لیکن تاثر اور آہنگ کے پس پردہ کوئی واضح نقطہ نظر کار فرما نہیں۔ Breakers and Granite (1921) میں شاعر نے امریکی مناظر کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں نیویارک، نیو انگلینڈ، مسسیپی ندی اور کولریڈو کے حسین مناظر ہیں اور ابراہیم لنکن کا مرثیہ بھی جو وھٹمین کی یاد دلاتا ہے۔

بیسویں صدی امریکی شاعری میں اگرچہ رابنسن اور فراسٹ نے عظیم روایات کو برقرار رکھا لیکن ان کے بعد پیکر نگاروں سے محض شعری تجربات اور انفرادی تقریظ کو ہی شہ ملی۔ خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں براعظم امریکہ کے وسط مغرب میں ایسے شاعر ابھرے جنھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں سے جدید شاعری کو نئے گوشوں سے آشنا کیا۔

(۳) "وسط مغربی شعراء" (MID-WESTERN POETS):-

"واشل لینڈسے" (Vachel Lindsay):-

لینڈسے کے کلام کا مطالعہ پیکر نگاروں کے پس منظر میں زیادہ اہم ہے۔ موخر الذکر شعراء نے روح عصر سے بے اعتنائی برتی اور شاعری کو محض خواص کے ایک ہمدرد حلقہ تک محدود رکھا۔ لیکن لینڈسے نے اپنے گوناگوں تجربات اور امریکی معاشرے سے واقفیت کے باعث عوامی شاعری کو دوبارہ نئی زندگی دی۔

اپنے خاندان اور تعلیمی اداروں سے اگرچہ لینڈسے کو کٹر مذہبی تعلیم ملی تھی لیکن وہ فطرتاً تصور پرست اور آوارہ مزاج تھا۔ مصوری سے معاش کی معقول صورت نہ نکلنے پر وہ اپنی نظمیں ادھر ادھر لوگوں کو سناتا پھرتا اور اسی سے روزی کی سبیل نکل آتی چنانچہ اس کا پہلا مجموعہ Rhymes to be Traded for Bread ہے۔ وہ عوام سے اسی قدر نزدیک تھا جتنا مارک ٹوین (Mark Twain) اور شاید اسی لئے اس کی شاعری میں خالص ملکی موضوعات اور عوامی زبان کے چٹخارے ملتے ہیں۔ اس کی سب سے مشہور نظم General William Booth Enters int Heaven" رسالہ "Poetry." میں شائع ہوئی۔

"The Congo" میں حبشی قوم کی فطرت وجبلت اور مذہبی رجحانات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے لیکن Daniel اور Simon Legree جیسی نظموں میں مزاحیہ انداز غالب ہے۔ لینڈسے کی شاعری اپنی عوامیت، تازگی اور جدت بیان کے باعث ممتاز ہے اور اسی لئے وہ اپنے زمانہ کے مقبول ترین شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔

"ایڈگر لی ماسٹرس" (Edgar Lee Masters) :-

اگرچہ ماسٹرس کی شاعری کا آغاز انیسویں صدی کی آخری دھائیوں میں ہو چکا تھا لیکن جنگ عظیم سے قبل اسے کوئی خاص مقبولیت نہیں حاصل ہوسکی۔ مگر جب ۱۹۱۴ء میں اس کا مجموعہ کلام Spoon River Anthology منظر عام پر آیا تو یکایک اس کا شمار امریکی شاعروں کے دوسری صف میں ہونے لگا۔

ماسٹرس کا مجموعہ امریکہ کے مغربی وسطی علاقوں کے افراد وکرداروں کا مرقع ہے۔ جس میں ڈرامائی خود کلامی کے ذریعہ مردوں کو اپنی زندگی کا وجہ جواز پیش کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ ان کرداروں میں المیہ کردار بھی ہیں اور مزاحیہ بھی۔ لیکن ایسوں کی بھی کمی نہیں جنھیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع نہ فراہم ہوسکے۔ شاعر نے یہاں اوسط طبقوں کی اخلاقیت، مادی ہوس اور تعصبات کا سختی سے محاسبہ کیا ہے۔

"کارل سینڈبرگ" (Carl Sandburg) :-

سینڈبرگ کے مجموعہ (1916) Chicago Poems نے پہلی دفعہ اسے صنعتی شاعر Poet of Industrialism کی حیثیت سے امریکہ میں روشناس کرایا۔ وہ معمولی مزدور سے لیکر حجام، ہوٹل کے ملازم اور سپاہی کی زندگی گزار چکا تھا اس لئے اسے امریکی زندگی اور معاشرہ کا براہ راست مطالعہ تھا۔ اس نے اپنی نظموں میں امریکی سماج کی رنگارنگی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے دوسرے مشہور مجموعے (1920) Smoke and Steel اور (1928) Good Morning, America اور لوک گیتوں کا (1936) "The People, Yes" ہیں۔

سینڈبرگ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ شاعری کا خمیر بسکٹوں اور پھولوں سے مرکب ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں زندگی کی مختلف ومتضاد عکاسیاں موجود ہیں۔ اگر اس کے مجموعہ "دھواں اور فولاد" میں شکاگو کی ملوں کے محل وقوع، صنعتی نظام اور معاشرہ پر اثرات نمایاں ہیں تو The Shadow of the Ships اور "White Shoulders" جیسی نظموں میں مشاہدہ وتخیل کی رنگارنگی ملتی ہے۔ یہاں افکار واحساسات کا کوئی خاص مقام نہیں۔ اس کے برخلاف مشاہدہ اور تاثر زیادہ اہم ہیں۔

اسلوب بیان کی حد تک سینڈبرگ آزاد نظم اور شاعرانہ نثر کا قائل ہے۔ پیکر نگاروں کی طرح اس کی نظمیں بھی اکثر وبیشتر تاثراتی ہوتی ہیں جن سے ان کی مشکل پسندی واجب ہو جاتی ہے لیکن سینڈبرگ کی انسانی ہمدردیوں سے کسی کو انکار نہیں۔

(۴) ایلیٹ اور جدید شعری تجربے

اگرچہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. Eliot) اور ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) دونوں امریکی شاعری سے بے نیاز ہو کر آزادانہ شعری تجربے کرتے رہے اور فرانسیسی رمز نگاروں کی مخصوص اسلوب نگارش، پیکر نگاری اور مکالماتی رنگ اختیار کر کے لسانی ایجاز بیانی اور لب و لہجہ کی جستی میں نئے گل کھلاتے رہے۔ جس کے بین ثبوت The waste Land اور Mauberley جیسی شعری اکتیاسات ہیں، لیکن ان کے اثرات شعوری و غیر شعوری طور پر امریکی شاعری پر پڑے بغیر نہ رہ سکے۔ روح عصر کے انتشار و بے ربطی (Disintegration) کے شدید احساس کے ساتھ عالمانہ طرز اسلوب اور مشکل پسندی دونوں شاعروں کا خاصہ ہے جس سے جدید شاعری بے نیاز نہ رہ سکی۔ جنگ عظیم اول اور دوئم کے درمیان امریکی شاعری میں تنوع اور تجرباتی رنگ بہت حد تک انھیں مشاہیر کا مرہون منت ہے۔

"ہارٹ کرین" (HART CRANE):-

کرین کی شاعری میں اگر ایک طرف ایلیٹ کا اثر ملتا ہے تو دوسری طرف وٹمین کی عقیدت مندی بھی شامل ہے۔ اگرچہ کرین "خرابہ" (THE WASTE LAND) کے مصنف کی رمز نگاری اور شاعرانہ استدلال سے متاثر ہوا لیکن اسے جلد ہی اس امر کا احساس ہو گیا کہ ایلیٹ کے طرز میں شاعری اس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اس نے ایلیٹ کے اسلوب بیان میں وٹمین کی رجائیت کا امتزاج ہی اپنی شاعری کے لئے بہتر سمجھا۔

جس زمانہ میں کرین اس تجرباتی دور سے گزر رہا تھا اس کا قیام "بروکلن" (BROOKLYN) میں تھا۔ جہاں سے مشرقی ندی کو پار کر کے وہ نیو یارک شہر جایا کرتا۔ اس سے پہلے وٹمین اس ندی کو کشتیوں سے پار کرتا تھا لیکن کرین کے زمانہ میں ایک خوب صورت اور مضبوط پل بن چکا تھا۔ جسے اس نے جدید امریکہ کا اشاریہ سمجھا۔ اس پل کے خیال نے اسے ایک نظم لکھنے پر متحرک کیا جس میں امریکی زندگی کی رجائیت اور اثباتیت POSITIVISM کا بخوبی جائزہ لیا جا سکے۔ اور "کولمبس"، "پوکوہانٹس" (POCAHANTAS) کے ساتھ قدیم و جدید کی تخیلی ترجمانی ہو سکے۔ چنانچہ (۱۹۳۰) "THE BRIDGE" اسی پلان کے تحت نظم ہوئی جو کرین کی شاہکار تخلیق ہے۔

کرین کی خودکشی اور ادبی زندگی کی ناکامی کے باوجود اس کی نظموں میں خیالات کا تنوع اور احساسات کی دھڑکن پائی جاتی ہے۔ اس کی شاعری میں غنائی کیفیات زبردست قوت پیکر نگاری سے ہم آہنگ ہیں اور اس لئے اس کی تصانیف کو بیشتر معاصرین پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

"مس مِلے" (Edna Vincent Milley):-

ملے کی شاعری داخلی زندگی اور احساسات و جذبات کی شاعری ہے۔ چنانچہ اس نے جہاں حسن و عشق کی سرمستیوں

اور زندگی کی مسرتوں کا والہانہ ربودگی سے اظہار کیا وہاں اخلاقی پابندیوں سے فنی بغاوت بھی کی۔ وہ جنت کی دلآویزیوں کی بجائے کرۂ ارض کی خوشیوں کی طالب ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری ماورائیت سے پاک ہے۔ "GODS WORLD" میں یہی سرمستی پائی جاتی ہے۔ اس کی نظم (۱۹۳۱) "FATAL INTERVIEW" میں "محبت" کے تمام منازل ——— خوشی و غم، فراق و وصال کی فن کارانہ عکاسی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس کی نظم "RENAISSANCE" سب سے نمائندہ تخلیق ہے جس میں غموں سے نڈھال شاعرہ قبر میں جا پڑی ہے لیکن موسم بہار کی مسرتوں اور سرمستیوں کو یاد کر کے از سر نو زندہ ہو جاتی ہے۔ ملے کی تمام نظموں میں غنائیت اور رومانی تاثر بدرجہ اتم موجود ہیں۔

"رابنسن جیفرس" (ROBINSON JEFFERS) :-

مس ملے کی شاعری کی ہمواری اور توازن کے برخلاف جیفرس کی شاعری میں سیقلونی تندی (CYCLONIC ENERGY) کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ وہ فطرتاً مفکر ہے۔ اور حیات و کائنات کے متعلق اس کے واضح نظریات ہیں اس لئے وہ اپنی شاعری میں "شدت" (INTENSITY) کا زیادہ قائل ہے۔ اس کی مشہور نظم "طامار" (۱۹۲۴) (TAMAR) ساحل کیلیفورنیا پر پہاڑی علاقوں میں "بدکاری" (INCEST) کی ایک موثر اور مافوق الفطرت ڈرامائی مرقع ہے۔ جذبات اور شہوت سے بدمست لڑکی "طامار" اپنے بھائی "لی" (LEE) کے ساتھ بدکرداری کرتی ہے۔ اور حاملہ ہو جانے پر دوسرے عاشق "اینڈریوز" (ANDREWS) سے شادی کرنے کا خیال کرتی ہے لیکن پھر اسے اس سے شدید نفرت ہو جاتی ہے۔ یہ جان کر کہ بدکاری اس کی خاندانی وراثت ہے۔ وہ دیوانگی میں دونوں عاشقوں کو ایک دوسرے سے لڑا دیتی ہے جس سے ان کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ موضوع، اسلوب اور خیال کا یہ تسلسل (۱۹۳۰) "APOLOGY FOR BAD DREAMS" (۱۹۴۱) "BE ANGRY AT THE SUN" اور (۱۹۴۶) "MEDEA" میں بھی موجود ہے۔

جیفرس کی بیانیہ شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیت جذبات کی شدت ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک شاعری میں احساسات و جذبات کو خاص اہمیت ہے اور اسی لئے وہ "عدیپس" (OEDIPUS)، "لیئر" (LEAR) اور "ہیملٹ" (HAMLET) کو اعلیٰ ترین شاعری کا نمونہ سمجھتا ہے۔ لیکن خود جیفرس کا فن سافو کلیز اور شیکسپیر کی بجائے ویبسٹر (WEBSTER) اور اونیل (O'NEILL) کی زیادہ یاد دلاتا ہے۔ اس کے یہاں ڈرامائی کیفیات کی جگہ خوفناک عناصر کا مظاہرہ، اور جمالیاتی ترفع (ELEVATION) کی جگہ المیہ کی شدت ہے۔ لیکن یہ کہنا شاید مناسب نہ ہو کہ جیفرس اعلیٰ شاعری سے بالکل عاری ہے کیونکہ اس کی شاعری کا خط عقبی کھلے میدان، جنگلات، پہاڑی ندیاں، مرغزار اور سمندر کے حسین ساحل ہیں۔ جہاں المیہ کرداروں کو ہم واقعی شاعرانہ سطح پر پاتے ہیں۔ جیفرس سائنسی مادیت اور فطری قوتوں سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اسی لئے وہ ان خارجی قوتوں کے خلاف انسان کو کمزور پاتا ہے اور اس کا انجام کار "موت" تصور کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کی

تہذیب و تحسین میں "حسن" اور "نشاطیت" کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔

جیفرس کی شاعری امریکی فطرت اور رجائیت کا آئینہ دار نہیں۔ کیونکہ وہ نظام کائنات میں انسان کو جبریت و مشیت کا غلام سمجھ کر انھیں مجہولیت پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن اس کے پیغام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان اپنے خول سے نکل کر کائنات کی وسعتوں کا مطالعہ کرے اور ان حقائق کی روشنی میں اپنی زندگی سنوارے۔

"آرچیبالڈ میکلیش" (ARCHIBALD MAE LEISH):-

میکلیش کے کلام کا نمایاں رنگ بھی وہی ہے۔ جو جیفرس کی شاعری کا ہے۔ یعنی یہاں بھی انسان فطرت کی بے پروا اور طاقتور عناصر کا شکار ہے۔ اس مطمح نظر کی ذمہ دار شاید میکلیش کی شاعرانہ تربیت ہے جس میں پاؤنڈ اور ایلیٹ کے علاوہ فرانسیسی رمز نگاروں اور جیمس فریزر کی مشہور و معروف تصنیف "THE GOLDEN BOUGH" کو زبردست دخل رہا ہے۔ اس کے ابتدائی مجموعہ کلام (۱۹۲۵) "THE POT OF EARTH" میں جہاں رومانی احساسات اور موت کی آرزومندی ہے۔ ہم ان اثرات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

"THE HAMLET" (۱۹۲۸) اور (۱۹۲۹) "EINSTEIN" جو میکلیش کی نمائندہ شعری اکتسابات ہیں، امریکی "گمراہ نسل" (LOST GENERATION) کی روحانی کشمکش اور سائنسی قنوطیت کی آئینہ دار ہیں۔ "ہیلمٹ" اس شاعر کا ذہن سائنس اور احساسات کی دنیا سے ماورا حقائق کی تلاش میں منفیت (NEGATIVITY) سے دوچار ہوتا ہے۔ اور عدم کا یہ شدید احساس انسانی مجبوریوں کو تلخ تر بنا دیتا ہے۔ جدید ہیلمٹ کی روح نہ تو کوئی شکل اختیار کرتی ہے اور نہ کچھ کہتی ہے۔ ———

شاعر محض اس کی طرف دیکھ سکتا ہے لیکن وہاں اسے کچھ بھی نہیں ملتا ہے۔ "آئنسٹائن" میں شاعر نظریہ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) کے زور سے کائنات کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جہاں تک بھی اس کی ذہنی رسا پرواز کر سکتی ہے اسے اپنے دماغ کا عکس ہی دکھائی پڑتا ہے۔

محزونیت کا یہ احساس میکلیش پر زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ اس لئے کہ معاشی بحران (ECONOMIC DEPRESSION) کی وجہ سے امریکی ادیبوں اور شاعروں میں وطنیت اور انسان دوستی کا نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اور وہ پھر سماجی موضوعات سے دلچسپی لینے لگے۔ چنانچہ اپنی نظم (۱۹۳۲) "CONQUISTADOR" میں میکلیش بھی انھیں جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وطنیت اور جمہوری آزادی کے یہی تصورات "FRESCOES FOR MR. ROCKEPLLERS CITY (۱۹۳۳) میں بھی نمایاں ہیں جہاں شاعر نے انتہائی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور اشتراکی جھولاؤ کے درمیان امریکی روایت اور جمہوری نظام کو ترجیح دی ہے۔

جنگ دوم کے درمیان میکلیش کی قومی نظموں سے متاثر ہو کر پریسیڈنٹ روزولٹ نے اسے کانگریس لائبریرین مقرر کر دیا تھا لیکن ان نظموں میں ہمارے لئے کوئی خاص کیفیت نہیں۔ البتہ اس کی مختصر غنائیہ نظمیں موضوع کی انفرادیت اور موسیقی کے باعث پسند کی جاتی ہیں۔ (۱۹۴۸) "ACT FIVE" شاعر کا حالیہ کارنامہ

جس میں وہ پھر انسانی اقدار اور مادی تقاضوں کی کشمکش دکھاتا ہے اور ذمہ داری ہمت اور عظمت کے حصول کی تلقین کرتا ہے۔

"کمنگس" (E.E. CUMMINGS)

بیسویں صدی کے امریکی شاعروں میں "کمنگس" شدید رومانی اور انفرادی خصوصیات کا حامل ہے لیکن اس کے یہاں امریکی معاشرت اور وسطی طبقوں کی سطحی جمہوریت اور خود آسودگی (SELF COMPLACENCY) کے خلاف مزاحیہ رنگ بھی نمایاں ہے۔ وہ جدید شعراء میں ذہین دلچسپ اور شریر شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی طنزیہ نظمیں امریکی خانگی زندگی، قومیت یا مروجہ اقدار اور مسلمہ اداروں کا مذاق اڑاتی ہیں لیکن اس کی عشقیہ نظموں میں غنائی کیفیت اور احساسی حسن بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ انگریزی زبان میں بڑے و چھوٹے حروف سے نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "میں" ("نہ") اور "خدا" ("god") کو چھوٹے حروف سے لکھ کر وہ ہمیں جدید دنیا میں ان کی بے وقتی کا احساس دلاتا ہے۔

"ڈالیس اسٹیونس" (WALLACE STEVENS)

اسٹیونس اگرچہ فراسٹ، ایلیٹ اور رابنسن کے پایہ کا شاعر نہیں لیکن ہم عصروں میں اس کا اہم مقام ہے۔ اس کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کی ندرت اور لب و لہجہ کی چستی کے ساتھ اسلوب بیان کی غنائیت قابل تعریف ہے۔ وہ جدید دنیا کی بے کیفی کا مخالف ہے۔ اسی لئے اس کا لہجہ رومانی اور نشاطی ہے۔ (۱۹۲۳) "HARMONIUM" میں یہ عناصر و خصوصیات نمایاں ہیں۔

آخری دور کے کلام میں اسٹیونس کے یہاں فکری عناصر بھی ملتے ہیں چنانچہ (۱۹۳۵) "IDEAS OF ORDER" اور (۱۹۵۰) "AURORAS OF ARTUMN" میں حقیقت و تخیل کی کشمکش اور فرد و سماج کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے اور شاعر فن کاروں کے لئے "SUPREME FICTION" کی تلقین کرتا ہے

جنگ عظیم دوئم کے بعد امریکی شاعری میں تنوع اور تجربات انتہا کو پہونچ گئے ہیں۔ شاعروں کی کثرت میں بھی ROHERT PENN WARREN کے علاوہ ALLEN TATE JOHN CROWE RANSAME اور RICHARD WILBUR اور ("AUTO - WRECK" مصنف) KARL SHAPIRO (مصنف "THE JNGGLAR") اہم حیثیتوں کے مالک ہیں۔

بیسویں صدی امریکی شاعری فکر و خیال سے زیادہ تجربوں اور فنی جدتوں کی شاعری ہے۔ جس میں اظہار کے نئے نئے پیرائے اور اسلوب اختیار کئے گئے ہیں اور تکنیکی امتیاز کی بازی لگی ہوئی ہے چونکہ ناول کا رعب سارے اصناف ادب پر غالب رہا ہے۔ اس لئے امریکی ذہن کی بہترین عکاسی افسانوں اور ناولوں میں ہی ہوسکی ہے مگر اس کے باوجود شاعری میں ایلیٹ، پاونڈ، فراسٹ، رابنسن اور جیفرسن کی تصانیف کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حیات گارسین دتاسی

ڈاکٹر ثریا سلطانہ ایم اے (علیگ) ڈی لٹ (پیرس)

فرانسیسی میں گارساں دی تاسی کے حالات اور زندگی پر کوئی سیر حاصل مضمون یا کتاب موجود نہیں۔ اردو میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا کتابچہ اور مولوی عبدالحق کا مقدمہ خطبات گارساں دی تاسی ناکافی ہیں۔ فرانس کی مختلف سوانحی ڈکشنریوں میں کہیں کہیں چند سطریں نظر آجاتی ہیں یا اس وقت کے رسالوں میں کبھی مختصر نوٹ مل جاتے ہیں جو زیادہ تسلی بخش نہیں کیونکہ ان سے ہماری معلومات میں بہت کم اضافہ ہوتا ہے۔ مجھے مواد جمع کرنے کے لئے پیرس اور مارسیلز کے کتب خانوں اور محافظ خانوں سے پوری مدد ملی۔ جن میں پیرس کی نیشنل لائبریری، نیشنل آرکائو اور اورنٹیل اسکول (ایکول دے لانگ اورنیتال وی وانت) لائبریری کے ساتھ ساتھ مارسیلز کی میونسپل لائبریری اور آرکائو قابل ذکر ہیں۔

گارسین دتاسی کے والد جوزف ژاک گارساں مارسیلز کے ایک خوش حال تاجر ژاں جوزف گارسین کے صاحبزادے تھے اور خود بھی تاجر تھے۔ ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ء کو ان کی شادی کلیر ورجنی تاسی سے ہوئی جو مارسیلز کے رئیس گھرانے سے تھی۔ ان کے والد آندرے تاسی شہر کے صاحب حیثیت لوگوں میں سے تھے۔ سال بھر بعد ۲۰ جنوری ۱۷۹۴ء کو ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کے نام میں ماں باپ دونوں کے ناموں کی رعایت رکھی گئی ——————

گارسین دتاسی!

پیدائش نامہ مورخہ ۲۱ جنوری ۱۷۹۴ء کا خلاصہ درج ذیل ہے جو نام اور وقت پیدائش کا تعین کرتا ہے۔

> فرینچ ری پبلک کے دوسرے سال بوقت دوپہر ہمارے افسر کے سامنے جوزف
> ژاک گارسین معہ دو گواہوں کے پیش ہوا اور اطلاع دی کہ کل سات بجے شام اس کے
> ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کو جوزف الیودورسا جس ورتو گارسین دتاسی نام دیا گیا۔

پیدائش نامہ پر جن لوگوں نے دستخط کئے ان میں مارسیلز کا زمیندار بلیز تاسی (بچہ کا ماموں) بھی تھا۔

ہمارا مصنف اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ محافظ خانہ مارسیلز کے رجسٹروں سے تصدیق ہوتی ہے کہ اس کے دو بھائی اور تھے۔ منجھلا چارلس ورلسنٹ فرانسیس ۲۳ اکتوبر ۱۷۹۶ء کو مارسیلز میں پیدا ہوا اور تھا۔ ؟ بھائی جوزف تھیوفیل کی ولادت بھی وہیں ۹ اگست ۱۸۰۲ء کو ہوئی۔

گارسین د. تاسی نے مارسیلز چھوڑ کر پیرس میں سکونت اختیار کی مگر اس کے بھائی اور خاندان کے دوسرے افراد اپنے وطن میں ہی مقیم رہے، جو میں فارغ البال تاجر ہی نہیں بلکہ اچھے افسر بھی ہوئے ہیں. خود گارسین د تاسی کا بھائی جوزف تھیوفیل مارسیلز کی میونسپلٹی میں معزز عہدہ (مشیر) پر فائز تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر میں اس خاندان کو نہ صرف امتیاز حاصل تھا بلکہ معاشرتی زندگی پر اس کے افراد اثر و اقتدار رکھتے تھے. اس کا بھتیجا اور وارث ہلیو دورہ ۸ر اگست ۱۸۳۶ء کو مارسیلز میں پیدا ہوا۔ یہ بھی تجارت کرتا تھا۔ آخر عمر میں وہ اکیلا اپنے گھر پر دو خادماؤں کی زیر نگرانی رہتا تھا۔ اس کی وفات اپنے وطن میں ۲۶ر جنوری ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔ وہ لاولد مرا۔ اس کے بعد سے اس خاندان کا کوئی پتا نہیں چلتا۔

ہمارا مصنف اپنے آبائی گھر نمبر ۱۳ اسٹرک پنیوار مارسیلز میں رہتا تھا۔ وہیں اس کا لڑکپن گزرا" اس نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی جہاں اس نے عربی شروع کر دی تھی" (۱) اس کی ابتدائی زندگی پر قطعی کوئی تفصیل نہیں ملتی. جنوبی فرانس کی مشہور انسائیکلو پیڈیا صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے کہ "اس ذہین اور محنتی مستشرق کے بچپن اور نوجوانی کے متعلق کچھ نہیں معلوم" (۲) بیس سال کی عمر سے ۱۸۱۴ء میں اس نے مصر سے آئے ہوئے استاد گیبریل تاؤل (GOBRIEL TAOUIL) سے عربی پڑھنی شروع کی اور اس کے رفائیل دی موناشی (RAPHAEL DE MONACHIS) سے درس لیتا رہا۔

یورپ میں اس وقت تک مشرق اور مسلمانوں کی دولت کا چرچا عام ہو گیا تھا خصوصیت کے ساتھ سلطنت مغلیہ اور حکومت عثمانی کی صولت و ثروت پُر کشش تھی. گارسین د تاسی کے والد مارسیلز کے تاجر تھے. اس اہم بندرگاہ پر مشرق سے ہر وقت آمد و رفت رہتی تھی اس لئے تعجب نہیں جو یہ اس طرف کھنچ گئے اور عربی کی تحصیل شروع کر دی کیونکہ ایک علمی ذوق والے کا نباہ تجارت سے آسان نہیں تھا. فرانس میں السنہ مشرقیہ سے دلچسپی پیدا ہو چلی تھی. شاید اسی لئے نوعمر گارسین د. تاسی نے اس تعلیم کو اور سب پر ترجیح دی اور ۲۳ سال کی عمر میں جب اس نے اس سلسلے کو جاری رکھنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ۱۸۱۷ء میں وطن چھوڑ کر پیرس آگیا۔

مشہور مستشرق سلوستر د ساسی (۱۸۳۳-۱۷۵۸) نے فرانس میں السنہ مشرقیہ کو پورے طور پر روشناس کرنے میں پیش قدمی کی۔ اور اس روایت کی تحریک اور ولولہ نوجوانوں میں پیدا کرایا۔ وہ تینوں مشرقی اسلامی زبانوں (عربی. فارسی اور ترکی) کا عالم تھا اور عربی فارسی بے تکان بولتا تھا پیرس کے مشہور مدرسہ السنہ مشرقیہ (ایکول دے لانگ زورینتال دی وانت) میں عربی کا پروفیسر تھا پیرس آکر جب گارسین. د تاسی نے اس سے مشورہ لیا تو اس نے نووارد کی ہمت افزائی کی اور

(1) NOUVELLE BIOGRAPHIE GENERALE TOME XIX PAGE 468.

(2) LES BOVEHES DU RHONE, ENCYCLOPEDIE DEPORTEMENTALE, TOME XXI PAGE 223.

مشرق کے اس شیدائی کی ہر ممکن مدد کی۔ اس نے بھی شفیق و ہمدرد استاد کی زیر نگرانی چار سال دن رات ایک کر کے تینوں اسلامی زبانوں میں مہارت پیدا کی اور ذوق و بصیرت حاصل کی پیرس کی سوربون یونیورسٹی سے اس نے ان زبانوں کا ڈپلوما غیر معمولی اعزاز کے ساتھ حاصل کیا۔ اس دوران میں السنہ مشرقیہ کی تعلیم، سلوسترد ساسی سے قرب و تعلق اور اس کی منفرد و جاذب شخصیت نے شاگرد کے ذہن و خیالات اور علمی مذاق کی تربیت و رہبری کی جس کا اعتراف ہمارے مصنف نے ہمیشہ شکرگزاری کے ساتھ کیا۔

چار سال کی محنت شاقہ کے بعد اس نے ۱۸۲۱ء میں عزالدین مقدسی کی کتاب "کشف الاسرار عن حکم الطیور والازھار" کو بعد مقابلہ و تصحیح شائع کیا اور فرانسیسی میں اس کا ترجمہ بھی کیا۔ ۱۸۲۱ء کے اختتام پر یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرتے ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ سلوسترد ساسی کالج دی فرانس میں بھی فارسی کا پروفیسر تھا۔ شاید اسی کی اعانت سے ۱۸۲۲ء کے شروع میں ہی شاگرد وہاں سکریٹری ہو گیا اور اسی سال ۵ر دسمبر کو اس نے اپنی پسند اور خواہش سے "میری فیلیسٹ صوفی سیتے" سے پیرس میں شادی کر لی(۱)

پروفیسری

گارسیں دتاسی نے اپنی زندگی کا آغاز پیرس کے مشہور ترین تحقیقی اور علمی ادارہ کالج دی فرانس سے کیا جہاں اس کو سکریٹری شپ مل گئی تھی مگر یہ دفتری ملازمت تھی اور اس وقت تک کے لئے کر لی تھی جب تک اور کوئی مناسب صورت نکلے۔ کیونکہ ایسی ملازمت صاحب ذوق و علم کو مطمئن نہ کر سکتی تھی اور ایک مستشرق کو جد و جہد اور محنت کے بعد خود ہی اپنا راستہ نکالنا ہوتا تھا۔ اس نے یونیورسٹی سے نکلتے ہی ملک کی علمی تنظیموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایشیاٹک سوسائٹی (سوسی اتے ازیاتک) پیرس کے بانیوں میں سے تھا۔ ۱۸۲۲ء میں اس کی جب بنیاد پڑی تو اسی سال یکم اپریل سے وہ اس کا اسسٹنٹ سکریٹری اور لائبریرین آنریری طور پر مقرر ہوا(۲) اس سے ذرا پہلے مشرقی ادب پر ایک تفصیلی لیکچر CIRCLE DES ARTS کے سالانہ جلسے کے موقع پر دیا جو مقبول ہوا اور مارچ ۱۸۲۲ء میں (MEMOIRE UNIVERSEL) میں چھپا۔ اس میں اس نے مشرقی ادب کی ترقی، نشو و نما اور اہمیت کو واضح کیا اور اس کو مغربی کلاسیکل ادب کے ہم پلہ قرار دیا۔ اس کے بعد سے متواتر مشرقیات سے متعلق موضوعات پر اس کے مضامین اور کتابیں شائع ہوتی رہیں۔

سلوسترد ساسی السنہ مشرقیہ کا ماہر فن تھا۔ وہ ۱۸۲۴ء تا ۱۸۳۸ء مدرسہ السنہ مشرقیہ پیرس کا ڈائرکٹر رہا جہاں وہ خود بھی پڑھایا کرتا تھا اور فارسی ترکی کے عالم پروفیسر بھی موجود تھے مگر ایسا کوئی نہ تھا جو ہندوستان کی

---

(1) ACTE DE MARIAGE DE GARCIN DE TASSY, ARCHIVE DE LA SEINE 30, QUAI HENRI IV PARIS.

(2) LE LIVE DU CENTENAIRE DE LE SOCIETE' ASIATEARE – 1822 A 1922 PARIS

کروڑوں مسلمانوں کی زبان سے واقف ہوتا۔ چنانچہ اس نے السنہ مشرقیہ کے سلسلے کو مکمل کرنے کے لئے ہندوستانی (اردو) کی درس و تدریس کو ضروری سمجھا۔ اس خیال اور ضرورت کے تحت اس نے اپنے اثر سے حکومت فرانس کو اس پر آمادہ کیا کہ مدرسہ السنہ مشرقیہ میں ہندوستانی کی تعلیم باقاعدہ شروع کی جائے۔ اس عرصہ میں گارساں دی تاسی کو بھی اپنے ایماء سے مطلع کیا اور شاید اس کو اس زبان کے سیکھنے کی ترغیب دی ہو۔

گارسین د تاسی انگریزی سے بخوبی واقف تھا۔ اور انگریزی میں اردو سیکھنے کے لئے خاصہ مواد موجود تھا۔ گرامر، ڈکشنری اور اچھے انتخابات وغیرہ۔ اس نے بڑی جانفشانی سے اردو سیکھنی شروع کی۔ وہ اس غرض سے انگلینڈ گیا کہ وہاں اردو داں عالموں سے ملے۔ اس زبان کے رسالے اور قلمی و مطبوعہ نسخے دیکھے۔ حکومت فرانس نے موسیو مارتیانک (M. DE MARTIGNAC) کے مختصر عہد وزارت میں اردو کی پروفیسری کو جب منظور کرلیا تو استاد نے اپنے شاگرد کو اس کا صحیح طور پر مستحق سمجھا۔ چنانچہ اس کی سفارش پر یہ خدمت گارسین د تاسی کے سپرد ہوئی۔ اس زبان کی تعلیم شروع ہونے سے پہلے سلوستر دساسی کی طرف سے عوام کی توجہ مبذول کرانے کے لئے اخبار مونیٹر مورخہ ۱۶ر جون ۱۸۲۸ء کو ذیل کا مضمون شائع ہوا:۔

"السنہ مشرقیہ کی تعلیم جو کئی سالوں سے یورپ میں مروج ہے اس میں ملک فرانس اور حکومت نے مزید پیش قدمی کی ہے۔ جس سے ان کی ادب و سائنس میں بڑھتی دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے اور ان نوجوانوں کی بھی ہمت افزائی ہوتی ہے جو اس تعلیم کے خواہاں ہیں۔ ۱۹ر مئی کو حکومت نے ایکول میں ہندوستانی کی پروفیسری کا اعلان کیا ہے۔ کالج دی فرانس میں ۱۸۱۴ء سے لوئی چہاردہم کے وقت سے سنسکرت پڑھائی جاتی ہے۔ اب ایکول اورینتال دی لانگ وی وانٹ (جہاں بالخصوص زندہ زبانیں پڑھائی جاتی ہیں) میں ایسی زبان کی تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے جو فارسی اور سنسکرت سے مل کر بنی ہے۔ یہ مخلوط زبان ہندوستان کی مختلف قوموں میں اس درجہ عام ہے کہ پورے ملک میں (سوائے دور دراز علاقوں کے) بول چال کا ذریعہ ہے۔

"اس عظیم ملک میں دس گیارہ زبانیں بولی جاتی ہیں مگر غیر ملکیوں کے لئے ہندوستانی سیکھ لینا کافی ہے۔ تقریباً سارے ہندوستان میں کیپ کامروں سے لے کر بلوچستان تک اور سندھ سے برہم پترا کی وادیوں تک سمجھی جاتی ہے۔ دوسری زبانیں مثلاً بنگالی اور تامل وغیرہ اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔ مگر ہندوستانی ملک کی عام یا قومی زبان کہی جاسکتی ہے۔ یہ تہذیب یافتہ زبان ہے۔ اور اپنے طبع زاد کارناموں کی وجہ سے وسیع اور قابل توجہ ادب کی

ؔ ہندوستانی اردو کے مترادف ہے۔ گارسین د تاسی اور دوسرے فرانسیسی مستشرقین نے اسی معنی میں استعمال کیا ہے اس لئے سہولت کی خاطر میں نے بھی کہیں کہیں ان کی پیروی کی ہے۔

مالک ہے چنانچہ اس زبان کی ابتداء سے السنۂ مشرقیہ کی سرپرستی ہوتی ہے..... گارسیں دتاسی جن کو یہ خدمت سپرد ہوئی ہے۔ اس کو بخوبی جانتے ہیں۔ انہوں نے انگلینڈ جاکر اس میں ماہرین فن سے بھی مدد لی ہے۔ وہ وسیع معلومات کے حامل ہیں۔ گذشتہ پندرہ برسوں سے وہ تین اہم اسلامی مشرقی زبانوں پر برابر کام کر رہے ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کے مضامین اور کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ چھٹیوں کے ختم ہوتے ہی اسکول میں ہندوستانی کی تعلیم شروع ہو جائے گی۔ اب تک جو دیر ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ پروفیسر مذکور ہندوستانی گرامر کی ترتیب و طباعت میں مشغول تھے" (۱)

اس پر ایک فرانسیسی نے بنام شوم (CHAUME) ۲۴ جون ۱۸۲۸ء کو اس کا مفصل جواب ایڈیٹر کو دیا جس کے کچھ ضروری حصے نقل کئے جاتے ہیں۔

"حقیقتاً ہندوستانی سوائے مسلمانوں کے اور کوئی نہیں سمجھتا۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس میں عربی فارسی سے ترجموں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ترجموں پر ہر صاحب ذوق اصل کو ترجیح دے گا۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے چاہے وہ طبع زاد ہو یا ترجمہ۔ اس کے لکھنے پڑھنے والوں کے لئے ضرور جاذب ہو گی مگر یورپ کے لئے نہیں ہندوستانی میں تاریخی اور عالمگیر دلچسپی کے طبع زاد کارنامے نہیں لکھے گئے .... حکومت سے اس زبان کی تعلیم کی درخواست اس بنا پر کی گئی کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بول چال کے کام آتی ہے۔ مگر نہ تو یہ فرانسیسی مقبوضات میں سمجھی جاتی ہے (کرناٹک یا مالابار کوئی جائے تو شاید کام دے) اور نہ ہی مذہبی نقطۂ نظر سے مفید ہے کیونکہ مسلمان عیسائیت میں دلچسپی نہیں لیتے نہ ہی شوق ظاہر کرتے ہیں.... گارسیں دتاسی کا انتخاب اس زبان کی پروفیسری کے لئے ہوا ہے۔ اور وہ جلد اس زبان کی گرامر شائع کرنے کا وعدہ کرتے ہیں مگر یہ زبان اس قدر آسان ہے کہ بغیر گرامر کے سیکھی جاسکتی ہے۔ مصادر، ان کی بناوٹ اور فعل کے کچھ اصول معلوم کر لینے کافی ہیں۔ اس کے علاوہ پہلے سے کئی ایک گرامریں موجود ہیں۔ مثلاً دو تین گل کرسٹ کی لکھی ہوئی۔ ایک جان شیکسپیر کی جو سب سے اچھی ہے۔ ایک پرائس کی۔ ایک اسمتھ کی اور سن فورڈ آرنو کی بھی قابل ذکر ہے۔ یہ کتابیں انگریزی میں ہیں مگر ہندوستانی پر تحقیق کرنے والے کے لئے انگریزی جاننا ضروری ہے۔ اور ہندوستان کو جاکر دیکھنا بھی مفید ہوگا....... ہندوستانی فرانسیسی گرامر تیار ہو جاتی ہے جب بھی انگریزی کے بغیر کام نہ چلے گا کیونکہ سوائے انگریزی کے کسی اور زبان میں اس کی ڈکشنری موجود نہیں....... یہ یقیناً اہم ہے کہ حکومت ان نوجوانوں کی ہمت افزائی کرے جو مشرقی زبانوں کی تحصیل چاہتے ہیں مگر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ ہمت افزائی ایسے مقاصد کی طرف رہبری کر سکے جو مذہبیات تجارت اور ادب کے نقطۂ نظر سے اہم ہوں۔ ہندوستانی کی تعلیم سے بظاہر ان میں سے کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مسلمان عیسائی نہیں بنتے۔ پھر اس زبان سے واقفیت بھی کوئی امتیاز کی بات نہیں سمجھی جاتی اور نہ ہی ہمت افزائی و قدر دانی کی جاتی ہے" (۱)

(1) LE MONITEUR UNIVERSEL, LUNDI 16 JUIN 1828, NO. 168. PAGE 844 Colonne 2.

اس طویل خط سے مصنف کی تنگ ذہنیت اور عصبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط پر ہی اکتفا نہیں بلکہ اس کو قوم نے کتابچہ کی شکل میں چھپوا کر بھی تقسیم کیا۔ وہ اس زبان کی تعلیم بے کار سمجھتا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ یہ شروع نہ ہو تو بہتر ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک نہ چلی اور اعلان کے مطابق ہندوستانی کی تدریس مدرسہ السنہ مشرقیہ میں شروع ہو گئی۔

گارسین دتاسی کا ابتدا میں عارضی طور پر تقرر ہوا۔ ۱۸۲۹ء میں اس نے سو صفحے کی گرامر RUDIMENT DE LE LANGUE کے نام سے شائع کی جس میں عربی اور دیوناگری حروف تہجی کے بعد قواعد اردو کے بنیادی اصول فصل کی گردان اور مشقیں ہیں اور ۱۸۴۷ء میں ہندی گرامر پر RUDIMENT DE LA LANGUE HINDOUSTANI کے نام سے سو صفحوں کی کتاب چھاپی۔ ملازمت کے شروع دو سالوں میں اس کو پے بہ پے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اپنی علمیت، ذہانت اور محنت سے بھرم قائم کر لیا۔ اور اپنی جگہ بنا لی طالب علم بھی شوق سے اس زبان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ دو سال بعد ۲ دسمبر ۱۸۳۰ء کو آخر کار اس زبان کی پروفیسری مستقل کر دی گئی اور کچھ عرصہ بعد ہی اس کا سنہری دور شروع ہو گیا۔ کیوں کہ سالوں سال تک مدرسہ السنہ مشرقیہ میں اس زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دور دور سے غیر ملکی طالب علم آتے رہے جن میں بڑی تعداد انگریزوں کی ہوتی جو کمپنی ہند کی ملازمت کے خواہاں تھے (۲)

گارساں دی تاسی پر ان مخالفتوں کی چھاپ اس درجہ گہری پڑی کہ یہ ہمیشہ دکھتی رگ کی طرح اس کے ساتھ رہی چنانچہ ہر سال یونیورسٹی کھلنے پر جب وہ سالانہ تفصیلی لیکچر دیتا تو اس میں کم و بیش اس بات پر زور دیتا کہ ہندوستانی ملک کی عام زبان ہے۔ جس کو کروروں ہندی باشندے بولتے ہیں جس کا ادب برابر ترقی پذیر ہے اور قابل توجہ ہے۔ یورپ کے علمی حلقوں میں میرا خیال ہے کہ آج بھی یہ نقطہ نظر ملتا ہے کہ زندہ زبانیں تحقیق اور سائنٹفک کام کے لئے کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں ہوتیں۔ اس لئے سنسکرت کو شوق سے پڑھنے والے زیادہ ملیں گے مگر ہندوستان کی موجودہ زبانوں میں دلچسپی کم لیں گے۔

۱۸۵۰ء کے سالانہ لیکچر میں گارسین دتاسی ایک جگہ تصدیق کرتا ہے کہ "میں نے ۱۸۴۰ء میں پہلی دفعہ ہندوستانی کے نسخے لانگلیس (LANGLES) کے نادر کتب خانہ میں دیکھے جن میں افسوس کی آرائش محفل قابل ذکر ہے جو ہندو کی بہترین کتابوں میں سے ہے" (۲)

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس نے اردو اس وقت سے شروع کر دی تھی۔ اس کی ابتدائی تصانیف عربی [illegible]

(۱) NOTICE HISTORIQUE SUR L'ECOLE SPECIALE DES LANGUES OMNTALES VI PARIS 1883, PAGE 28.

(۲) LA LANGUE ET LA LITHERATURE HINDOMSTANIES 1867, PAGE 14.

سے متعلق ہیں۔ اردو اس نے بعد میں سیکھی مگر جب شروع کی تو اس کی لپک روز بروز بڑھتی گئی۔ اس نے انگلینڈ کا سفر متعدد بار کیا اور کافی عرصہ وہاں قیام کیا۔ تاکہ اردو دانوں سے تفصیلی ملاقات اور تبادلہ خیال ہو سکے۔ ادبی رجحانات اور نئی کتابوں کے متعلق بات چیت کر سکے۔ اس سلسلے میں چند نام قابل ذکر ہیں۔ اس کی ملاقات ڈبلیو۔ ایف ایلن سے ہوئی جو ALLEN'S INDIAN MAIL کا مدیر تھا۔ ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے سکریٹری ایڈون نورس سے ملا جس کو لسانیات اور ہندوستانی زبان سے شغف تھا۔ سالانہ خطبہ میں وہ اعتراف کرتا ہے کہ ڈنکن فوربس سے ملا۔ "جس نے ہندوستانی انگریزی ڈکشنری مرتب کی ہے۔ ڈنکس فوربس اور آر نوٹ نے مل کر لندن میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ یہ دونوں گل کریسٹ کے شاگرد ہیں۔" (۳) وہ کچھ اور مستشرقین احباب کا ذکر خلوص سے کرتا ہے جن میں ڈبلیو ایچ سائیکز ہنری کورٹنز۔ الیکزنڈر کاظم بیگ۔ تھیوڈور گولڈ سٹکر اور سری کار بینیٹ اہم ہیں۔

وہ ہندوستانیوں یا ہندشناسوں سے ملنے کا ہمیشہ خواہش مند رہتا۔ اگر کوئی پیرس آتا تو وہ سمجھتا جیسے یہ اسی کا مہمان ہو۔ اس کے خطبات اور خطوط میں اکثر متفرق لوگوں سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۸۷۲ء میں سید محمود پیرس گئے تو ان کی بڑی خاطر کی۔ اپنے گھر مدعو کیا اور اپنی کتاب تاریخ ادبیات ہندی ہندوستانی بطور تحفہ دی۔ ویسے ہی مولوی مسیح الدین خاں رئیس کاکوروی سفیر شاہ اودھ سے پیرس میں مل کر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کو ولیم میور سے بھی پیرس میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن کے بارہ میں اطلاع دیتا ہے کہ انہوں نے پانچ ہزار روپے بہترین ہندوستانی کتابوں کے لئے سال ۷۴ - ۱۸۷۳ میں وقف کئے جو سولہ اردو کے اور دو ہندی کے مصنفین کو ملے۔ ڈبلیو نوکس سکریٹری نواب بنگال سے بھی پیرس میں ملنے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی قدرت زبان کا معترف ہے (۲)

گارسیں د تاسی کی مراسلت ہندوستان کے مصنفین۔ اخبار و رسائل کے مدیروں اور چھاپہ خانے کے مالکوں سے رہی ہے۔ مثلاً وہ شکر گزار ہے کہ "اخبار الاخبار اس کے منتظم مولوی سید امداد علی نے از راہ عنایت مجھے بھیجا۔" (۳)

اس کی خط و کتابت ہندوستان میں مختلف ہندشناسوں سے ہوئی ہے۔ فیلکس بوترو س فرنچ مستشرق (جو دہلی کالج میں پروفیسر تھا پھر اس کا پرنسپل ہو گیا۔) کو پابندی سے خط لکھتا رہا۔ اور متفرق مسائل بوقت ضرورت پوچھتا رہتا۔ اس کے تعلقات با ذوق اور علم کے قدردان انگریزوں سے بھی تھے جو برابر اس کو مطلوبہ کتابیں اور رسائل بھیجتے رہتے اور تحقیق طلب امور کا جواب بعد دریافت و تحقیق کے دیتے رہتے۔ ان

(1) I BID 1877, PAGE 96

(2) I BID 1873, PAGE 86

(3) I BID 1866 PAGE 450

میں سر الیگزنڈر گرانٹ (ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی) سر چارلس ٹریولین۔ ایم شکال میجر جیمس اور میجر ظر قابل ذکر ہیں۔ اپنے خطبہ میں افسوس سے کہتا ہے کہ مجھے فرانسیس ٹیلر (پرنسپل دہلی کالج جو غدر میں شہید ہوئے ہیں) سے علمی امداد متواتر ملتی رہی " فرانسیس ٹیلر مجھے اکثر و بیشتر شمالی ہند کی ادبی تحریکات سے مطلع کرتے رہے۔ مجھے ان پر ادبی مسائل کی فراہمی پر بڑا بھروسہ تھا۔ وہ خط کا جواب پابندی سے دیتے اور جو پوچھا جاتا اس میں حتی الامکان تحقیق کرتے۔ وہ ہندوستانی زبان سے بخوبی واقف تھے اور اس کے عالموں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے اس لئے بحث طلب معاملات میں وہ اہل زبان عالموں کی رائے لیتے رہتے تھے۔ اس سے ان کے علمی و ادبی معاون ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے " (۱)

گارسین دتاسی نے اردو کے لئے جان شیکسپیر کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ حال ہی میں عظیم مستشرق کو موت نے اٹھا لیا ہے وہ ایسا غیر معمولی عالم تھا جس نے ابتداء صدی سے نہایت کامیابی کے ساتھ ہندوستان پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہندوستانی میں رومن رسم الخط کا بہت مخالف تھا میں جان شیکسپیر کا ذکر کرتا ہوں۔ جو میرے اردو کے استاد تھے۔ ایسے ہی جیسے عربی فارسی کے لئے سلوسترد ساسی تھے۔ وہ جان شیکسپیر کو اپنا استاد مانتا ہے مگر اس کی کوئی یقینی شہادت نہیں ملتی کہ باقاعدہ طور پر انگلینڈ میں رہ کر اس نے اردو شیکسپیر سے کب پڑھی؟ وہ اس سے متعدد بار ضرور ملا ہے۔ اس سے پابندی کے ساتھ مراسلت بھی تھی۔ کتابیں وغیرہ منگواتا رہتا اور دوسرے علمی مسائل میں مشورہ لیتا رہتا تھا۔ ان ملاقاتوں۔ علمی مشوروں اور قدردانی کی وجہ سے اسے اپنا استاد سمجھتا ہے۔ شاید یہ تعلق روحانی زیادہ تھا۔

علمی اعزاز

گارسین دتاسی کو سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس کی تصانیف اور تقریروں سے اس خیال کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا اور خاطر خواہ قدردانی بھی ہوئی۔ وہ تین اگست سنہ ۱۸۳۸ء کو پرنس تاییراں کے مرنے پر فرانس انسٹی ٹیوٹ کی اکیڈیمی (A CADEMIE DES INSCRIPTIONS ET DES BELLES LETTRES) کا ممبر مقرر ہوا جو ایک فرانسیسی عالم کے لئے سب سے بڑا امتیاز ہے۔ اٹھائیس جون سنہ ۱۸۶۷ء کو وہ ایشیاٹک سوسائٹی پیرس کا صدر منتخب ہوا۔ انتیس اپریل سنہ ۱۸۳۶ء کو ایک ممتاز فرانسیسی خطاب CHEVALIES DE LA LEQION DIHONNEIV عطا ہوا۔ انگلینڈ سے امپریل اسٹار آف انڈیا کا اعزاز ملا۔ پیٹرس برگ۔ برلن۔ میونک ویانا۔ فلورنس۔ اپسالا۔ امریکن اورنیٹل سوسائٹی۔ انجمن اسلام لاہور۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ۔ بنگال اور سویڈن کی اورنیٹل مجلسوں کا بھی رکن مقرر ہوا۔ وہ فرانس کی اورنیٹل سوسائٹی اور سوسائٹی علم الاقوام

(1) LA LANQUE ET LA LITHERATURE HIDONSTANIE 1867 PANIS PAGE 126.
(2) IBID 1859. PAGE 184.

کا نائب صدر منتخب ہوا۔

اپنا اولین کارنامہ "کتاب کشف الاسرار عن حکم الطیور والازھار" کا ایڈیشن اور اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کرنے کے صلہ میں گارساں دی تاسی کو شاہ فرانس کے دربار میں حاضری کا شرف نصیب ہوا (۳) اس میں شاید سلوستر دتاسی کا ہاتھ رہا ہو جس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ دنیاوی اعزاز اور رکھ رکھاؤ سے شاگرد کی بہ نسبت استاد کو زیادہ دلچسپی تھی۔

مذہب

وہ پکا عیسائی اور رومن کیتھولک عقاید رکھتا تھا (۲) سالانہ خطبات میں وہ عیسائی مشنری کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے قبول عیسائیت کی تفصیل و تعداد دیا کرتا تھا جس سے اس کے مذہب سے شغف کی شہادت ملتی ہے مگر وہ عام اور روایتی قسم کا عیسائی نہ تھا کیوں کہ جو چیزیں اس کو ناپسند تھیں ان کا اس نے مذاق اڑایا ہے۔ اس نے مختلف مذاہب کا مقابلہ و مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ تمام مذاہب انسان کی رہبری ایک ایسی بلند حقیقت کی طرف کرتے ہیں جو کثرت و تنوع کے باوجود وحدت و کلیت کی حامل ہے۔ اس کے خیال میں یہ بنیاد تمام مذہبوں میں مشترک ہے اور کسی قسم کا تضاد بنیادی طور پر نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اسلامی عقاید کو سمجھنے سمجھانے میں اس نے صبر اور ہمدردی سے کام لیا۔

ازدواجی زندگی

گارسین دتاسی کے کوئی اولاد نہ تھی مگر اس کی ازدواجی زندگی خوش اور مطمئن گزری۔ وہ اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ خطبہ ۱۸۷۵ء میں اس اقتباس سے اس کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

" میں ہندوستانی مصنفین اور مستشرقین کی وفات کے بیان سے پہلے اپنے ذاتی نقصان اور جاں کاہ سانحہ کا ذکر کرتا ہوں کہ میری محبت کرنے والی ہمہ صفت شریک حیات، صحیح معنوں میں پتی ورتا، نرم گفتار و خدمت گذار جو باون سال تک میری دل آسائی اور خوش قسمتی کا باعث رہی، آج مجھے ہمیشہ کے لئے تیرہ و تار کر گئی تسلی اب تو بقول ایک انگریز کے بس اس خیال سے ہوتی ہے۔

سوئیں گے ہم مگر نہ ہمیشہ کے واسطے
ہے دل کو ایک صبح درخشاں کا انتظار
ملنا ہے ہم کو یوں کہ نہیں ہجر اس کے بعد
اس روز جس کو کہتے ہیں حشر اہل روزگار (۳)

(1) JOURNAL DES SAUANTS, COMPTE RENDES, 1821 PASIS

(2) INSTITUT DE FRANCE: FUNE'SAILLES, DISCONRS DE ED. LABONLAYE, PRESIDENT DE ACADEMIE DES INSCRIPTIONS ET BELLES-LETTRES, DU 6 SEPTEMBSE 1875 PAIS

(3) LA LANGUE ET LA LITTARATURE HINDONSTANIES 1875 PASIS PAGE 98

وفات

محمد سیعد تاسی نے دو ستمبر ۱۸۷۸ء کو ایک بجے دن پیرس میں اپنے گھر میں انتقال کیا[1]۔ اس وقت اس کی عمر چوراسی برس کی تھی۔ اس کی لاش مارسیلز لے جائی گئی جہاں وہ سینٹ پیر قبرستان میں گھنے سایہ دار درخت کے نیچے ابدی نیند سو رہا ہے۔ اس کی کشادہ قبر مارسیلز میں آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ اس پر اس کے ساتھ ساتھ تھیوفیل گارسین د تاسی اور خاندان کے دو افراد کے اور نام کندہ ہیں۔

اس کی وفات پر اخبار و رسائل میں اطلاعات و مختصر مضامین شائع ہوئے جو اس کی ہر دل عزیزی، انتھک محنت اور ادبی خدمات کے معترف ہیں۔ چند مخصوص تعزیتی بیانات کے اقتباسات حسب ذیل ہیں جن سے گارسین د تاسی کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایڈمنڈ رینان نائب صدر ایشیاٹک سوسائٹی پیرس گیارہ اکتوبر ۱۸۷۸ء کے جلسہ کو، یوں مخاطب کرتا ہے۔

سالانہ اجلاس منعقدہ جون کے بعد ہم نے اپنا محبوب پرانا ساتھی اور بڑا عالم کھو دیا۔ میں اس موقع پر آپ سب کے ساتھ غمگین ہوں۔ وہ سوسی اتے ازیاتک پیرس کے بانیوں میں سے آخری تھا جس نے اس کی بنیاد رکھی، اور مرتے دم تک سالوں سال نہایت محنت اور ذوق و شوق سے اس کی خدمت و تربیت کی۔ اس کی بے لوث خدمت و کام کی یاد ہمیشہ ہمارے سینوں میں محفوظ رہے گی۔ وہ مستشرقین کی اس نسل سے تھا جس کا محرک سلوستر د ساسی اور اس کا ذوق علم تھا۔ وہ ہر لحاظ سے استاد کا منفرد شاگرد اور غیر معمولی مستشرق تھا۔ . . . . عربی اور فارسی زبان سیکھنے کے بعد اس نے بالخصوص ہندوستانی پر مہارت پیدا کی اور اس کے لئے اپنے آپ کو کھپا دیا۔ استاد کی درخواست پر ایکول رے لانگ اور نیتال دی وانت میں اس زبان کی پروفیسری نکالی گئی۔ اپنے کو اس خدمت کے مستحق ثابت کرنے کے لئے اس نے بڑے ولولہ اور علمی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے اپنی ساری زندگی اس نے ہندوستانی کی تعلیم و تصنیفات پر لگا دی اور اس کو معزز بنا دیا۔ اس کا اعتراف ہمیں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے ادب کو ہے۔ ہندوستان (اس کے ذاتی تعلق وہاں کے عالموں اور قدردانوں سے تھے) میں اس نے بالخصوص عظمت حاصل کی ہے۔ اس ملک کے مختلف پہلوؤں، تاریخ حاضرہ اور زبان و بیان کے بارہ میں اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ ہر سال یونیورسٹی کھلنے پر اپنے خطبہ میں وہ ایسے منتخب اور دلچسپ بیانات دیتا جو معلومات سے پُر ہوتے۔

یہاں اس کے کارناموں کا سائنٹفک تجزیہ مقصود نہیں۔ اس کا حق ہمارے سکریٹری اپنی سالانہ رپورٹ میں ادا کریں گے۔ گارسین د تاسی کی سیدھی سچی، قانع، بے لوث اور علم و ادب میں سرگرم زندگی ہمارے لئے اچھی مثال ہے۔ . . . . . . وہ پکا عیسائی تھا۔[2]

---

(1) JOURNAL DES SAUANTS, COMPTE- RENDN. 1821, PASIS

2) YOURNAL ASIATIQNE- OCTOBNE- NONEMDNE 1878, PASIS PAGE 454- 456.

سالانہ جلسہ ایشیاٹک سوسائٹی پیرس منعقدہ اٹھائیس جون ۱۸۷۹ء کو ارنسٹ رینان سکریٹری اپنی رپورٹ میں گارسین دتاسی پر پانچ صفحات پر مشتمل تفصیلی بیان دیتا ہے۔ جس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

گارسین دتاسی کے ساتھ سوسی اتے ازیاٹک کے بانیوں میں سے آخری قبر میں اتار دیا گیا۔ وہ ممتاز مستشرقین کے قافلے میں آخری تھا جو سلوسترد ساسی کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ اور اپنی اپنی متعلقہ زبانوں کے عالم و ماہر ہوئے۔ ..... مارسیلز میں پیدا ہوا۔ السنہ مشرقیہ کا ذوق و شوق اپنے وطن میں اس کو ہو گیا تھا۔ اور اس کی تکمیل کے لئے پیرس آیا۔ جہاں سلوسترد ساسی نے پدرانہ شفقت سے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ اور اپنا علمی میدان اس کو سونپا۔ اس زبان و ادب کو وہ خود سیکھنا چاہتا تھا جس کا رسم الخط عربی تھا۔ جس پر اکثر فارسی کے اور بیشتر برہمنی اثرات ملتے ہیں۔ اور جس کو ہندوستانی کا نام سے پکارتے ہیں۔ اس نے اس اہم مملکت کو گارسین دتاسی کے سپرد کیا۔ وہ بھی باذوق، ذہین اور تابعدار شاگرد تھا۔ اس نے اس میں مہارت پیدا کرنے اور لکھنے پڑھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وہ اس اہم خدمت کی بجا آوری کے لئے پورے طور پر تیار تھا۔ اور اس کا جائز مستحق ...... اس نے اپنی ساری زندگی خدائے واحد کی حقیقی اور عظیم ذات کو سمجھنے سمجھانے میں لگا دی۔ مشرقی فلسفیانہ شاعری سے اس نے ہمیں متعارف کیا جو دل کش و جاذب ہے۔ ...... کلیات ولی اور اس کے منتخبات کا فرانسیسی ترجمہ بیش بہا خزانہ ہے جو پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں کی رہنمائی ایک نئی سمت کی طرف کرتا ہے۔ گارسین دتاسی نے ہندوستان پر پڑھنے پڑھانے، سوچنے اور لکھنے لکھانے کے ساتھ ہر قسم کی نئی معلومات رجحانات اور تجربات حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

اس کی معلومات کا پیمانہ وسیع تھا۔ اس نے ہندی مسلمانوں کے سارے اہم پہلوؤں کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا تھا اور ہندوستانی کے تمام رجحانات اور تخلیقی کارناموں پر اس کی نظر تھی۔ اس کو اس ادب کی سائنٹفک تاریخ کی بڑی کمی محسوس ہوئی، کیوں کہ اب تک کسی ملکی یا غیر ملکی نے اس طرف توجہ نہیں کی تھی۔ چناں چہ اس نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ضخیم تذکرہ "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" بڑی محنت سے مرتب کیا۔ جس میں فراخ دلی سے ہر اس شخص کو جگہ دی جس کا کلام ہندوستانی میں ملتا ہے۔ اس تذکرہ میں مصنف کی تاریخ پیدائش و وفات، حیات، اس کے علمی کارنامے اور ان کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔

گارسین دتاسی کی نظر سے کوئی نئی تحریر نہ چھوٹتی۔ کون سا ایسا ہندی اخبار تھا جو وہ نہ پڑھتا تھا۔ کوئی بھی ادبی نشست یا مجلس تھی جس کے کارناموں کا اس نے جائزہ نہ لیا ہو۔ اس کے سالانہ خطبات معلومات اور علمی دلچسپیوں سے بھرپور ہیں۔ وہ ہم مستشرقین کے لئے ماڈل ہے۔ ہندوستان میں اسے شہرت ملی۔ ہندوستان کے اخبار و رسائل میں اس کی تصویر چھپی اور وہ اس کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں انگلینڈ میں وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے وہ کچھ کیا جو انگریز مستشرقین خود کرنا چاہتے تھے۔

گر نہ کر سکے۔ اس کے ذاتی تعلقات ہندوستانیوں سے وسیع تھے۔ حکومت انگلشیہ نے بھی اس کی ادبی خدمات کی کھلے دل سے قدردانی کی۔ . . . . . اپنے عقاید و خیالات میں وہ مستحکم تھا مگر اس کے باوجود اس کے ہاں دوسروں کے لئے بڑی گنجائش تھی۔ . . . . . . ہم اسے پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ جہاں ہم اس کی کمزوریوں اور قدردانی کی خواہش پر مسکراتے ہیں وہاں یہ بھی قابل غور ہے کہ وہ بھی گذشتہ نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک زندگی کا نام سنجیدگی اور دنیا سے بے تعلق ہو کر اپنے کام میں لگے رہنا مقصد حیات۔ اسے نہ دنیا سے کوئی دلچسپی تھی نہ کسی چیز سے واسطہ۔ اس کے ہاں زبان و ادب کے لئے ایسا خلوص ملتا ہے جو اس کی تحریروں میں حقیقی جاذبیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ کسی موضوع پر گم نہیں ہو جاتا۔ اور ایسا کوئی ریمارک پاس نہیں کرتا جس سے کسی کو صدمہ پہنچے۔ اس کے ہاں خود قابل نفرین نہیں۔ سب کے لئے اس کے ہاں مروت و ہمدردی کے جذبات ملتے ہیں۔ وہ کسی کا مخالف نہیں اس کے اندر ہم اپنا ماضی دیکھتے ہیں۔ جو گزر گیا۔ اگلوں کے نزدیک جو خوبیاں تھیں ہم ان کو کمزوریاں سمجھتے ہیں۔ اس کی ذاتی رائے کی آزادی پر روایتی قدروں کی چھاپ گہری تھی۔ وہ کاٹرمیر (QUATRE MIRE) سے مشابہ ہے سوائے اس کے وہ ان لوگوں سے بھی صبر و نرمی سے پیش آتا جو اس سے کوئی طبعی مناسبت نہ رکھتے تھے۔ اس کی محبت آمیز مسکراہٹ اور دور دراز کی دنیا پر اس کے طویل دلچسپ بیانات ہمیشہ اس کی یاد دلاتے رہیں گے۔ اس کی وفات ہمیں انتہاء رنج و محن میں چھوڑ جاتی ہے۔"(1)

وصیت و وراثت

وہ لاولد مرا۔ اس کے چھوٹے بھائی جوزف تھیوفیل کا لڑکا ہیلیو دور گارسین دتاسی اس کا وارث ہوا۔ مال و متاع سے قطع نظر ہمارے مصنف کا کتب خانہ بڑا اہم اور بیش بہا تھا۔ کتب خانہ کی تفصیلی فہرست (CATALOGUE) اس کے شاگرد دلونکل نے جانفشانی سے تیار کی۔ کتابوں کی تعداد ۲۹۰۵ ہے۔ جس میں ہندوستانی سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور ترکی کے قلمی و مطبوعہ نسخے شامل ہیں۔ فہرست کتب خانہ دتاسی کے شروع میں گارسین دتاسی کی آخری عمر کی تصویر بھی چھپی ہے۔ وصیت کے مطابق اس کا کتب خانہ پیرس میں نیلام کیا گیا۔ جیسا کہ اس کے بھائی جوزف تھیوفیل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو فہرست کتب خانہ کی ابتدا ہی میں نظر آتا ہے۔

"میرے عزیز و محترم بھائی نے اپنی وصیت میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ان کا کتب خانہ فروخت کیا جائے۔ تاکہ ان کے صاحب ذوق شاگردوں اور با مذاق دوستوں کو اس سے فائدہ اٹھانے اور نادر نسخوں کو اپنے پاس رکھنے کا موقع مل سکے۔ اس خواہش کی تعمیل میں میرے بیٹے اور میں نے کتب خانہ کی فہرست چھپوا دی ہے۔ تاکہ شائقین دیکھ سکیں اور مرحوم بھائی کی وصیت خاطر خواہ طریقہ پر انجام پائے۔"

(1) JOURNAL ASIATIQNE, RAPPORT ANNUEL 1879, PARIS, PAGE 13 TO 17.

فہرست کتب خانہ دی تاسی مختلف عنوانات کے تحت منقسم ہے:۔
دین عیسائیت ۔ مذاہب قدیمہ ۔ دین اسلام ۔ مذاہب فارس ۔ مذاہب ہند، یورپین اور مشرقی علم فقہ ۔ جنرل سائنس ۔ فلسفہ ۔ علم الانسان ۔ طب ا، نیچرل سائنس ۔ ریاضیات ۔ فنون لطیفہ ۔ لسانیات ۔ تاریخ ۔ فن تعمیر علم مسکوکات ۔ علم کتبات ۔ تاریخ ادبیات ۔ رسائل ۔ فہرست ۔ کتب خانہ جات ۔ متفرق انسائیکلو پیڈیا اور آخر میں ہندوستانی ۔ سنسکرت ۔ عربی ۔ فارسی اور ترکی قلمی نسخوں کی تفصیلی فہرست جس میں ۱۳۶ ہندوستانی و سنسکرت قلمی نسخے ۳۲ فارسی کے ۱۶ عربی کے اور ۵ ترکی کے ۔ اس کے علاوہ مشرقی قلمی نسخوں کے نامکمل حصے ہیں جن میں ہندوستان ۔ مصر اور قدیم روم کے آرٹ اور ڈرائنگ کے متعلق اور کچھ ٹکٹوں کے سیٹ ہیں۔
کتب خانہ کا نیلام سترہ مارچ ۱۸۷۹ء کو شروع ہوا۔ اوقات دو سے چار مقرر ہوئے ۔ پہلے روز سنسکرت کے قلمی و مطبوعہ نسخے ۔ جغرافیہ اور سیاحت سے متعلق کتابیں ۔ دوسرے دن فارسی اور تاریخ سے متعلق کتابیں ۔ اسی طرح یہ فروخت کا سلسلہ پندرہ روز چلا۔
اورینٹل اسکول لائبریری پیرس میں گارسیں د تاسی کے کچھ ذاتی نسخے اس کے قلم سے ہی فٹ نوٹ لکھے ہوئے میری نظر سے گزرے ہیں ۔ شاید وہ اس کا عطیہ ہوں ۔ مارسیلز کی میونسپل لائبریری میں بھی اس کے کتب خانہ سے پچاس قلمی و مطبوعہ نسخے موجود ہیں ۔ جن کی فہرست میں نے اپنے مارسیلز کے دوران قیام جنوری ۱۹۶۰ء میں تیار کی تھی ۔ شاید یہ نیلام کے بعد بچ رہے ہوں ۔ ان میں زیادہ تر کتابیں اردو کی ہیں ۔ جن میں اردو کے کچھ اہم قلمی نسخے بھی ہیں۔

رؤف احمد خاں پرتو

سخاوت مرزا

علاقہ مدراس میں اردو کے اچھے اچھے شاعر گذرے ہیں۔ ہم یہاں پرتو کے مختصر حالات اور ان کے کلام پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ پرتو داغ کے مخالف معاصر تھے اس لئے یہاں اس کا کچھ ذکر نامناسب نہ ہوگا۔

مخالفین داغ پر ایک سرسری نظر

داغ دہلوی کی شخصیت اردو شاعری میں مسلمہ ہے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ جو تیکھا پن داغ کے کلام میں ہے وہ دوسرے شعرا میں نہیں۔

ڈاکٹر اقبال، تو خیر داغ کے شاگرد ہی تھے۔ مگر ان کا رنگ کچھ اور ہے۔ تاہم اپنے استاد کی رحلت پر آنسو بہائے اور ان کی عاشقانہ شاعری کی تعریف کی ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبہ میں داغ کے تلامذہ پھیلے ہوئے تھے۔ جب کسی شاعر کی شخصیت اور شہرت قائم ہو جاتی ہے تو بعض اشخاص کو رشک و حسد بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایک متوسط شاعر کا اس کے سامنے چراغ جل نہیں سکتا۔ بقول

"چراغ داغ کے آگے کسی کا جل نہ سکا"

تاہم اس رقابت سے اتنا ضرور ہوتا ہے کہ مسابقت کا ایک جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہر شاعر کسی صاحب کمال شاعر سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ اس کو اس مسابقت میں کامیابی تو نہیں ہوتی مگر اردو زبان کے لئے کچھ جواہر پارے ہاتھ آ ہی جاتے ہیں۔ خصوصاً دکن میں داغ دہلوی کی بڑی شہرت ہوئی۔ ہزاروں شاگرد تھے۔ خود والی دکن کو داغ سے تلمذ تھا۔ بعض نے تو پہلے پہل مخالفت کی مگر آخر کار داغ کا لوہا ماننا پڑا۔ چناں چہ مولانا رضی الدین کیفی حیدرآبادی پہلے میکش تھانوی کے شاگرد تھے اور خوب کہتے تھے۔ مگر دل کو تسلی نہ ہوئی تھی۔ داغ کے آخر زمانہ میں، داغ کے پاس ایک غزل بغرض اصلاح لے کر پہنچے۔ اور یک ہی شعر کی اصلاح پر داغ کے قائل ہو گئے اور شاگردی سے عار نہ کیا۔ بعض ثقہ اشخاص کا بیان ہے کہ جب حیدرآباد میں داغ کی رحلت کے بعد جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو کیفی کا نام بھی پیش ہوا۔ مگر سائل دہلوی کے آگے کسی کی نہ چلی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کیفی مرحوم کو حسن اتفاق سے غالباً نیلام میں داغ دہلوی کا تخت ہاتھ آگیا تھا۔

اس پر استاد داغ کو غسل میت دیا گیا تھا جس پر کیفی کو بڑا ناز تھا۔ سایل دہلوی نے بعض حیدرآبادی شعرا کے کلام پر اعتراضات کئے تو کیفی کو بوجہ حب وطنی اس کی تاب نہ رہی اور سایل سے کہا کہ حضرت استاد بھی تو کبھی کبوتر کو کفوتر کہا کرتے تھے

داغ کے مخالفین میں ایک اور خوش گو شاعر ڈاکٹر احمد حسین مایل مدراسی بھی تھے۔ جن کو داغ کا یہ مشہور شعر بہت کھٹکتا تھا ؎

نہیں سہل اے داغ یاروں سے کہدو　　کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

مایل نے اس کا جواب یوں دیا تھا ؎

زباں کا بہت جن کو دعویٰ ہے مایل　　انھیں بھی تو آئی زباں آتے آتے۔

شیفتہ اکبرآبادی جو اس زمانہ میں حیدرآباد میں تھے ان کو بھی داغ کا کلام پسند نہ تھا۔ اس لئے کہ داغ ایک عوامی شاعر تھے۔ زیادہ گہرائی میں نہیں جاتے تھے۔ اور داغ کے قبل غالب کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ چناں چہ حبیب اللہ ذکا نے قدیم رنگ تغزل کو چھوڑ کر غالب کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اور غالب سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح بھی لیا کرتے تھے غرض شیفتہ فرماتے ہیں ؎

کیا طبیعت کو لڑا ہیں شیفتہ　　طفل مکتب جس جگہ استاد ہو

ایک اور اردو کے جید شاعر حضرت منشی میر امداد علی علوی تھانوی (خلیفہ مرزا سردار بیگ قدس سرہٗ تلمیذ مخیر میرٹھی بھی تھے۔ مگر ان کا رنگ زیادہ تر صوفیانہ تھا۔ بعض عاشقانہ غزلیں تو داغ سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان کو بھی داغ کا رنگ پسند نہ تھا۔ جب ان کے تلامذہ داغ کا طرح مصرعہ دیتے تو آپ جھنجھلا جاتے تھے تاہم بعض غزلیں داغ کی طرح میں بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ داغ کی منظور نظر طوائف نے علوی رحمۃ اللہ علیہ کی غزل گائی۔ جب مقطع سنا تو داغ مرحوم کہنے لگے کہ ارے تو نے کس کی غزل پڑھ دی۔ ان کے کیا کہنے ہیں یہ تو تصوف کی پڑیا ہیں ــــــ علوی صاحبؒ کی اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

نہ ہوئی پھر کسی عاشق پہ جفا میرے بعد　　بن گئے دست ستم دست دعا میرے بعد

جو غالباً داغ کے مصرعہ طرح پر کہی گئی تھی ؏

"نہ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد"

مولانا علوی کے شاگرد رشید سجاد علی میکش تھانوی (سورج بھان) نے اپنی ایک تالیف داغ و امیر پر لکھی تھی طبع اور شائع ہو چکی ہے۔

ان کی یہ رائے ہے کہ دونوں اپنے اپنے فن کے ماہر تھے۔ داغ محاورہ بندی اور روزمرہ کے استاد تھے۔

حضرت داغ کے تلامذہ مدراس ... [illegible]

تلیذ کوثر خیرآبادی کو ایک مکتوب میں یہ لکھا ہے کہ "شیر بیشۂ سخنوری محی الدین حسین خاں تسنیم کو تسلیم۔ میں نے آپ کو ایک شیر سمجھ کر مدراس کی لومڑیوں پر چھوڑ دیا ہے۔ کلام داغ سے لکھنوی اور مدراسی جلتے ہیں، عطا کریں واللہ باللہ یہ میں کسی کے اعتراض کو دیکھوں نہ اس کے جواب کی طرف مخاطب، اہل زبان ہو جانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ داغ اہل مذاق کا دل نشین ہے۔ مٹائے سے نہیں مٹتا۔ اس کو فقیر کی دعا ہے۔ ذوق مٹے تو داغ مٹے ع

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است		طرفہ ماجرا ہے کہ کلام داغ

پر اعتراض کر کے فروغ چاہتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے کہ بغیر کہے سنے صاحب اعتراض کو کوئی نہ کوئی جواب دندان شکن دے ہی دیتا ہے۔ اپنی خیریت سے مع کار لائقہ کے ہمیشہ یاد شاد فرماتے رہئے، زیادہ نیاز (داغ دہلوی)

اردو ادب علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۶ء ص ۵۲-۵۰

سخاوت مرزا۔

پرتو کے حالات کمیاب ہیں، ہم انہیں کے کلام کی داخلی شہادتوں سے مختصر و جامع حالات یہاں پر رقم کرتے ہیں:

تذکرہ یادگار ضیغم میں پرتو کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے :۔

رؤف، روف احمد خاں، خلف حاجی حافظ نواب خورشید احمد خاں۔

خورشید، نواسے، نواب عظیم جاہ بہادر والئ سابق مدراس کے ہیں، جو بیس سال کی عمر ہے، شاگرد شریف مدراسی، دو دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ کبھی کبھی پرتو بھی تخلص کرتے ہیں۔ الخ

عبداللہ خاں ضیغم نے ان کی ایک تصویر بھی شائع کی ہے جو عالم شباب کی ہے جس میں پرانی وضع داری کی ایک جھلک ہے۔ زلفیں چھوٹی ہوئیں، چگی داڑھی۔ کھڑے کی گول ٹوپی۔ تذکرہ ضیغم کے شعرا کی تصویریں رسالہ آجکل دہلی میں پروفیسر مختار الدین آرزو نے اپنے متعارفی مضمون کے ساتھ شائع کرائی ہیں مگر زمانہ مابعد کی ایک تصویر جو آپ کی ایک مثنوی حرز جان (اردو) میں موجود ہے اس میں تو پرتو بالکل نئی فیشن کے اپ ٹوڈیٹ جنٹل مین معلوم ہوتے ہیں۔ جو انگریزی سوٹ بوٹ میں ہے۔ مگر ٹوپی ترکی پہن رکھی ہے۔ جو ہندوستانی قومیت کی اسلامی علامت ہے۔ اور داڑھی منڈی ہوئی۔

غرض پرتو والا جاہی، حافظ خورشید احمد خاں کے صاحبزادے اور نواب سراج الامرا غلام محمد علی خاں المخاطب بہ عظیم جاہ پرنس آف آسکاٹ اول (۱۲۵۸/۱۲۹۰ھ) کے نواسے تھے جو بزمانہ نابالغی نواب غلام غوث خاں المتخلص بہ اعظم کے (۱۲۶۱/۱۲۵۸ھ) تک ریجنٹ بھی رہ چکے تھے۔ ترتیب تذکرہ ضیغم ۱۳۰۲ھ کے وقت پرتو کی عمر ۲۴ سال کی تھی۔ اس لحاظ سے ان کی تاریخ ولادت تقریباً ۱۲۷۸ھ قرار پاتی ہے۔ علوم متداولہ اردو و فارسی کی تکمیل اساتذہ وقت سے کی، شاعری میں سید شاہ صادق الحسینی المتخلص بہ شریف مدراسی کے شاگرد تھے۔ اور چوبیس سال کی عمر میں دو دیوان اردو کے مرتب کر چکے تھے۔ اس سے زاید حالات نہیں ملتے جو تذکرۂ ضیغم

میں ہیں۔ البتہ دواوین کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پرتو کے معاصرین میں جعفر حسین عریف فرزند وشاگرد شریف مدراسی (ان کے استاد بھائی) اور نظام الدین المتخلص بہ نظامی نبیرۂ شرف الامرا (ابن عبدالصمد خاں دلیر جنگ؟) دوسرے عبدالباقی المتخلص بہ نیازی شیرازی پرتو کے خواجہ تاش، محمد جلال الدین اعجاز شہزادہ مرزا الٰہی بخت بیدار (خلف سلطان بخت بہادر دہلوی، جنھوں نے مدراس میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اور مرزا علی بخت اظفری کے برادر یا بنی عمام سے تھے۔ اور محی الدین حسین خاں تسنیم وغیرہ یہ تو مدراس کے معاصرین ہیں، اور شمالی ہند کے شعرا میں میر ضامن علی جلال لکھنوی، داغ دہلوی۔ امیر مینائی امانت لکھنوی۔ ہیں۔ جن سے پرتو کے تعلقات رہے ہیں، جلال نے پرتو کی غزل پر ایک مخمس تضمین کیا اور دیوان پرتو کا قطعہ تاریخ بھی کہا تھا۔ پرتو نے اپنے معاصر داغ پر چوٹ کی تھی، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

وفات:- پرتو نے کب وفات پائی؟ سنہ وفات فی الحال دستیاب نہ ہوسکا۔ ان کی مطبوعہ تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ پرتو ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء تک بقید حیات تھے۔ مدراس کے مصنفین نے پرتو کی اردو شاعری کے متعلق غالباً اب تک کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔

اولاد:- پرتو نے اپنی دو صاحب زادیوں۔ احمد النساء اور حامد النساء اور اپنے ایک فرزند قدرت احمد کا اشارہ اپنے دواوین میں کیا ہے۔

تلامذہ:- آپ کی صاحب زادیاں اور صاحب زادے قدرت احمد المتخلص بہ طلعت آپ ہی کے شاگرد تھے۔ نیز غلام دستگیر عرف صاحب جان قمر تخلص میر اشرف علی اشرف مدراسی اور عریاں، مصنف دیوان تیغ عریاں۔ عبدالاحد خاں احد تلمیذ پرتو۔ عزیز احمد خاں عزیز تلمیذ پرتو حاجی محمود علی رونق تلمیذ پرتو۔ محمد غوث کاشف تلمیذ پرتو ـــــ میر وحید علی وحید تلمیذ پرتو۔

تصنیفات:- پرتو کی دس تصنیفات کا پتہ چلا ہے جو درج ذیل ہیں۔ جن کی اشعار کی تعداد تقریباً بیس ہزار ہے۔

(۱) کلیات پرتو:- صفحات ۳۶۱ (۲۸ ابیات فی صفحہ)۔ (تقریباً دس ہزار بیت) مطبوعہ مطبع شرفیہ مدراس ۱۳۰۸ھ

جس میں دیوان اول اور دوم اور حسب ذیل متفرق مثنویاں اور ڈرامے شامل ہیں:۔

۱۔ وفاق نامہ پرتو	۷ صفحہ	سطر ۱۵ بیت	۱۰۵	ابیات
۲۔ عشق نامہ پرتو	" "	" "	۴۳	ابیات
۳۔ سوز نامہ پرتو	" "	" "	۴۰	"
۴۔ طلب نامہ پرتو	" "	" "	۵۱	"

۶۔ طلسم پرتو۔ بطرز اندر سبھا ۳۲ صفحہ سطر ۱۱ ۔ ۳۵۲ ابیات
۷۔ پرتو سبھا۔ ۴۰ صفحات ۔ ۴۰۰ "
۸۔ پرستان پرتو۔ (راجہ اندر) ۲۰ صفحات ۲۰۰ "

۲۔ دیوان سوم پرتو اردو :۔ معہ فارسی چند غزلیات و قطعات۔

۳۔ دیوان چہارم پرتو اردو :۔ (ہم قافیہ دیوان شریف مدراسی استاد خود) تقریباً تین ہزار بیت۔

۴۔ مخمسات پرتو: (۱۰ مخمسات صفحات ۲۰)۔ مطبوعہ مطبع رزاقیہ مدراس ۱۳۲۵ھ

۵۔ مخمسات جلال لکھنوی بر غزل ہائے پرتو مدراسی (۱۰ مخمس) مطبوعہ ــــ
جلال لکھنوی نے مخمسات پرتو پر قطعہ تاریخ بھی کہا تھا جو یہ ہے ؎

غزلیں بھی لاجواب ہیں مصرع بھی انتخاب ٭ بے مثل و یادگار مخمس جدید ہیں
تاریخ ان کے طبع کی یوں لکھ دے اے جلال ٭ نایاب روزگار مخمس جدید ہیں

۶۔ دیوان پرتو فارسی :۔ طبع ہو چکا ہے۔

۷۔ مثنوی حرز جاں ۱۱۸ صفحہ ۱۵ سطر، جملہ ۱۷۰۰ ابیات تقریباً۔ مطبوعہ مطبع رزاقیہ کوچہ طٰہٰ صاحب مدراس۔
معہ تصویر مصنف ۔ ۱۳۲۶ھ

ابتداء :۔ زبان قلم اور حمد خدا ٭ یہ جرأت یہ مقدور یہ ادعا؟
خاتمہ ؎ ملے جیسے بچھڑے ہوئے ایک جا ٭ ملا یوں ہی بچھڑے ہوؤں کو خدا
مراد ان کی بر آئیں جیسی تمام ٭ ہماری مرادیں ملیں والسلام

مثنوی کے کردار :۔ شاہنشہ باج در۔ شہنشاہ بیگم۔ شہزادہ جان جان۔ فتنہ گر۔ شہزادہ الامان
مثنوی کی زبان سلیس بامحاورہ اور عام فہم ہے واقعہ نگاری اور تسلسل کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

۸۔ نغمہ پرتو مجموعہ، کلام ہندی ٹھمری۔ ہولی۔ دھرپد وغیرہ ۔ ۹۔ زاد راہ پرتو مجموعہ نعت وسلام و مرثیہ وغیرہ۔

۱۰۔ پرتوستان سے کریم پٹیہ (مائل لندن تو جاپان) ایک کھیل ــــ ہماری نظر سے نہیں گزرا ــــ

مدراس میں اردو

احاطہ مدراس میں اردو کی ترویج کا زمانہ تین سو سال سے زائد ہی ہے۔ نواب سعادت اللہ خاں ناظم آرکاٹ اردو دکھنی کے شایق اور دکھنی شعراء کے سرپرست تھے اور خود بھی کچھ مرثیے دکھنی میں کہا کرتے تھے۔ ان کے عہد کے شعراء میں قابل ذکر جسونت راؤ منشی۔ زین العابدین خاں دیوان، عبداللہ ذاکر بیجاپوری۔ حافظ محمد کمال، امین اسرائیلی وغیرہ ہیں۔ نواب محمد علی والا جاہ نے بھی بڑی سرپرستی کی ان کے صاحبزادے عمدۃ الامراء ممتاز خود اردو کے اچھے شاعر تھے۔ اور اہل زبان شعراء مثلاً فضل علی ممتاز (تلمیذ سودا)، مرزا علی بخت اظفری، ذوالفقار علی خاں صفا بریلوی تلامذہ میر تقی ان کے مصاحب تھے۔ جن کی وجہ سے ان کی اور علامہ آگاہ (محمد باقر) کی شاعری پر گہرا اثر ہوا۔ اور پرانے دکھنی الفاظ ترک کیے

اسلوب بیان بھی بدلا۔ غرض ان کے متبعین کے لئے مشعل راہ بنے۔ متاخرین میں عبدالرحمٰن شاطر مدراسی اور پرتو والا جاہی صاحب زیر ترجمہ بڑے اچھے شاعر گزرے۔ اور آج سے نصف صدی قبل اہل زبان نے ان کے کلام کی داد دی ہے۔ بخیال چہ پرتو اپنے کو فخر شعراء لکھنؤ لکھتے ہیں ـــــــ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے پرانی قدیم دکھنی زبان، اور اسلوب بیان کو ترک کرکے اہل زبان کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا۔ اور ان کی تتبع کی۔ اور اس طرح یہ دکھنی شاگرد بھی، اہل زبان ہونے کا دم بھرنے لگے۔ جو ایک حد تک بجا ہے ـــــــ اور ان کی حوصلہ مندی قابل داد ہے۔

شاعرانہ تعلی ؎

فخر شعراء لکھنؤ ہوں   گر ہند ہے گل، میں رنگ و بو ہوں
مدراس ہے میرے دم سے گلشن   گویا میں چمن کی آبرو ہوں

معلوم ہوتا ہے کہ پرتو کے استاد شریف مدراسی کے آباد اجداد ہندوستانی تھے، اور انہی غزلوں میں ایک جگہ اشارہ کیا ہے کہ میں لکھنؤ اور دہلی میں کیوں نہ ہوا کہ میرے کلام کی داد خاطر خواہ ملتی۔ غرض پرتو نے بھی داغ دہلوی پر ایک غزل میں چوٹ کی ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

مدراس میں ہوں گو پہ وہ معجز بیاں ہوں میں   پھاہا ہے شعر تر مرا دلی کے داغ کا
وہ بے جگر ہوں میں کہ مرے دل سے دم بدم   دم بند، تنگ قافیہ ہوتا ہے داغ کا
کیا حضرت شریف کو لینے سے اس کو ربط   پرتو منہ آئے واہ! کہاں منہ یہ داغ کا

حضرت شریف سے مراد سید صادق حسینی شریف تخلص پرتو کے استاد ہیں۔ مگر حقیقت تو یہ ہے داغ ایک اہل زبان شاعر تھا۔ روزمرہ، محاورہ بندی، شان تغزل حسن بیان میں۔ بڑے بڑے استاد اس کا لوہا مانتے ہیں۔ اس قسم کی تعلی سے کسی باکمال شاعر کی شخصیت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، ظاہر ہے ـــــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ پرتو نے بحیثیت مجموعی مدراس جیسے دور دراز مقام میں، اپنی شاعری سے اردو کو بڑا فروغ دیا ہے۔ اور ان کے استاد شریف مدراسی بھی بڑے اچھے شاعر تھے۔ اور ان کی وجہ سے وہاں اردو زبان نے بڑی ترقی کی ہے۔ اور آج کل کے شعراء مشاعروں میں شمالی ہند کے شعراء کو بھی تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ جو یہ کہا کرتے ہیں کہ مدراس اور اردو مشاعرہ اور ایسی فصیح اردو۔ جو منصف مزاج ہیں۔ وہ داد دیتے ہیں اور حوصلہ افزائی سے دریغ نہیں کرتے۔ اس میں تو ترقی و ترویج اردو کا راز مضمر ہے۔

پرتو اور شاعری

پرتو نے اردو شاعری میں ناسخ لکھنوی کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

سودا، امیر، آتش و غالب تو ہیں پرتو   شایق نہیں ناسخ کے سوا اور کسی کا

پرتو ایک پر گو اور خوش گو شاعر ہے۔ کسی صنف سخن میں قاصر نہیں۔ ہم یہاں ان کے دواوین سے

کلام کے مختلف نمونے بغرض ضیافت طبع درج ذیل کرتے ہیں:۔

بعض خصوصیات انہوں نے پرتو کے بجائے تخلص اوجالا بھی استعمال کیا ہے۔ اور اردو غزل بے شرکت الفاظ فارسی و عربی وغیرہ بھی خوب کہی ہے جس کی آج کل بہت مانگ ہے۔

منہ کھولو تو، کل ہو، بے کل میں　　یہ بات کہاں کسی کلی میں
بے کل کو ہو کل کا کیا بھروسہ　　چھوٹے کوئی کل ہے بے کلی میں
بہتر جلے جب جلے یہ بھڑکی　　لڑکے ہیں بچاس سو گلی میں
گھایل ہوں یہ تیری گا رہا ہوں　　یہ ٹھاٹھ یہ دھن ہے بانسلی میں
جوبن ہے جو کچھ تیری کچوں کا　　یہ کچھ ہے او بہار کب ڈلی میں
بات ان سے جو کی بھی تو جھڑے پھول　　کیا پھول تھے ہونٹ کی کلی میں
دھن باندھ کے ان کلائیوں کی　　ہاتھوں سے پڑا میں بے کلی میں
تلوار سی چل گئی لگی آگ　　کیا لاگ کی ہے کٹی جلی میں
تھم جاؤ تو آنسوؤں کے لڑکو　　کھو جاؤ گے جھوٹ کھلبلی میں
اے سورج ہے تیرا اوجالا　　تنکا تنکا بری بھلی میں

غزل مدراسی اردو، بلا شرکت عربی و فارسی وغیرہ:۔

۵ نر بھاگی ہے گوروں کی جو مورت　　ہے بھاگ یہاں کی سانولی میں
بے کل ہوں سنگار سے تمہارے　　کب تک رکھو گے تل کھلی میں
بڑھ کر ہے کرن سے بھی اوجالا　　چولی کی تری اسا ولی میں

مزاحیہ غزلیں:۔ اکثر لڑکے لڑکیاں بعض خاص زبان میں تفریح دل لگی مذاق کے طور پر فے کی بات اور ڑے کی بات کہا کرتی ہیں۔ تاکہ غیر واقف شخص سمجھ نہ سکے، پرتو صاحب نے اس کو بھی نہیں چھوڑا۔

غزل ترکیب زبان کہ ہر حرکت میں حرف فے زاید کیا جائے:۔ اور یہ تو ہکلی زبان سے بھی مشکل معلوم ہوتی ہے جس کے متعلق ظریف دہلوی نے بھی کچھ ہار مان لی ہے جس کا ذکر سطور بعد میں ہم کریں گے ——— پرتو (بچوں) کی رمزیہ زبان میں اس طرح گنگناتے ہیں۔

تفیرے فے غفم مفیں بفیکفل ہفوں مفیں　　اَفا نسفو ؤوں سَفے بَفادَ فَلْ ہَفوْں مَفیں
تیرے غم میں بے کل ہوں میں　　آنسوؤں سے بادل ہوں میں

ـــه رسالہ عصمت جولائی ۱۹۵۹ء

اُوفُش کُفِے دَفعدَبِے کُفِے بَغَا غِفَش سُفِے　　تِغیرُغَا غوفَا ہِفَاں مُفنلفَل ہِغُوں مُغیں
اس کے وعدے کے باعث سے　　ترا خواہاں ۔ متلگل ہوں میں
جُفَبْ وُفَہْ کُفَرُوفا ہِفو جُغا تُفَا ہِفِے　　تفلفی سِفِے کُفَرُ وفا پُفہفل ہِفوں مُغیں
جب وہ کڑوا ہو جاتا ہے ۔ تلخی سے کڑوا پھل ہوں میں

پرتو نے ایک مزاحیہ غزل ہکلی زبان میں کہی۔ جس کے متعلق اہل فن کا خیال ہے کہ بحر میں توازن قائم رکھنا دشوار ہے۔ اس کا موجد شاعر فارسی گو قاآنی بیان کیا جاتا ہے۔ بعض اور بھی فارسی شعراء نے کہا ہے۔ نیز شنا، گجراتی معاصر و تلمیذ ولی کی بھی ایک غزل موجود ہے۔

غرض پرتو یوں ہکلا ہکلا کر نغمہ سرا ہیں۔

تیتیری فففرقت میں یہ مضطر ہوں میں　　پپیارے سے بڑھ کر وہ دلبر ہوں میں
تیری فرقت 〃 〃 〃 〃　　پیارے وہ
در دنداں کی دُہن میں جو نکلا آنسو　　ببولا بچمک کر گگگوہر ہوں میں
کی جو　　(بولا) چمک (گوہر)
پوچتے ہیں بُبرہمن گگکیوں بہر ناحق　　بولتا ہے ببت خود ککہ پتھر ہوں میں
نہیں ہوتی سسیاہی ششب ہجر کی دور　　غضب ایسا تتیرا مُمقدر ہوں میں
گگھتا ہے اے مہ رخ روشن تتیرا　　زرنگ مماہ ممنور ہوں میں
تراہر تل بچمک کر یہہ کہتا ہہے　　ططلعت ممیش دیکھو ببن اختر ہوں میں
ت ت ترے اا ابروے رخ خدار کا قول　　م م میدان م میں خ خنجر ہوں میں
س ستادن م میں دل کو اا اپنے ن نہ کیوں　　ش ش شیدائے ش شوخ، س ستمگر ہوں میں
ت ت تنہائی م میں جب گ گ گھبراتا ہوں　　بیکسی بول ت تی ہے س س سر پر ہوں میں
بیکسی سے ج جو ہوئے وہ ہیں حیراں غ غریب　　بولتا ہے ت توکل س س سر پر ہوں میں
مہرباں کیوں د د دوری م مجھ سے ایسی　　واہ پرتو ت ت تیرا م م مقرر ہوں میں

عام کلام پرتو سے

میں جسم تو جاں اے ہوش ربا تو اور نہیں میں اور نہیں　　اس بزم میں مثل ساز و صدا تو اور نہیں میں اور نہیں
اے جان سیہ بختی کے فدا یا یں بھی میرا لگا نہ چھٹا　　رخسار ہے تو میں زلف دوتا تو اور نہیں میں اور نہیں

ہم رنگ لالہ بھڑکی گل و یاسمن میں آگ　　رخسار آتشیں نے لگا دی چمن میں آگ

فرقت کا تپ زدہ ہوں تو اے بت نہ چھیڑنا — چقماق کی طرح ہے نہاں میرے تن میں آگ
کیا ماجرا سناؤں تمہیں سوزِ دل، کا آہ — لگ جائے گی تمام زبان و دہن میں آگ
کھینچوں اگر میں زلفِ بتاں کے فراق میں — ہندوستان سے آہ لگا دے ختن میں آگ
وہ گرمی مزاج سے بے کل ہے بے طرح — خشکی نے ڈال دی ہے جھریرے بدن میں آگ
اس شمع رو سے بات بھی کی تو عدد جلے — گویا بھری ہوئی ہے ہمارے سخن میں آگ
وہ آستیں غدار کہاں، اور کہاں یہ شمع — الٹے اگر نقاب لگے انجمن میں آگ
از خاک تا بہ کرۂ آتش ہے آگ ہی — کیسی بھری ہوئی ہے دل نعرہ زن میں آگ
گرمی ہجر سرو رواں سے چنار ہوں — ایسی بھڑک رہی ہے مرے تن بدن میں آگ
بے وجہ آج گرم سراپا ہوا جو وہ — دل جل گیا لگی ہے میرے تن بدن میں آگ
پرتوؔ جو کھنچ گیا کوئی بے مہر بے سبب — آہیں میری لگائی ہیں چرخ کہن میں آگ

(دیوان سوم پرتوؔ)

برغزل والد ماجد خود خورشید تخلص

سب کو ناکام جو رکھا تو ہوا خود ناکام — ہاتھ میں چرخ کے ہے قوس قزح تیر نہیں

ہم قافیہ برغزل ظفر بہادر شاہ دہلی سے

اوچھالتا ہے جو فوارہ آب دو دو ہاتھ — اوچھل رہا ہے فلک پر سحاب دو دو ہاتھ
الاپتا جو کبھی محفلِ نشاط میں وہ — اوچھلتے وجد میں آکر رباب دو دو ہاتھ
ابھی یہاں سے اٹھائے نہ اس نے اک دو قدم — نہ کود اے دلِ پُر اضطراب دو دو ہاتھ
یہ ہاتھ آنے کا ان کے ہے اشتیاق کہ واہ — دعا کو اٹھتے ہیں ہر دم شتاب دو دو ہاتھ
امنگ کرتی ہے کیا دختِ رز میرے آگے — مدام اچھلتے ہیں جامِ شراب دو دو ہاتھ
وہ گل جو آ گیا محفل میں اپنی دعوت کی — گلاب پاش سے اچھلا گلاب دو دو ہاتھ
کبھی جو ہاتھ میں اس مہ کے دیکھتا ہے شراب — تو کانپتا ہے مدام آفتاب دو دو ہاتھ
نہ کیوں خوشی سے قیامت میں کودتا پھرتا — ہر اک غلامِ شہ بوتراب دو دو ہاتھ
مژہ کے پنجہ میں آیا نہ طائرِ مقصود — اُڑا رہا شبِ فرقت میں خواب دو دو ہاتھ
ابھی روانہ ہو پرتوؔ کا علیش کوسوں دور — تو ہٹ کے بیٹھے جو خانہ خراب دو دو ہاتھ

برطرح غالب سے

ہاتھ میرے کر رہیں گے پیش دستی ایک دن — دونوں آنکھوں میں بسے گی دل کی بستی ایک دن

سر اٹھایا جس نے وہ پامال ہوتا ہے ضرور ہر بلندی کے لئے لازم ہے پستی ایک دن
حق پرستی سے ہو کڑوا دل تمہارا شیخ جی بزم ہستی میں کریں جب مے پرستی ایک دن

ایضاً، ولہٗ ؎
تاب و بے تابی عاشق میں ہے معشوق کی دید سر جھکا بھی نہ سکوں آنکھ اٹھا بھی نہ سکوں
ایضاً، ولہٗ ؎
روؤں فراق یار میں کب تک جگر کو میں جی میں ہے پھونک ڈالوں دلِ نوحہ گر کو میں

ایضاً، ولہٗ ؎
فقط وہ اپنی ہی تیغ و سپر کو دیکھتے ہیں ہم اس نگاہ کے ساتھ اپنے سر کو دیکھتے ہیں
یہاں فراق میں بھی ہے خیال خانۂ دل وہ اپنی سیر میں، ہم ان کے گھر کو دیکھتے ہیں

؎
جب سے وہ آنکھیں میری آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں نقش بن کر صفحۂ دل پر نمایاں ہو گئیں
تو وہ رشکِ لعبت چین ہے کہ تیرے حسن کو دیکھتے ہی پتلیاں آنکھوں کی قرباں ہو گئیں

؎
ہائے غضب کی بات ہے آنکھ نہ تو دکھا کہ یوں آرزوئے نگاہ لطف، یار کبھی ملا کہ یوں
معرکہ ہائے حسن و عشق غایت چشم بے قرار آج دکھا چکی مجھے اس کی ہر اک ادا کہ یوں
برشِ تیغ کی جو بات مد نظر ہوئی انہیں اپنے دہان زخم نے کھل کے یہ کہہ دیا کہ یوں
شبہ ہوا جو کبک کو حسن خرام ناز میں چل کے تمہاری چال نے سکہ بٹھا دیا کہ یوں

؎
جلتی ہے شمع دیکھ کے اس سیم تن کے پانوں جل کر ہوئے ہیں آگ بہولا لگن کے پانوں

بر طرح شاہ ظفر دہلی ؎
جہاں گذر ہوا اس کا وہاں فساد کیا ہمیشہ ہے نگہ فتنہ گر فساد کی جڑ

ایضاً ؎ سو ظلم توڑ ایک دل اے دلربا نہ توڑ مرجھا گیا ہے ہائے شگوفہ مرا نہ توڑ
زنجیر زلف کا ہوں میں ہر سال مستحق اے بخت ہاں جنوں کا مرے سلسلہ نہ توڑ

اے دہان پان شہد کی بولی سے کیا غرض　　تو اور توڑ تاڑ، یہ شان خدا نہ توڑ
پائے نہ دل شکست، زمانہ کے ہاتھ سے　　تیر غضب سے سینۂ اہل وفا نہ توڑ
خوگر نہ ہو تو شیشۂ دل کی شکست کا　　اے محتسب شراب کے شیشے سدا نہ توڑ

بطرز ناسخ لکھنوی ؎

گھنگوں سے گلا کاٹتی ہے ناز کی آواز　　تلوار کی تلوار ہے آواز کی آواز
پڑ جائے گلا، نکلے نہ پھر ساز کی آواز　　سن لے جو سُریلی میرے دم ساز کی آواز
اس بات سے دھن بزم طرب کی نہیں مجھ کو　　یاد آئے گی محبوب خوش آواز کی آواز
ہر ساز میں گو سُر ہے یہ تاثیر کہاں ہے　　دلچسپ ہے کافر ترے انداز کی آواز
میدان میں وہ کیا آئے سنی ہی نہ ہو جس نے　　ایک نیچۂ معرکہ پرواز کی آواز
انداز میں کیا ناز ہے، کیا ناز میں انداز　　انداز کی ہر بات ترے ناز کی آواز
کیا آہ کی ہر بات میں دیپک کا اثر ہے　　جاں سوز ہے میرے دل جاں باز کی آواز
خاموش ہے غماز کی صورت ترے منہ پر　　غیبت میں فقط بولتی ہے ساز کی آواز
دم بن کے شب وصل صدا مرغ کی نکلے　　یارب نہ سنوں تفرقہ پرواز کی آواز
سننے کی تمنا میں ہوئے سنگ بھی گویا　　داؤد میں کب تھی ترے اعجاز کی آواز
لگتی ہے جو انساں کو ہچکی دم آخر　　کیا طایر جاں کی ہے یہ پرواز کی آواز
مرغوب فزوں زمزمۂ طایر جاں سے　　کانوں کو میرے دلبر دم باز کی آواز
آنکھوں سے اشارہ مجھے کرتے ہیں کہ خاموش　　سن لیتے ہیں جب وہ کسی غماز کی آواز
کیا طنطنہ و دمدمۂ بزم طرب ہے　　طنبور کی اور اس بت طناز کی آواز
بھائے نہ اسے ہند کی طوطی کی صدائیں　　پر تو جو سنے بلبل شیراز کی آواز

ناز بانکا تری ادا بانکی　　چال بھی تیری دل ربا بانکی
ترا ہر ہر ستم ہے بانک سے تیز　　قتل کرتی ہے کیا جفا بانکی
ٹوپی بدلی کہ ہو گئے تیڑ ہے　　لوگ کرتے ہیں کیا دغا بانکی
کہو کس کی غزل ہے اے پر تو　　اس غزل کے سوا بھلا بانکی

بطرز ملال لکھنوی ؎

دل جب ہوا اداس تو ہر گھر کا گھر اداس　　دالان صحن اداس ہیں دیوار و در اداس

شبنم سے اس قدر ہے دھواں دھار کیا کہوں ‌‌ مانند نور چشم ہے نور قمر اداس
ہے ہے! شب فراق کے عالم کی کیا کہوں ‌‌ گھڑیالی خود بجاتے ہیں ہر پہر پہر اداس

رطرز ناسخ سے کیا عشق نے سکھلائی ہے اعجاز نمائی ‌‌ بے فصل دکھا دیتی ہے ساون کی جھڑی آنکھ
یا روئے کتابی میں ترے صاد کئے ہیں ‌‌ یا چہرۂ نرگس میں کوئی نرگس کی ہے آنکھ

بعض نئی ردیفیں فارسی طرز سے

کیا نقش کا لحجر ہے دلوں پر وقار ژ اژ ‌‌ سکہ چلا رہا ہے یہاں اعتبار ژ اژ
دل میں قیام آہ نہیں، واہ واہ دِژ ‌‌ یعنی یہاں ضرور ہے بہر سپاہ دِژ

روف احمد پرتو مدراس میں رہ کر امانت لکھنوی و مداری لال کی تتبع میں اندرسبھا کی طرز میں کئی ڈرامے لکھے۔ پہلا طلسم پرتو، جس کے تقریباً ساڑھے تین سو بیت ہیں۔ دوسرا ڈرامہ، پرتو سبھا، جس کے تقریباً چار سو بیت۔ تیسرا، پرستان پرتو دو سو بیت پر مشتمل ہے۔ یہ ڈرامے بڑے دلچسپ اور راگ راگنی اور غزلوں کے لحاظ سے بھی خوب ہیں۔ مکالمے، اور نثر و نظم زور دار ہے۔ مدراس میں رہ کر ایسی فصیح اردو لکھی ہے جو اہل زبان سے ٹکر کھاتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کی غزلیں اساتذہ لکھنؤ و دہلی کی طرح میں کہی گئی ہیں، مثلاً آغا حسن امانت لکھنوی۔ ناسخ لکھنوی، داغ دہلوی۔

ہم یہاں طلسم پرتو کے بعض گانے اور مناظر پیش کرتے ہیں:۔ جو غالباً اسٹیج بھی کئے جاتے ہونگے۔

عنوان: شمس شاہزادۂ اسد آباد کا کوٹھے پر چاندنی میں آرام پانا۔ دوپہر شب کو پریوں

پہلا پردہ:۔ کا اڑالے جاکر سنبلہ پور کی قمر شہزادی سے ملانا۔

کردار:۔ ثریا پری، نثری پری، شعری پری، سبھا پری۔

ثریا پری:۔ دیکھو دیکھو تو بہن شمس کو قربان گئی ‌‌ اسد آباد کا شاہزادہ ہے یہ پہچان گئی
اس کے رخسار سے خود مہر بھی شرماتا ہے ‌‌ شیر یہ برج اسد کا ہے میں پہچان گئی

دوسرا پردہ:۔ "چاروں پریوں کا شمس شہزادہ کو معہ پلنگ سنبلہ پور کو اڑا لیجانا اور" قمر شہزادی کی خواب گاہ پر پہنچ کر دونوں کو جگانا۔" شمس شہزادہ کا جاگنے کو اجنبی دیکھ کر (جگہ) گھبرانا اور یہ اشعار پڑھنا سے

یا الٰہی یہ کس کا کوٹھا ہے ‌‌ میں کہاں اور یہ ماجرا کیا ہے
نہانی قمر شہزادی سے کون تو کس لئے آیا ہے حقیقت کیا ہے ‌‌ یہ بھی معلوم نہیں تجھ کو کہ گھر کس کا ہے
دوپہر رات کو چوروں کی طرح اے بے باک ‌‌ گھس پڑا غیر کے گھر واہ جگر کیسا ہے
شمس شہزادہ سے شیر ہوں اسد آباد نیستاں میرا ‌‌ یعنی شہزادہ ہوں میں باپ ہے سلطان میرا

پریوں کا کچھ پڑھ کر پھونکنا اور دونوں کا بدستور سو جانا، اور شمس شہزادے کے پلنگ کو اسد آباد پہنچانا۔

شمس شہزادہ کا خواب سے ہشیار ہو کر ادھر ادھر دیکھ کر گھبرانا اور رات کی سرگذشت کے

سرا پردہ :۔ خیال میں گانا۔ اس سلسلہ میں تین غزلیں اور ایک ہوری کہی دوسری غزل کے چند شعر ؎

جان پر عاشق کے ہے ہر روز بھاری ان دنوں — اس کا ہر موئے مژہ ہے اک کٹاری ان دنوں
لگ گئی ہے دل میں پھر غم کی کٹاری ان دنوں — اشک کے بدلے ہے خوں آنکھوں سے جاری ان دنوں
خون روتا ہے میرا ہر زخم کاری ان دنوں — تیغ ابرو کا ہے اس کے فیض جاری ان دنوں

عنوان :۔ ایک گھوڑے اور ایک جوڑے سے شمس شہزادہ کا فراق قمر شہزادی میں آوارہ ہونا۔

چوتھا پردہ :۔ " قمر شہزادی کا خواب سے بیدار ہو کر شمس شہزادہ کے لئے زار زار رونا "

؎ رات بھر کاکل دلدار نے سونے نہ دیا — دو گھڑی چین سے اس یار نے سونے نہ دیا
یار کی ابروئے خمدار نے سونے نہ دیا — ہائے دم بھر مجھے تلوار نے سونے نہ دیا

ٹھمری بزبانی قمر شہزادی ؎

یاں ری سکھی کیسے گجاروں دن رتیاں — گھڑی پل چین موہے نہیں پڑت الخ

قمر شہزادی کا کہکشاں وزیر زادی کے ساتھ جوگن بن کر یہ پڑھتے ہوئے جنگل میں نکلنا ؎

مارا ہے شمس نے اسد آباد شہر کے — آرام رات سے مجھے لے کہکشاں نہیں

ہولی بزبانی قمر۔ غزل بزبانی قمر۔ اسی جنگل میں شمس شہزادے کا پہونچنا اور فراق قمر میں یہ غزل گانا ؎

مجھ سے پوچھو نہ مقدر کی کہانی لوگو — داغ دل ہے یہ کسی مہ کی نشانی ہوگی الخ

شمس شہزادہ کا کہکشاں سے سوال :۔ " اے پری رو حور جمال تو کس کے فراق میں مبتلا ہے، اور اس صحرائے لق و دق میں تیرا آنا کیسا ہے، کیا کسی کی عاشق زار ہے۔ دیو فراق سے دو چار ہے "

جواب کہکشاں :۔ کیا خوب چلو صاحب اپنا راستہ لو۔ تمہیں ہم اپنا حال کیا بتائیں۔ خود اجنبی ہو غول بیابانی شکل سر صحرا، بس بس جاؤ، میرا مغز نہ کھاؤ۔ اور یہ گاتی ہے کہ سنبلہ پور کی شہزادی چھوٹ گئی، شمس نے دیوانہ کیا۔ یہ سنتے ہی شمس بے اختیار بولا کہ وہ شمس تو میں ہی ہوں۔ دونوں کا گلے ملنا، پھر سوال و جواب سہا پری و کہکشاں کا۔

سہا پری کا شمس شہزادے اور کہکشاں کو پرستان لے جانا۔

پانچواں پردہ :۔ عنوان :۔ آمد ثریا پری ؎ سبھا میں آج ثریا کی آمد آمد ہے۔ الخ

۱۰ ؎ ۱، ۲، ۵، کہ آتشمہ میں اس بت کے برابر ہوتا — آدمی ہونے سے بہتر تھا کہ پتھر ہوتا

شانہ ہوتا تو کسی زلف کو چھوتا دن رات ہوتا آئینہ تو منظورِ سکندر ہوتا

غرض سراپا میں ۲۳ بیت گائے۔

ثریا پری: غزل بطرز ناسخ ؎

سر کوہکن و قیس کا قدموں پہ جھکا ہے شیدا ترا اے جان ہمہ تن ظلِ ہما ہے

آمد شعری پری و سہا پری اور گانا یکے بعد دیگرے: ؎

نسبت نہیں ہے کچھ اسے حورِ جناں کے ساتھ آئی ہے اب سبھا میں پری کہکشاں کے ساتھ الخ

اور راجہ اندر سے عرض کرتی ہے۔ "خداوندِ نعمت قصور معاف، کل باندی نے قصدِ سیر کیا تھا۔ عین سیر و سفر میں، دشت ہولناک کی رہ گذر میں ایک جوگن قدرتِ خدا نظر آئی، خانہ زاد بنا بر ملاحظہ حضور میں لائی اگر حکم حضور ہو تو شریکِ محفل یہ رنجور رہو۔

ارشاد راجہ اندر ؎

اری کون جوگن ہے یاں اس کو لا سنوں تو کہ ہے اس کی کیسی صدا

کہکشاں عرض کرنے کے بعد گاتی ہے ؎

رہے گا کب تک یہ سینے میں دل اسیرِ قیدِ فرنگ ہو کر نکل ہی آئے گا اک نہ اک دن تری طلب میں امنگ ہو کر
پھنسا ہے دل اپنا اک فرنگن کی زلف کے پیچ میں الٰہی اگرچہ مدراس میں ہوں لیکن اسیرِ قیدِ فرنگ ہو کر
لیا دل اس ترک نے جو آنکھیں لڑا لڑا کر نگاہی پر تو سنا ہے میدانِ رزم میں بھی تو صلح ہوتی ہی جنگ ہو کر
نگاہ تیرے فراق میں کی جو اے قمر ہم نے آسماں پر ہر اک ستارہ جگر میں اپنے لگا ہی نوکِ خدنگ ہو کر

غزل مستزاد کہکشاں ؎

اے کافرِ بے پیر جفا ہم پہ نہ کرنا اللہ سے ڈرنا
مشتاقِ نظارہ ترا کب تک یوں ہی مرنا کوٹھے سے اترنا الخ

سوال و جواب راجہ اندر اور کہکشاں سے یہ کہ شاہ جن قمر کو اڑا لے گیا۔

سفید دیو عرض کرتا ہے:۔ مہاراجہ کا بول بالا ہو، جاہ و حشم دوبالا ہو، بڑی محنت سے فرمان بردار شاہ جن کو معہ قمر شہزادی سنبلہ پور سے لایا ہے۔

ارشاد راجہ اندر:۔ اس موذی کو نذر زندانِ سلیماں کر دو۔ اور قمر کو حورِ کہکشاں کر دینا پھر شمس و قمر کو راجہ کا تختِ عروسی پر بٹھانا اور چاروں پریوں کا معہ کہکشاں گانا ؎

اس سبھا کے لئے راجہ یہ مبارک ہووے حاکمِ طبقۂ اعلیٰ یہ مبارک ہووے
نور و ظلمت سے ہے جب تک سحر و شام طلوع قمر و شمس کا جوڑا یہ مبارک ہووے
دودھ کا دودھ ہے اور پانی کا پانی ہے یہاں عدل و انصاف تمہارا یہ مبارک ہووے

سنبلہ پور کی اس رشک قمر دولہن کو   اسد آباد کا دولہ یہ مبارک ہووے
یا خدا حضرت پرؔتو کے لئے صبح و مسا   عشق اور حسن کا چرچا یہ مبارک ہووے

غرض پرتو قدیم ڈرامہ نویسی میں امانت لکھنوی کے پیرو تھے۔ ان کے کلام میں تنوع ہے، غزلیں، ٹھمریاں، ہوری، چوبولہ، ملہار وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ اور امانت کی طرح زبان شستہ صاف ہے، رقص و سرود کی محفلیں اور لکھنوی رنگ مدراس میں ستر اسی سال پیشتر خوب جما یا ہے۔ دوسرا مشہور ڈرامہ نگار لکھنوی مداری لال بھی پرتو کا معاصر تھا۔ جس کی اندر سبھا ۱۳۰۲ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ اور امانت لکھنوی کی اندر سبھا خود مدراس میں معہ تصویر امانت ۱۲۸۳ھ میں طبع ہوئی تھی۔ جس کا ایک نسخہ کتب خانہ نواب امین جنگ بہادر حیدرآبادی کے کتب خانہ میں تھا۔ پرتو سبھا وغیرہ ڈرامے پرتو نے ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء سے قبل لکھے تھے۔

مدراس میں ان کے معاصر ڈرامہ نگار آصف تھے، جن کے کئی ڈرامے مثلاً "انتقام" "غافل مسافر" "ترکی طپنچہ" "جہانگیر" "اورنگ زیب" وغیرہ مختلف کمپنیوں مثلاً الگزنڈر تھیٹریکل کمپنی۔ الفریڈ کمپنی اپولو ناٹک منڈل کمپنی میں اسٹیج کئے گئے۔ مگر مولوی عبدالعلیم نامی نے تعجب ہے کہ اپنی تالیف اردو تھیٹر میں پرتو کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔

لہ "اردو تھیٹر" از نامی مطبوعہ کتب خانہ اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

سید بشیر الحق دستوری

رسالہ ادیب الہ آباد

ادب اردو کا باتصویر ماہنامہ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کے ریفرنس سکشن میں رسالہ ادیب الہ آباد کی مکمل سات ششماہی جلدیں (نمبر العایت) محفوظ ہیں۔ ہر جلد کی تقطیع رسالہ نگار لکھنؤ جیسی ہے۔ اور ہر جلد کا ہر نمبر کئی ہاف ٹون رنگین و سادہ تصویروں کا حامل ہے۔ رسالہ کاغذ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت ہی دلفریب ہے۔ مشاہیر کی تصاویر کے علاوہ ہندو دیو مالا مشہور عمارتوں اور چند صلیبوں کے فوٹو ان جلدوں میں پائے جاتے ہیں۔ سب جلدیں انڈین پریس الہ آباد کی چھپی ہوئی ہیں۔ اس رسالے کی سالانہ قیمت چار روپے اور فی پرچہ چھ آنے تھی۔ ہر جلد کے صفحات مسلسل ہیں۔

ادارت

جلد اول دوم: جنوری ۱۹۱۰ء تا دسمبر ۱۹۱۱ء منشی نوبت رائے نظر لکھنوی

جلد سوم جنوری ۱۹۱۱ء تا جون ۱۹۱۱ء (۱) منشی نوبت رائے نظر لکھنوی (۲) پیارے لال شاکر میرٹھی

جلد چہارم پنجم و ششم جولائی ۱۹۱۱ء تا دسمبر ۱۹۱۲ء پیارے لال شاکر میرٹھی

جلد ہفتم جنوری ۱۹۱۳ء تا جون ۱۹۱۳ء میر حسین عظیم آبادی سابق محقق السنہ مشرقیہ سرکار ہند

ساتویں جلد کی تکمیل کے بعد رسالہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

تفصیل جلد وار

جلد نمبر ۱۔ جن مشاہیر کی تصاویر اس جلد کے ساتھ شائع ہوئی ہیں ان کے اسم گرامی درج ذیل ہیں۔ پوری جلد میں پچاس اہل قلم کے پچاسی مضامین ۴۰۰ صفحوں پر درج ہیں اور ۴۴ رنگین و سادہ پورے سائز کی ہاف ٹون تصاویر شامل ہیں۔

فہرست تصاویر مشاہیر

(۱) پنڈت بشن نرائن در (۲) سید اکبر حسین اکبر (۳) حضرت جلال لکھنوی (۴) ڈیوڈ ہیوم (۵) مولوی محمد حسین آزاد دہلوی۔ (۶) بابو رمیش چندر دت (۷) مولوی عبد الحلیم شرر (۸) سوامی رام تیرتھ (۹) منشی نادر علی خاں نادر کاکوروی (۱۰) مولانا شہری مرحوم۔

تصاویر کے ساتھ ان بزرگوں کے حالات بھی درج رسالہ ہیں۔

جلد ھذا کے قابل قدر مضامین کی فہرست

(۱) چند الہامی کلمات (۱) (۲) (۳) رائے پربھو لال بی۔ اے (۲) فلسفہ اور اس کی مراد منشی شیو دت لال ورمن ایم اے

(۳) معاشرتی مذہب — مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر
(۴) تاریخ فوٹوگرافی — شاکر میرٹھی
(۵) صنائع لکھنؤ — ایڈیٹر
(۶) فلسفہ سانکھیہ — سورج نرائن مہر
(۷) قدیم عربوں کا فن تحریر — حکیم سید شمس اللہ قادری
(۸) ماہیت فلسفہ (نظم) — عزیز لکھنوی۔
(۹) تمدن ہند — مترجمہ سید علی بلگرامی
(۱۰) قطب مینار — تیرتھ رام
(۱۱) اخلاقی تعلیم — گنیشی لال ماتھر
(۱۲) رہنمائے ہند — نواب رائے (ترجمہ از سوامی ویویکانند)
(۱۳) قومی یادگاریں — مرزا سلطان احمد
(۱۴) فن کتاب نویسی — محمد یحییٰ تنہا

جلد دوم۔ جس میں ۵۳ نامور اہل قلم کے ۴۹ مضامین ۲۹۶ صفحوں پر درج ہیں اور ۵۰ رنگین وسادہ ہاف ٹون تصاویر شامل ہیں۔ مضامین کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن مشاہیر کی تصاویر اس جلد کے ساتھ شائع ہوئی ہیں ان کے اسم گرامی یہ ہیں

(۱) راجہ رام موہن رائے (۲) جارشی دیویندرا ناتھ ٹیگور (۳) مولانا سید علی حیدر طباطبائی (۴) سید راحت حسین صاحب بی۔اے۔
(۵) حضرت ریاض خیرآبادی۔ (۶) بابو کیشب چندر سین۔

نامیدہ بالا بزرگوں کے حالات بھی رسالہ میں درج ہیں۔ اس جلد کے قابل قدر مضامین کی فہرست درج ذیل ہے

(۱) معمۂ ہستی ..... رائے پربھولال صاحب بی۔اے
(۲) املائے اردو۔ خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی۔
(۳) لکھنؤ کے قدیم تعلقے (ماخوذ از پکٹوریل لکھنؤ) — ایڈیٹر
(۴) اردو زبان اور ناول — ؍؍
(۵) آنکھ — شاکر میرٹھی
(۶) دمدار ستارے کا طلوع وغروب۔ سید راحت حسین صاحب بی اے
(۷) تبادلۂ اشیاء — سلطان احمد
(۸) لٹریچر میں انقلاب (ویسٹ منسٹر ریویو میں ایک مکالمہ) محمد یحییٰ تنہا
(۹) اخبار نویسی کی ابتدا اور ہندوستان میں اس کی موجودہ حالت — تیرتھ رام
(۱۰) رود نیل — حکیم سید شمس اللہ قادری
(۱۱) مقصد حیات — پربھولال
(۱۲) تذکرہ شعر وسخن — بشن نرائن در
(۱۳) عالم وما فی العالم — جے۔ آر۔ رائے
(۱۴) شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان۔ حکیم حبیب الرحمن
(۱۵) ثمرۂ حیات — پربھولال

جلد سوم۔ جس میں پچاس اہل قلم کے ایک سو مضامین، تین سو چار صفحات میں درج ہیں اور ۷۵ رنگین وسادہ تصاویر شامل ہیں

مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد: سالانہ چندہ للعہ روپے۔ مشاہیر جن کی ہاف ٹون تصاویر اس جلد میں شائع ہوتی ہیں:-

(۱) سرولیم ویوربرن (۲) آنریبل پنڈت سندر لال سی۔ آئی۔ ای (۳) مولانا محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی (۴) پربھولال صاحب بی اے (۵) ارل کریو وزیر ہند (۶) لارڈ ہارڈنگ (۷) حضور جارج پنجم دام ملکہ (۸) ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا (۹) خان بہادر مرزا سلطان احمد (۱۰) جسٹس کرشنا سوامی آئر (۱۱) منشی جوالا پرشاد برق مرحوم (۱۲) خان بہادر مولانا ذکاء اللہ مرحوم۔ (۱۳) سید کاظم حسین صاحب محشر (۱۴) کرنل الگزینڈر ہملٹن ہیری۔ (۱۵) منشی امیراللہ صاحب تسلیم لکھنوی (۱۶) پروفیسر آرمینس ویمبری۔
(۱۷) جناب رشید لکھنوی (۱۸) پروفیسر جے۔ آر رائے (۱۸) شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم۔

ان بزرگوں کے مختصر حالات زندگی بھی اس جلد میں دیئے ہوئے ہیں۔

حالات مضامین کی فہرست

(۱) مسئلہ سالمات (۱) (۲) (۳)	جے ۔ آر رائے
(۲) روضۂ ممتاز محل	سید شہاب الدین توقیر حیدری
(۳) مجموعہ شوشل	سلطان احمد
(۴) ویسٹ منسٹر ابے	جیدیال سکینہ
(۵) اجنٹا کے غار	اشہری
(۶) مشرقی و مغربی تہذیب	پربھولال
(۷) مصوران لکھنو	ایڈیٹر
(۸) ویدانت	رام چندر
(۹) قدیم عربوں کا علم الاصنام	حکیم سید شمس اللہ قادری
(۱۰) لکھنو کا قدیم تمدن	مولوی عبدالرؤف عشرت
(۱۱) قدیم ہندوستان کی بحری تجارت	ماڈرن ریویو کے ایک مضمون کا خلاصہ
(۱۲) ٹیپو سلطان	شاکر میرٹھی
(۱۳) عبدالرزاق خاں لاری	محمد یحییٰ تنہا
(۱۴) توحید	پربھولال

۲۹۴

جلد چہارم: جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۱ء جس میں اسّی اہل قلم کے سو سے زیادہ مضامین، دو سو چورانوے صفحات میں درج ہیں اور ۱۰۱ رنگین و سادہ تصاویر شامل ہیں۔

مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد۔ سالانہ چندہ للعہ روپیہ

مشاہیر جن کی ہاف ٹون تصاویر مع مختصر حالات اس جلد کے ساتھ شائع ہوئی ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) علامہ شبلی نعمانی (۲) سوامی شنکر اچارج (۳) حضرت امیر مرحوم۔ (۴) مسٹر میتھو بروں کیمرن (۵) سلطان عبدالحمید خاں (۶) پرنس بسمارک (۷) مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی (۸) راجہ سر سر انندہ بکرم پرشاد بہادر مرحوم (۹) مولوی سید احمد صاحب دہلوی (۱۰) نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ مرحوم (۱۱) نواب میر عثمان علی خاں فتح جنگ بہادر نظام دکن (۱۲) مہاراجہ کوچ بہادر۔ مرحوم۔ (۱۳) مہارانی صاحبہ کوچ بہار۔ (۱۴) مہنت نارائن ناتھ (۱۵) مولوی نظام الدین حسن (۱۶) مہاراجہ راجندر نرائن بھوپ بہادر والی ریاست کوچ بہار

فہرست مضامین جن سے اس جلد کی زینت ہے

(۱) امومیت (تمدن کے ابتدائی مدارج) اقتباس از کتاب تمدن ہند	سید علی بلگرامی
(۲) قدیم ہندوستان میں فن ہوابازی	تیرتھ رام

(۳) ایشیائی شعرا کا کمال (۱) (۲) — احمد حسن شوکت
(۴) ہندوؤں کے مذہب پر ایک عام فلسفیانہ نظر — پربھو لال
(۵) عالم خیال کا چوتھا رخ (نظم) — احمد علی شوق قدوائی
(۶) شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی — احمد حسن شوکت
(۷) از یاد رفتہ سلطنت بیجانگر باب سوم — حکیم سید شمس اللہ قادری
(۸) تقسیم علم ادب — محمد نظام الدین حسن
(۹) تمدن (معاشرت. سیاست اور مذہب) — ناطق لکھنوی
(۱۰) سینس اینڈ ریلیجن یعنی علم طبیعیات اور مذہب (نظم) — احمد علی شوق قدوائی
(۱۱) اقوام ہند کی اصل اور ان کی تقسیم (۱)(۲) — سید علی بلگرامی
(۱۲) فلسفہ سیاست — ظفر عمر صاحب
(۱۳) ہکسلے کے خیالات — جے. آر. رلئے
(۱۴) ملک الدولہ صولت (۱) (۲) — سید علی حیدر طباطبائی لکھنوی

جلد پنجم۔ جنوری لغایت جون ۱۹۱۲ء۔ اس جلد کا پہلا نمبر بابت جنوری ۱۹۱۲ء دربار نمبر ہے جو بیادگار دربار تاج پوشی ہز امپیریل میجسٹی اعلیٰ حضرت شہنشاہ جارج پنجم شائع ہوا تھا صرف اس نمبر میں ۲۷ اہل قلم کے مضامین نثر و نظم اور ۴۳ نادر تصاویر شامل ہیں۔ پوری جلد میں اسی اہل قلم کے قریب ایک سو مضامین نظم و نثر سوا تین سو صفحات پر درج ہیں اور ۹۸ رنگین و سادہ ہاف ٹون تصاویر شامل ہیں۔ مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد۔

فہرست تصاویر مشاہیر مع مختصر حالات زندگی

(۱) شہنشاہ جارج پنجم (۲) ملکہ معظمہ میری (۳) جارج اول تا جارج چہارم (۴) شاہان مغلیہ (۵) شاہان مغلیہ کی بیگمات (۶) نوابان و شاہان اودھ (۷) خواجہ حسن نظامی داعیان و مشائخ بیت المقدس (۸) میر انیس لکھنوی (۹) مولانا احمد علی صاحب شوق لکھنوی (۱۰) جاوید لکھنوی (۱۱) لالہ ہنس راج (۱۲) شیخ سعدی (۱۳) مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم (۱۴) بابو رابندر ناتھ ٹیگور (۱۵) جسٹس سید کرامت حسین (۱۶) میر بادشاہ علی بقا لکھنوی (۱۷) نواب مرزا سعید الدین احمد خاں طالب (۱۸) پنڈت بشن نرائن در (۱۹) منشی تلوک چند صاحب محروم۔ (۲۰) مولوی نذیر احمد مرحوم (۲۱) منشی عبدالخالق خلیق دہلوی۔

فہرست مضامین

(۱) ابن رشد (۱) (۲) — سید خورشید علی
(۲) اصطلاحات صوفیہ اور شاعری — رائے بہادر پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب

(۳) تکوین (۱) (۲) (۳)		مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب
(۴) جدید علمی انکشافات		شیخ فیروزالدین مراد
(۵) سلاجقہ روم کے نقرئی سکہ جات		حکیم سید شمس اللہ قادری
(۶) ضبط طبیعت اور خوشی		منشی ڈپٹی لال نگم بی اے دہلوی
(۷) علم و عمل		سید ظہیر علی
(۸) علم الاخلاق		صاحبزادہ ظفر حسین خاں
(۹) فلسفہ سیاست		مسٹر ظفر عمر صاحب بی۔ اے (علیگ)
(۱۰) قدیم ہندوستان کے جہاز اور جہاز رانی		منشی تیرتھ رام فیروزپوری
(۱۱) ہندو فن حکمت		منشی نواب رائے
(۱۲) خواب ہستی	(نظم)	خلیق دہلوی
(۱۳) تخلیق عالم	(نظم)	کیفی دہلوی
(۱۴) ماہ تاباں	(نظم)	منشی تلوک چند محروم
(۱۵) حکیم سینیکا		ضیاء الدین احمد برنی
(۱۶) القدس الشریف		خواجہ حسن نظامی
(۱۷) دھنتیہ باد	(نظم)	شوکت میرٹھی
(۱۸) کوہ نور		محمد شفیع الدین خاں

جلد ششم۔ (جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۲ء) جس میں اسّی اہل قلم کے قریب ایک سو مضامین نظم و نثر میں سو صفحات پر درج ہیں اور پچاس سے زائد رنگین و سادہ ہاف تصاویر شامل ہیں۔ مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد۔

مشاہیر جن کی تصاویر مع مختصر حالات اس جلد میں ہیں

(۱) مرزا غالب (۲) مسٹر ولیم اسٹیڈ (۳) بابو پرتاب چندر موزمدار (۴) خواجہ امان دہلوی (۵) اخبار نویسان لاہور (۶) نواب صفدر علی خاں بہادر صفدر (۷) سر جون ہیوٹ (۸) لیڈی ہیوٹ (۹) منشی امیر احمد صاحب مینائی (۱۰) نواب سالار جنگ ثالث (۱۱) نواب عماد الملک بہادر (۱۲) مرزا حاتم علی مہر (۱۳) سر سالار جنگ اعظم (۱۴) جنرل ولیم بوتھ (۱۵) کمشنر نوتھ ٹکر و مسز لوتھ ٹکر (۱۶) ڈاکٹر اے۔ ایچ ایونگ مرحوم (۱۷) جنرل نوگی (۱۸) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ (۱۹) مولوی چراغ علی مرحوم (۲۰) نظیر اکبر آبادی (۲۱) مولانا شوکت میرٹھی (۲۲) مسٹر مدھولکر (۲۳) میر امجد حسین صاحب ماہ عظیم آبادی۔

فہرست مضامین قابل قدر

(۱) آلات پرواز — منشی تیرتھ رام فیروزپوری
(۲) اردو میں انگریزی الفاظ — مسٹر م۔ ی۔ چھانیا۔
(۳) استمرار مادہ — مولانا عبدالماجد دریابادی
(۴) سکہ جات سلاطین بیجاپور — حکیم سید شمس اللہ قادری
(۵) سنجائی میں آزادی — منشی ڈپٹی لال نگم بی اے
(۶) سانچی کے آثار قدیمہ — رشید احمد صاحب ارشد تھانوی
(۷) سائنس — مسٹر جے۔ آر۔ رائے
(۸) شرائع ہنود و اسلام کی مماثلت — سید محمد اسد علی ایم آر اے ایس
(۹) علوم تجربیہ — مسٹر جے۔ آر۔ رائے
(۱۰) فلسفہ سیاست — مسٹر ظفر عمر بی۔ اے دعلیگ
(۱۱) مبادی الاخلاق — صاحبزادہ ظفر حسین خاں
(۱۲) ملکۂ زمانیہ — خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی
(۱۳) برکھارت کی آمد (نظم) — سید حسن مرتضیٰ شفق
(۱۴) برسات کا ایک منظر — مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی
(۱۵) تاج تمکنت — منشی دوارکا پرشاد طالب بنارسی
(۱۶) عید قرباں — ایضاً
(۱۷) غالب — مولانا احمد علی شوق قدوائی لکھنوی
(۱۸) قیل و قال — پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی
(۱۹) گور غریباں — میر امجد حسین آہ عظیم آبادی

جلد ہفتم ۔ اس جلد میں ۴۹ اہل قلم کے ۱۲۲ مضامین نثر و نظم، ۳۲ صفحات میں درج ہیں اور ۳۵ رنگین و سادہ تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

فہرست تصاویر مشاہیر جو اس جلد کے ساتھ شائع ہوتی ہیں

(۱) چاند بی (۲) مہاراجہ بڑودہ۔ (۳) مجلس میر نفیس لکھنوی (۴) گوسائیں تلسی داس (۵) مسز سروجنی نائڈو۔ (۶) نواب ذکی دہلوی (۷) منشی پیتمبر پرشاد اختر (۸) سر سید احمد خاں (۹) منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی۔ (۱۰) نواب سر بلند جنگ بہادر حمید اللہ خاں (۱۱) حکیم محمد اجمل خاں دہلوی (۱۲) مسٹر حیدری بی اے ہوم سکریٹری دولت آصفیہ (۱۳) نواب آصف الدولہ بہادر شاہ اودھ۔

فہرست مضامین

(۱) فلسفہ غالب — مولوی عبدالماجد صاحب
(۲) تاریخ تکوین فلسفہ — خان بہادر مرزا سلطان احمد
(۳) خالاؤں کا مارا آغا — نواب سید ضمیر حسین صاحب خیال عظیم آبادی
(۴) زبان کی ترقی — راجہ صاحب پنڈت شیو نرائن شمیم وکیل
(۵) علم کی حد — جنلب جے۔ آر رائے صاحب
(۶) عادات — مولانا عبدالماجد صاحب بی اے
(۷) متکلم — خان بہادر مرزا سلطان احمد
(۸) امریکہ جارہ کے قدیم جنگلات — مولوی محمد ابراہیم خاں صاحب غوری
(۹) ہیں کی فلاسفی — خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب
(۱۰) جوع الارض — شیخ فیروز الدین مراد
(۱۱) سلام (نظم) — حافظ جلیل حسن صاحب جلیل
(۱۲) بچہ — مولانا حسن مرتضیٰ صاحب شفق عمادپوری
(۱۳) ارتقار انسانی — حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی حیدرآبادی
(۱۴) داستان شاہان اودھ — نواب مرزا مرتضیٰ حسین خاں
(۱۵) قطعہ تاریخ وفات واجد علی شاہ خاتم تاجداران اودھ — از ملفوظات مولوی محمد یوشع مرحوم عظیم آبادی

اسعد الاخبار

۱۸۴۸ تا ۱۸۵۲ء کی علمی، ادبی اور سیاسی خبروں کا انتخاب

(محمد عتیق صدیقی)

اسعد الاخبار اکبرآباد (آگرہ) کا ایک ہفتہ وار دو ورقی اخبار تھا۔ مہتمم اخبار ہی کی ایک تحریر کے مطابق "شہر جمادی الآخر ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۷ مئی ۱۸۴۷ عیسوی" کو اسعد الاخبار کا اجرا ہوا تھا۔ اس دور کی روایات کے مطابق اخبار صاحب مطبع بھی تھا۔ اخبار ہی کے نام کی مناسبت سے مطبع کا نام "مطبع اسعد الاخبار" تھا۔

اخبار کے مہتمم اور مطبع کے مالک قمرالدین خاں نامی ایک بزرگ تھے۔ اخبار اور صاحب اخبار دونوں کے متعلق ہماری معلومات بے حد محدود ہیں۔ اخبارات و مطابع سے متعلق سرکاری رپورٹوں سے ہم کو صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ مولوی قمرالدین خاں ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ علم حدیث اور تاریخ اسلام پر ان کو کلی عبور تھا۔ اسعد الاخبار کی ورق گردانی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی قمرالدین خاں کی طبیعت کو شعر گوئی سے بھی کچھ مناسبت تھی۔ اسعد الاخبار میں ان کی کچھ فارسی غزلیں بھی ہم کو ملتی ہیں۔ نثر سادہ، سلیس اور بامحاورہ لکھتے تھے۔

مطابع و اخبارات سے متعلق (۱۸۴۸ تا ۱۸۵۳ء) صوبہ شمالی و مغربی کی سرکاری رپورٹوں سے اسعد الاخبار کے باب میں حسب ذیل تفصیلات ہم کو معلوم ہوتی ہیں:

۱۸۴۸

"یہ آگرہ کا دیسی [اردو] اخبار ہے۔ اس کا بھی بہ ظاہر کچھ اثر نہیں ہے۔ قمرالدین خاں جو اخبار کے مالک اور ایڈیٹر ہیں، کٹر مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ علم حدیث اور اسلامی تاریخ پر عبور رکھتے ہیں۔ عام خبروں کے علاوہ اس اخبار میں عموماً مذہبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

"اسعد الاخبار کی ہفتہ وار اشاعت ۵۲ کاپیاں بتلائی گئی ہے۔ اور آٹھ آنے مہینہ پیشگی اس کا چندہ ہے۔ مسلمان ۴۸، اور ہندو ۴ خریدار ہیں۔ اخبار کی بکری سے اگر کچھ آمدنی ہوتی بھی ہے، تو برائے نام ہوتی ہے ایڈیٹر کے کسب معاش کا ذریعہ کتابوں کی طباعت ہے۔

۱۸۴۹ء

"اسعد الاخبار اخبار نہیں بلکہ رسالہ ہے۔ اخبار چار صفحے کا ہوتا ہے۔ تین صفحات میں قابل ذکر مسلمانوں کے حالات بھرے رہتے ہیں اور باقی ایک صفحہ میں روزمرہ کی خبریں درج کی جاتی ہیں۔"

"گذشتہ سال اس کی اشاعت ۵۲ تھی جو اس سال ۱۲۰ ہو گئی ہے۔"

۱۸۵۰ء

"اسعد الاخبار اردو میں شائع ہوتا ہے، اب اس کی اشاعت ۱۲۵ ہو گئی ہے۔ یعنی گذشتہ سال کے مقابلہ میں اس کی اشاعت بہ قدر پانچ بڑھ گئی ہے۔ مسلمان مولفین و مصنفین کے اقتباسات کے علاوہ اخبار میں بہت کم کوئی اور چیز ہوتی ہے۔ چناں چہ اس کی اشاعت صرف اسی حلقے تک محدود ہے۔ جو اس نوع کی چیزوں کو پسند کرتا ہے۔"

۱۸۵۱ء

"اس مطبع سے آپ دو اخبار شائع ہوتے ہیں۔ اسعد الاخبار اور معیار الشعراء۔ پہلا ہفتہ وار ہے اور دوسرا پندرہ روزہ۔ مطبع کے مالک قمر الدین خاں ہی ہیں۔ جو اپنے اخبار میں سیرت، بزرگانِ دین کے سوانح اور دیگر مذہبی موضوعات کے علاوہ اور کچھ نہیں چھاپتے۔ یہ اخبار صرف مسلمانوں ہی کے لئے نکالا جاتا ہے۔"

"گذشتہ سال اسعد الاخبار کی اشاعت بہت زیادہ گر گئی یعنی ۱۸۵۱ء کے اواخر میں اس کی اشاعت صرف ۱۷ رہ گئی ہے۔"

۱۸۵۲ء

"اردو کا اسعد الاخبار، جو مطبع اسعد الاخبار سے شائع ہوتا ہے، اب اس کی اشاعت [۱۷ سے بھی گر کر] صرف ۵۸ رہ گئی ہے۔"

۱۸۵۳ء

"اسعد الاخبار اب اتنا پُر منافع نہیں رہا جتنا کہ پہلے تھا۔ اب اس کی اشاعت بہت گر چکی ہے۔ حسب دستور اس کا تنزل تدریجی مگر قطعی ہے۔

اخبار کی ناکامی کی بہ ظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ جس طبقے کے لئے یہ اخبار نکالا جاتا ہے، اس کے مذاق کے پیش نظر اسی اخبار کے طرز تحریر، خبروں کی نوعیت اور ترتیب کی باقاعدگی وغیرہ میں مشکل ہی سے کوئی خامی نکالی جا سکتی ہے۔"

مذکرہ بالا رپورٹ کے مطابق اسعد الاخبار کی اشاعت کا حسب ذیل نقشہ مرتب ہوتا ہے۔

سنہ	مسلمان	ہندو	یورپین	تبادلہ و مفت	کل	
۱۸۴۸	۴۸	۴	۰	۰	۵۲	

سنہ	مسلمان	ہندو	یورپین	تبادلہ و مفت	کل
۱۸۵۰	۸۴	۱۶	۸	۱۷	۱۲۵
۱۸۵۱	۶۳	۵	۳	۰	۷۱
۱۸۵۲	۵۰	۶	۲	۰	۵۸
۱۸۵۳	۳۹	۳	۲	۰	۴۴
۱۸۵۴	۴۲	۳	۱	۰	۴۶

۱۸۴۹ء کی سرکاری رپورٹ میں اس پہلو پر زور دیا گیا ہے کہ "اخبار کی بکری سے برائے نام آمدنی ہوتی ہے۔ ایڈیٹر کی آمدنی کا ذریعہ کتابوں کی اشاعت ہے۔" یہ بیان یقیناً صحیح تھا کیوں کہ مطبع اسعد الاخبار سے جو مذہبی ادبی و تاریخی کتابیں شائع ہوتی تھیں، ان کی تعداد خاصی ہے۔ متذکرہ بالا رپورٹ سے مطبع اسعد الاخبار کی کارگذاری کا بھی ہم کو حسب ذیل حال معلوم ہوتا ہے:

۱۸۴۸ء

مطبع اسعد الاخبار

ایڈیٹر [اسعد الاخبار، قمر الدین خاں] کے کسب معاش کا ذریعہ کتابوں کی طباعت ہے۔ اگر اس کا بیان صحیح ہے تو جیبی قرآن د حمائل ہے اس کی یقیناً کافی آمدنی ہوئی ہوگی۔ جس کی قیمت [ہدیہ] آٹھ روپے فی نسخہ ہے۔ گذشتہ جون تک اس حمائل کے صرف نصف ایڈیشن ہی کی کھپت ہوئی تھی لیکن اس سے بھی اس کو ۲۵۲ ۳ روپے وصول ہوئے تھے۔ اس [حمائل] کی جتنی ستھری کتابت و طباعت ہے اس طرح کی چھپی ہوئی کتابیں اس [مالک مطبع] کے ہم وطن پسند کرتے ہیں۔ اس چھاپے خانے کے قیام کو ابھی دس مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے ہیں۔ [اس کے معنی ہیں کہ مطبع اسعد الاخبار ۱۸۴۷ء میں قائم ہوا]۔

۱۸۴۹ ۱۸۴۹ء میں حسب ذیل کتابیں اس مطبع نے لیتھو سے شائع کی ہیں۔

۱	گلستان	حواشی کے ساتھ دوسرا ایڈیشن
۲	مظہر العجائب	بنارس کے منشی فخر الدین کی طبعی اردو کتاب
۳	سکندر نامہ	آگرہ کالج کے سابق استاد منشی اعظم علی کا اردو ترجمہ
۴	مفتاح التواریخ	اردو میں تاریخ کی کلید
۵	پوتھی گورا منگل	دوارکا داس کی اردو نظم جس میں مہادیو اور گورا پاروتی کی شادی کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔
۶	مسائل قوانین	صدر دیوانی عدالت کے عملے کے تین صاحبان نے مال اور دیوانی کے قوانین کے متعلق سوالات اور ان کے جوابات مرتب کئے ہیں۔

ان میں سے صرف گلستان ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کو مالک مطبع نے خود چھاپا ہے۔ اس کے ڈھائی سو

نسخے چھپے تھے جن میں سے ۸۰ ایک روپیہ فی نسخہ کے حساب سے نکل چکے ہیں۔ باقی کتابوں کی طباعت سے حسب ذیل رقمیں وصول ہو رہی ہیں۔

شمار	کتاب	اشاعت	قیمت	اجرت طباعت
۱	مظہر العجائب	۶۰۰	۲ روپیہ	۳۶۶ روپے
۲	سکندر نامہ	۱۵۰	۳ 〃	۱۰۰ 〃
۳	مفتاح التواریخ	۲۰۰	۸ 〃	۳۷۲ 〃
۴	پوتھی گورا منگل	۳۰۰	۲ 〃	۱۲ 〃
۵	مسائل قوانین	۲۵۰	۵ 〃	۳۰۵ 〃
			طباعت سے جملہ آمدنی	۱۱۵۵ 〃
			گلستان کی قیمت	۵۲۵ 〃
				۱۶۸۰ 〃

۱۸۵۰ء

اس رپورٹ کی ابتدا میں جو نقشہ منسلک کیا گیا ہے اس کے دیکھنے سے یہ حیرت ناک بات معلوم ہوتی ہے کہ گزشتہ سال اس مطبع نے ۱۱۷۱۵ روپے کی مالیت کی کتابیں شائع کیں۔

۱۸۵۰ء میں حسب ذیل گیارہ کتابیں مطبع [اسعد الاخبار] نے چھاپی ہیں؛

شمار	نام کتاب	تفصیل	اشاعت	قیمت آنہ	قیمت روپیہ	فروخت
۱	افسانۂ رنگین	فرخ آباد کے نواب امیر علی خاں کی عام موضوعات پر اردو کتاب	۲۴۰	۰	۱	۷۰
۲	فضائل الشہداء	مرزا کلب حسین خاں ڈپٹی کلکٹر اٹاوہ کا اردو شہادت نامہ۔ یہ کتاب شیعہ فرقے میں جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔	۲۵۰	۰	۲	۱۶۲
۳	تعبیر نامۂ خواب	خوابوں کی تعبیر کی اردو کتاب	۲۰۰	۴	۰	۱۵
۴	تصریح الانفاس	قسمت شناسی کی کتاب جسے سید احمد علی نے "ہندو سرودھا" سے اردو میں مرتب کیا ہے۔	۳۰۰	۴	۰	۲۲
	نصاب غریب	اردو نظم میں فارسی فرہنگ از سید احمد علی	۳۰۰	۴	۰	۲۰
۶	مولود شریف	سید ہدایت علی شکوہ آبادی کی اردو کتاب	۲۷۵	۴	۰	۳۶

نمبر	نام کتاب	تفصیل	اشاعت	قیمت آنہ	روپیہ	فروخت
۷	حمائل	جیبی قرآن مع اردو ترجمہ	۱۲۲۵	۰	۸	۱۱۰۰
۸	سیپارۂ عم		۱۲۰۰	۴	۰	۸۰۰
۹	تشریح المسائل	اسلام کے متعلق فارسی میں سوال و جواب کی کتاب از فضل رسول بدایونی	۳۰۰	۸	۱	۱۴۱
۱۰	خالق باری	امیر خسرو	۲۵۰	۲	۰	۳۰
۱۱	صفوۃ المصادر	فارسی گردان	۵۰۰	۴	۰	۵۰

مندرجہ بالا گیارہ کتابوں کے علاوہ بہت سے نقشے اور فارم بھی گذشتہ سال اس مطبع نے چھاپے ہیں۔

گذشتہ سال حسب ذیل سات کتابیں مطبع اسعد الاخبار سے چھپی ہیں۔ ان میں سے پہلی چار کتابیں خود مطبع نے چھاپی ہیں۔ اور باقی تین کتابیں دوسروں نے چھپوائی ہیں۔

نمبر	کتاب	تفصیل	اشاعت	قیمت آنہ	روپیہ	فروخت
۱	رامائن تلسی داس	ہندی میں	۳۵۰	۰	۳	۱۵۰
۲	کریما		۵۰۰	۴	۰	۷
۳	وشنو سہسر نام	سنسکرت میں پوجا کی کتاب	۳۰۰	۴		۱۴۰
۴	دستور الصبیان		۱۰۰	۴		۱۰۰
۵	نظم نادر	مرزا کلب حسین ڈپٹی کلکٹر کا مجموعہ حمد و نعت و منقبت	۲۵۰	۰	۳	نہیں معلوم
۶	دیوان تفتہ	ہرگوپال تفتہ کا فارسی کلام	۳۰۰	۰	۴	"
۷	رسالہ شق القمر	مولوی رفیع الدین دہلوی کا فارسی رسالہ	۳۰۰	۸	۱	"

گذشتہ سال حسب ذیل کتابیں اس مطبع نے شائع کیں۔

نمبر	کتاب	تفصیل	اشاعت	قیمت آنہ	روپیہ	فروخت
۱	قصہ بسودھی کبودھی	ایک اخلاقی قصہ	۱۰۰۰	۴	۰	۱۰۰۰
۲	لمعات قمر	[؟]	۱۵۰۰	۴	۰	۱۵۰۰
۳	قصہ صادق خاں	ایک اخلاقی قصہ	۳۰۰۰	[؟]		۳۰۰۰
۴	حقایق الموجودات	ایضاً	۳۰۰۰	۴		۳۰۰۰

نمبر	کتاب	تفصیل	اشاعت	قیمت آنہ	قیمت روپیہ	فروخت
۵	قصہ شمشاد	ایک اخلاقی قصہ	۳۰۰۰	۱½	۰	۳۰۰۰
۶	انشائے خرد افروز	ایضاً	۱۵۰۰	۴	۰	۱۵۰۰
۷	شق القمر	نادر علی وکیل صدر دیوانی کے لئے	۱۰۰۰	۰	۲۰	۱۰۰۰
۸	رسالہ	عربی، امجد علی وکیل صدر دیوانی کے لئے	۲۵۰	؟		۲۵۰
۹	ہدایت البرکات	مبارز الدین صدر امین مراد آباد کے لئے	۲۵۰	״		۲۵۰
۱۰	دیوان شرر	علی بخش مصنف ماتھر کے لئے	۱۷۵	۸	۱	۱۵۰
۱۱	انشائے صریح الافادہ	زین العابدین اور عبد الرحیم خاں کے لئے	۵۰۰		۲	۵۰۰
۱۲	خلاصہ قانون دیوانی	طفیل احمد کے لئے	۵۰۰	۸	۰	۵۰۰
۱۸۵۳ء						
۱	خیالات سنائی	فارسی میں قدرتی مناظر کا بیان	۳۰۰۰	۴	۰	۳۰۰۰
۲	انتخاب نظائر	صدر دیوانی عدالت کے فیصلوں کا انتخاب	۴۰۰	۰	۳	۲۰۰
۳	منتخبات انوار سہیلی		۶۰۰۰	۵	۰	۶۰۰۰
۴	مولود شریف		۲۰۰	۸	۰	۲۰۰
۵	تعلیم النفس	خود تربیتی ۔ حصہ اول	۵۰۰	۲½		۵۰۰
۶	״	״ حصہ دوم	۵۰۰	۲½		۵۰۰
۷	مرآۃ الساعت	اردو میں تقسیم اوقات	۲۰۰۰	۴		۲۰۰۰
۸	انشائے خرد افروز	فارسی خطوط نویسی	۱۵۰۰	۴		۱۵۰۰
۹	گلستان باب ہشتم	کا اردو ترجمہ	۱۵۰۰	۴		۱۵۰۰
۱۰	چراغ حقیقت و شمع معرفت	تصوف	۳۰۰	۸		۳۰۰
۱۱	مخزن التواریخ	اردو تاریخ ہند	۳۰۰	۸		۳۰۰
۱۲	گلشن رنگین	ایک فارسی عشقیہ داستان	۱۲۵	۰	۱	۱۲۵
۱۳	منتخبات جنایت	ضابطہ فوجداری	۵۰۰	۰	۸	۵۰۰

راقم الحروف کو اسعد الاخبار کا ایک مجموعہ (از اول مئی ۱۸۴۸ء تا آخر فروری ۱۸۵۲ء) دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کی حسب ذیل خصوصیات قابل ذکر ہیں:

۱۔ اس مجموعے کا ہر شمارہ دو ورقی نہیں بلکہ ایک ورقی ہے۔
۲۔ کسی شمارے کے پہلے یا دوسرے صفحے پر اخبار کا نام، تاریخ اور نمبر شمارہ وغیرہ درج نہیں ہیں۔
۳۔ ہر شمارے کی پریس لائن حسب ذیل ہے۔

"اسعد الاخبار کے مطبع میں باہتمام قمرالدین خاں کے چھاپا گیا۔ مقام اکبرآباد۔ پھلٹی بازار۔"

صرف اسی پریس لائن اور بعض اندرونی اشتہارات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسعد الاخبار ہے۔

۴۔ بیش تر شماروں میں سرکاری گزٹ کا خلاصہ بھی ملتا ہے جس میں گزٹ کے اجرا کی تاریخیں بھی درج ہیں، جن سے اخبار کی اشاعت کی قریبی تاریخوں کے تعین میں مدد ملتی ہے۔

۵۔ کسی نہ کسی فلسفی کے مختصر "مقالات" سے ہر شمارے کا آغاز ہوتا ہے۔ آگے چل کر اس کی جگہ پر "اخبار الاخیار" کا ترجمہ چھپنے لگا۔ جو نصف کالم سے ایک کالم تک پھیلا رہتا تھا۔

پیش نظر مجموعہ اپنے نقائص کے باوجود بے حد مفید اور کارآمد معلومات اپنے اندر رکھتا ہے جس کے ہر ورق میں ان گنت علمی و ادبی اور سیاسی و تاریخی کوائف بھرے پڑے ہیں، جو عموماً اور جگہ ہم کو نہیں ملتے۔ سرکاری رپورٹوں میں ۱۸۵۴ء تک اسعد الاخبار کی زندگی کے قطعی ثبوت ہم کو ملتے ہیں۔ اغلب ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت تک یہ اخبار جاری رہا ہوگا۔

اسعد الاخبار اور اس کے پیش نظر مجموعے کا اجمالی ذکر کرنے کے بعد، اس مجموعے کا پہلا ورق یا پہلا شمارہ تمام و کمال نقل کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد خبروں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ جو حسب ذیل دو حصوں پر مشتمل ہے:

۱۔ علمی و ادبی خبریں اور اشتہارات		۲۔ پنجاب کے آخری معرکوں کی خبریں

موخرالذکر حصہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ سکھوں اور انگریزوں کی آخری لڑائی کے اور اسی سلسلے کے بعد کے بہت سے واقعات معاصر اخباروں کے حوالے سے ہم کو معلوم ہوتے ہیں۔

ا؎ رسالہ اردو پندرہویں جلد اپریل ۱۹۳۵ء۔ ص ۱۹۳-۱۹۴۔ ۲؎ رسالہ اردو۔ اپریل ۱۹۳۵ء ص ۱۹۳

(پیش نظر مجموعے کا پہلا شمارہ)

مقالات حکیم اومیرس

یہ حکیم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانسو برس بعد ہوا۔ شاعری میں کمال کا مرتبہ رکھتا تھا۔ بہت سے نصائح اور مواعظ اس سے یادگار ہیں۔ اور اس نے اکثر قصائد خوش مضمون بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کہے۔ بعد اس کے جتنے شعرا یونان میں ہوئے سب نے اس کی پیروی کی اور اسے اپنا رئیس سمجھا۔ ایک بار بہ حسب اتفاق یہ حکیم والاجاہ قید میں پڑا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو کہاں سے آیا۔ جواب دیا کہ ماں باپ کے پاس سے۔ پوچھا کہ کس کام کے لئے آیا۔ بولا اس لئے کہ ایک دن یہاں سے رہائی پاکر اور آزاد ہو کر چلا جاؤں۔ لوگ اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ ارسطو اس کے دیوان کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ ایک سو اسی برس کی عمر ہوئی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تو شعر میں جھوٹ بولا کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ جھوٹ سے شعر کا حسن بڑھتا ہے اگر سچ کے خواہاں ہو تو پیغمبروں کے پاس بہم پہنچے گا۔ اس نے کہا کہ عاقل وہی ہے جو برا کہنے سے بند ہے۔ اور بدی کو نیکی کے عوض بخشش دے اور اہل خیر کے ساتھ نیکی کرے۔ اور کہا ہے (کہ) اہل شر سے دور رہو تاکہ تم ویسے ہی نہ ہو جاؤ۔ اور کہا ہے کہ نیکی کرنے میں جلدی کرو، مبادا کاہلی آجائے یا کوئی مانع پیدا ہو، اور نہ کرسکو۔ اور کہا ہے کہ ہر چیز کا ظاہر اس کے باطن کا مخبر ہوا کرتا ہے۔ اور اس نے کہا کہ آدمی جس کام کی کثرت کرے، نیک ہو خواہ بد، اسی کام میں مشہور ہو جائے گا۔ مثلاً بد کام زیادہ کرتا ہے اور نیک کام تھوڑے، تو اس کی نیکی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو کر برائی گلے پڑے گی، اور بدکار مشہور ہوگا۔ پس نیکی میں کثرت کرو تاکہ بدی پایۂ اعتبار سے ساقط اور رفتہ رفتہ زائل و نابود ہو جائے اور عنداللہ و عندالناس نیک کار ٹھہرو۔ فقط

غزل حکیم حسن علی صاحب کولوی

ہوا زخمی میں ایسے شعلہ رو کی تیغ ابرو کا
کہ رکھتا ہے وہ ہم چشموں میں شیوہ عین جادو کا

اٹھائے ہات جاں سے اور لے سر پر وبال اپنے
سپیرا بن کے پکڑے جو کوئی یہ مار گیسو کا

فلک پر جو نمایاں ہے ہلال اس کو نہ سمجھو تم
نشاں ہے قاتل سفاک کی یہ تیغ ابرو کا

فراق شعلہ رو میں چشم گریاں بن گئی مجمر
ہوا ہے آخگر سوزاں میرا ہر قطرہ آنسو کا

جو ہم پہلو میرے بیٹھا اسے دیکھا تو جل بھن کر
رقیب روسیہ مانع ہوا پہلو سے پہلو کا

کیا قاتل نے جب دو چار ہم سے چشم وابرو کو
ہوئے مقتول ہم کھا زخم تیر و تیغ ابرو کا

اشتہار [حمائل]

پرچہ اسعد الاخبار نمبر ۴۲ میں حمائل مترجم کے مطبوع ہونے کا اشتہار سامعہ افروز دین داران اہل اسلام

دیار کیا گیا ہے۔ سو واضح ہو کہ اسی روز سے حائل موصوف بہ سعی و اہتمام تمام و بہ حسن و جمال مالا کلام چھپ رہا ہے... (یہ اشتہار تقریباً پون کالم یا آٹھ انچ کا ہے)۔

خبر ہوشیار پور

آج کل ہوشیار پور میں بہت چیز گراں ہے۔ خصوصاً قلی مزدوروں کا تو دماغ بالائے آسمان ہے علاوہ اس کے ایک خط کے رو سے معلوم ہوا کہ انگریزوں کی بہت بری نوبت ہے، اور ہندوستانی نہایت خوش ہیں۔ چند روز ہوئے ایک ڈاک کے سپاہی نے کسی انگریز کو کسی بات پر گالی دی۔ اور کچھ ایسا کہا کہ اس انگریز کی ہتک عزت پر دال تھا۔ صاحب نے اپنی بے عزتی سمجھ کر حکام کو عرضی دی کہ اس شخص کو سزا قرار واقعی دی جائے۔ اور اس پر حکم ہوا کہ تم عدالت دیوانی میں نالش کرو۔ (از صدر الاخبار)

خبر مصر

دہلی گزٹ میں لکھا ہے کہ ان دنوں انگلستان کی ڈاک سے مصر کی تازہ خبریں آئی ہے کہ محمد علی پاشا ایسا مبتلائے شدائد امراض ہے کہ جان کنی کی نوبت پہنچی۔ لیکن اس ڈاک کی روانگی تک دم باقی تھا۔ اور اس کے ارکان دولت نے اس کے بڑے بیٹے ابراہیم پاشا کو مسند حکومت پر بٹھا کر روس کی اطاعت و فرماں برداری قبول کر لی ہے۔ (از زبدۃ الاخبار)

خبر ملک پروشیہ

امسال ملک فرنگستان میں بڑے بڑے فتنہ برپا ہوئے۔ فرانسستان (فرانس) کا حال تو ہفتہ ہائے گذشتہ میں درج اخبار ہو چکا ہے۔ اب انگریزی اخبار سے معلوم ہوا کہ رعایائے ولایت پروشیہ نے بھی بڑا دند مچایا، اور فرانسیسیوں کی طرح انھوں نے بھی اپنے بادشاہ کو ردّ.. نامنظور کر کے خود سری اور حکومت قوم اختیار کی۔ عجب تماشا ہے کہ رعایا کے ہاتھ بادشاہوں کا دم ناک میں آ رہا ہے۔

خبر حیدر آباد دکن

حضرت بندگان عالی کرنل لو بہادر قائم مقام رزیڈنٹ کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے اور ان کے حسن رائے، اور ادب شناسی پر کمال تحسین و آفرین کی۔ اور واقع میں کرنیل مذکور بندگان والا شکوہ کے آداب شناس اور اخلاق ستودہ میں کامل ہے۔ اور الحمد اللہ کہ وہ شکر رنجی جو نواب وزیر الممالک بہادر کی طرف سے بندگان عالی کے دل میں تھی، بالکل رفع ہو گئی۔ ان دنوں نواب عالی جناب حسب الطلب بندگان عالی باریاب ملازمت ہوئے اور حضور کو بدرجہ کمال متوجہ حال خود پاکر نہایت مسرور و شادمان دربار سے دولت خانے میں آئے۔ (از زبدۃ الاخبار)

خبر کلکتہ

رستم نداف داماد کرم علی حلاج نے بہ علت قتل زن و فرزند کے پھانسی پائی۔ بعد پھانسی پانے کے موکلان حبس اور جلادوں نے اس کی قوم کے لوگوں سے ہر چند کہا کہ اس کی لاش لے جاؤ اور گاڑ دو۔ بے خبروں نے باوجود سے کہ اس کی وصیت بھی تھی، قبول نہ کیا اور کہا کہ اس کو بھنگیوں نے ہاتھ لگائے ہیں، اب اگر ہم چھوئیں گے تو گناہ ہوگا۔ اور ہماری قوم میں ہمارا حقہ پانی بند کیا جائے گا۔ غرض کہ نہ اس کی تلقین و تدفین کی، نہ جنازے کی نماز پڑھی۔ افسوس جو لوگ اپنے تئیں مسلمان کہتے ہوں اور پھر وہ ایسی حرکت کریں ان کو اسلام سے کیا بہرہ ہے۔ اور کلکتہ میں کسی نے ایک عورت کو مار ڈالا، سو دیوان علی نام اسی عورت مقتولہ کا پہلا خصم اشتباہ جرم میں پکڑا گیا ہے۔ اور بہو بازار میں بھی ایک عورت ماری گئی۔ غالب کہ اس کو بھی اس کے خصم اور ناتے والوں نے مار ڈالا۔ اور ایک بھنگن نے اپنے خصم کو مار ڈالا اور اپنے تئیں اپنے ہاتھ سے زخمی کر کے لوگوں کے آگے ظاہر کیا کہ میرا خصم مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا، جب قادر نہ ہوا تو اس نے اپنے تئیں آپ کو ہلاک کیا۔ وہ عورت ابھی اسپتال میں ہے۔ اور یہ واقعہ مولا علی کی درگاہ کے متصل واقع ہوا۔ اور گاسپر فرنگی بہ علت غارت جامہ ہائے طالب علمان مدرسۂ طبابت کوتوال کی حوالات میں ہے۔ (از سلطان الاخبار)

خلاصہ گورنمنٹ گزٹ

مقام آگرہ منگل کے دن مئی مہینے کی ۹ تاریخ ۱۸۴۸ء سرکیولر آرڈرس مقدرہ صاحبان دیوانی عدالت ملک غربی (۲ ۔ ۵) ممالک مغربی کے سول ججوں کے نام۔ واضح ہو کہ بہ سبب وضوح غلطی کے ترجمہ اردو سرکیولر آرڈر صدر دیوانی عدالت مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۴۰ء مندرجہ آگرہ گورنمنٹ گزٹ مشتہرہ ۱۶ دسمبر سنہ الیہ میں حکام ذوی الاحتشام اس ترجمہ اصلاح یافتہ کو بغرض اطلاع جمہور انام کے مشتہر فرماتے ہیں۔ .... (یہ اشتہار جو ۶ انچ پر پھیلا ہے۔ اسی کے ساتھ اسعد الاخبار کا یہ شمارہ ختم ہو جاتا ہے۔ جلی قلم سے آخری سطر حسب ذیل ہے۔)

اسعد الاخبار کے مطبع میں باہتمام قمرالدین خاں کے چھاپا گیا۔ مقام اکبرآباد پھلٹی بازار۔

یہ تھا اسعد الاخبار کے پیش نظر مجموعے کا پہلا ورق یا پہلا شمارہ۔ اس کے بعد اسعد الاخبار کی خبروں کا ایک مختصر انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں علمی و ادبی اشتہارات اور خبروں کا انتخاب ہے۔ اور دوسرے حصے میں صرف ان خبروں کو منتخب کیا گیا ہے۔ جن کا پنجاب کی آخری لڑائیوں (۱۸۴۸ء - ۱۸۴۹ء) سے براہ راست تعلق ہے۔ ان دونوں حصوں میں جو خبریں پیش کی جا رہی ہیں ان کے وقوع کی قریبی تاریخیں اس سرکاری گزٹ کی تاریخوں سے متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو اکثر و بیشتر چھپا کرتا تھا۔ جن خبروں کے اندر بر سبیل تذکرہ تاریخوں کا ذکر آگیا ہے، ان کے وقوع کی تاریخوں کا تعین نسبتاً آسان ہے۔

جہاں تک خبروں کے عنوانات کا تعلق ہے، یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس دور میں بالعموم سرخیاں نہیں قائم کی جاتی تھیں۔ بلکہ جس جگہ کی خبر ہوتی تھی، اس جگہ کا نام جلی قلم سے لکھ دیا جاتا تھا۔ اور اس کے آگے لفظ "خبر" کا اضافہ کر دیا جاتا تھا ــــ مثلاً "خبر دہلی" یا "خبر لاہور"۔ سرخیاں جن کا اضافہ کیا گیا ہے قوسین میں درج کی گئی ہیں۔

پہلا حصہ
علمی و ادبی اشتہارات اور خبریں

(۱)

(خلاصۃ القرات ــــ ایک منظوم رسالہ)

اشتہار

رسالہ خلاصۃ القرات تصنیف جناب عرفان مآب، عابد اکمل، شیخ اجل، عمدۂ سادات کرام حافظ مولوی سید محمد جعفر قادری اکبر آبادی کا، جو اس مطبع میں طبع ہوتا تھا، اختتام کو پہنچا۔ اب عنقریب اس کے اجزا رشتہ بند ہو کر طالبین کی خدمت میں پہنچیں گے۔ جس صاحب کو اس کی خواہش ہو اس مطبع سے طلب کریں۔ اس کی قیمت فی جلد آٹھ آنے ہے۔ اور وہ رسالہ منظوم ہے۔ مصنف ممدوح نے قواعد مشکلۂ قرات کو بڑی خوش بیانی کے ساتھ نظم میں بیان کیا ہے۔ پندرہ سطر کے صفحہ سے چار جزو دو ورق اس کی ضخامت اور کاغذ ولایتی ہے۔ لہ

(۲)

(منشی واجد علی کی تصنیف مطلع العلوم و مجمع الفنون کے دوسرے ایڈیشن کا اشتہار)

خبر مطبع زبدۃ الاخبار

کتاب فوائد انتساب مطلع العلوم، تصنیف مجمع علوم جہان ماہر فنون زمان، وحید العصر والدوران جناب مولوی

لہ [illegible] ۲۸ جولائی ۱۸۴۸ء [illegible]

منشی واجد علی خاں، جو مطبع موصوف میں چھپتی تھی۔ قریب الاختتام ہے۔ شائقین اور طالبین کتاب کو خوشخبری ہو کہ اب کی دفعہ مصنف ممدوح نے اس کتاب میں بہت سے مطالب مفیدہ بڑھائے ہیں۔ نسخہ مطبوعہ سابقہ میں اور اس میں بہت فرق ہے جو کوئی اس کو ایک نظر دیکھے گا مدت العمر جدا نہ کرے گا۔ ہر شائق علم کو اس کتاب کو لینا اور اس سے مستفید ہونا ضروریات سے ہے۔[1] (جولائی ۱۸۴۸ء)

(تھامس بیل کی مفتاح التواریخ کا اشتہار)[2]

اشتہار

شائقان فن تواریخ اور مشتاقان کتب سیر متقدمین پر مخفی و محتجب نہ رہے کہ ان دنوں اس مطبع میں ایک کتاب تواریخ مسمی بہ مفتاح التواریخ منطبع ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے لطف و خوبی کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ مگر ناظرین اخبار کے ملاحظہ کے لئے یکے از ہزار و اندک از بسیار درج اخبار کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ وہ کتاب عجیب تالیف کی ہوئی طامس ولیم بیل صاحب ملازم محکمہ صدر بورڈ کی ہے۔ مولف موصوف نے اس کی تالیف میں ایسی کوشش وسعی کی ہے اور گذارشات متقدمین و متاخرین اس حسن تہذیب و ترتیب سے لکھے ہیں کہ دیکھنے والے تعجب کرتے ہیں۔ جہاں سے کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرو وہیں دل لگ جاتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و اصحابہ وسلم کے عہد سے اس کا شروع اور لاہور کی لڑائی پر اس کا ختم ہے۔ اور اس مدت میں جتنے بادشاہ اور امرا اور اہل علم و فن، اور فقرا اور اولیا، اور شعرا جس ملک میں ہوئے ہیں، سب کا حال مع تاریخ منظومہ، جو شاعران صاحب بلاغت و فصاحت نے درباب تولد و وفات انھوں کے لکھی ہیں۔ تاریخ باغ و عمارات و قلعہ و چاہ وغیرہ کی تواریخ متقدمین میں سے منتخب کر کے بے کم و کاست اس میں لکھا ہے۔ اور ہر ایک کا

---

[1] اس اشتہار میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ یہ کتاب اردو کی ہے یا فارسی کی؟ لیکن ۱۸۴۸ء کی ایک سرکاری رپورٹ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ:

"مطلع العلوم مجمع الفنون — مختلف علوم و فنون کے متعلق منشی واجد علی خاں کی فارسی تالیف ہے۔"

اسی رپورٹ کے مطابق اسی سال منشی واجد علی کی ایک اور کتاب شائع ہوئی تھی۔

"گلدستہ انجمن — یہ اردو قواعد کی کتاب ہے جو منشی واجد علی خاں نے لکھی ہے۔"

منشی واجد علی خاں آگرہ کے زبدۃ الاخبار کے ایڈیٹر اور مطبع زبدۃ الاخبار کے مالک تھے۔ ۱۸۴۸ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے "منشی واجد علی خاں گذشتہ پندرہ برسوں سے اس اخبار کے مہتمم رہے ہیں، اور اب پچھلے دو برسوں سے وہی اس کے مالک بھی ہیں۔ یہ اخبار اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں انگریزی کے آگرہ اخبار سے بھی تعلق رکھتا تھا۔"

[2] اسی شمارے میں اکبرآباد (آگرہ) کی ایک خبر مورخہ ۱۰ر جولائی درج ہے۔

پر تعظیم و تکریم اس کے مرتبے کے موافق ذکر کیا ہے۔ وہ کتاب غوابت انتساب اول تو منشی خادم علی کے مطبع (اکبری) میں چھپنی شروع ہوئی[1] اور قریب بہ نصف وہاں چھپی۔ مگر مولف موصوف اور منشی صاحب ممدوح سے امور چھاپہ کے عیب و صواب، اور وعدہ خلافیوں کے سبب کچھ بدمزگی درمیان آئی۔ اس جہت سے انھوں نے وہ کتاب وہاں چھپوانا موقوف کر کے اس مطبع میں بھیج دی۔ چناں چہ نصف آخر سے یہاں چھپنی شروع ہوئی۔ اور صاحب موصوف یہاں کے چھاپہ وغیرہ اور اہل مطبع کے معاملہ سے بہت رضامند ہوئے۔ یقین ہے کہ بفضل الٰہی دسمبر (۱۸۴۸ء) تک تمام ہو جائے گی۔ اور اکثر شائقین اس کے طالب ہوئے ہیں۔ اور جو سنتا ہے اس کے لینے کی تمنا کرتا ہے۔ آٹھ روپے اس کی قیمت ہے۔ مگر یہ قیمت اختتام طبع تک یعنی ماہ دسمبر ۱۸۴۸ء تک رہے گی بعد ازاں دس روپیہ فی جلد یا زیادہ ہو جائے۔ اور کتاب بھی بڑی حجیم ہے۔ سری رام پور کے تختہ کا جو ورقہ اس کی تقطیع ہے۔ اور پچیس سطر کا صفحہ، بڑی طولانی سطر ہے .... جس کسی کو اس کا خرید نا منظور ہو اپنی درخواست مع زر قیمت ہنڈوی کر کے مولف موصوف کے پاس کچہری صدر بورڈ میں بھیج دے۔ بعد اختتام طبع بار سال صاحب موصوف بر سبیل ڈاک، پارسل بصیغہ بیرنگ ان کی خدمت میں پہنچے گی۔ (اکتوبر ۱۸۴۸ء)

۴

(معیار الشعراء کا اشتہار)

خلاصہ اشتہار

مرسلہ جناب منشی محمد ابو الحسن میر منشی مدرسۂ عالیہ اکبر آباد، مدرس اول درجۂ فارسی

واضح ہو کہ ایک مجلس مشاعرہ کی پندرہویں روز راقم کے مکان پر ہوتی ہے، اور اکثر غزلیں شعرا کی، اور اضلاع سے بھی اس مشاعرہ میں آتی ہیں۔ راقم نے یہ تجویز کیا کہ وہ نتائج افکار تازہ شعرا جو مشاعرہ میں پڑھے جاتے ہیں، قالب طبع میں بھی آیا کریں، تاکہ سخن سنجان امصار و دیار اس کے ملاحظہ سے محظوظ ہوا کریں اور ہر ایک شاعر کی طباعی کا حال ہر کہہ و مہ کو معلوم ہو۔ اور چوں کہ بعضے شاعر علم عروض و قافیہ سے کم واقف ہوتے ہیں، اس نظر سے اس کے اخیر صفحہ کے آخر میں اس کا بھی بیان ہو۔ اور چار آنہ ماہواری اس کی قیمت صرف کاغذ اور چھاپہ کے لئے مقرر کی۔ آئندہ اگر غزلیں زیادہ ہوں گی، اور اس دو ورقہ میں جو بالفعل مطبوع ہو کر تقسیم ہوا کرے گا ان کی گنجائش نہ ہوگی تو پرچہ کا حجم زیادہ کیا جائے گا۔ اور اوراقِ زائدہ کی بابت فی ورق کچھ قیمت بڑھا دی جائے گی۔ اور مصرع طرح مشاعرہ آئندہ کا اس کے آخر میں چھاپہ جائے گا کہ ناظرین اور خریدار بے تکلف اس سے اطلاع پا کر اس زمین میں غزل کہہ کر بھیج دیا کریں۔ اور غزل و خط بھیجنے میں طریقہ پوسٹ پیڈ بھیجنے کا مسلوک رکھیں،

---

[1] مفتاح التواریخ کا ایک اشتہار دہلی کالج کے ادبی اخبار قران السعدین (جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۳ جنوری ۱۸۴۸ء) میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس اشتہار کے مطابق اس وقت یہ کتاب مطبع اکبری (آگرہ) میں چھپ رہی تھی۔

ورنہ راقم کو بہر بہ گوارے خط و غزل کا محصول دینے میں بڑی زیر باری ہوگی اور اس کا متحمل نہ ہو سکے گا لہذا یہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ جس صاحب کو خریدنا اس پرچہ موسوم بہ معیار الشعرا کا منظور ہو درخواست اپنی راقم کے پاس مدرسہ اکبرآباد میں ارسال کریں۔ اور محصول اس پرچہ کا خریدار کے ذمہ ہوگا۔ اور وہ پرچہ لطافت آمیز مطبع اسعد الاخبار میں چھپا کرے گا۔[1]

السعید

نمد ابو الحسن مدرس اول فارسی مدرسہ اکبرآباد

(معیار الشعرا کی ادارت میں تبدیلی)

پرسوں شب میں مشاعرہ ہوا۔ اکثر شعرا اکبرآباد اور بعض سخنوران عجم تشریف لائے۔ ہر ایک کے کلام فصیح سے حاضرین بزم مشاعرہ محظوظ ہوئے۔ وے شایقان سخن جو مشاعرہ میں تشریف نہ رکھتے تھے بہ ملاحظہ معیار الشعرا جو اس مطبع (اسعد الاخبار) میں چھپتا ہے، اور سید مدد علی تپش اس کی تہذیب و ترتیب کا اہتمام کرتے ہیں محظوظ ہوں گے۔ مشاعرہ بڑی زیب و زینت کا ہوتا ہے۔ اور پرچہ معیار الشعرا عجب لطف عنبر مطبوع ہوتا ہے۔ ہر شاعر کی غزل منتخب ہو کر لکھی جاتی ہے۔ (جون ۱۸۴۹ء)

اشتہار کتاب گلدستۂ انجمن

جناب کمالات انتساب مولوی منشی واجد علی خاں صاحب مہتمم زبدۃ الاخبار کی طرف سے

ہر خاص و عام پر ظاہر ہے کہ ایک مدت سے حکام وقت کی کچہریوں میں تحریر زبان اردو کی جاری ہے، اور کاغذات معاملات و مقدمات دیوانی و فوجداری و کلکٹری اسی زبان میں لکھے جاتے ہیں، اور تحریر فارسی ایک قلم موقوف ہوگئی ہے۔ مگر اہل دفتر کہ نوشت و خواند فارسی کے عادی تھے، جو کچھ مطلب اور مضمون زبان اردو میں لکھتے ہیں وہ بعینہ گویا ترجمہ فارسی کا ہوتا ہے۔ اور اردو محاورے اور روزمرے کے بالکل خلاف ہے۔ اگرچہ زبان اردو اہل ہندوستان کی ہے، مگر تحریر و تقریر میں بہت فرق و تفاوت ہے۔ مثلاً فارسی زبان اہل ایران کی ہے

---

[1] معیار الشعرا کا ایک اشتہار ماسٹر رام چندر کے رسالہ فوائد الناظرین (نومبر ۱۸۴۷ء) میں بھی شائع ہوا تھا جو "ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)" ص ۲۸۸ - ۲۸۹ پر نقل کیا گیا ہے۔ وہ اشتہار نسبتاً مختصر ہے۔

گارساں دی تاسی نے ۱۸۵۲ء کے خطبہ میں ایک جگہ تذکروں اور انتخابات ذکر کرتے ہوئے معیار الشعرا کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے

"معیار الشعرا قدیم و جدید شعرا کا کلام ہے جو آگرے سے قمر الدین (قمر) اور گلاب خاں ہفتہ میں دو بار نکالتے تھے۔"

خطبات گارساں دی تاسی ص۳۱

آگے چل کر منشی شیو نرائن آرام معیار الشعرا کے ایڈیٹر اور مالک ہو گئے۔ مرزا غالب کے بعض خطوط میں بھی معیار الشعرا کا ذکر آیا ہے۔

اور عربی زبان اہلِ عرب کی، اور انگریزی زبان اہلِ انگلستان کی ہے۔ ہر جاہل و عالم وہی اپنے ولایتوں کی زبان بولتے ہیں۔ مگر ایک زبان کے اہلِ علم جو کچھ مطلب لکھتے ہیں، تو بہ نسبت ان کی تقریر کے تحریر کی فصاحت و بلاغت کچھ اور ہوتی ہے اور فصاحت و بلاغت اور شستگی زبان و صفائی بیان بغیر پڑھنے کسی کتاب کے جس میں قاعدے اور اصول اور محاورات اور اصطلاحات اور کنایات وغیرہ منضبط ہوں ہرگز حاصل نہیں ہوتی۔

زبان اردو میں بہت سی مثنویاں اور دیوان اور قصے کہانی کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور ان کتابوں میں مصنفوں نے محاورات زبان اردو کو بڑی خوبی و لطافت کے ساتھ بیان کیا ہے، مگر ایسی کوئی کتاب آج تک تصنیف نہیں ہوئی، جس کے پڑھنے سے جو لوگ کہ زبان اردو سے ناواقف ہیں اور شوق سیکھنے کا رکھتے ہیں، ان کی زبان درست اور آراستہ ہو اور محاورات سے بخوبی آگاہ ہو جائیں۔ اس واسطے اس خاکسار، سراپا انکسار، محمد زبدۃ الاخبار نے اکہ جس سے وہ سب فائدہ حاصل ہوں تصنیف کی ہے۔ اور نام اس کا گلدستۂ انجمن رکھا ہے۔

تاریخ کتاب گلدستۂ انجمن

از نتائجِ فکرِ رسا جناب مولوی واجد علی خاں صاحب مصنف کتاب

ہوا جب یہ مجموعۂ علم و فن	کہ ہے نام گلدستۂ انجمن
مرتب بہ فضلِ خدائے کریم	دعا میں نے کی یا غفور الرحیم
کریں اس کو مقبول سب خاص و عام	رہے تا قیامت میرا اس میں نام
کریں گے اگر غور سے اک نظر	میری جاں فشانی پہ اہلِ ہنر
اگر قدرداں ہیں تو دیویں گے داد	اسے دیکھ کر دل میں ہویں گے شاد
مگر جن کی ہے نکتہ چینی شعار	یہ گل ان کی آنکھوں میں ہووے گا خار
یہ داخل ہے کچھ ان کی عادات میں	نکالیں گے سو نقص ہر بات میں
کہیں گے وہ ہو کر کے چیں بر جبیں	کہ یہ کچھ نہیں، اور وہ کچھ نہیں
انھیں میری محنت کی تب ہو خبر	اٹھا کر قلم جب لکھیں ایک سطر
نئی بات کو دل سے پیدا کریں	معنیِ مشکل ہویدا کریں
سخن گوئی کچھ کار آساں نہیں	سزاوار اس کے ہر انساں نہیں
مگر جو کہ ہیں اہلِ علم و ہنر	ہے انصاف کا بھی کچھ ان میں اثر
وہ البتہ محنت کی دیویں گے داد	کریں گے وہ تحسیں بہت ہو کے شاد
دعا اب یہی ہے میری صبح و شام	پڑھے جو کوئی یہ رسالہ تمام
وہ ہو باعمل، باادب، باتمیز	جہاں میں رہے شادماں و عزیز

نہ آوے کبھی اس کے دل پر ملال — رہے کامراں اور فرخندہ حال
یہ آیا ہے اب میرے دل پر خیال — لکھوں ایک میں ایسی تاریخ سال
کہ ہو مادہ اس کا فرخ اثر — کہیں مرحبا سن کے اہل ہنر
جو کی فکر اک لحظہ میں نے ادھر — کہ تا سال ہجری سے دوں میں خبر
سر و جد سے عقل نے دی نشاں
جہاں میں یہ ہے گلشن بے خزاں

۱۲۶۵ (م ۱۸۴۸)

۶

اشتہار (دیوان تفتہ)

ان دنوں دیوان تفتہ سکندر آبادی اس مطبع (اسعد الاخبار) میں چھپنا شروع ہوا ہے۔ اور یہ دیوان تفتہ وہی ہے جس کا اشتہار اخبار ہٰذا میں اواخر ۱۸۴۷ء میں دیا گیا تھا۔ بہ سبب عدم فرصتی کے اب تک ملتوی رہا۔ اب اس کی تدبیر کی گئی۔

اس دیوان کی لطافت اور فصاحت و بلاغت کا کیا حال بیان کیا جائے بشعرائے متاخرین ہندوستان میں ایسا فارسی کلام کسی کا کم دیکھنے میں آیا۔ اس کی فصاحت کے اعتبار سے اگر تفتہ کو صائب وقت اور اس کے وطن سکندر آباد کو اصفہان کہیے تو بجا ہے۔ اور اس (دیوان) کا چھاپہ اس کیفیت سے ہوتا ہے کہ ولایتی لیٹر کاغذ بہت شفاف و آب دار، اور اکیس سطر کا صفحہ بہ خط نستعلیق متوسط لکھا جاتا ہے۔ اس کی ضخامت ۴۵ جزو سے زیادہ ہوگی۔ اور اشعار پندرہ ہزار سے زیادہ ہیں۔ اور نظر بہ فائدہ خریداران اس کی قیمت بالفعل چار روپیہ ہیں۔ اور آج سے دو مہینے کے بعد چار روپے آٹھ آنہ، پھر دو مہینہ کے بعد پانچ روپیہ ہو جائیں گے۔ ۱ جن کو اس نسخۂ لطیفہ کا خرید نا منظور ہو، درخواست معہ زر قیمت کے اس مطبع میں بھیج دیں۔ دیوان موصوف بعد اختتام طبع بندۂ راقم کے توسط سے بہ سبیل ڈاک بصیغۂ بیرنگ ان کی خدمت میں بھیجی جائے گی۔ اور اس دیوان میں لطافت سخن کے سوا اور لطف یہ ہے کہ ہر غزل دو غزلہ ہے، اور یہ لطف بالالتزام کسی دیوان میں نہیں دیکھا گیا۔ شایقان سخن کے ملاحظہ کو ایک دو غزلہ الف کی ردیف کا لکھا جاتا ہے۔ (دو غزلہ حذف کیا جا رہا ہے)۔

اور مخفی نہ رہے کہ اکثر اہل علم اور قدر شناسان سخن اس کے طبع ہونے کی خبر سنتے ہی اس کی خریداری پر بہ صد شوق آمادہ ہوئے۔ اور جناب ثروت مآب منشی محمد ظہور علی خاں صاحب بہادر نائب اور مختار کل سرکار ٹونک نے از راہ قدردانی اس کے مصارف طبع میں اعانت فرمائی۔ اور جناب

حشمت انتساب رائے جوگل کشور صاحب وکیل محکمہ عالیہ صدر دیوانی نے بہ کمال اشتیاق اور بہ نظرِ اعانتِ مصارف طبع بیس جلدیں خریدیں۔ سبحان اللہ سخنوروں کے لئے قدردان اور سخن شناس بھی زمانہ میں موجود ہیں۔ (ستمبر ۱۸۴۸)

نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ

مصنفہ

حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب جو اپریل کے مہینے میں قیمت بھیج دے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

نظم

مژدہ اے رہروان راہِ سخن
طے کرو راہِ شوق زود از زود
پاس ہے اب سوادِ اعظم نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی
یا تو دیکھو کہ کیا نظر آیا
ہاں یہی شاہراہِ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ
ہے یہ وہ گلشنِ ہمیشہ بہار
نہیں اس کا جواب عالم میں
اس سے اندازِ شوکتِ تحریر
مرحبا طرزِ نغز گفتاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم
اس کے فقروں میں کون آتا ہے
تیس نثروں سے کام کیا نکلے

پایہ سنجانِ دست گاہِ سخن
آن پہنچی ہے منزلِ مقصود
دیکھئے چل کے نظم عالم نثر
چشم بینش ہو جس سے نورانی
جلوۂ مدعا نظر آیا
مطبع بادشاہ دہلی ہے
گل و ریحاں و لالہ رنگا رنگ
بارور جس کا سرو گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں
اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
حبذا رسم و راہِ نثاری
ہے مقرر جواب بہرِ تعلیم
کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلے
تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن

تھے ظہوری و عرفی و طالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے

اپنے اپنے زمانے میں غالب
اسد اللہ خاں غالب ہے

قول حافظ کا ہے بجائے دوست — ہر کسے پنج روزہ نوبت اوست
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے — شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دانِ معنی ہے — بادشاہِ جہانِ معنی ہے
دیکھو اس دفتر معانی کو — سیکھو آئین نکتہ دانی کو
نثر اس کی ...... نامہ راز — نظم اس کی نگار نامہ راز
.... — ....
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا — سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست — تین بھیجے وہ روپے بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب — زر قیمت کا اور ہوگا حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے لیویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو وہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہار ریاض مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکماء
میں نہ ہوں در پہ حصول شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصل تحریر — کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر

چشمۂ انطباع جاری ہے
ابتدائے ورق شماری ہے

[نوٹ اسعد الاخبار]

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار دہلی سے بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والاشان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا تھا۔

(اواخر فروری ۱۸۴۹)

۸

تاریخ عطائے خطاب و خلعت از حضور بادشاہ دہلی

بہ جناب اسد اللہ خاں غالب

از روئے اخبارات کے ہر شہر و دیار میں مثل آفتاب روشن و ظاہر ہو چکا ہے کہ شاہ دہلی نے

جناب اسد اللہ خاں غالب کو، جو نظم و نثر میں استاد اکمل اور تمام کشور ہند میں لاثانی و بے بدل ہیں۔ حضرت شاہ والا بارگاہ نے باکمال اعزاز و اکرام اپنے حضور بلوا کر بہ عطائے خلعت معزز فرمایا۔ اور کل سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ جناب تفتہ نے ان کے خطاب و خلعت عطا ہونے کی تاریخ لکھی۔ [جو درج ذیل ہے]

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را ... خطاباتے کہ ہر ہر لفظ آں روشن تر از اختر
دبیر الملک و نجم الدولہ ویک جزو دیگر ہم ... نظام اول بود، زاں بعد لفظ جنگ اے سرور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید و بر خلعت ... فزودہ جیغہ و سرپیچ و مالائے در و گوہر
بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی ... سخن فہم و سخن گو پرور و دانا و دانش ور
پئے تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی ... بہ دریائے تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ ہنگامے کہ شد در غوطہ بالش برزمیں تایم ... بہ گوش تفتہ ہاتف گفت کہ اے رند زباں آور

بگو گر سال ایں پیش آمد اقبال می خواہی
یکے سامان، دوم حشمت، سوم اعزاز، چہارم فر
۱۲۶۶ھ (م ۱۸۵۰ء)

(اوائل ستمبر ۱۸۵۰ء)

۹ (گلستان بے خزاں ـــ جواب گلشن بے خار)

اشتہار مرسلہ جناب حکمت مآب حکیم سید غلام قطب الدین اکبر آبادی باطن تخلص

شایقان کتب تذکرہ و تواریخ پر مخفی و محجوب نہ رہے کہ اس ہیچمدان نے ایک تذکرۃ الشعرا گلستان بے خزاں نام، بہ جواب گلشن بے خار تالیف نواب مصطفیٰ خاں دہلوی شیفتہ تخلص کے تالیف کیا ہے[۱] اور طرز اس کی

---

[۱] ڈاکٹر اشپرنگر نے "شاہ اودھ کے کتب خانے کی فہرست" میں گلستان سخن کے باب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

"اس تذکرہ کو سابقہ تذکرہ (گلشن بے خار) کا ناقابل فہم ہندستانی ترجمہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جس میں چند احمقانہ خیالات کا اضافہ کیا گیا ہے۔"

گلستان سخن کی عبارت کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"غالب و اسد تخلص، اسد اللہ خاں نام، ملقب بہ مرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں، کچھ تعجب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از بنا گر غلام حسین خاں کمیدان (؟) قبل اس سے جد دہلی میں ان کی سکونت کہ ملتا (؟) استادان با شعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اوستادی شعرا، جو بے نظیر روزگار تھے اچھی تعلیم پائی۔"

برعکس گلشن بے خار ہے، کہ اس کے مولف نے براہِ استغنا مزاجی شعرا کی تحقیر اور اکثر ترک اسم نویسی شاعرانِ ذوی الاقتدار، اور صفت اپنی اور اپنے دوستوں کی لکھی ہے۔ اور اس حقیر نے گلشن بے خزاں میں سب کو حسبِ مراتب بہ تعظیم یاد کیا ہے۔ جن سخن شناسوں نے اس کا مسودہ دیکھا، بہ دل وجان پسند کیا، اور یقین واثق ہے کہ سب قدردان اسے پسند کریں گے۔ اور اس کی سیر سے حظ دلی اٹھائیں گے، خصوص وے صاحب، جن کی نظر سے گلشن بے خار بھی گذر گیا ہوگا وہ جانیں گے کہ مولف تذکرۂ ثانی نے مولف اول کے کلام کو کس منصفی و لطافت سے رد کیا ہے۔ الحاصل میرا ارادہ ہے کہ اس نسخے کو چھپواؤں۔ اس کی ضخامت تقریباً چوبیس جزو اور قیمت فی جلد تین روپیہ ہوگی۔ شایقانِ فن سخن سے عرض ہے کہ جس کو اس کی خریداری منظور ہو، خالی درخواست سے بلا زر ثمن بہ طور پوسٹ پیڈ بہ پتہ و نشان تاج گنج محلہ کٹرہ عمر خاں، میرے پاس بھیج دیں، جب اس کا چھپنا شروع ہوگا تو قیمت اہل درخواست سے منگوالی جائے گی۔

—— الراقم عاصی سید غلام قطب الدین ساکن تاج گنج من محلات اکبرآباد
(اگست ۱۸۴۹)

نقل اشتہار مطبع جام جمشید [آگرہ] ۱۰

واضح و لائح ہو کہ ایک چھاپہ خانہ جدید کہ روکش نگار چین ہے، سات (ساتھ) نام جام جمشید کہ واقعہ میں خبر دینے والا ہر عجیب و غریب کا ہے، بیچ مقام مستقر الخلافہ اکبر آباد محلہ رکاب گنج کے اس نحیف، بابو شب چندر ناتھ غریب نے طیار کیا ہے۔ اور اس میں کتابیں اردو، فارسی اور ہندی و سنسکرت وغیرہ اور اخبارات اطراف منطبع ہوں گے۔ بالفعل واسطہ رفاہ خاص و عام کے قیمت اخبار کی بارہ آنہ ماہواری کہ جس کے نو روپیہ سالیانہ ہوتے ہیں، اور بہ شرط دینے پیشگی بہ حساب دس آنہ ماہانہ کے، کہ جس کے سات روپیہ سالیانہ ہوتا ہے، علاوہ خرچ ڈاک کے کہ وہ ذمہ خریدکنندۂ اخبار کے ہے، مقرر کیے گئے۔ اور مہینے میں چار قطعہ بعد ہفتہ کے تقسیم ہوتے رہیں گے۔ اور اخبار بھرے ہوں گے سات (ساتھ) اچھی اچھی خبروں کے اور صحیح صحیح احوال کے کہ جس میں سر مو لغو اور جھوٹھ نہ ہوگا۔ بلکہ بے اختیار جی سماعت پر اس کے لگے گا۔ اور سامعین اس کے محظوظ ہوں گے۔ فقط

دریں ولا ایک نسخہ کتاب چہار درویش کا کہ وہ معروف ہے سات (ساتھ) نام باغ و بہار کے، بہ خط نستعلیق و خوش خط اور بہت صحیح معہ تصویرات رنگ آمیز بوقلموں کہ اپنے اپنے موقع اور مقام پر کھینچی ہوں گی، معہ جلد اس مطبع میں قالب طبع کا پہنتی ہے۔ اور قیمت اس کی آٹھ روپیہ آٹھ آنہ فی جلد اور پیشگی دینے پر سات روپیہ آٹھ آنہ مقرر کیے۔ اور بیچ عرصہ دو مہینے کے سب کتاب تیار و مرتب ہوکر

پہنچے گی۔ بیچ خدمت صاحبان خرید کنندگان کے۔ جس کسی کو خواہش لینے اس کے کی ہو، تو روپیہ پیشگی بین المیعاد کہ شروع ماہ جنوری سے آخر ماہ مذکور تک ہی مطبع جام جمشید میں بھیج دے، خواہ بذریعہ ہنڈوی خواہ نقد۔ اور صورت نہ دینے پیشگی کے فقط درخواست بھیجے کہ نام اس کا فہرست ذیل اخبار کے میں مندرج کیا جاوے گا۔

اور معلوم ہووے کہ یہ وہی بابو شب چندر ناتھ ہے کہ بیچ مقام میرٹھ کے مطبع جام جمشید بنایا ہوا ان ہی کا ہے کہ وہ اب تک بہ رونق تمام جاری ہے، اور اخبارات وہاں کے دور دور جاتے ہیں۔ اب اس شہر اکبرآباد میں بھی اسی نام جام جمشید پر دوسرا مطبع تیار کیا ہے۔ سو یہاں بہ فضل الٰہی کتابیں نوادر چھپتی ہیں گی چناں چہ ان کے اشتہار بروقت آغاز طبع کتاب کے جاری کئے جائیں گے۔ فقط۔ مطبع جام جمشید بابو شب چندر ناتھ

۱۱

ماہ جنوری ۱۸۵۱ء سے اس مطبع (جام جمشید) میں ایک اخبار موسومہ جام جمشید آگرہ باہتمام بابو شب چندر ناتھ، مہتمم مطبع مذکور کے، زبان اردو میں ہر ہفتہ آٹھ صفحہ سنبہ کے روز چھپا کرے گا۔۔۔۔۔

۱۲

خبر اخبار جدید مسمی بہ کوہ نور

اخبار نویسوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ جنوری سنہ حال (۱۸۵۰ء) کی چودہویں تاریخ سے مقام لاہور میں ایک اخبار موسوم بہ کوہ نور منشی ہرسکھ رائے صاحب کے اہتمام سے جو پیشتر جام جمشید میرٹھ کے مہتمم تھے، جاری ہوا ہے۔ از آں جا کہ پنجاب اور کشمیر اور کابل کی خبروں کے اکثر لوگ شایق رہتے ہیں۔ اب اس اخبار کے ذریعہ سے وہاں کے حالات سارے اخبار نویسوں کو بے دقت دریافت ہو جایا کریں گے اور اخبار انگریزی سے ترجمہ نہ کرنا پڑے گا۔ یہ اخبار مہینے میں چار بار پیر کے روز چھپا کرے گا۔ اس کی قیمت اٹھارہ روپے سالانہ اور بہ رسم اڈوانس بارہ روپے سال مقرر ہوئی ہے۔ اور چھ ورق کا اخبار ہوا کرے گا۔

(جنوری ۱۸۵۰)

(۱۳)

(اخبار نور الابصار پر تبصرہ)

اکبرآباد میں جناب منشی سداسکھ لال نے، جو بہ علم انگریزی، و فارسی و اردو امثال و اقران میں ممتاز اور استعداد و لایقہ میں بے نظیر ہیں، ایک مطبع جدید محلہ موتی کٹرہ میں قائم و جاری کیا ہے۔ اور اخبار موسوم بہ نور الابصار کہ فی الواقع اسم بامسمی ہے، طبع کیا ہے۔ راقم (اسعد الاخبار) اس کے معائنہ سے ازبس خوش ہوا۔ عبارت اردو کی سلاست و متانت کی تعریف کی جائے یا مطالب و معانی مفیدہ کا بیان ہو۔

اس کی ترتیب ان مطالب سے کی گئی ہے کہ اول تو واقعات سانحات شہر و دیار، پھر مطالب علمی، پھر نصیحت و پند اور بیانِ اخلاق، پھر سرکاری قانون۔ اور وہ اخبار ہفتہ وار چھپتا ہے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ماہوار، اور پیشگی دینے والے کو چھ روپیہ سالیانہ ہے۔ (اکتوبر ۱۸۵۲ء)

۱۴

(بمبئی میں صنعتی کالج کا قیام)

خبر بمبئی

سر ہنری اسکین صاحب حاکم والا مقام بمبئی نے ایک کارخانہ بنایا ہے کہ باشندگان بمبئی کو ہنرہائے اقسام و انواع مثل آہن گری و نجاری و معماری وغیرہ تعلیم کریں۔ سو انگریزی نامور جو ان فنون کے خوب ماہر ہیں، لندن سے بلایا ہے۔ اور ہر فن کے اوزار بہ صرفِ زرِ خطیر انگلستان سے منگوائے ہیں۔ چناں چہ استاد کاریگر ہنرمند اس کارخانہ میں نوکر ہوئے اور بمبئی کے لوگوں کو اپنے اپنے ہنر تعلیم کرتے ہیں۔ اہلِ ہند کہ اکثر ذہین ہوتے ہیں، غالباً چند روز میں ایسے ماہر ہو جائیں کہ استاد و شاگرد میں فرق نہ رہے۔

— (منقول از زبدۃ الاخبار بحوالہ مجمع الاخبار — مئی ۱۸۴۸ء)

۱۵

(کلکتہ میں کپڑے بننے کا کارخانہ)

خبر کلکتہ

چار چرخہ سوت کاتنے کے لئے ولایت لندن سے کلکتہ میں آئے ہیں۔ روئی کا بنولا بھی انہیں سے جدا کیا جائے گا، اور سوت بھی بغیر تکلی کے انہیں سے کاتا جائے گا۔ اور بہت باریک و ملائم کپڑا تیار ہوگا۔ ایک چرخہ تو مقام بوریا میں رکھا گیا ہے۔ اور تین کہیں اور رکھے جائیں گے۔

اس صنعت سے ایک دن میں دو سو تھان، ہر ایک تھان دو دو سو گز کا تیار ہو سکتے ہیں۔ اب نہ بیوہ عورتوں چرخہ زنوں کی روزی رہی، نہ کولی جلاہوں کی، مگر اور سب لوگوں کا فائدہ ہے کہ اچھا کپڑا نہایت ارزاں ہاتھ آئے گا۔

— از سلطان الاخبار کلکتہ ۳ دسمبر (۱۸۴۸ء)

۱۶

خبر کم و کیف آبادئ شہر دہلی

مہتمم قران السعدین از روے نقشہ مرتبہ جناب رابرٹ صاحب مجسٹریٹ دہلی کے یوں لکھتے ہیں کہ دہلی میں اندرون شہر بارہ تھانہ ہیں، اور پانسو چھتر محلے، اور اٹھارہ ہزار تین سو ستاسی جو نہ بچی کی عمارات، اور ساتھ ہزار

دو سو چوبیس پکے گھر، اور ہزار سات سو اسی دوکانیں چونہ گچی کی، اور ایک سو ہنسٹھ کچی دوکانیں تمام دوکانوں اور حویلیوں کی میزان کل پینتیس ہزار پانسو چھپن اور مسجدیں دو سو اکسٹھ، اور مندر ایک سو اٹھاسی۔

قوم فرنگ زن و مرد و بچہ سب تین سو ستائیس۔ اہل اسلام چھیاسٹھ ہزار ایک سو بیس۔ قوم ہنود اکہتر ہزار پانسو تیس۔ جس کی کل میزان یہ ہے ـــــ مرد اونچاس ہزار اور ساٹھ، عورتیں اکیاون ہزار پانسو چھیاسی۔ ہندو اور مسلمان اور اہل فرنگ کے لڑکے بیس ہزار چھ سو اکھتر۔ لڑکیاں سولہ ہزار چھ سو ترانوے ـــــ کل میزان ایک لاکھ سینتیس ہزار نو سو ستتر۔ کنوے ۷۷۸ مکتب ایک سو چھیانوے۔

ـــــ از زبدۃ الاخبار (جولائی ۱۸۴۸ء)

۱۷

(ولایت میں اندھے بھی پڑھتے ہیں)

خبر ولایت

انگلش کے کچھ اخبار سے معلوم ہوا کہ وہاں اندھے آدمی بھی پڑھتے ہیں۔ اور اندھوں کے پڑھنے کے لئے کتابیں ایک نئی ترکیب سے بنائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کتابوں کے حروف اونچے ابھرے ہوتے ہیں۔ اندھے لڑکے ان حرفوں کو ہاتھ سے چھوتے چھوتے پہچان لیتے ہیں۔ اور بعد ربط ہو جانے کے کتاب کی عبارت بآسانی تمام پڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ـــــ از اخبار الحقایق ۱۶ر اگست ۱۸۴۸

۱۸

(حاتم علی مہر کا قطعہ تاریخ خیر مقدم ڈلہوزی)

خبر اکبر آباد

نواب گورنر جنرل بہادر نومبر کی ۷ ہر تاریخ با دولت و اقبال شہر اکبر آباد میں تشریف لائے۔ اور خبر ہے چار روز نہضت فرمائیں گے۔ افصح الشعرا، سخنور یکتا، میرزا حاتم علی مہر جنھوں نے سال گذشتہ کے امتحان میں سند مصنفی پائی ہے۔ مگر اغلب ہے کہ حکام والا مقام ان کی لیاقت اور عالی خاندانی اور جوہر ذاتی و صفاتی ملحوظ و منظور فرما کر عنقریب کسی ضلع عہدہ موصوفہ پر انہیں منصوب کریں۔ نواب محتشم اللہ کے ہندوستان تشریف لانے کی انہوں نے کیا خوب برجستہ تاریخ موزوں فرمائی۔

قطعہ تاریخ

لارڈ ڈل ہوزی است رونق بخش ہند ۔ صبا در شش جہت ایں مژدہ گو
مصرع تاریخ مقدم گفت مہر ۔ افتخار ہند باد انجم تو
۱۸۴۸ء

۱۹

تاریخ تقرر جناب مرزا حاتم علی مہر بر عہدۂ منصفی

از نتائج طبع سخنور بے جوہر حافظ بلاقی صاحب اکبرآبادی متخلص بہ رزؔ

انگریز نے حکومت جب مہرؔ کو عطا کی — جو تھے فلک سے عیسیٰ بولے خوشی مبارک

تاریخ رزؔ نے لکھی یہ آب زر سے اس دم — اے مہرؔ تجھ کو ہووے یہ منصفی مبارک

۱۲۶۵

(نومبر ۱۸۴۹ء)

۲۰

(اُردو ترجمے کے لئے تین ہزار روپے کے انعام کا اعلان)

اشتہار

تین ہزار روپے کا صلہ جو کتاب تشریح کے ترجمہ اردو کی بابت میں دیا جائے گا۔

نواب معلی القاب والی کرناٹک کے حضور سے تین ہزار روپے کا صلہ اس شخص کے لئے مقرر ہوا ہے، جو ایک اچھا ترجمہ کسی ایک کتاب کا اس کتابوں میں سے، جس کا ذکر ہوتا ہے، مرتب کرکے پیش کرے۔

۱۔ ولٹن صاحب کا ویڈمیکم

۲۔ ڈبلن ڈسکٹر (ڈی سک ٹر)

۳۔ کین صاحب کی تشریح جو گبن صاحب اور شارپے صاحب کے اہتمام سے چھاپی گئی۔

ان تینوں کتابوں میں سے جس کتاب کا ترجمہ نواب معلی القاب والی مفخر الیہم کو زیادہ پسند ہووے، اس کے ترجمہ کو صلہ مذکور عنایت ہوگا۔ لیکن اور ترجموں پر غور ہو کر بلحاظ خوبی ترجمہ صلہ ثانی بھی تجویز ہوگا۔

یے سب ترجمہ اصل عبارت کے محاورے کے مطابق، ہونے چاہئیں۔ اس طرح کہ عبارت انگریزی ایک صفحہ پر اور اس کے سامنے دوسرے صفحہ پر اس کا ترجمہ لکھا رہے۔

اگر مترجم چاہے تو اس کو اس بات کا اختیار ہے کہ اپنے انتفاع کے لئے کتاب کو چھپوا کر خود شائع کرے یا اس کی اشاعت والی مفخر الیہم پر موقوف رکھے۔ اگر مترجم کو چھپوانا اور ترویج دینا اپنے اختیار میں رکھنا منظور ہووے، تو لازم ہے کہ وہ اس بات کا معاہدہ کرے کہ فلاں معیاد کے اندر میں اس کو چھپوا کر مروج اور شائع کردوں گا۔ اور ان دونوں حالتوں میں نواب محتشم الیہم۔ کتاب کی ان تصویروں کی تیاری کے خرچ اخراجات، جو تجویز کئے جاویں اپنے خزانے سے عطا فرمائیں گے۔

حسب الحکم

دستخط محمد علی منشی نواب معلی القاب والی کرناٹک

(سپاہیوں کو ورغلانے کے جرم میں جرنل خان سنگھ کو پھانسی کی سزا)

خبر لاہور

جرنل خان سنگھ کو معہ ایک منشی کے سب سپاہ کے سامنے پھانسی لگی۔ باعث اس کا یہ تھا کہ نام بردہ کپتنی کمپنی کے سپاہیوں کو ترقی مدارج اور افزونی مراتب کا امیدوار کر کے بہکایا کرتا تھا۔ آخر شخص اسی کے ایک سوار نے سارا حال انگریزوں سے کہہ دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ملا۔ (جون ۱۸۴۸)

۲۲

خبر طیاری مدرسہ واسطے تعلیم ہندوستانی عورتوں کے

عقلا اور امرا کلکتہ میں ایک مدت سے مشورہ ہو رہا تھا کہ مدرسہ قائم کیجئے۔ اب بابو جے کشن مکرجی نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا۔ اور مستقل ارادہ کیا کہ عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ مقرر کریں۔ اور ایک شفاخانہ بھی بنایا جائے۔ اور اس مدرسے میں شرفا کی لڑکیاں پڑھیں، لیکن چوں کہ اس کے مصارف کے لئے تنہا بابو مذکور متحمل نہ ہوسکتے تھے اس واسطے انھوں نے اور ایبل تھوم (؟) صاحب میر مجلس تعلیم و تربیت ہندوستان سے مشورہ کیا۔ اور صاحب موصوف نے اقرار واثق کیا ہے کہ سرکار سے اس امر میں ضرور مدد ہوگی۔ اب یقین ہے کہ چند روز میں یہ مدرسہ خوب رونق پائے گا اور علم و عقل کی زیادتی ہوگی۔ (ماخوذ از فواید الناظرین)

۲۳

خبر چھاپہ

اولاً ۱۸۱۲ء میں دخانی کل سے جب اخبار چھپتے تھے، تو ایک گھنٹہ میں گیارہ سو اخبار چھپ جاتے تھے۔ ۱۸۴۲ء میں ایسی حکمت اور تدبیر سے کل بنائی گئی کہ بڑے بڑے آٹھ صفحوں کے اخبار ایک گھنٹہ میں چھ ہزار چھپتے تھے۔ اور ایک ایک صفحہ ہندوستانی اخبار کا آٹھ گنا ہے۔ لیکن اب (۱۸۵۰ء) میں ایک ایسی کل ایجاد کی گئی ہے کہ اس سے ایک گھنٹہ میں دس ہزار چھپتے ہیں، اور ایک پرچہ میں چھ ہزار سات سو اشتہار چھپتے ہیں۔ اور ایک صفحہ اشتہار کے لئے دس ہزار استی روپیہ اس کے مالک کو ملتے ہیں۔ ہر روز مسمی اٹمز (؟) اخبار کے ۳۵ ہزار پرچے چھپتے ہیں۔ مگر جب کوئی عجیب و غریب واردات ہوتی ہے تو ایک دن میں پچاس ہزار سے بڑھ کر پرچے چھپتے ہیں۔ امریکہ میں ایک چھاپا خانہ ہے، جس میں فی گھنٹہ بیس ہزار پرچے چھپتے ہیں۔

۲۴

التماس (مہتمم اخبار)

حضرات مشتریان اخبار سے امید ہے کہ جن پر اخبار ہذا کی قیمت چڑھی ہوئی ہے آخر سنہ پچاس (۱۸۵۰ء) تک

عنایت فرمائیں تاکہ مصارف طبع اخبار میں کام آوے، اور راقم حقیر ان کا ممنون احسان ہو۔

۲۵

(بہادر شاہ کا ہجرت کر کے مکہ جانے کا ارادہ)

خبر دہلی

حضرت ظل سبحانی کو بہ معائنہ عدول حکمی گردوں سلطنت دنیا سے نفرت ہوئی، اور طبیعت کو بہ طرف سادہ آرائی مملکت دینی رغبت ہوئی۔ چنانچہ ۸ ر صفر سنہ حال روز سہ شنبہ کو حضرت اعلیٰ نے جناب معظم الدولہ صاحب کلاں بہادر (رزیڈنٹ) سے بہ زبان خاص کرامت اختصاص ارشاد کیا کہ بہ معائنہ بے اعتنائی ارباب گورنمنٹ بہ نسبت مراعات ضروریہ متعلقہ سلطنت، خاطر دریا مقاطر مقتضی اس بات کی ہوتی ہے کہ سررشتہ مقدمات صوری کو چھوڑ کر بہ انکشاف سر معاملات معنوی بلدۂ طیبہ میں بہ طریق توطن قیام دوام اختیار کیا جاوے۔ بہ اقتضائے سعادت فرزندی واجب ہے کہ صدر سے اجازت منگا کر تدبیر عزم معظم جو مصمم ہے، عمل میں لاؤ۔ (نومبر ۱۸۵۱)

حصۂ دوم

پنجاب کے آخری معرکوں کی خبریں

۲۶

خبر (بغاوت) ملتان

بھاول پور کے ایک خط سے واضح ہے کہ دیوان مولراج اپنے قلعہ میں سامان جنگ جمع کرتا ہے، اور سب عاملوں کے نام حکم جاری کیا ہے کہ خراج فصل ربیع تحصیل کر کے ملتان میں بھیج دیں۔ اور کار دار متھن کوٹ سوار و پیادوں کی بھرتی میں مصروف ہے اور بھرتی کر کے ملتان میں بھیجتا جاتا ہے۔

نواب صاحب بھاول پور نے دو سو سوار محافظت کے واسطے گھاٹ پر بھیجے تاکہ سرکشان ملتان دست غارت دراز نہ کرنے پائیں۔

واضح ہوتا ہے کہ بائیس افسر انگریزی، جو بہ حصول رخصت کوہ شملہ پر گئے تھے، ماہ حال کو ان کے نام حکم جاری ہوئے کہ جلد اپنی اپنی رجمنٹوں میں چلے جائیں۔ اور ایسا ہی حکم اور افسران سپاہ کو جو رخصتی تھے، بھیجا گیا ہے۔ اور یہ حکم گورنر جنرل بہادر کے حضور سے آیا ہے۔

(بحوالہ دہلی اردو اخبار)

ملتان کے بلوے میں رانی صاحبہ کی بھی سازش پائی گئی۔ سو انہیں صاحب رزیڈنٹ بہادر بنام نہاد لاہور میں بلانے کے شیخو پورہ کے قلعہ سے نکال کر فیروز پور کو روانہ کیا۔ رانی اول تو خوش و خرم بہ عزم لاہور روانہ ہوئی مگر جب معلوم ہوا کہ فیروز پور جانا پڑے گا، تب حقیقت حال معلوم ہوئی، اور جانا کہ معاملہ کیا ہے جس وقت قصور پہنچی احفاظت کے لئے سوار و پیادے کچھ زیادہ ساتھ کر دیئے گئے۔ اب غالباً کوچ در کوچ روانہ بنارس کی جائے گی۔

۲۸
خبر سزائے مفسدان لاہور

صاحب زبدۃ الاخبار دہلی گزٹ سے نقل کرتے ہیں کہ ۷ مئی (۱۸۴۸ء) کو ایک جاسوس نے صاحب رزیڈنٹ کے تئیں خبر دی کہ مفسدوں کی جماعت فلاں مقام پر فتنہ انگریزی اور بلوہ کا مشورہ کر رہے ہیں۔ صاحب رزیڈنٹ نے فوراً ایک کمپنی بھیج کر انہیں گرفتار کروایا۔ سو منشی گنگا رام اور کھان سنگھ جو پہلے توپ خانہ کا جرنیل تھا، اور گلاب چابک سوار گرفتار ہوئے۔ اعیان گورنمنٹ و ارکان ریاست لاہور نے اجلاس کر کے بعد ثبوت جرم قتل اسیران دیا۔ ۱۲ مئی کو تین پھانسی ان تینوں کے لئے تیار کر کے علی الصبح تمام لشکریوں کے روبرو اول منشی گنگا رام کو اور کھان سنگھ کو پھانسی دی۔ اور ان دونوں نے بڑے استقلال سے جان دی۔ گلاب چابک سوار کی نوبت آئی (تو) وہ کانپنے لگا۔ اور رنگ چہرہ کا متغیر ہوگیا۔ اس حالت میں اس نے کہا کہ اگر میری جان بخشی ہو جائے تو ہر شریک فساد کا نام بتا دوں۔ صاحب رزیڈنٹ نے اسے امان دی اور دہ دار کے نیچے سے جان سلامت لے گیا۔

۲۹
خبر نواب گورنر جنرل بہادر

مشہور ہے کہ اسی مہینے میں نواب گورنر جنرل بہادر لاہور کی طرف کوچ کریں گے کہ ایک ضرورت درپیش ہے۔ مگر کونسل کے دفتر سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ لاہور کی طرف جائیں گے۔ اور ملتان کے باب میں کوئی امر تجویز کریں گے۔ دو ہفتے کے عرصے میں معلوم ہو جائے گا کہ کیا وقوع میں آیا۔ اور مہم ملتان میں کیا تجویز ہوا، اب تک اس میں سکوت ہے۔ از صدر الاخبار

۳۰
(مہارانی چندا بائی کی جلاوطنی کی خبر)

آدھی رجمنٹ پیادوں کی اور دو ٹرپ سواروں کے رانی کے ساتھ ہیں۔ اور خبر تحقیق ہے کہ رانی صاحبہ نویں

ط یہ تینوں خبریں ایک ہی شمارے سے اخذ کی گئی ہیں۔ سابقہ نمبر میں گورنمنٹ گزٹ درج ہے جس پر ۲۴ مئی ۱۸۴۸ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ خبریں اوائل جون کے اسعد الاخبار میں درج ہوئی ہوں گی۔

یادسویں تاریخ انبالہ سے روانہ ہوئیں۔ سہارنپور ہوکر میرٹھ آویں گی۔ اور میرٹھ سے بنارس کو روانہ ہوں گی۔ فقیر نورالدین ان کے ساتھ ہے۔ اور غالباً بنارس تک ساتھ جائے گا۔ کہتے ہیں کہ جلا وطنی کے سبب رانی بہت مکدر ہے۔ فقط

۳۱

خبر ملتان

جون کی ۱۸ر تاریخ جو مولراج سے لڑائی ہوئی، اس میں مولراج کے چھ ہزار آدمی، اور ایڈورڈ صاحب کے اور نواب بھاولپور کے بارہ سو آدمی مارے گئے۔ مولراج تھوڑے سے آدمی ہمراہ لے کر جان بچا کر بھاگا۔ اس لڑائی میں ایڈورڈ صاحب نے بڑی ناموری پیدا کی۔

مولراج کا مال سرکار لاہور میں اس تفصیل سے ضبط ہوا ــــ چار ہزار پانسو روپیہ لاہور سے اور چھ لاکھ چالیس ہزار کا شیشہ اور اکتیس ہزار روپیہ نقد امرت سر سے دستیاب ہوا۔

لاہور میں منادی کی گئی کہ مہارانی صاحبہ سے سب کو ترک مراسلت وخط وکتابت کرنی چاہیئے۔ اگر ثابت ہوا کہ وہ کسی مفسد و باغی سے خط وکتابت رکھتی ہے تو چنار گڑھ کو روانہ کی جائے گی۔

ــــ از اخبار الحقایق۔ یکم جولائی (۱۸۴۸ء)

۳۲

(چندا بائی کے جواہرات کی ضبطی)

اخبار الحقایق ۹ر اگست (۱۸۴۸ء) میں مرقوم ہے کہ رانی سکرول میں پہنچی۔ وہاں کے اجنٹ گورنر جنرل، کمشنر اور مجسٹریٹ نے شہر کے جوہریوں کو بلا کر رانی کا مال و جواہرات وغیرہ انکوایا۔ سو دس لاکھ روپے کا سب مال ہوا۔ چونکہ اتنے مال کا رانی صاحبہ کے پاس رہنا موجب خطرہ تھا۔ سرکار نے وہ سب مال رانی سے لے کر بہ حفاظت تمام خزانہ کلکٹری میں رکھوا دیا۔ رانی کو بڑا رنج ہے کہ ملک اور وطن بھی چھوٹا، اور مال جو کچھ پاس تھا سو بھی گیا۔ فقط

۳۳

خبر فیروز پور

صاحب زبدۃ الاخبار دہلی اردو اخبار سے نقل فرماتے ہیں کہ سپاہ جو ملتان کی مہم پر مامور ہوئی ہے۔ ۲۳ر جولائی (۱۸۴۸ء) کو دریا کا عبور کر کے مقام کنڈسنگھ والا پر خیمہ زن ہوئی۔ ۲۴، ۲۵ر وہیں مقام رہا۔ سپاہ سپر مینا اور پنیر(؟) لدیانہ کی چھاؤنی سے آکر ستلج کے کنارے پڑی۔ یہ سب سپاہ عنقریب ستلج اتر کر ملتان کو جاوے گی۔

۳۴

خبر لاہور

سپاہ لاہور جو ملتان کی مہم پر گئی ہے ۲۹ر جولائی کو بہ مقام لیچاونی پہونچی۔ تمام سپاہی چست و چالاک اور شاد و فرحناک ہیں کہ رسد ہر طرف سے بافراط آتی، اور ہر چیز ارزاں ہے۔

۳۵
خبر ملتان

صاحب زبدۃ الاخبار لکھتے ہیں کہ اگست کی سولہویں تاریخ سپاہ انگریزی اور ملتان کے لشکر میں لڑائی ہوئی ڈیڑھ گھنٹے تک خوب گرما گرمی رہی۔ ملتان کے لشکر میں پچیس آدمی مقتول و مجروح ہوئے۔ انگریزی لشکر میں دسویں رجمنٹ بادشاہی کے چار سپاہی مارے گئے، اور زخمیوں کا حال معلوم نہیں۔ آخر الامر فوج ملتان نے شکست پائی اور تاریخ مذکور تک لشکر انگریزی نے قلعہ ملتان کا محاصرہ نہیں کیا تھا، مگر محاصرے کے تہیہ میں تھے۔

۳۶

دہلی اردو اخبار میں مرقوم ہے کہ ایک چٹھی صاحب دہلی گزٹ کے پاس آئی ہے، اس سے واضح ہوا کہ ۱۴ر تاریخ ماہ گذشتہ (اگست؟) کو مولراج اپنی سپاہ کے تئیں سمجھاتا تھا کہ انگریزی برگڈوں (بریگیڈوں؟) کے پہنچنے سے پہلے ایک دفعہ تم اور بھی لفٹنٹ اڈورڈس کی سپاہ سے لڑو۔ مگر اس تاریخ تک (سپاہیوں نے) اس کی درخواست قبول نہیں کی تھی مولراج قلعہ کی فصیل کے استحکام میں مصروف تھا، اور اس نے نئے نئے مورچے تیار کئے ہیں۔ شہر کے دروازوں کو تیغہ کر دیا ہے۔ اور بعضے مکان منہدم کر دئے۔ بالجملہ ظاہر ہے کہ مولراج محاصرہ کے وقت حتی الوسع محاصرین کا بخوبی مقابلہ کرے گا۔

توپوں کو اوتارنے کے واسطے محاذی بھاول پور کے گھاٹ پر ۱۹ر تاریخ ماہ گذشتہ کو تجویز کمپ ڈالنے کی تھی اور لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ بہ فور اترنے توپوں (کے) ملتان پہ یورش ہوگی۔

۳۷

اخبار الحقایق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ ۴ر ستمبر کو قلعہ کشا توپیں ملتان میں جا پہنچیں۔ تھوڑے عرصہ میں محاصرہ ہوا چاہتا ہے۔ ان توپوں کے ساتھ تین سو اسّی گاڑیاں، تین ہزار پانسو اونٹ میگزین اور سامان کے تھے۔

مولراج کے لئے یہ منادی ہوئی ہے کہ ۲۴ گھنٹہ میں قلعہ خالی کر دو، نہیں تو محاصرہ کیا جائے گا۔ نیپیر صاحب نے عیدگاہ کے مینارہ پر چڑھ کر بیابانہ اچھی طرح قلعہ کا سب بھید دریافت کر لیا۔ چناں چہ معلوم ہوا کہ یہ قلعہ جانب شمال اور مشرق اور شمال کے کونہ کی طرف سے کھلا ہوا ہے۔

۵ر تاریخ کو فوج انگریزی میں توپیں جو سر ہوئی تھیں، ان سے یہ اطلاع دینا مقصود تھا کہ ۲۴ گھنٹہ بعد قلعہ ملتان کا محاصرہ شروع ہوگا۔ بعد انقضائے میعاد مقررہ کے کوئی آدمی شہر سے باہر نہ نکلنے پائے گا۔

۳۸

راجہ شیر سنگھ اپنی فوج سمیت معہ بارہ ضرب توپ، اور چند توپ گولہ انداز آسمانی، اور اسّی زنبوک ملتان میں جاکر دیوان مولراج سے مل گیا۔ مولراج نے اس کی تعظیم کے واسطے توپیں سر کیں۔ اور بہت تکلف سے ضیافت بھی۔ اور اس کے مل جانے سے دیوان مولراج کو بہت طاقت و قوت ہوگئی۔

ایڈورڈ صاحب کا کمپو (کیمپ) جو مائل بہ مشرق پڑا تھا، اب اس کو جانب مغرب تنے کا حکم ہوا ہے۔ انگریزوں کو پنجاب کے سرداروں پر اعتماد نہ رہا۔ اب شیر سنگھ کی بے وفائی دیکھ کر ملک پنجاب قبضہ میں لانا منظور ہوگا۔

لاہور میں شہرت تھی کہ لاہور کے قلعہ کی فصیل توڑ دی جائے گی، اور بعد قبضۂ ملتان کے وہاں کے قلعہ کا بھی ایسا ہی حال ہوگا۔

تازہ خبر یہ ہے کہ تتمۂ دہلی گزٹ مطبوعہ ۱۲ ستمبر سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر سنگھ کے اُدھر مل جانے سے ملتان کا محاصرہ ملتوی رہا۔ جب تک اور فوج انگریزی نہ پہنچے گی محاصرہ نہ کیا جائے گا۔ ۱۶ تاریخ کے خط میں جو ملتان آیا ہے اس میں لکھا ہے کہ چوں کہ یہ لڑائی اب ایک کاردار سے نہیں، بلکہ تمام پنجاب سے کرنی پڑی۔ اس لئے جرنیل وش صاحب نے اپنی فوج کو اس شہر کے مغرب کی جانب دریائے چناب پر مقیم کیا، جب تک کہ از سر نو کوئی حکم تازہ اور بندوبست گورنمنٹ کی طرف سے نہ ہو۔

اور تتمۂ منفصلیت مطبوعہ ۲۱ ستمبر میں ۸ ار ستمبر کا جو خط لاہور سے آیا ہے مندرج ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ تیج سنگھ گرفتار ہوا اور معلوم ہوا کہ تمام سردار سوائے فقیر نورالدین کے مولراج اور چتر سنگھ سے سازش رکھتے ہیں۔ اس واسطے اب محل میں گوروں کا پہرہ متعین ہوا ہے، اور شہر کے دروازہ پر انگریزی سپاہی متعین ہو گئے۔ گلاب سنگھ سے بھی کچھ استفسار کیا گیا تھا، مگر وہ کچھ نہ بولا۔ فقط — اخبار الحقائق، ۲۳ ستمبر

۳۹
خبر بغاوت، ملک ہزارہ

چھتر سنگھ پدر راجہ شیر سنگھ کے ایما سے سارے نانک شاہی بلوہ پر آمادہ ہو گئے۔ اور گورنمنٹ اور والی لاہور کی اطاعت سے سب پھر گئے۔ کرنیل کنارا سنگھ افسر توپ خانہ سے اہل بلوہ نے کہا کہ تو ہمارا شریک ہو جا تو ہم انگریزوں سے لڑیں۔ اس نے انکار کیا۔ چھتر سنگھ نے حکم دیا کہ اسے مار ڈالو۔ اہل بلوہ نے اس کا سر اڑا دیا۔ اور توپ خانہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور قلعہ اٹک کا لے لینا چاہا۔ جب کنارا سنگھ کے قتل کی خبر پشاور میں پہنچی۔ تو وہاں بڑی گھبراہٹ مچی۔ کپتن (کپتان) نکلس صاحب باوجود علالت طبع کے فوراً قلعہ اٹک پر دوڑ گئے۔ لیکن مسلمانوں کا لشکر اپنے ساتھ لے گئے، کیوں کہ ہنود کا اب اعتبار نہیں رہا۔ اور کپتن رابی سن (رابنسن ؟) اور مسٹر انگرام (؟) بھی بزودی تمام، اسی جانب کو روانہ ہوئے۔ مگر ابھی فتنہ فرو نہیں ہوا۔ — سلطان الاخبار (کلکتہ) مطبوعہ ۱۰ ستمبر

۴۰
خبر کوچ افواج انگریزی

کل فوج جسے آگے بڑھنے کا حکم ہوا، اس کی یہ فہرست ہے:

سپاہ گورا سوار ان گولہ انداز کا پہلا رسالہ دوسرا برگیڈ میرٹھ سے۔

پیادہ گولہ انداز نمبر ۶ میرٹھ سے، نمبر سات کانپور سے، رسالہ نمبر ۹ کا میرٹھ سے۔

ارگولر (IRREGULARS) رسالہ تیسری رجمنٹ کا نصیر آباد سے۔
پانچویں پلٹن کی پانچ کمپنی میرٹھ سے۔
نویں پلٹن بریلی سے۔
بارہویں پلٹن لودھیانہ سے۔
تیرہویں پلٹن کی پانچ کمپنی کھو سے
سپر مانیر (سفر مینا؟) ۴ کمپنی دکشیا سے۔
انگریزی پیادہ پلٹن ۲۴ نمبر آگرہ سے۔
اول نمبر انگریزی ...... پانچ کمپنی کانپور سے۔
سپاہ ہندوستانی بارہویں پلٹن کی ۵ کمپنی علی گڑھ سے۔

پندرہویں پلٹن مراد آباد سے، ۲۰ الہ آباد سے، پچیسویں اور چوبیسویں پلٹن اکبر آباد سے، تیسویں دہلی سے، ۴۱ نصیر آباد سے، ۵۴ انبالہ سے، ۶۰ مرزا پور سے، ۶۳ نیمچ سے، لدھیانہ کی پلٹن میرٹھ سے شیخاباٹی کی پلٹن کی ۵ کمپنی جونپور سے، سرمور کی پلٹن دہرہ دون سے۔

— اخبار الحقایق ۳۰ دسمبر۔ اور اس میں دہلی گزٹ سے منقول ہے۔

۱۴

خبر پنجاب

اخبار الحقایق (یہی) میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ مولراج کو شیر سنگھ کی فوج سے اب تک اطمینان کلی حاصل نہیں۔ مگر شہر ملتان میں اس کی فوج فردکش ہے، اور لوٹنے کی بھی دھمکی دکھا رہی ہے۔ انگریز لوگ جو بہ سبب نہ ہونے شتران بارکش کے تھوڑے سے گولہ بم کے نواح ملتان میں پڑے ہوئے چھوڑ آئے تھے اسی طرح پڑے ہیں۔ مولراج اپنے آدمیوں کو بایں خیال کہ مبادا ان کے چھونے سے ہلاک ہو جائیں۔ ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ مگر تھوڑا سا غلہ انگریزوں کا جو رہ گیا تھا اٹھا لے گئے۔

ایک صوبہ دار فوج انگریزی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولراج انگریزی سپاہ پر جو ملتان کے قریب پڑی ہے حملہ کا ارادہ رکھتا ہے۔

مفصلیٹ مطبوعہ ۲۶ دسمبر میں ایک خط مورخہ ۷ ماہ حال کا جو ملتان سے آیا ہے، دریافت ہوتا ہے کہ جنرل وش صاحب کی فوج ملتان کے سامنے پڑی ہے۔ ان کے ہمراہ تین مہینہ کا توشہ موجود ہے۔ اور صاحب مذکور نے سندھ اور بمبئی سے اور فوج طلب کی ہے۔ اس فوج سے میسرہ پر دریائے چناب واقع ہے جس میں تین جہاز دخانی جاری ہیں۔

۱۹ کے خط میں لکھا ہے کہ چتر سنگھ نے مولراج کی کمک کو فوج بھیجی ہے۔ اور شیر سنگھ کی فوج کے مسلمان

لوگ مولراج کی فوج سے شامل نہیں ہوئے۔ مگر کورٹ لینڈ صاحب کی فوج سے، جو ایڈورڈ صاحب کے مددگار ہیں، جا ملے۔ اغلب ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ کیوں کہ سکھ لوگ مسلمانوں کو ہمیشہ سے ستاتے رہے ہیں۔ سکھوں نے بغاوت و سرکشی کر کے ایک مفسدہ تو برپا کیا ہے، مگر جس وقت لشکر انگریزی باساز و سامان حرب پنجاب میں پہنچا، سب مفسد اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ کیوں کہ اہل بلوہ کو شاہنشاہوں کے مقابلے کی کیا جرأت ہوسکتی ہے۔ دہلی اردو اخبار میں مندرج ہے کہ رجمنٹ ۹ نیزہ داران ملکہ اور پلٹن ۶۰ پیادگان ہندوستانی کو پنجاب کی روانگی کا حکم پہنچنے والا ہے۔ فقط

۴۲
خبر کوچ فوج انگریزی

اخبار الحقایق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ سپاٹو سے تمام توپ خانہ روانہ کیا گیا۔ میرٹھ کا توپ خانہ اور نویں رجمٹ (رجمنٹ) رسالہ ملکہ نے ۲۹ تاریخ کو کوچ کیا۔ پہلا رسالہ چھبیسویں کو فیروزپور میں داخل ہوا۔ نویں رجمٹ سپاہی کی جواب بنارس میں ہے، دوسری تاریخ انبالہ کی طرف کوچ کرے گی۔

۴۳
خبر فیروزپور

معلوم ہوتا ہے کہ ۵۲ پلٹن تئیسویں کو وہاں پہنچی۔ ۲۹ پلٹن ملکہ کی اور ۳۱ اور ۵۶ پلٹن سپاہی کی جانب بہاولپور کے ۲۹ تاریخ کو روانہ ہونے کو تھی۔ یہ لوگ ۱۲ تاریخ اکتوبر کو جرنیل وش صاحب سے جا ملیں گے اور دریائے ستلج پر دو پل باندھے جائیں گے۔

۴۴
خبر (بغاوت) تازہ نورپور واقعہ پنجاب

اخبار مذکور (اخبار الحقایق) میں ایک خط کی رو سے مرقوم ہے کہ اس شہر میں ایک شخص مسمی رام سنگھ نورپور کے پچھلے راجہ کا بیٹا بڑا مفسد ہے۔ اس نے ڈیڑھ سو آدمی جمو (جموں؟) کے باشندے اپنے ہمراہ کر کے سرکار انگریزی کے علاقے میں سے ایک پرانے قلعہ پر چڑھائی کی، اور اس کو اپنے تحت حکم اور قبضۂ اقتدار میں لایا۔ اور اب یہ ذات خود نورپور کے پہاڑ کے قریب ایک بن میں جا گھسا، اور رہزنی کرنے لگا۔ صدہا باشندے اس ملک کے اس کے ہمراہ ہو گئے ہیں۔ اور اس نے پرمٹ کے کئی چپراسی بھی مار ڈالے اور کئی چپراسی تحصیل کے پکڑ کر ان سے بہ بدسلوکی پیش آیا۔ پھر جب کہ اس مفسد کے ساتھ چار سو آدمی جمع ہو گئے، اس وقت اس نے بڑی سرکشی کی۔ مگر لارنس صاحب کمشنر اور بارنس صاحب دو ہزار سوار و پیادہ لے کر چڑھے۔ چنانچہ ایک روز قبل طلوع آفتاب مقابلہ ہوا۔ ایک گھنٹہ تک خوب گولی چلی۔ اور فوج سرکاری پہاڑ

پر چڑھ گئی۔ رام سنگھ کو گھیر لیا۔ لیکن بن بہت بڑا تھا۔ وہ اس میں سے چھپ کر نکل گیا۔ دس پندرہ آدمی اس کی طرف کے مارے گئے۔ اور دو سپاہی پلٹنی کے مارے گئے اور تین چار زخمی ہوئے۔ اور اس کی جمعیت پریشان ہو گئی۔ رام سنگھ کا گاؤں انگریزوں نے پھونک دیا۔ اب وہ بھاگا پھرتا ہے اور سرکاری آدمی اس کا تعقب کرتے پھرتے ہیں۔

۴۵

(باغیوں کے تعاقب کی خبر)

اخبار مذکور (اخبار الحقائق) میں دہلی گزٹ میں منقول ہے کہ وہ سپاہ جو رام سنگھ کے درپے تعقب تھی ایک روز میں ۲۵ کوس کا دھاوا کر کے ہری پور کے نخلستان میں جہاں اس باغی نے اپنے چار ہمراہیوں سمیت پناہ لی تھی، اس کو جا لیا۔ چاروں ہمراہی تو گرفتار ہو گئے مگر رام سنگھ، باوجودیکہ اس کے سر اور شکم پر زخم شدید آیا، پھر بھی بھاگ گیا۔ ایک میل تک تو اس کے خون کے قطروں کا کھوج لگا، مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ رام سنگھ کے تمام کاغذات متعقبوں کے ہاتھ آئے۔ دو سو باغی جو اس کے ساتھ ہو گئے تھے، وہ بھی ابھر دستگیر ہوئے۔

۴۶

خبر بھاول پور (بابت اعانت کمپنی)

زبدۃ الاخبار میں قران السعدین سے منقول ہے کہ والی بھاول پور فوج کی بھرتی میں ساعی و سرگرم ہے اور اپنے عاملوں اور ناظموں کو تاکید کرتا ہے کہ جس قدر سوار و پیادل سکیں بھرتی کر لو۔ پیادہ کی تنخواہ سات روپیہ اور سوار کی پچیس روپیہ مقرر کیے ہیں۔ پانسو سپاہ اور چار سو توپ تو سپاہ انگریزی کی کمک کے لئے ملتان کی طرف بھیج دیئے، اور پندرہ سو جوان نو ملازم عنقریب اس طرف پہنچے گا۔

۴۷

خبر پنجاب

دہلی اردو اخبار مطبوعہ ۸ر اکتوبر میں مرقوم ہے کہ ایک چٹھی انگریزی مرقومہ ۱۴ر ستمبر سے جو مقام سورج کنڈ کے کیمپ سے آئی واضح ہے کہ اس دن تک فوج انگریزی اسی جگہ مقیم تھی۔ لیکن خبر تھی کہ ۱۵ر تاریخ وہاں سے دو میل پیچھے ہٹ جاوے گی۔

۴۸

مول راج کا حملہ

۲۰ر تاریخ ملتان کی طرف سے طنبور کی آواز سنی گئی اور تھوڑی دیر بعد مول راج کی فوج باہر نکل آئی۔ اور سنا گیا کہ شیر سنگھ ان کی سرداری میں تھا۔ انھوں نے توپیں چلانی شروع کیں۔ مگر فوج انگریزی جو بہ طور گرد آوری کے باہر گئی تھی، اپنی لیں میں چلی آئی۔ بہ فور داخل ہونے فوج انگریزی کے مول راج نے سپاہ انگریزی

پر یورش کا قصد کیا، اور مقابلے پر آکر توپیں مارنے لگا۔ بعد دو ڈھائی گھنٹے کے الٹا پھر گیا۔ فوج انگریزی کو اس دن بھوکا رہنا پڑا۔ اور رات کو بھی بہ خوف شب خون بہت احتیاط رہی۔ ۲۴ تاریخ بھاری توپیں عقب منزل گاہ یعنی جہاں کہ سپاہ انگریزی اب ہے بھیجی گئیں۔ اور ۲۵ تاریخ گورہ کی فوج بھی توپوں کی فرودگاہ پر چلی آئی صرف ہندوستانی پیادوں کی دو رجمنٹیں اور دو توپیں اور کچھ سوار..... حفاظت کے لئے وہاں چھوڑ آئے۔ ہنوز سپاہ نے دم نہ لیا تھا کہ کورٹ لیڈ صاحب نے آکر جنرل سے کہا کہ دشمن آگے بڑھتے آتے ہیں۔ سب صاحب لوگوں نے دوربین لگا کر دیکھا کہ گرد اڑتی آتی ہے۔ پھر نشان اور سرداران کی چھتریاں دکھائی دیں۔ بالجملہ وہ لوگ ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر کھجور کے درختوں تلے آکر ٹھہرے اور دیر تک فوج انگریزی کی طرف دیکھتے رہے۔ اڈورڈس صاحب نے کچھ توپیں اور سوار ان کے سامنے بھیجے اور گولہ چلنے لگا۔ لیکن بہ سبب فاصلہ اور بعد کے خون ریزی کم ہوئی۔ دو گھنٹہ گولہ چلا۔ بعد ازاں سب مخالفین غائب ہو گئے۔ اس دن بھی فرصت فوج انگریزی کو کھانا کھانے کی نہ ملی۔

سنا گیا کہ ایک روز اڈورڈس صاحب نے ایک نئی بات جو ان کے مفید مطلب ہے اختراع کی۔ یعنی جرنیل وش صاحب کی طرف سے ایک قطعہ خط بہ نام راجہ شیر سنگھ اس مضمون کا قلعہ میں بھیجا کہ ہم تمہاری تدبیروں سے جن کے سبب ہمیں کامیابی کی توقع ہے بہت شکر گزار ہیں۔ اور ہم تمہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ اب تمہارا منصوبہ حسب دل خواہ انجام کو پہنچے گا۔ سو یہ خط مول راج کے ہاتھ پڑا، اور اس نے شیر سنگھ پر فریب و دغابازی کی تہمت رکھی۔ شیر سنگھ سے سوائے اس کے اور کچھ نہ بن پڑی کہ میں اپنی بے گناہی انگریزوں سے لڑ کر ثابت کروں گا۔

—(دہلی اردو اخبار مورخہ ۸ راکتوبر)

۴۹
خبر کمانڈر انچیف بہادر

مہتمم جام جمشید اخبار انگریزی میرٹھ سے جس کا نام مفصلات (مفصلائٹ) ہے لکھتے ہیں کہ سپہ سالار بہادر شملہ سے فیروز پور کو کوچ کر کے اوائل ماہ نومبر میں بہ حدود فیروز پور خیمہ زن ہوں گے۔ اور قریب تیس ہزار فوج کے ہم رکاب سپہ سالار بہادر کے مہم پنجاب کے سعی و جاں فشانی کرے گی۔ اور جو فوج کہ بمبئی اور سندھ سے ملتان پر چڑھے گی وہ اس کے علاوہ ہے۔ اور ماورائے اس کے ایک بڑا لشکر فیروز پور اور لدھیانہ کی چھاؤنیوں میں تیار رہے گا۔ تاکہ ضرورت کے وقت کام آوے اور اس کے دباؤ سے ستلج کے اس طرف کے سرکش سر نہ اٹھا سکیں۔

۵۰
خبر سردار چتر سنگھ (باغی)

دہلی اردو اخبار (مورخہ) ۱۵ اکتوبر میں مرقوم ہے کہ بہ موجب ایک چٹھی کے واضح ہوا کہ سردار چتر سنگھ کی فوج نے ان دو رجمنٹوں اور چار توپوں اور دو سو پچاس سواروں کو جنھیں لفٹنٹ روبنسن صاحب نے گجرکھاٹ

اپنے میں ملالیا۔ اب چترسنگھ کی اتنی فوج ہے ــــــــ چھ پیادہ رجمنٹ، اور سولہ یا اٹھارہ توپ اور دو ہزار بے آئین سوار، اور ایک ہزار اترنگر سوار، اور سکھوں کی دو رجمنٹ راجہ گلاب سنگھ کے ہاں کی جن کے آنے کی خبر ایک مدت سے مشہور ہے۔

اور خبر ہے کہ کپتان ایبٹ صاحب کے پاس بھی ہزارہ کے اکثر سردار اپنی اپنی فوج سمیت آگئے۔ اور ایک خط سے واضح ہے کہ چترسنگھ کی سپاہ نے قلعہ رہتاس پر بھی قبضہ کر لیا۔

۵۱
خبر مہاراجہ گلاب سنگھ والی جنبو (جموں)

اخبار الحقایق مطبوعہ ۲۰/ اکتوبر میں مرقوم ہے کہ لوگوں کو گمان تھا کہ مہاراجہ گلاب سنگھ بھی مفسدین کے شریک ہیں اور سرکار سے منحرف ہیں۔ لیکن اب بہ ملاحظہ مراسلہ مہاراجہ موصوف موسومہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے معلوم ہوا کہ لوگوں کا گمان غلط تھا۔ چناں چہ خط مذکور اور اس کے جواب کا خلاصہ شملہ اخبار سے واسطے ملاحظہ ناظرین کے حرف بہ حرف نقل کرتے ہیں۔

خلاصہ خط مہاراجہ گلاب سنگھ موسومہ صاحب رزیڈنٹ بہادر

بعد القاب معمولی کے آپ کو بہ خوشی روشن ہو کہ یہ دوست دار آپ ہی کا سرسبز کرا ہوا ہے۔ اس واسطے امید ہے کہ آپ کسی اہل غرض کے کہنے پر اپنی خاطر مبارک میں شبہ نہ لاویں۔ اور میری تمام فوج سرکار کی خدمت گذاری کے واسطے کمربستہ تیار ہے۔ آپ کبھی یہ خیال نہ فرمادیں کہ میں سردار چترسنگھ نمک حرام سے دوستی رکھتا ہوں۔ میں سرکار کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ اور اگر مرضی مبارک ہو تو قبل پہنچنے فوج سرکاری کے میں اپنی فوج لے جا کر اس نمک حرام کو اس کے کیے کی سزا کو پہنچاؤں۔ مجھے سوائے سرکار انگریزی کے کوئی اور اپنا نہیں ہے۔ اور آپ میرے مربی ہیں۔ محررہ دسویں اسوج سمت ۱۹۰۵۔

۵۲
خلاصہ خط محررہ رزیڈنٹ بہادر موسومہ مہاراجہ گلاب سنگھ

بعد القاب معمولی کے خط آپ کا متضمن دشمن جاننے سردار چترسنگھ نمک حرام کے اور مستعد ہونے مع اپنی فوج کے واسطے سزا دہی کے پہنچ کر موجب نہایت خوشی کا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ باوجود چند آدمیوں کے کہنے سننے کے بھی ہم کو آپ کی دانائی اور دوراندیشی پر یہی لحاظ رہا ہے کہ آپ سے کبھی کوئی بات خلاف عہد و پیمان کے نہیں ہوگی۔ اور چوں کہ (چوں کہ) آپ کے خط کے مضمون سے آپ کی توجہ چترسنگھ کے خراب کرنے پر قبل پہنچنے سرکاری فوج کے پائی جاتی ہے۔ سو اس سے کچھ مضائقہ نہیں۔ آپ کپتان ایبٹ صاحب بہادر کو اطلاع دے کر جس طرح بنے کہ چترسنگھ کی خرابی ہووے، اس کا تدارک فرمائے۔ اس میں آپ کی بہتری اور نیک نامی بھی ہے اور پھر کسی شخص کو کچھ کہنے کی جگہ باقی نہ رہے گی۔ محررہ یکم اکتوبر ۱۸۴۹ء۔

۵۳
رنجیت سنگھ کی سرکوبی کے لئے گلاب سنگھ کی فوجوں کی روانگی کی خبر

اخبار المطابق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ شہر لاہور کی خبر سے دریافت ہوتا ہے کہ چھ ہزار سپاہی مہاراجہ گلاب سنگھ کے بہ سرکردگی کرنیل اسٹیک کے چتر سنگھ کی تنبیہ کے واسطے روانہ ہوئے ہیں۔ اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ سپاہی اپنے کرنیل کو قتل کر کے چتر سنگھ سے جا ملیں گے۔

۲۴ ر اکتوبر کو یہ خبر آئی کہ چتر سنگھ لاہور کے قریب آتا ہے۔ چناں چہ اس کا پیش خیمہ وزیر آباد کے پاس آپہنچا ہے۔ اغلب ہے کہ تمام سوار اور توپ خانہ فیروز آباد کا دریا کو عبور کر کے جانب لاہور کوچ کرے۔ اور یہ تحقیقاً معلوم ہوا کہ دوسری پلٹن گورہ اور ۵۶ اور ۱۰ پلٹن ہندوستانی کو ۳ ر تاریخ میں فیروز پور سے جانب لاہور کوچ کرنے کا حکم ہو چکا تھا۔

۵۴
لام پنجاب

جنرل آرڈر کمانڈر انچیف صاحب سے واضح ہے کہ فوج مفصلہ ذیل واسطہ تنبیہ سرکشان اضلاع پنجاب کے جمع ہوگی ــــــ لائٹ فیلڈ بیٹری ۳، ٹرپ توپ خانہ اسپی ۸، پیادہ گولہ اندازوں کی کمپنی ۸، سیبر مینا کی ایک پوری رجمنٹ، گورہ سواروں کی رجمنٹ ۲، بے آئیں سواروں کی رجمنٹ ۵، آئیں والے سواروں کی رجمنٹ ۵، گورہ پیادوں کی رجمنٹ ۵، ہندوستانی پیادوں کی رجمنٹ ۱۶ــ ان سب کی میزان کل پچیس ہزار آدمی ہوتا ہے۔

خبر تھی کہ ۷ ر تاریخ اکتوبر کو کمانڈر انچیف صاحب بہادر بالضرور شملہ سے نہضت فرما ہوں گے۔ اور ۹ ر تاریخ مقام کالکا میں ہوں گے۔ لشکر صاحب موصوف کا ۲۲ ر تاریخ منی مزرعہ میں مقام کرے گا۔ اور بعد ازاں انہ ساہ لدھیانہ سیدھا فیروز پور کو جاوے گا۔ ــــ از دہلی اردو اخبار

۵۵
خبر کلکتہ

سلطان الاخبار کلکتہ میں مرقوم ہے کہ لشکر کے اکثر صاحب لوگ جو بڑے بڑے عہدوں پر تھے، بہ حکم گورنمنٹ بنگالہ کلکتہ سے فیروز پور کو روانہ ہوئے، تاکہ لڑائی میں دلیری کی داد دیں، اور جو کہ باقی ہیں وہ بھی پا بہ رکاب ہیں، اور قلعہ کے اکثر صاحب لوگ بھی دیار مغرب (پنجاب کی طرف) روانہ ہوں گے۔ فقط

۵۶
خبر لاہور

دہلی اردو اخبار میں مرقوم ہے کہ لاہور میں مشہور ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے پانچ چھ ہزار آدمی بہ سرکردگی

کرنیل اٹیگ صاحب اس ارادے سے بھیجے ہیں کہ شمال کی طرف سے چترسنگھ کے بازو پر حملہ آور ہوں گے۔ مگر سب کی یہ رائے ہے کہ اس کی سپاہ سردار مذکور سے مل جاوے گی۔ اور کرنیل مذکور کو مار ڈالے گی۔

۵۷

خبر ملتان

اخبار المحقائق میں لکھا ہے کہ شہر ملتان اور قلعہ میں کئی روز سے شور وغل کچھ نہیں سنا جاتا۔ قلعہ کے اندر ایک کچی دیوار بنائی جاتی ہے اور پزاوہ منہدم کیا جاتا ہے۔ مول راج کو خیال ہے کہ اگر انگریز اس پر قابض ہو جاویں گے تو پھر شہر اور قلعہ پر بخوبی زد ہو سکے گی۔ مگر فوج سرکاری اب کے ادھر ہی طرف سے حملہ کرے گی۔ کڈھ کپتان اعلیٰ بہت سی فوج ساتھ لے کر ایک خاص برج قلعہ کا دیکھنے گئے اور بہ خیریت تمام حضوری باغ تک پہنچے اور اپنے کام سے فراغت کر کے ساری جمعیت سمیت واپس آئے۔ اس نے تو ایک میل طے کی ہی تھی کہ کچھ سوار مول راج کے نمودار ہوئے۔ بڑی دیر تک تو ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ اور فوج آہستہ آہستہ چلی گئی۔ بعد اس کے توپ خانہ سے توپیں سر ہوئیں، مگر اتنے میں وہ سوار بھاگ گئے اور پھر نظر نہ آئے۔ جمعیت مذکور قریب دس بجے رات کے کیمپ میں داخل ہوئی۔

۵۸

وہاں کی چٹھی مورخہ ۱۹ راکتوبر سے واضح ہے کہ مول راج نے بہت قیدیوں کو جو ایک مدت سے قید تھے چھوڑ دیا، کیوں کہ اس کے پاس اپنے آدمیوں کے کھانے کو نہیں ہے۔ قیدیوں کو کہاں سے دے۔ ان قیدیوں میں ایک آدمی ۷۲ رجمنٹ ہندستانی کا تھا۔ جو کہ ۹ رتاریخ کی لڑائی میں زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا تھا۔ اسی کی زبانی معلوم ہوا کہ مول راج کی فوج کا حال بہ باعث کمی غلہ وغیرہ مایحتاج کے تباہ ہے۔ وہ آدمی کہتا ہے (کہ) جب سے میں قید تھا مول راج مجھ پر بہت عنایت کرتا تھا اور چلتے وقت تیس روپے مجھے دئے۔ اور ۱۰ رجمنٹ ملکہ کا جو میرے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا، اب صحت پاتا جاتا ہے۔ مول راج اُسے بھی صحت پانے کے بعد چھوڑ دینے (کو) کہتا ہے۔

ایک اور چٹھی سے واضح ہوتا ہے کہ ۲۶ راکتوبر تک کوئی امر تازہ وقوع میں نہیں آیا۔ مگر یہ کہ تاریخ مذکور کو خوب مینہ برسا۔ ایک چٹھی لشکر ملتان مورخہ ۲۷ راکتوبر سے واضح ہے کہ اب مول راج کے پاس صرف آٹھ ہزار سپاہ سنی جاتی ہے، کیوں کہ اس کی فوج سے ہر روز لوگ بھاگ جاتے ہیں مگر اس کے ہاں غلے کی ایسی کمی نہیں جیسی لوگ بیان کرتے ہیں۔ ملتان میں آٹھ سیر کا آٹا بکتا ہے۔ مول راج کا سیر انگریزی سیر سے بہت زیادہ ہے۔

اڈورڈس صاحب کے لشکر کے سامنے ایک بڑی توپ شہر میں نئے مورچہ پر چڑھائی گئی ہے، جو کہ دور ہی سے بہ خوبی دکھائی دیتی ہے۔ فقط۔

از دہلی اردو اخبار

۵۹

اخبار الحقائق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ کورٹ لینڈ صاحب کی پلٹنوں میں سے جو فوج کہ مخالف سے
اس میں صرف ملتانی ہی لوگ تھے پوربیے اور مسلمان نہ تھے۔
۷ تاریخ کی جنگ میں اگرچہ فوج انگریزی بہت بے تاب تھی مگر سپہ سالار نے اپنی تدابیر سے اس کو دا
طرف لاکر کئی نالے اتر کر مخالفین کی بائیں فوج پر حملہ کیا۔ اور ان کے سپاہیوں کو جو دام و دو کے مانند غار و
اور جھاڑیوں میں مخفی ہو رہے تھے۔ اکثر کو تہ تیغ کیا۔ باقی بھاگ گئے۔ گولہ اندازان سرکاری نے توپ مارنی شرو
کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں فوج سرکار نے دشمن کے مورچوں پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کی توپوں کو میخیں ٹھونک کر بیکا
کردیا۔ ہری سنگھ کیدان گولہ اندازان مخالف زخم مہلک کھا کر اور زخمیوں سمیت سرکاری دواخانہ میں آیا۔
۸ تاریخ کے خط میں لکھا ہے کہ جب دسویں پلٹن ملکہ نے حریف کے مورچوں پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھاری
میں پناہ لے کر پھر اپنی فوج کو درست کیا۔ سرکاری فوج نے ان پر ایسے گولے مارے کہ وے وہاں سے بھی پیچھے
ہٹ گئے۔ فوج سرکار نے دشمنوں کے مورچوں کا سارا کارخانہ جلا کر اپنے کمپو میں معاودت کی۔
اسی جنگ ثانی میں ہر چند کہ ہزارا سنگھ کیدان طلائی کمر باندھے، اسپ سفید پر سوار، گویا سب سرداروں
کی ناک بنا ہوا حاضر و موجود تھا، مگر سرکاری فوج کے سامنے نہ آیا۔ توپیں جو سرکار کے قبضے میں آئی ہیں، ان
میں سے ایک توپ کلاں پر یہ عبارت منقوش ہے:-

احمد یار فرزند فتح محمد لاہوری نے بہ حکم خالصہ شریفہ ۱۸۸۵ سمت میں بہ حکم حاکم ملتان
اس توپ کو طیار کیا۔ اس توپ کا گولہ بلا خطا بتا دے وے گا۔ (مٹا دے وے گا؟) ہر
ایک شے کو جو اس کے سامنے آوے گی۔۔۔۔۔

۶۰

خبر بغاوت پشاور

زبدۃ الاخبار میں ضمیمہ دہلی گزٹ مورخہ ۱۰ نومبر سے ایسا منقول ہے کہ پشاور کی سپاہ پر جیسا کہ بغاوت
کا گمان تھا، آخر ویسا ہی وقوع میں آیا۔ یعنی سکھوں کی تمام سپاہ متعینہ پشاور نے بغاوت اختیار کی، اور
سب کے سب چتر سنگھ اور شیر سنگھ اور اور باغیوں سے جا ملے۔ میجر لارنس صاحب قبل اس سے کہ سپاہ
باغی ان کے مکان پر حملہ کرے، باتفاق مسٹر بوئی صاحب و مسٹر ٹامس صاحب کے کوہاٹ میں سردار
سلطان محمد خاں کے پاس چلے گئے۔ خوب ہوا جو صاحبان موصوف نے جھٹ پٹ اپنے تئیں اسی طوفان بلاخیز
سے نکال کر جائے امن میں پہنچایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر جلنے میں ذرا بھی دیر کرتے تو بلا شک گرفتار ہو جاتے۔

۶۱

برروانگی اسباب حرب (کمپنی)

اخبار الحقائق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ وہ بڑا حصہ اسباب حرب کا ۔۔ تاریخ کو ۔۔۔ سے

روانہ ہوا تھا۔ ۲۴ر کو گنڈا سنگھ والہ میں پہنچا۔ اس کے ہمراہ تیسرا اور نواں اور کیو (ریگولر؟) رسالہ اور ۱۶ اور ۶۹ پلٹن پیادہ ہندوستانی معہ دو توپ جو بیس بنی اور آٹھ توپیں اٹھارہ بنی اور دو توپ آسمانی تاریخ کی معہ چند توپوں نو بنی اور چھ بنی اور کئی اور چھوٹی آسمانی توپوں کے۔ اور تخمیناً چھ سو چھکڑے ہیں جن فی توپ ایک ہزار باچھتی کا اسباب لدا ہوا ہے اور بہت سی باروت اور گولہ زیادہ جت سے ہے۔ ۱۹ر کو پور میں اس کے پہنچنے کا انتظار تھا۔ ایک راقم لکھتا ہے کہ ہر ایک ہاتھی کے چارہ کا خرچ ایک سو اسی روپیہ ماہواری ان دنوں میں پڑتا ہے۔ اور ہر ایک شتر کا خرچ بیس روپیہ اور بیل کا کچھ کم، اور گھوڑے کا بیس روپیہ سے پینتیس روپیہ ماہواری تک ہے۔

۶۲
خبر ملتان

مہتمم زبدۃ الاخبار ایک خط کی رو سے جو مرقومہ ۱۴ر نومبر کا مقام بہاول پور سے ان کے پاس آیا، رقم فرماتے ہیں کہ تاریخ مذکور تک کپتان ایڈورڈ صاحب و لیک صاحب اپنی سپاہ سمیت کمال استقلال سے بہ مقام سورج کنڈ اقامت گزیں ہیں۔ اور فوج انگریزی ایک نخلستان میں پڑی ہے۔ اور ہرکارہ جاسوس ملتان سے لشکر سرکار میں ایسی خبر لائے ہیں کہ دیوان مول راج ۸۴ توپوں میں سے جو قلعہ میں اس کے پاس ہیں دس توپ باہر لایا، اور بہ مقام شیوالہ مقابل باغ شیش محل قائم کی ہیں۔ دوسری دفعہ پھر جنگ (کے) میدان کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اپنی سپاہ کو انعام کا امیدوار کرکے لڑائی کی ترغیب دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر ہماری فتح ہوئی تو نانک شاہیوں کے دین کی رونق ہے، نہیں تو مرنا اچھا۔ اور رنگ رام کو لشکر انگریزی کے ساتھ سازش و آمیزش کے شبہ میں قید کیا۔

کٹار پلٹن کے جوانوں کو جو چھٹی اور ساتویں نومبر کی لڑائی میں لشکر انگریزی سے بھاگ کر دشمنوں سے جا ملے تھے، مول راج نے تنخواہ دو ماہ انعام دے کر نوکر رکھ لیا ہے۔ جرنیل وش صاحب بہادر لشکر سندھ کے منتظر ہیں، جب وہ کمک کے لے آوے گا تو قلعہ ملتان کے تسخیر کی تدبیر کی جائے گی۔

۶۳
خبر کیفیت جنگ ملتان واقعہ ۷ نومبر

اخبار موصوف (زبدۃ الاخبار) میں اسی خط کی رو سے مندرج ہے کہ ۷ر نومبر کی لڑائی میں مول راج کے لشکر سے قریب تین سو آدمی کے مقتول اور دو سو مجروح ہوئے۔ سرکاری لشکر سے نو آدمی زخمی ہوئے، سو زخم بھی ایسے خفیف۔ اپنے پیروں ڈیروں میں چلے آئے۔ ساتھ (۷) توپ اور آٹھ زنبوک، اور اکثر بڑی بندوقیں اور گھوڑے اور بیل سپاہیان لشکر سرکار کے ہاتھ لوٹ (میں) آئے۔ اور خبر ہے کہ تیسری پلٹن اور حکیم صاحب کا رسالہ سندھ سے آتا ہے ۱۳ر نومبر کو بہ مقام خان پور، جو بہاول پور سے ساٹھ کوس دکھنی طرف ہے، پہنچے تھے۔

اور خبر تازہ یہ ہے کہ جس دن سے دیوان مول راج نے بغاوت کی ہے، اس دن سے اب تک تو اپنے سرداروں کو لڑنے کے لئے بھیجا کیا ہے۔ مگر اب اس کا یہ مقصد ہے کہ آپ سپاہ کثیر لے کر میدان میں آوے اور لشکر سرکار سے مقابلہ کرے۔

۶۴
خبر جنگ لاہور

زبدۃ الاخبار میں آگرہ مسنجر اکسٹرا سے منقول ہے کہ ایک خط مرقومہ ۲۱ نومبر جو مقام رام نگر لشکر کمانڈر ان چیف بہادر سے آیا، اس سے واضح ہوا کہ ۱۲ کو فوج سرکاری کے تئیں سپاہ سکھ سے لڑائی پیش آئی۔ میدان جنگ میں سرکاری سپاہ اس قدر حاضر تھی، یعنی ـــــ گورہ سواروں کا تیسرا اور چوتھا رسالہ اور پانچواں رسالہ اور تین ترپ توپ خانے کے، اور یہ سب سپاہ جرنیل کیورٹن کے زیر حکم تھی، اور بہ سبب اس کے کہ میدان تنگ تھا، جوانان لشکر اور کئی ایک نامدار افسر مارے گئے اس تفصیل سے ـــــ جرنیل کیورٹن بہادر چوتھے رسالہ بادشاہی کا افسر، کرنیل ہولاک بہادر اسی رسالہ کا افسر، کپتان ذت جرلٹ بہادر۔ زور کئی افسر مجروم ہوئے اس تفصیل سے ـــــ لفٹنٹ کرنیل الکزنڈر صاحب کپتان ویلی صاحب متعینہ رسالہ پنجم، کپتان ہوس صاحب متعینہ رسالہ ہندوستانی، کپتان ہارونک صاحب جو سپہ سالار کا مصاحب تھا۔ اور مشہور ہے کہ ایک توپ اور میگزین کے دو چھکڑے میدان سے کھوئے گئے۔

اخبار موصوف (زبدۃ الاخبار) میں مرقوم ہے کہ ایک خط دسمبر کی ۷ ارکا لکھا ہوا جنرل وش صاحب کے لشکر سے آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۷ نومبر کی لڑائی کے بعد سے تحریر خط کے روز تک وہاں لڑائی نہیں ہوئی تھی لیکن دیوان مول راج اکثر اوقات فوج کثیر لے کر بیراگی باغ تک آتا ہے اور لڑائی کا موقع انداز دیکھ کر دائیں بائیں پھر کر لوٹ جاتا ہے، اور اپنے مصاحبوں سے کہتا ہے کہ سنکرات ماگھ بدی کے بعد ایک بڑے لشکر سے میدان میں چل کر لڑائی کا ہنگامہ گرم کروں گا۔

لشکر انگریزی میں خبر آئی کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں و ڈیرہ غازی خاں کی طرف اور تو کوئی فتنہ و فساد نہیں ہے، لیکن اکثر سکھ لوگ سردار چتر سنگھ کے لشکر کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔

ہرکارے لشکر سرکار میں خبر لائے کہ مول راج نے عبداللہ نام ساہوکار پر لشکر انگریزی کے امیروں کے ساتھ سازش کی تہمت رکھ کر اسے قید کیا ہے۔ اور جرمانہ میں اس سے روپیہ مانگتا ہے۔ اور اسی طرح ایک شخص جس کا نام چندو تھا ایسی ہی تہمت لگا کر قید کیا۔ اور اس کی داڑھی مونچھ منڈوا کر کالا منہ کروا کر گدھے پر چڑھوا کر تمام شہر ملتان میں پھروایا۔ اور کہتے ہیں کہ بہت بے نوکر (بلا تنخواہ) سکھ بہ پاس مذہب مول راج کے ساتھ ہو کر لڑنے کو آتے ہیں۔ اور مول راج کے ساتھ موافقت و مرافقت کا دم بھرتے ہیں۔

خبر تازہ یہ ہے کہ مول راج نے میدان میں نکل کر اپنے سرداروں سے مشورہ کیا کہ سندھ کی فوج جو کمک کے لئے آتی ہے اسے روکنا چاہیئے کہ جنرل وش صاحب سے نہ مل سکے۔ سب سرداروں نے اس مشورہ کو

پسند کیا۔ اور دو ہرکارے بھیج دیئے کہ سندھ کی سپاہ کا حال دریافت کریں (کہ) کہاں تک آ چکی ہے۔

۶۵
خبر جنگ پنجاب

اخبار موصوف (زبدۃ الاخبار) آگرہ مسنجر اخبار اکسٹرا سے منقول ہے کہ ۱۲ نومبر کو کمانڈر انچیف بہادر علی پور میں ورود کرکے دو بجے حکم دیا کہ لشکر سرکار چپ چاپ دشمنوں پر دوڑ جائے۔ ترم (ڈرم) وغیرہ کچھ نہ بجے۔ سپاہ نے حکم سنتے ہی حملہ کر دیا۔ سات بجے رام نگر میں داخل ہوئے۔ راجہ شیر سنگھ کی سپاہ، تمام سوار و پیادے توپ خانہ قریب بیس ہزار کے آمادۂ جنگ تھے۔ طرفین سے توپ چلنے لگی۔ عین لڑائی میں سکھوں کی ایک جماعت مورچوں سے باہر نکل کر آگے بڑھی۔ تیسرے رسالہ بادشاہی کے سوار ان کے مقابل ہو گئے اور انھیں ہٹا دیا۔ کمانڈر انچیف بہادر اپنے مصاحبوں سمیت باتفاق کرنیل ہولاک صاحب کے سکھوں کا تعاقب کرتے تھے کہ ناگاہ سکھ پھر دریا اتر کر یورش کر آئے۔ کرنیل صاحب نے سواروں کو حکم دیا کہ تلواریں کھینچ کر ان پر جا پڑو۔ چوں کہ سکھ بہت تھے اور رسالہ کے سوار صرف چار سو پچاس تھے۔ نرغے میں پڑ گئے۔ کرنیل موصوف، اور جرنیل کیورٹن اور کئی سردار اور بھی بڑی شجاعت و مردانگی کرکے مارے گئے۔

۶۶
خبر ملتان

اخبار الحقایق میں دہلی گزٹ سے مرقوم ہے کہ ان دنوں ملتان میں سن سان ہو رہا ہے۔ سو اس کا سبب یا تو یہ ہے کہ غنیموں میں کچھ نا اتفاقی واقع ہوئی یا قلعہ کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور دوربین سے دیکھا تو یہی معلوم ہوا کہ بلاشک قلعہ کے نظم و نسق میں مصروف ہیں۔ ایک دن مول راج نے توپ اور بندوق کی شلک کروائی۔ اور مشہور کیا کہ یہ شلک اس فتح کی ہے جس کی خوش خبری چتر سنگھ نے ہمارے پاس بھیجی ہے۔

ہرکاروں کی زبانی یہ خبر آئی کہ گلاب سنگھ نے مول راج کے نام ایک خط بھیجا۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم اس خط کے دیکھتے ہی ملتان کا قلعہ سرکار انگریزی کے حوالہ نہ کرو گے، تو میں اپنی فوج لاکر قلعہ کو مسمار کر دوں گا۔ اس خط کا مضمون سن کر مول راج کی ماں (ماں) نے کہا کہ گلاب سنگھ یا راجہ دلیپ سنگھ کی دھمکیوں سے ہمارا بیٹا ہرگز بزدل نہ ہوگا۔ اور دم واپسیں تک قلعہ کو نہ چھوڑے گا۔

۶۷
(پشاور سے انگریزوں کا فرار)

دہلی اردو اخبار میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ لشکر سردار چتر سنگھ کا ۱۸ تاریخ نومبر کو نوشہرہ سے، جو کہ اٹک سے بیس میل ہے، تھا۔ اور تمام صاحب لوگ رزیڈنسی پشاور کے لیڈیوں سمیت اس کے ساتھ تھے۔ وہ اگرچہ ان کی بہت حفاظت ہوتی ہے، لیکن سردار موصوف اور اس کے سب افسران کی بہت عزت اور خاطرداری

کرتے ہیں۔ ان صاحبوں کو سلطان محمد خاں مارکزئی نے سردار مذکور کے حوالہ کر دیا اور اس احسان کا عوض کیا جو کرنیل لارنس رزیڈنٹ لاہور، برادر کلاں میجر لارنس صاحب نے ۱۸۴۶ء میں قید لاہور سے اس کے چھڑانے میں اس پر کیا تھا۔

فٹس جرالڈ صاحب بھی، جو کہ ۲۲ر تاریخ کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے، مر گئے۔ اور اب اس بار مورچہ دشمنوں کے اور اس طرف انگریزی مورچے تیار ہوتے ہیں۔ جس گورے کو سکھ پکڑ لے گئے تھے، اسے کچھ کپڑے اور روپیہ دے کر بہ خاطر داری تمام شیر سنگھ نے چھوڑ دیا۔ اور ایک خط کمنڈر انچیف بہادر کے نام، اور ایک خط نواب گورنر بہادر کے لئے اسے دیا۔ سو وہ گورا دونوں خریطے لے کر لشکر انگریزی میں داخل ہوا۔

۶۸
خبر بغاوت کیمپ رام نگر (پشاور)

راقم جام جمشید میرٹھ کے انگریزی اخبار سے نقل کرتا ہے کہ تین دسمبر کو توپ کی لڑائی طرفین سے گرم رہی آخر کار دشمن نہ ٹھہر سکے۔ رات کو اپنے مقام سے اٹھ گئے، اور لشکر سرکار میں خبر آئی کہ چتر سنگھ فوج اور توپ خانہ سمیت شیر سنگھ کے لشکر سے آملا۔ شیر سنگھ کی فوج میں اس کی سلامی کی توپیں چلیں۔ اور ساتویں اور آٹھویں تاریخ کے خطوط سے معلوم ہوا کہ شیر سنگھ کا لشکر دریائے جہلم کے اس پار ایک جنگل میں جہاں بالکل جھاڑی ہے، پڑا ہے۔

سردار محمد خاں نے جو میجر لارنس کو چتر سنگھ کے حوالہ کر دیا، اب امیر دوست محمد خاں اس بات سے اس پر بہت خفا ہوئے۔ اب میر دوست محمد خاں کا ارادہ ہے کہ پشاور میں اپنا قبضہ کرلیں اور سکھوں کو وہاں سے بالکل نکال دیں۔

۱۱ر دسمبر کو دو رسالہ، دو پلٹن، اور دو توپ پشاور سے آکر شیر سنگھ کے ساتھ مل گئے۔ اور ۳ر دسمبر کی لڑائی کے بعد سے آٹھویں تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ انگریزی لشکر چناب کے پار اور شیر سنگھ کا لشکر جہلم پار پڑا ہے۔

۶۹
خبر بہاول پور

اخبار الحقائق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ مول راج نے نویں تاریخ شوالہ میں کچہری کی اور حاضرین دربار سے کہنے لگا کہ سکھ بڑے نامرد ہیں کہ لڑائی کے بعد بد دل ہو کر بھاگنے لگتے ہیں۔ ۱۱ر تاریخ کے مقابلہ میں تین سو سوار مول راج کی فوج میں سے بھاگ گئے۔ ان کا سر مونڈ کر سارے شہر میں تشہیر کروا دیا تاکہ اوروں کو عبرت ہو۔

۷۰
خبر ملتان

زبدۃ الاخبار میں آگرہ سے منجر اخبار سے مرقوم ہے کہ اخبار مرقوم میں ۷ ،۱۲ر دسمبر کے خط سے جو لشکر جنرل وٖ[illegible]

صاحب سے آیا ایسا لکھا ہے کہ ۲۵ دسمبر کو فوج بنگال نے اپنی جگہ سے حرکت کر کے سیتل ندی کے مقابل ڈیرہ کیا۔ اس کے دوسرے دن بمبئی کی فوج بھی اس فوج سے آملی۔ اور بائیں طرف اس نے بھی ڈیرہ کیا۔ ۲۷ دسمبر کو انگریزی سپاہ نے سکھوں کے لشکر پر حملہ کیا۔ سکھ کا لشکر اپنے مورچہ چھوڑ کر شہر پناہ کے اندر بھاگ گیا۔ سرکاری لشکر نے سکھوں کے مورچوں میں اپنی توپیں لگا کر شہر ملتان پر گولہ مارنے شروع کیے۔ اور بڑی توپوں کے واسطے مورچے اور دمدمے بنائے جاتے ہیں۔ جس دن سکھوں کے لشکر پر حملہ کیا (گیا اس دن) انگریزی لشکر کے تین سردار زخمی ہوئے ـــــ کیس صاحب تیسویں پلٹن کے، اور میجر میکڈوگل صاحب ۲۷ رجمنٹ کا افسر، اور گارڈن صاحب ۔ ۶ رجمنٹ بادشاہی کا افسر۔ باقی فوج انگریزی قلعہ اور شہر پناہ کی دیوار کے نیچے پہنچ کر دشمنوں کی توپ کی زد سے محفوظ ہوگئی۔

۷۱

اخبار الحقایق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ (جنوری کی) ۵ تاریخ کے تیسرے پہر تک کی خبر آئی کہ اب تک نہ تو قلعہ پر انگریزوں نے دھاوا کیا ہے، نہ مخالفوں سے کسی طرح کا ایسا امر جو ان کے عجز پر دلالت کرنے ظہور میں آیا۔ بلکہ دونوں طرف سے گولہ چل رہا ہے۔

بھاول پور کا اخبار نویس دوسری تاریخ کے خط میں لکھتا ہے کہ باروت خانے کے اڑ جانے سے مول راج کے سپاہی بہت آزردہ خاطر ہوئے۔ اور قوم روہیلہ نے عرض کیا کہ ہم قلعہ سے شہر میں جا کر انگریزوں سے لڑیں اور اپنی بہادری دکھائیں۔ مول راج نے ان کو قلعہ سے نکلنے نہ دیا کہ مبادا انگریزوں سے مل جائیں۔ وہی اخبار نویس ۵ تاریخ کے خط میں لکھتا ہے کہ جس وقت مول راج کی فوج شہر میں انگریزوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکی تب قلعہ کی طرف بھاگی۔ دیوان جی اس وقت قلعہ سے باہر نکلے تھے۔ فوج کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر بہت دلاسا دیا، مگر کسی نے ان کی بات نہ سنی، اور قلعہ کے اندر گھس پڑے۔ دیوان جی بھی قلعہ ہی میں پھر گئے۔ اور پھاٹک بند کروا دیے تاکہ اندر کوئی آنے نہ پاوے۔ اور دوسرے روز دیوان جی نے لالہ رنگ رام اور حکیم رائے پر سلو خانے کے جلانے کی تہمت رکھ کر دونوں کو پھانسی دے دی۔

۷۲

زبدۃ الاخبار میں دہلی گزٹ مورخہ ۱۳ جنوری (۱۸۴۹ء) سے منقول ہے کہ انگریزوں نے نقب یہاں تک پہنچا دی ہے کہ قلعہ بیس گز کے فاصلہ پر رہ گیا ہے۔ اگرچہ قلعہ سے ہر وقت توپیں چلتی ہیں، لیکن توپوں سے اتنی مضرت لشکر سرکار کو نہیں پہنچتی جیسی بندوقوں کی گولیوں سے۔

ملتان کی لوٹ میں ہزاروں گھوڑے اور ہاتھی اور نفیس نفیس اسباب لشکر ظفر پیکر کے ہاتھ آیا۔ اور ملتان کے ساہوکار تیس لاکھ روپیہ دینے (کا وعدہ) کرتے ہیں کہ شہر نہ لوٹا جائے۔ شاید میران انگریزی قبول کرلیں۔

اخبار الحقایق میں مرقوم ہے کہ مول راج نے دیا بخش نام ایک وکیل لشکر سرکار میں بھیجا۔ اس کے آگے آگے

ایک جھنڈا تھا کہ وہ علامت ایلچی گری کی ہے۔ جب اس وکیل کو جرنیل وِش صاحب کے خیمہ میں لے گئے، پوچھا گیا کہ تمہارے پاس دیوان جی کا وکالت نامہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وکالت نامہ تو نہیں مگر معذرات بے قصوری کے مول راج کی طرف سے عرض کرنے آیا ہوں۔ جرنیل صاحب نے جواب دیا کہ دیوان جی کو اپنے تئیں ہمارے سپرد کر دینا عین جواب باصواب ہے۔ جب وکیل رخصت ہو کر قلعہ کو گیا تو دربانوں نے بڑی روک ٹوک حجت تکرار سے اندر آنے دیا۔

۳ ۔

(خبر جنگ ۱۳ ؍ جنوری ۱۸۴۹ء)

زبدۃ الاخبار میں آگرہ منجر الشرا اخبار انگریزی سے منقول ہے کہ ۱۳؍ جنوری کو مقام مونگ پر ایک جنگ عظیم ہوئی۔ اول تو سکھوں نے لشکر ظفر پیکر پر گولے مارنے شروع کئے بعد ازاں لشکر سرکاری پر حملہ کیا اس بات سے نویں اور چودہویں رسالہ بادشاہی اور دو ٹرپ توپ خانہ نے سکھوں کو روکنے کو بموجب حکم کمانڈر انچیف بہادر کے حملہ کیا۔ اور ان کے مقابل ہوگئے۔ اس میں کچھ فوج سکھوں کی ایک گوشہ صحرا سے نمودار ہوئی اور لشکر سرکار پر توپ و تفنگ مارنی شروع کی۔ اس مارسے لشکر ظفر اثر کو بڑا نقصان پہنچا اور سواروں کا پاؤں اکھڑ گیا۔ فوج سرکار کی چھ توپ سکھوں کے ہاتھ پڑ گئیں اور گولہ انداز بھی مقتول ہوئے۔ جب یہ حال ہوا تو گوروں کی ۲۴ و ۲۹ رجمنٹ اور ہندوستانیوں کی ۳۰ و ۵۶ و ۶۹ رجمنٹ لشکر سے نکل کر آگے بڑھی اور بڑی مردانگی سے لڑ کر گئی ہوئی چھ توپوں میں سے چار توپ اور اور بھی لیں۔ اور ان کے پیالوں میں کیلیں ٹھونک دیں۔ ان میں سے پندرہ توپ تو اپنے لشکر میں لے آئے۔ باقی وہیں میدان میں چھوڑ دیں۔

سکھوں کا ارادہ ہے کہ دریائے جہلم اتر کر اس طرف آجائیں۔ ایک خط کا راقم وہاں سے لکھتا ہے کہ لشکر سرکار کے تین ہزار آدمی مقتول ہوئے۔

۴ ۔

خبر ملتان

نواب گورنر جنرل بہادر نے نظر بہ جاں فشانی سپاہ یہ تجویز کی ہے کہ ملتان کا سب مال غنیمت معہ اسباب وخزانہ بہ طور انعام سپاہیوں کو علی قدر مراتب تقسیم کر دیا جائے۔ جو مال و منال شہریوں کا ضبط ہے، تا جائے کہ کم سے کم پندرہ لاکھ روپیہ سرکار کو نہ دیں گے مسترد نہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ قلعہ میں ہر قسم کے اسباب سے ڈھکے انبار پائے گئے۔ اور متعفن لاشیں قلعہ میں اکثر ملیں۔ اور گولے اور گولیاں اور باروت خانے، اور پشمینہ مول راج کے توشک خانے میں روپیہ اشرفی کے سوا قیمتی تلواریں اور اسباب مکانات بھی ملا۔ اور ۲۸ جنوری کو ۱۲ توپیں بہ ہمراہی فوج ملتان کمانڈر انچیف صاحب کے پاس بھیجی گئیں۔ اب یہ خبر ہے کہ دیوان مول راج کو بمبئی بھیجا جائے گا۔

—— از اخبار الحقائق ۔ ار فروری بہ حوالہ مفصلات

۷۵

دہلی اردو اخبار نے دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ شہر ملتان کو لوٹنے کے عوض بیس لاکھ روپیہ جرمانہ مقرر کیا گیا اور اب تک قریب بیس لاکھ روپیہ کا نقد و جنس قلعہ میں سے بھی ہاتھ آیا ہے۔

دیوان مول راج ہمراہ فوج برگیڈیر جنرل ڈنڈاس صاحب کے ملتان سے روانہ ہوا ہے۔ مول راج رام نگر تک اس فوج کے ساتھ جاوے گا، اور وہاں سے لاہور کی طرف بھیجا جاوے گا مگر اس کے متعلق (متعلقین) بالفعل ملتان ہی میں رہیں گے۔ اور مول راج کے مصارف ضروری کے لئے دو صد روپیہ یومیہ مقرر ہوا۔ اور چار گھوڑے اور ایک ہاتی اس کی سواری کے لئے واگذاشت کرکے باقی سب گھوڑے ہاتھی سرکار میں ضبط ہوگئے۔

۷۶

خبر لاہور

سکھ کا لشکر چناب سے اتر کر وزیرآباد میں آگیا تھا۔ اور لاہور [illegible] تھا۔ ۱۹ فروری کو انگریزی لشکر میں حکم ہوا تھا کہ سکھوں کے مقابلہ کے لئے مسلح و آمادہ رہیں۔ لاہور کے چاروں طرف توپیں لگادی ہیں اور اور تمام ولایتی بی بیاں اطفال سمیت مقام انارکلی سے قلعہ میں پہنچا دی گئیں۔ اور قلعہ سے ساری سپاہ میدان میں نکل کر سکھوں کے مقابلے کو تیار رہے۔ تاکہ سکھوں کو لاہور میں آنے کی طاقت نہ ہو۔ لاہور میں مشہور ہے کہ سکھ بہ مقام جالندھر اور امرتسر بڑا فتنہ برپا کریں گے۔ اور سکھوں کے سوار چناب کے اس طرف دکھائی دیتے ہیں اور جرنیل وش صاحب کو جو ملتان سے آتے ہیں، حکم ہوا کہ کمانڈر انچیف صاحب بہادر کے لشکر سے جا ملیں۔ (منقول از زبدۃ الاخبار و جام جمشید)

۷۷

خبر جنگ گجرات

سکھ کا لشکر دو مقام پر، جو گجرات سے پرے ہیں، بڑے استقلال سے پڑا تھا۔ جس وقت فوج سرکار نے ان کا تعاقب کیا، سکھوں نے مقابلہ کیا کہ کئی بار سپاہ نصرت مند کے دائیں بائیں حملہ کیا۔ لشکر سرکار میں سندھ کے سواروں اور بادشاہی نویں رسالہ نے کار نمایاں کیا اور ہر بار دشمنوں کو شکست دی اور دائیں طرف سے توپ خانہ کے سواروں اور ملکہ کے رسالہ نے دلیرانہ حملہ کرکے اعدا کو پس پا کرکے بھگا دیا۔ اور سکھ کا لشکر مقابلہ کی تاب نہ لاکر اپنا سارا توپ خانہ اور حرب وغیرہ کا سب سامان میدان میں چھوڑ کر جان بچا کر بھاگے۔ توپ خانہ کے سواروں نے پانچ میل تک ان کا تعاقب کیا۔ راہ میں جہاں کہیں سکھوں کو پایا بے دریغ قتل کیا۔ (ایضاً)

۷۸

خبر پنجاب

زبدۃ الاخبار میں آگرہ مسنجر اخبار انگریزی سے منقول ہے کہ ۲۳ فروری کو میجر میکشن صاحب اجنٹ گورنر

جنرل بہادر نے جو کمانڈر انچیف صاحب بہادر کے ہمراہ ہیں، بہ حضور گورنر جنرل بہادر کیفیت جنگ اس طرح لکھ کر بھیجی کہ لشکر سرکار نے بہ مقام گجرات سکھ کی سپاہ پر یورش کر کے بڑی شجاعت و مردانگی سے سکھوں کو شکست دی۔ ان کی جمعیت بالکل درہم برہم ہو گئی اور سکھ ایسے سراسیمہ و بدحواس بھاگے کہ اپنا توپ خانہ اور مال و اسباب بھی نہ لے جا سکے۔ سب چھوڑ گئے۔ فوج سرکار نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے یہ خبر فتح سنکر حکم دیا کہ ہر ایک بڑی چھاؤنی میں ۲۱ توپ سر ہوں اور خبر فتح تمام عالم کو سنا دیں۔

"نواب گورنر جنرل کے حکم سے مشتہر ہوا

"(دستخط) ایچ ۔ ایم ۔ ایلیٹ سکریٹری گورنمنٹ ہند

ہم رکاب نواب گورنر جنرل بہادر

ترجمہ اشتہار سر ہنری لارنس صاحب ریزیڈنٹ لاہور

جام جمشید میں مرقوم ہے کہ صاحب موصوف نے گورنر جنرل کے حکم بہ موجب ۸ ر فروری کو ایسا اشتہار دیا ہے کہ لشکر سکھ کے تمام ہمراہی بجز سردار سلطان محمد خاں کے اختیار رکھتے ہیں کہ سرکار کی طرف رجوع لاویں پس جو لوگ بلا تامل حاضر ہوں گے، مواخذہ سے محفوظ رہیں گے۔ اور سپاہیوں میں سے اجو کوئی کہ حاضر ہو کر ہتھیار رکھ دے گا، بلا مزاحمت چلا جائے۔ اور جاگیر داروں میں سے جو کوئی بہ طوع و رغبت حاضر ہو گا اس سے کچھ مواخذہ نہ ہو گا، بلکہ جاگیر بھی بحال رہے گی۔

تبصرہ

اقبال کے آخری دو سال

مؤلف : عاشق حسین بٹالوی

تقطیع : ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۸۰ صفحات، قیمت نو روپے

ناشر : اقبال اکادمی ۔ کراچی۔

گذشتہ چوتھائی صدی میں اقبال پر چھوٹی بڑی ان گنت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی فہرست اگر مرتب کی جا[ئے] تو یہ بھی ایک خاصی کتاب بن سکتی ہے۔ اسی میں ان مضامین کے عنوانات کا بھی اگر اضافہ کر دیا جائے، جو وقتاً فو[قتاً] ہندوستان پاکستان کے رسائل میں لکھے گئے ہیں تو ممکن ہے کہ اس ببلیوگرافی کے مرتب کو پاکستان کی کسی یونیو[رسٹی] سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی مل جائے۔ لیکن "اقبالیات" کے اس انبار در انبار میں خال خال ہی کتابیں ملتی ہیں جو سنجیدہ مطالعے کی مستحق ہیں۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی "اقبال کے آخری دو سال" بھی اسی قبیل کی کتاب ہے جو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کو پڑھتے وقت قاری کو، اگر وہ مسلم لیگی نہیں رہا ہے [تو] بعض جگہ جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوتی ہے اور کہیں کہیں وہ ان نتائج سے اختلاف بھی کرتا ہے، جو مؤلف نے اخذ کئے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بہ حیثیت مجموعی کتاب سے قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔

عاشق حسین بٹالوی نے اس کتاب میں بڑی محنت و کاوش سے اقبال کی زندگی کے آخری دو سال، سیاسی الجھنوں کا حال اپنی معلومات اور ذاتی تجربے کی بنا پر تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ "الجھنوں" لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں اقبال جس سیاسی راہ پر گام زن رہے، اس میں پھول کہیں بھی نہیں تھے۔ کانٹے ہی کانٹے تھے، جن کی خلش نے بالآخر ان کا کام ہی تمام کر دیا۔ یہی اس کتاب کا حقیقی موضوع بھی ہے۔

مؤلف کے بیان کے مطابق اس داستان سرای کے اہتمام سے ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ "اقبال نے اپنے آخری دو برسوں میں پنجاب مسلم لیگ کی تحریک کو فروغ دینے اور مسٹر جناح کی مہم کو کامیاب بنانے کے

جو کچھ کیا تھا" اس کی ایک جامع اور مستند روئیداد مرتب کردی جائے"۔ ان دو برسوں میں اقبال پنجاب مسلم لیگ کے صدر رہے تھے" اور عاشق بٹالوی اس کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ چنانچہ جب ان سے درخواست کی گئی کہ "اقبال کے آخری دو برسوں کی سرگزشت آپ کیوں نہیں لکھ ڈالتے" تو اس خدمت کو انجام دینے کے لئے وہ تیار ہوگئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عاشق بٹالوی نے حسن وخوبی کے ساتھ یہ خدمت انجام دی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ انھوں نے عام پاکستانی ذہن کے پیچ وخم کو نظر انداز کرکے اور بہت سی مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر بڑی بے باکی وبے لاگی سے یہ داستان دہرائی ہے۔ اور اسی ضمن میں انھوں نے پنجاب کی چوتھائی صدی کی سیاسی تاریخ (۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۸ء) بھی مرتب کر ڈالی ہے، جو اس تفصیل کے ساتھ اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ "پس منظر" ہے جو سات ابواب پر مشتمل اور ۲۸۱ صفحات پر پھیلا ہے۔ مولف نے اس حصہ میں سر مائیکل او ڈائر کے گورنر پنجاب مقرر کئے جانے کے وقت (۱۹۱۳ء) سے لے کر "انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء" کے نفاذ تک کے سیاسی حالات کا احاطہ کرلیا ہے۔ جلیان والا باغ کی خوں چکاں داستان سے "پس منظر" کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد یونینسٹ پارٹی، مجلس احرار، مسجد شہید گنج اور اتحاد ملت کی تحریکوں کے علاوہ جن افراد سے ہماری ملاقات ہوتی ہے، ان میں سر فضل حسین، سر محمد شفیع، سر سکندر حیات، سر چھوٹو رام، راجا نریندر ناتھ، سر فیروز خاں نون، نواب ممدوٹ اور ملک برکت علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ طویل پس منظر حقیقتاً سر فضل حسین کے گرد گھومتا ہے، جو "سولہ سال پنجاب کی سیاست پر حاوی رہے"، اور جنھوں نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک "پورے ہندوستان کی سیاست کو اپنی خواہش اور اپنی مرضی کے مطابق چلایا۔ ان کے بڑے بڑے حریف بھی ان کے سامنے مات کھا جاتے تھے" (ص ۲۶۳)

انہی سر فضل حسین نے ۱۹۲۹ء میں "مسلم کانفرنس" کی طرح ڈالی، جو مسلمانان ہند کی سیاسی تاریخ میں اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ نئی دلی اور لندن کے سرکاری حلقوں نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء تک صرف مسلم کانفرنس ہی کو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت تسلیم کیا تھا۔ اس مسلم کانفرنس کی:

"باگ ڈور میاں فضل حسین کے ہاتھ میں تھی۔ اور اب وہی پس پردہ بیٹھ کر مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کی تشکیل کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی اثر ورسوخ سے کام لے کر [نظام] حیدرآباد دکن، اور سر آغا خاں سے بہت بڑی رقمیں حاصل کیں[1] اور اس روپے کو نشر واشاعت پر صرف کیا۔ انگلستان اور ہندوستان میں بعض آدمیوں کو معقول تنخواہ دے کر تحریری پراپگنڈے پر مامور کیا۔ ہندوستان خصوصاً پنجاب کے چند اردو اور انگریزی اخباروں کے بیش قرار وظائف مقرر کئے اس کے علاوہ ایک مرکزی بورڈ قایم کرکے نہایت ہوش مندی سے پبلسٹی کا کام شروع کیا۔ بعض

[1] عاشق بٹالوی نے یہ بات سر فضل حسین کی اس سوانح عمری کے حوالے سے نقل کی ہے جو ان کے بیٹے میاں عظیم حسین نے مرتب کی ہے۔

لیڈروں کو بھی مالی امداد دی گئی۔ اس طرح ایک باضابطہ اور مرتب شدہ اسکیم کے تحت کانفرنس کی قرارداد ہوئی، اس کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں پر کھلے دل سے روپیہ صرف ہونے لگا۔ ہر چھ مہینے کے بعد کسی نہ کسی مقام پر کانفرنس کا اجلاس بھی منعقد کر دیا جاتا تھا۔ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، علامہ اقبال، سر محمد یعقوب، سیٹھ عبداللہ ہارون، سر محمد شفیع، نواب اسمٰعیل خاں اور سر عبدالرحیم وغیرہ کانفرنس کی ذمہ دار شخصیتیں تھیں۔ کانفرنس کی تمام جزئیات سر فضل حسین کے ایما و مشورے سے طے ہوتی تھیں، اور جب تک وہ کسی پروگرام کی منظوری نہ دے دیتے۔ کانفرنس اس کو اختیار نہ کرتی تھی۔ سر فضل حسین کی سیاسی بصیرت کا کمال ہے کہ وہ حکومت ہند کے رکن کی حیثیت سے وائسرائے کو بار بار کانفرنس کی سرگرمیوں کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے، اور آہستہ آہستہ انھوں نے وائسرائے اور حکومت ہند کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ مسلم کانفرنس اسلامیان ہند کی تنہا نمائندہ جماعت ہے" (ص ۳۲۶-۳۲۷)

مسلم کانفرنس کی یہی "ذمے دار شخصیتیں" جن میں اس کتاب کے مرکزی کردار ڈاکٹر اقبال کا نام بھی شامل ہے سر فضل حسین کے انتقال کے بعد مسٹر جناح کے دست و بازو بنیں۔ عاشق بٹالوی نے بھی، براہ راست تو نہیں، لیکن بین السطور میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"اقبال کے آخری دو سال" کی داستان کو جو اس کتاب کا اصل موضوع ہے چھیڑتے ہوئے عاشق بٹالوی لکھتے ہیں کہ:

"۲۹ راپریل ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح لاہور تشریف لائے اور احمد یار خاں دولتانہ کے یہاں قیام پذیر ہوئے ...... مسٹر جناح کی تشریف آوری کا مقصد یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد بمبئی کے مطابق پنجاب میں بھی ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے۔ یکم مئی کو مسٹر جناح سر فضل حسین سے ان کے گھر پر جا کر ملے ...... جناح اور فضل حسین کی گفتگو دیر تک جاری رہی ...... اس بحث و مباحثہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا" (ص ۳۰۴-۳۰۶)

اس جگہ یہ ظاہر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۳۶ء تک مسٹر جناح لبرل نیشنلسٹ سمجھے جاتے تھے۔ سنٹرل اسمبلی میں وہ اس سوراج پارٹی کا ساتھ دیا کرتے تھے جو کانگریس کی پارلیمنٹری پارٹی تھی۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر حکومت کے حلقوں اور حکومت پرست طبقوں میں ان کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان حالات میں مسٹر جناح کے ساتھ سر فضل حسین کا تعاون نہ کرنا، قطعاً حیرت ناک نہیں ہے۔ سر فضل حسین اور ان ہی کے قسم کے دوسرے حضرات سے مایوس ہونے کے بعد مسٹر جناح نے اقبال کی طرف رخ کیا۔ عاشق بٹالوی لکھتے ہیں:

"یہ صورت حال تھی جب مسٹر جناح علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں

کافی پریشان تھے۔ ان کی صحت خراب ہو چکی تھی اور وہ بیماری جس نے بعد ازاں مرض الموت کی شکل اختیار کر لی، شروع ہو چکی تھی..... جب ان دو عظیم المرتبت انسانوں کی ملاقات ہوئی تو اس وقت میرے مرحوم دوست فضل کریم درانی بھی موجود تھے .... درانی مرحوم نے ایک مرتبہ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بڑا ہی دلچسپ نقشہ کھینچا تھا۔ کہنے لگے "مسٹر جناح اپنی روایتی جامہ زیبی اور خوش پوشاکی کا ایک دل آویز مرقع بنے ہوئے تشریف لائے۔ اعلیٰ درجے کی ولایتی دوکان کا سلا ہوا ایک بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی درویشی و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جسم پر سوائے بنیائن اور دھوتی کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے امداد کا وعدہ کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے۔ تو یہ جنس میرے پاس نہیں ہے۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔"

"درانی مرحوم کی روایت ہے کہ یہ سنکر مسٹر جناح کرسی سے دو انچ اوپر اٹھے اور بڑے جوش کے ساتھ کہنے لگے 'مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے'۔"

اقبال کے آخری دو سال کے تلخ تجربات جو اس کتاب کے مولف نے ترشی کے ساتھ قلم بند کئے ہیں، مسٹر جناح کے اس دعوے کی تکذیب کرتے ہیں کہ انھیں "صرف عوام کی مدد درکار" تھی، اور اس کتاب میں قدم قدم پر اس کی شہادتیں ملتی ہیں کہ اقبال کا یہ خدشہ بے بنیاد نہ تھا کہ مسٹر جناح کو اودھ کے تعلقہ داروں اور بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں ہی کی قسم کے لوگوں کی پنجاب میں بھی تلاش تھی۔ اس عبرت ناک داستان کو جو اس کتاب کے ۹۶ ۳ صفحات میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ مسلم لیگ کی تحریک کا دیباچہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ جو ۱۹۳۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند پر ختم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی، جس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ان واقعات کا راوی خود اس "المیہ" کا ایک اہم کردار تھا۔ اور دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ مولف نے اپنے بیانات کی تائید میں دستاویزی ثبوت بھی فراہم کئے ہیں۔

اس کتاب کے مولف عاشق بٹالوی ۱۹۳۶ء سے پہلے سیاست سے کوئی عملی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جب ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو ایک پرانے مسلم لیگی بزرگ ملک برکت علی کی "دوستی دنیا زمندی" ان کو بھی کھینچ کر مسلم لیگ میں لے گئی۔ ابتدا میں وہ اس کے لئے لینے کو آمادہ نہ کر سکے۔ لیکن بالآخر "ملک صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ چناں چہ ۱۲ مئی [۱۹۳۶ء] کو میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا کے مکان بیرون یکی دروازہ پر جب مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تو "عاشق بٹالوی کے نام بھی شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ جلسہ کی صدارت کے لئے علامہ اقبال بنفس نفیس تشریف لائے تھے، اور انھیں ہی کی صدارت میں

چار قراردادیں منظور ہوئیں، پہلی قرارداد یہ تھی کہ پنجاب مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم کی جائے اور اصحاب ذیل کو صوبہ لیگ کے عہدے دار مقرر کیا جائے۔ صدر: علامہ اقبال، نائب صدر: ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین سکریٹری: غلام رسول بیرسٹرایٹ لا، جائنٹ سکریٹری: میاں عبدالمجید بیرسٹرایٹ لا۔ اور عاشق حسین بٹالوی۔" (ص ۳۱۴-۳۱۵)

۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں پنجاب "مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے سات امیدواروں میں صرف دو کامیاب ہوئے یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خاں...... لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ راجہ غضنفر علی خاں نے اپنی کامیابی کے بعد بورڈ کے دفتر کی طرف قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کے بجائے وہ سیدھے یونینسٹ پارٹی کے جلسے میں پہنچے اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ترک کر کے یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے۔" (ص ۳۶۸)

۱۹۳۷ء کے انتخابات جو انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت عمل میں آئے تھے، ہندوستان کی تاریخ آزادی کے لئے ایک اہم موڑ ثابت ہوئے۔ کانگریس نے بھی ان انتخابات میں حصہ لیا اور خود اپنی توقعات سے کہیں زیادہ اس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ ہندستان کے گیارہ صوبوں میں سے چھ میں کانگریس کی اکثریت ہی نہیں بلکہ غیر معمولی اکثریت تھی۔ انتخابات سے قبل عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کانگریس نے اگر وزارت بنائی تو اسے مسلم لیگ کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا پڑے گا۔ مسٹر جناح کو بھی اس کا یقین تھا لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ کانگریس کو اپنی بھاری اکثریت کے پیش نظر اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ وزارت بنانے کے لئے کسی اور پارٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ اس صورت حال نے ہندستان کی سیاسی تاریخ میں ایسی الجھن پیدا کی جو پھر سلجھ نہ سکی۔ وہائٹ ہال اور نئی دلی کے سرکاری حلقوں نے، اپنی مصلحتوں کے پیش نظر، اس گتھی کو اور بھی الجھا دیا۔

۱۹۳۶ء تک مسٹر جناح ہندوستان و انگلستان کے سرکاری حلقوں میں معتوب تھے۔ اگرچہ اُس پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس میں ان کو مدعو کیا گیا تھا، جس کے بیش تر بلکہ تمام تر ممبر، بہ استثنائے چند خطاب یافتہ اور ایسے لوگ تھے جن کے مفاد حکومت سے براہ راست وابستہ تھے۔ اس مجمع میں مسٹر جناح بھی اپنے کو بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ لاہور کی ایک تقریر میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ۱۹۳۶ء میں خود انھوں نے کہا تھا کہ:

"میں گول میز کانفرنس میں بالکل یکہ و تنہا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو ناراض کیا، کیوں کہ وہ مجھے مخلوط انتخاب کا حامی سمجھتے تھے۔ ہندو مجھ سے الگ ناراض تھے۔ کیوں کہ میں چودہ نکات کا موجد تھا۔ میں نے والیان ریاست کو بھی ناراض کیا۔ کیوں کہ میں ان کی پس پردہ اور خفیہ کارروائیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ اور میں نے ان کو بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ برطانوی

پارلیمنٹ بھی مجھ سے ناراض تھی۔ کیوں کہ میں نے ابتدا ہی میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ کانفرنس بہت بڑا فریب ہے اور میں کسی شرط پر بھی حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہفتے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ کانفرنس کے مندوبین کے ہجوم میں میرا ایک بھی حامی و مددگار نہ تھا۔" (ص ۲۶۳)

مسٹر جناح کا یہ بیان یقیناً صحیح ہے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ تیسری گول میز کانفرنس کے مدعوئین کی فہرست جب شائع ہوئی تو اس میں مسٹر جناح کا نام نہ تھا۔ اس نے ان کے اندر انگریزوں کے خلاف اور زیادہ تلخی پیدا کی ہوگی۔ یہ اس زمانے کا تھا جب مسٹر جناح نے ہندستان کی سکونت ترک کر کے انگلستان میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس واقعے کے بعد ہی ہندستان واپس آنے اور ملکی سیاست میں عملی حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

مسٹر جناح نے ہندستان واپس آنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں جب مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم شروع کی تو ہندستان و انگلستان کے سرکاری حلقوں نے، قدرتی طور پر اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ کیوں کہ حکومت کے حق میں یہ مفید نہیں تھا کہ مسلم لیگ کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو جسے حکومت کا اعتماد حاصل نہ ہو۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سر فضل حسین اور ان ہی جیسے دوسرے "سرکاری مسلم لیڈروں" نے مسٹر جناح کے ساتھ تعاون کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ "یو۔پی سے نواب صاحب چھتاری سر محمد یوسف اور نواب زادہ لیاقت علی خاں [مسلم لیگ کے] مرکزی بورڈ کے ممبر نامزد کیے گئے تھے۔ لیکن اب ان تینوں نے بورڈ سے استعفیٰ دے دیا، اور مسلم لیگ کی بجائے نیشنل ایگری کلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یو۔پی کی یہ ایگری کلچرل پارٹی۔ گویا پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا مثنیٰ اور ہم زاد تھی۔" (ص ۳۵۷)۔ لیکن ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد جب کانگریس اور مسٹر جناح کے اختلافات نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ تو حکومت نے ان اختلافات کو "غیبی امداد" سمجھ کر ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دلی اور لندن کے برطانوی حلقے مسٹر جناح کی ضدی طبیعت اور ان کی انانیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان حلقوں کو اس کا بھی بہ خوبی احساس تھا کہ کانگریس نے مسٹر جناح کی آنا کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ اور اگر اس وقت پر کاری سے کام لیا جائے تو اُن کے زخم کو ناسور بنا کر کانگریس کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی نئے احساس نے مسٹر جناح کے باب میں حکومت کا رویہ یک سر بدل دیا۔ عاشق بٹالوی اور دوسرے حضرات اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی "سرکاری" ماہیت قلب" نے سر سکندر اور نواب زادہ لیاقت جیسے "سرکاری مسلمانوں" کو مسٹر جناح کی طرف مائل کر دیا تھا اور اس کے بعد ہی پنجاب میں ـــــــ

"یونینسٹ پارٹی کے بعض ذمے دار ارکان نے مسٹر جناح کی تعریف و توصیف شروع کر دی۔

چناں چہ حکومت پنجاب کے چیف پارلی منٹری سکریٹری میاں احمد یار خاں دولتانہ نے اس تعریفی ہم کا آغاز کرتے ہوئے لکھا کہ ...... "پنجاب کے تمام مسلمان آل انڈیا مسائل میں مسٹر جناح کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر بالکل آمادہ ہیں......" (ص ۴۷۷)

یہ وہی احمد یار خاں دولتانہ ہیں جن کے دولت کدے پر مسٹر جناح نے اس وقت قیام کیا تھا جب پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے لاہور گئے تھے۔ لیکن دو تین دن قیام کرنے کے بعد ان کے گھر سے "مسٹر جناح ہوٹل اٹھ آئے تھے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ احمد یار خاں دولتانہ یونینسٹ پارٹی کے چیف سکریٹری تھے اور .... مسٹر جناح نے ان کے .... یہاں ٹھہرنا مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا" (ص ۳۱۰-۳۱۱) لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ عاشق بٹالوی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"کانگریس کے ہندوستان گیر نظام کا جواب صرف آل انڈیا مسلم لیگ کا ہندوستان گیر نظام ہی ہوسکتا تھا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق اور پنجاب میں سر سکندر حیات آہستہ آہستہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے جا رہے تھے" (ص ۴۷۸)

لیکن فضل الحق اور سر سکندر کا یہ جدید احساس "خود آگاہی" کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ حکومت کا پیدا کردہ تھا۔ جہاں تک فضل الحق کا تعلق ہے وہ زندگی بھر تھالی کا بیگن رہے۔ جدھر وزن زیادہ ہوا ادھر لڑھک گئے لیکن سر سکندر تو ان لوگوں میں تھے جو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کے لئے بھی حکومت کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا وہ ہنگامہ خیز اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جس نے مسلم لیگ کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ اس اجلاس کی تفصیلات ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ کیوں کہ زیر نظر کتاب کے مؤلف نے اس سلسلے میں صرف وہی واقعات قلم بند کئے ہیں جن کا پنجاب مسلم لیگ سے براہ راست تعلق ہے۔

"مسلم لیگ کے اس اجلاس میں پنجاب کے اکثر لوگ شریک ہوئے تھے...... یونینسٹ پارٹی کا جوت کر لکھنؤ پہنچا تھا، اس میں سر سکندر، ملک خضر حیات خاں ٹوانہ، میاں عبد الحیٔ، نواب نثار علی خاں، میاں احمد یار خاں دولتانہ، راجہ غضنفر علی خاں، میاں امیر الدین، بیگم شاہ نواز، سید امجد علی، نواب زادہ خورشید علی خاں، میر مقبول محمود، سید افضال علی، نواب ممدوٹ، میاں غیاث الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں" (ص ۴۸۵)

اکتوبر ۱۹۳۷ء کے اخبارات کی اگر ورق گردانی کی جائے تو ایک بات اور معلوم ہوگی، جس کی طرف اس کتاب میں اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سرکاری قسم کے جن مسلمان لیڈروں نے مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں شرکت کی تھی۔ ان میں سے اکثر نے لکھنؤ جاتے ہوئے دلی میں قیام کرکے وائسرائے سے ملنا بھی ضروری سمجھا تھا۔ ان میں سے ایک نام آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ اور وہ نام سر سکندر حیات کا ہے۔

مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کا شاندار کارنامہ وہ معاہدہ کہا جاتا ہے جو جناح اور سکندر حیات کے درمیان ہوا اور جو مسلم لیگ کی تاریخ میں "جناح سکندر پیکٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ مسٹر جناح نے لیگ کونسل کے اجلاس میں جب اس معاہدے کا اعلان کیا تو "پنڈال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسرت و شادمانی کی ایک لہر طاری" ہو گئی۔

"مسٹر جناح نے کھڑے ہو کر سر سکندر کو خوش آمدید کہا، اور فرمایا کہ سر سکندر نے اعلان کیا ہے کہ وہ اور ان کی جماعت کے تمام ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔ مسٹر جناح کے اس ارشاد پر پھر پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور حاضرین کے چہروں پر ایک ایسی مسرت و طمانیت کے آثار نظر آنے لگے، جیسے میدان جنگ میں تازہ دم کمک کے پہنچ جانے سے تھکی ہوئی فوج کے اندر نئی زندگی کی رو دوڑ جاتی ہے۔ (ص ۴۸۷)

اسی جناح سکندر پیکٹ کے متعلق عاشق بٹالوی لکھتے ہیں کہ:

"یہ ایک ایسی تحریر تھی جس کے نتائج بڑے افسوس ناک ثابت ہوئے...... اسی تحریر نے لیگ کو ایک عوامی جماعت بننے سے روک دیا۔ اسی تحریر نے مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بننے پر مجبور کر دیا" (ص ۴۸۲)

اس معاہدے کی پہلی اور اہم ترین شق یہ تھی کہ

"سر سکندر حیات واپس پنجاب جا کر اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس منعقد کریں گے۔ جس میں پارٹی کے ان تمام مسلمان ممبروں کو، جو اب تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے ہیں، ہدایت فرمائیں گے کہ وہ مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اندریں حالات آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے۔"

اور آخری شق یہ تھی:

"مذکورہ بالا معاہدے کو مد نظر رکھتے ہوئے پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل از سر نو عمل میں آئے گی۔"

اس معاہدے کی مندرجہ بالا دونوں دفعات ڈاکٹر اقبال اور ان کی صوبائی مسلم کے لئے بے حد پریشان کن ثابت ہوئیں۔ سر سکندر نے پہلی دفعہ پر سرے سے عمل نہ ہونے دیا، اور دوسری دفعہ پر عمل درآمد کرا کر ڈاکٹر اقبال کی پارٹی کو پنجاب مسلم لیگ سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ اور حیرت ناک یہ ہے کہ اس معاملے میں مسٹر جناح نے بھی سر سکندر ہی کا ساتھ دینا عین مصلحت سمجھا۔

اس کتاب میں ڈاکٹر اقبال صدر پنجاب مسلم لیگ، ملک برکت علی نائب صدر اور غلام رسول خاں سکریٹری پنجاب مسلم لیگ کے متعدد خط نقل کیے گئے ہیں۔ جن میں مسٹر جناح کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ

سر سکندر اور ان کے رفقا مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط تو کرتے نہیں ہیں لیکن پنجاب مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی شاخ بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک خط میں ڈاکٹر اقبال تشویش کے ساتھ مسٹر جناح سے پوچھتے ہیں:

"سکندر حیات خاں کل مجھ سے ملنے آئے تھے ..... کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے اس بات پر رضامندی کا اظہار فرمایا تھا کہ لیگ پراونشل پارلی منٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا؟ سر سکندر مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ اس بارے میں اپنی ضمنی منظوری دے چکے ہیں، اور اسی بنا پر وہ اصرار کر رہے ہیں کہ [مسلم لیگ پارلی منٹری] بورڈ کے ارکان میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیئے ......"

ایک دوسرے خط میں ڈاکٹر اقبال مسٹر جناح کو مطلع کرتے ہیں کہ:

"سر سکندر اور ان کے احباب سے متعدد ملاقاتیں کرنے کے بعد میں قطعی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ گیا ہوں کہ سر سکندر مسلم لیگ اور پراونشل پارلی منٹری بورڈ پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے ہیں ..... وہ کہتے ہیں کہ لیگ کے تمام عہدے داروں میں ان کے حسب منشا رد و بدل کیا جائے وہ خصوصیت سے موجودہ سکریٹری کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں ...." (ص ۵۲۱-۵۲۲)

افسوس ہے کہ اس کتاب میں مسٹر جناح کے جوابات نقل نہیں کئے گئے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتا کہ سر سکندر کے ان مطالبات کے متعلق خود ان کی رائے کیا تھی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں، جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ جو مسٹر جناح کے دست راست بن چکے تھے، ان کی ساری ہمدردیاں سر سکندر حیات اور ان کی پارٹی کے حق میں محفوظ ہو چکی تھیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے عاشق بٹالوی لکھتے ہیں کہ:

"ان کی اعانت اور تائید و حمایت کلیتہً سر سکندر کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا، وہ ہر موقع پر سر سکندر کی مدد اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔ اس دوران میں کئی بار ایسے مواقع پیش آئے کہ ہم راستی پر تھے اور سر سکندر کا رویہ غلط تھا۔ مگر نواب زادہ صاحب مرحوم نے ہمیشہ سر سکندر کا ساتھ دیا۔" (ص ۶۱۸)

اس کتاب میں جو واقعات قلمبند کئے گئے ہیں اگر ان کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو وہ اس امر کی نشان دہی کریں گے کہ سر سکندر کے باب میں مسٹر جناح کا رویہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے رویئے سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اس باب میں عاشق بٹالوی نے سکوت اختیار کیا ہے، لیکن جو واقعات انھوں نے بیان کئے ہیں وہ اس کی غمازی کرتے ہیں کہ مسٹر جناح سر سکندر کو ناخوش نہ کرنے ہی کو مصلحت سمجھتے تھے۔ مثلاً یہ واقعہ:

"جب علامہ اقبال کی مسلسل کوششوں کے باوجود سر سکندر اور ان کی جماعت

نے مسلم لیگ کے قرطاس رکنیت پر دستخط نہ کئے، تو ڈاکٹر صاحب بالکل مایوس ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے یہ محسوس کر کے کہ عوام کو حقیقت سے آگاہ کرنا ضروری ہے، فروری ۱۹۳۸ء میں ذیل کا بیان غلام رسول خاں [جنرل سکریٹری پنجاب مسلم لیگ] کو لکھوایا اور حکم دیا کہ اسے فوراً اخبارات کو بہ غرض اشاعت بھیج دیا جائے۔" (ص ۶۱۹)

متذکرہ بالا طویل، "زبردست اور معرکتہ الآرا" بیان کا صرف ایک جملہ نقل کیا جا رہا ہے، جس سے اقبال کے جذبات واحساسات اور ان کے غم و غصے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"میں اعلان کرتا ہوں کہ معاہدۂ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اب تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں یہ بیان شائع کر رہا ہوں تاکہ مسلمانانِ پنجاب کو معلوم ہو جائے کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔"

(ص ۶۲۰ - ۶۲۲)

"غلام رسول اور ملک برکت علی کی رائے تھی کہ اشاعت سے پہلے اس بیان کی ایک نقل مسٹر جناح کو بھیج دی جائے تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ہم یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک نقل مسٹر جناح کو دہلی بھیج دی گئی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی وہیں تھے۔ انھوں نے مسٹر جناح کو مشورہ دیا کہ سر سکندر حیات سے بگاڑ کر لینا اچھا نہیں۔ چناں چہ مسٹر جناح کا جواب آ گیا کہ سر دست یہ بیان شائع نہ کیا جائے۔" (ص ۶۲۳)

یہ تھا مسٹر جناح کا رویہ سر سکندر اور یونینسٹ پارٹی کے مقابلے میں ڈاکٹر اقبال اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے عہدے داروں کے ساتھ۔ اس رویئے کا اور زیادہ عریاں مظاہرہ ایک دوسرے جبر تناک واقعے سے ہوتا ہے، جس کو قلم بند کرنے ہی کے لئے شاید یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

"۱۱ر مارچ ۱۹۳۸ء کو پنجاب مسلم لیگ کا ایک ضروری اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں ہوا تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے نوے ممبر منتخب کئے جائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چناں چہ نہایت خوش اسلوبی سے نوے آدمیوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ یونینسٹ پارٹی کے کسی آدمی نے اب تک مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کئے تھے، اور نہ اس پارٹی کا کوئی رکن اب تک کسی ضلع مسلم لیگ کا ممبر بنا تھا۔ اس لئے ان نوے آدمیوں میں ایک بھی یونینسٹ شامل نہ تھا۔

(ص ۶۱۷)

"سر سکندر کو [قدرتاً] اس واقعے سے سخت تشویش لاحق ہوئی تھی۔ اگر یہ صورت قائم رہتی تو گویا آل انڈیا مسلم لیگ سے سر سکندر حیات اور ان کے رفقا یک قلم خارج کر دیئے جاتے۔ ۔ ۔

کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست مسترد کر دی جائے۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں ان کی اپنی نامزدگی کا دروازہ کھل سکے ......

" لاہور میں کئی روز سے افواہ پھیل رہی تھی کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست نامنظور ہوئی ...... حتیٰ کہ یہ خبر ڈاکٹر صاحب تک پہنچ گئی ...... جب پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر نے یہ بات مشہور کی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لیگ کے الحاق یا عدم الحاق کی اطلاع، ہم سے بالا بالا، یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں کیوں کر پہنچ سکتی تھی۔

" [بالآخر] آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری [نواب زادہ لیاقت علی خاں] کی طرف سے ہمیں باضابطہ اطلاع موصول ہو گئی کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست منظور نہیں کی جا سکتی " (ص ۶۲۳ - ۶۲۷)

ڈاکٹر اقبال پر اور پنجاب مسلم لیگ کے دوسرے عہدے داروں اور ممبروں پر اس خبر کا جو اثر ہوا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس کتاب کے مؤلف اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری عاشق بٹالوی کے بیان کے مطابق اس خبر کا پہلا رد عمل یہ ہوا کہ :

" بہ طور احتجاج مسلم لیگ سے مستعفی ہو جانا چاہیے تاکہ نواب زادہ لیاقت علی خاں اپنی پسند کے آدمیوں کی مدد سے پنجاب میں مسلم لیگ کی جیسی شاخ چاہیں قائم کر لیں۔ لیکن پھر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یہ رویہ قومی مصلحت کے خلاف ہے۔" (ص ۶۲۹)

نواب زادہ لیاقت علی خاں کا متذکرہ بالا خط ۵ راپریل کو پنجاب مسلم لیگ کے دفتر میں موصول ہوا۔ اس سلسلہ میں ملک برکت علی نائب صدر پنجاب مسلم لیگ نے ایک طویل خط مسٹر جناح کو لکھا جس کے ایک ایک لفظ سے غم و غصہ کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں :

" ہمیں اور لیگ کے تمام کارکنوں کو سب سے زیادہ تکلیف اس بات سے ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے لوگ کئی روز سے شور مچا رہے تھے کہ ہماری لیگ کا الحاق نہیں ہوگا۔ آخر کار ان کی بات درست نکلی۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ نے وہی کیا جو یونینسٹ پارٹی چاہتی تھی ......

" ہم محسوس کر رہے ہیں کہ آپ کو ابھی تک یہ امید ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا لیڈر آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ ہم ہر ممکن طریقے سے آپ پر یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ سر سکندر کبھی بھی پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائیں گے ...... ستم ہے کہ ہمارے پیہم انتباہ کے باوجود وہ آپ کو قایل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ....

آپ کو اب ہماری چندل ضرورت نہیں رہی تو ہمیں آپ سے قطعاً کوئی شکایت نہیں۔ لیکن ہم یہ تو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری اس لیگ کا الحاق نامنظور کر دیا جائے .... جس کے ممبروں کی فہرست میں ڈاکٹر سر محمد اقبال ایسے عظیم المرتبت اور ہندوستان گیر شہرت کے آدمی کا نام بھی موجود ہے .....

میں اسی موقع پر خاموش رہنا بزدلی سمجھتا ہوں۔ کونسل کے ممبروں کی جو فہرست ہم نے بھیجی تھی اسے نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ہے، اور ان لوگوں کو کونسل میں نامزد کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے لیگ کے بدترین دشمن ہیں.... یقین کیجیے کہ آپ ان لوگوں پر اعتماد کر رہے ہیں جو اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ ہمیں آپ کی رائے پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ آپ بڑی خوشی سے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن خدارا ہمیں قربانی کا بکرا نہ بنائیے .... ہماری لیگ کے الحاق کا استرداد کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے کہ ہم خاموشی سے اس ذلت کو برداشت کر لیں ..... براہ کرم ہمارے تلخ و ناملایم الفاظ کو معاف کر دیجیے گا۔ ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ اس قدر تکلیف دہ ہے کہ معمولی صبر و ضبط سے کام نہیں لیا جا سکتا۔" (ص ۶۳۰ - ۶۳۵)

ڈاکٹر اقبال کے دل و دماغ نے اس "سانحے" کے جو اثرات قبول کیے ہوں گے۔ اس کتاب سے اس کا براہ راست علم ہم کو نہیں ہوتا۔ لیکن واقعات کی کڑیاں اگر ملائی جائیں تو صحیح نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہ ہوگا اس واقعے کے بعد اقبال کی زندگی دو ہفتے سے زیادہ وفا نہ کر سکی۔ انہوں نے اس سلسلے میں مسٹر جناح کو خط لکھنا بھی غیر ضروری سمجھا۔ اس واقعے کے بارہ دن بعد کلکتے میں مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس ہونے والا تھا۔ اقبال نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو حکم دیا کہ "کلکتے جا کر اپنی جنگ خود لڑو"۔ مسافران کلکتہ ڈاکٹر اقبال سے رخصت ہونے کے لئے جب ان کے گھر پہنچے تو اس وقت۔

"ڈاکٹر صاحب آنکھیں بند کئے ہوئے پلنگ پر لیٹے تھے۔

"غلام رسول نے عرض کیا کہ 'ہم لوگ شام کو کلکتے جا رہے ہیں'۔

"ڈاکٹر صاحب نے فرمایا 'ضرور جاؤ اور اپنے حق کے لئے آخر تک لڑو'۔

"ملک برکت علی نے کہا 'اگر ہماری نئی درخواست بھی منظور نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟

"ڈاکٹر صاحب کی طبیعت خراب تھی، لیکن انہوں نے کسی قدر جوش سے فرمایا 'کچھ فکر نہیں، درخواست منظور ہو یا نامنظور، جس اصول پر ہم نے اب تک کام کیا ہے، آئندہ بھی جاری رہے گا'

"جب ہم رخصت ہونے لگے تو فرمایا 'کسی کی پروا نہ کرنا'" (ص ۶۳۷ - ۶۳۸)

مندرجہ بالا مکالمہ اقبال کے جذبات و احساسات کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ ان کی آخری ہدایت "کسی کی پروا نہ کرنا" میں "کسی" کا اشارہ مسٹر جناح ہی کی طرف ہو سکتا ہے اور اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں عاشق بٹالوی نے لیاقت علی خان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور مسٹر جناح سے بھی آنکھیں

میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں۔ عاشق بٹالوی لکھتے ہیں کہ :

" ۱۷ اکتوبر کو وقت مقررہ پر کونسل کا اجلاس شروع ہوا ...... نواب زادہ لیاقت علی خاں نے پہلے گزشتہ اجلاس کی رپورٹ سنائی۔ پھر صوبائی لیگیوں کے الحاق کا مسئلہ زیر بحث آیا تو کئی ایسی لیگوں کی درخواستیں منظور کر لی گئیں جن کا وجود محض کاغذی تھا اور جن کا کوئی آئین نہ تھا.... لیکن جب پنجاب کی طرف سے الحاق کی درخواست پیش کی گئی تو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مخالفت کی اور کہا کہ درخواست منظور نہیں کی جاسکتی۔

" میں اسی موقع کا منتظر بیٹھا تھا۔ میں نے اسی وقت کھڑے ہو کر سوال کیا کہ ہماری درخواست نامنظور کئے جانے کی وجہ کیا ہے؟

" نواب زادہ صاحب نے کسی قدر تحکمانہ انداز میں فرمایا 'بیٹھ جاؤ'۔

" میں نے عرض کیا میں اسکول کا طالب علم نہیں ہوں اور نہ آپ اسکول ماسٹر ہیں کہ مجھے یوں بیٹھ جانے کا حکم دیں'

" اس پر بگڑ کر بولے : کیا لاہور سے ہماری بے عزتی کرنے یہاں آئے ہو؟

" میں نے جواب دیا : میں آپ کی بے عزتی کرنے تو نہیں آیا لیکن اپنی بے عزتی کرانے بھی نہیں آیا

" مسٹر جناح یہ سب کچھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر پوچھا 'چاہتے کیا ہو؟

" میں نے عرض کیا۔ پنجاب مسلم لیگ کا الحاق۔

" فرمایا 'تم میں سے ایک آدمی یہاں آکر اپنا معاملہ پیش کرے۔

" چنانچہ ملک برکت علی نے پلیٹ فارم پر جاکر تقریر شروع کی' ان کی تقریر ختم ہوئی تو پورا ایوان ہمارا ہم خیال اور معاون بن گیا لیکن مسٹر جناح نے ۲۴ گھنٹے کی مہلت طلب کی اور فرمایا کہ 'سر سکندر آج شام کی گاڑی سے کلکتے آرہے ہیں۔ کل صبح اس بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔"

دوسرے دن سر سکندر سے مشورہ کرنے کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ سنایا کہ

" پنجاب میں ایک نئی پراونشل مسلم لیگ قائم کی جائے گی۔

" غلام رسول خاں نے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ ہمارے الحاق کی درخواست کا کیا حشر ہوا؟ لیکن مسٹر جناح نے جواب دیا کہ گڑے مردے اکھاڑنے کا کچھ فائدہ نہیں۔

" اب کلکتے میں مزید قیام بیکار تھا ......" (ص ۶۳۹-۶۴۰)

۱۹ اپریل کی صبح کے اخبارات نے اس آخری معرکے کی ناکامی کی خبر ڈاکٹر اقبال کو بھی سنادی ہوگی اور یہ آخری فیصلہ ان کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس لڑائی کی پوری تفصیلات معلوم کرنے کے لئے دو دن بھی زندہ نہ رہ سکے۔ عاشق بٹالوی لکھتے ہیں کہ :

"کلکتہ سے لاہور تک کا طویل اور صبر آزما سفر اچھی خاصی کوفت میں کٹا۔ غلام رسول خاں کے مزاج میں غصہ زیادہ تھا۔ وہ راستے میں بار بار کہتے تھے کہ اب پنجاب میں مسلم لیگ کو ختم سمجھو۔ کبھی کہتے افسوس ہماری دو سال کی محنت رائگاں گئی۔ کبھی کہتے کہ ہم لاہور جا کر ڈاکٹر صاحب کو کیا منہ دکھائیں گے؟" خدا نے مجاہدین لاہور کی شرم رکھ لی اور ان کو ڈاکٹر اقبال کے سامنے پیش ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ عاشق بٹالوی کا بیان ہے کہ:

"۲۱ اپریل کی صبح کو ہم لاہور پہنچے۔ ابھی گاڑی پلیٹ فارم پر اچھی طرح رکنے بھی نہ پائی تھی کہ اخبار فروش لڑکے کو چلاتے سنا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر اقبال فوت ہو گئے۔"

اسی سانحے پر اس کتاب کا خاتمہ اور اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوتا ہے۔ اس ضخیم کتاب کو ختم کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں صرف ایک نقش باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جناح سکندر پیکٹ نے پنجاب کی اس صوبائی لیگ ہی کا خاتمہ نہیں کیا، جس کے صدر ڈاکٹر اقبال تھے بلکہ خود ڈاکٹر اقبال کی زندگی کے قصے کو کوتاہ کرنے میں بھی اس پیکٹ کے دور رس نتائج کا ہاتھ تھا۔ ان ہی احساسات نے عاشق بٹالوی کے لہجے میں ترشی اور ان کے انداز بیان میں تلخی پیدا کر دی ہے وہ ان تمام واقعات و حالات کا ذمے دار مسٹر جناح کو سمجھتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ساری کتاب میں ہر جگہ انہوں نے جناح کے نام کے آگے 'مسٹر' ہی کا اضافہ مناسب سمجھا اور کہیں بھی قائداعظم کے لقب سے ان کو یاد نہیں کیا۔ مسٹر جناح کی سیاست کے خلاف یہ ایک خاموش مگر شدید احتجاج ہے۔ عاشق بٹالوی پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے اپنے احساسات کی تلخیوں کو زیادہ گہرا رنگ دینے کے لئے یہ روش اختیار کرنے کی جرأت کی ہے۔ کانگریس کے باب میں عاشق بٹالوی نے ہر جگہ تند و لہجہ اختیار کیا ہے؛ اگرچہ مسلم لیگ میں داخل ہونے سے پہلے "وہ مخلوط انتخاب کے حامی اور کانگریس کے ذریعہ سے پنجاب کے مسلمانوں کے سیاسی جمود کو رفع کرنے کے خواہش مند تھے۔" (ص ۳۱۴)۔ ان کے غم و غصہ کا سبب غالباً یہ ہے کہ ان کے تجربے کے مطابق کانگریس ہی کی روش نے مسٹر جناح کو اس پالیسی کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو انہوں نے ۱۹۳۷ء کے بعد اختیار کی اور جس کے نتیجہ میں وہ سر سکندر اور ان ہی کی قبیل کے دوسرے تمام ٹوڈیوں کے ملجیٰ و ماویٰ بن گئے۔

اس جائزے کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ جو اس کتاب کا بدنما داغ ہے۔ عاشق بٹالوی نے ایک جگہ مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہوئے ان کے حسب نسب پر قطعاً غیر ضروری طور پر بے جا اور بے محل حملہ کر کے اس کتاب کی سنجیدگی و ثقاہت کو بری طرح مجروح کیا ہے۔

عاشق بٹالوی کی یہ کتاب ایک اہم بات کی نشان دہی کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ برسوں میں پنجاب کے دریاؤں میں بہت کافی پانی بہہ چکا ہے۔ اور شاید اب وہاں کے دانش وروں نے گزشتہ حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو یہ شگون نیک ہے۔

(محمد عتیق صدیقی)

شمارہ نمبر ۴

۱۹۶۲ء

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

شایع کردہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ	دس روپے
قیمت فی پرچہ	دو روپے پچاس نئے پیسے

سید بنیاد علی پرنٹر اور پبلشر نے کوہ نور پرنٹنگ پریس، لال کنواں، دہلی سے چھپوا کر انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر علی گڑھ سے شائع کیا

اردو ادب

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	میر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ	ڈاکٹر محمود الہٰی	۵
۲	سر سید اسٹیج پر	عبدالغفار شکیل	۹
۳	شعلۂ جوّالہ	نادم سیتا پوری	۲۲
۴	اودھ پنچ انیسویں صدی میں	عابد رضا بیدار	۴۲
۵	لے بے ڈف	نیر اقبال	۷۷
۶	غالب	محمد عتیق صدّیقی	۹۵
۷	بے خود بدایونی کی خود نوشت رام کہانی	خاور جبل پوری	۱۲۳
۸	تبصرہ		
	ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں	محمد عتیق صدیقی	۱۴۶

ڈاکٹر محمود الٰہی

میر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

"کلیات میر کا ایک نادر قلمی نسخہ" کے زیر عنوان میرا ایک مضمون اردو ادب علی گڑھ (شمارہ ۴، ۱۹۶۱ء) میں شایع ہوا تھا، جس میں میں نے کلیات میر کے اس قلمی نسخے کا اجمالی تعارف کرایا تھا جو پبلک دولت لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس نسخے میں ایک ایسا مرثیہ بھی ہے جس کے بارے میں میری یہ رائے تھی کہ یہ غیر مطبوعہ ہے لیکن اس مرثیے کا میں نے صرف پہلا مصرع نقل کیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی اس مرثیے پر میں مزید تحقیق کر رہا ہوں، اگر یہ غیر مطبوعہ ثابت ہوا تو اردو ادب کے کسی شمارے میں شایع کر دیا جائے گا۔

میں نے اب تک جو تحقیق کی ہے، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ تو ابھی تک اس مرثیے کا تعارف کرایا گیا ہے اور نہ میر کے کسی مطبوعہ مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ یہاں یہ مرثیہ اس یقین کے ساتھ نقل کیا جا رہا ہے کہ یہ کلام میر کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہے:-

(م ۱۰)

السلام اے کام جانِ مصطفےٰ
السلام اے یادگارِ مرتضیٰ
السلام اے مقصد خیر النسا
السلام اے پیشوائے دوسرا

کیا ستم ہے خیمہ دریا پہ ہوئے
اور بیجاں پانی پانی کر ہوئے
لب نہ یک قطرہ سے تیرے تر ہوئے
السلام اے تشنہ کام کربلا

زندگانی تو نے کی ہے کیا کٹھن
آ مدینہ سے ہوا غربت وطن
مر گئے پہ پھر نہ تربت نے کفن
السلام اے کشتۂ تیغِ جفا

چارہ گر سب تیرے بیچارے گئے
دونوں بیٹے کیا تجھے پیارے گئے
یار بھائی سب ترے مارے گئے
السلام اے بیکسِ دشتِ وفا

گھر ترا یکبار ویراں ہو گیا
دم نہ مارا گو کہ بیجاں ہو گیا
خاک سے مل کر تو یکساں ہو گیا
السلام اے رفتۂ راہِ رضا

ماجرا تیرا نہایت ہے شگرف
رنج میں طاقت ہوئی سب تیری صرف
خوں ہوا دل پہ نہ نکلا منہ سے حرف
السلام اے غنچۂ بادِ صبا

شانِ کیا کیسی امارت تیرے بعد
ہو گیا اسباب غارت تیرے بعد
بچھلوں کی ہیے اب حقارت تیرے بعد

السلام اے لائق مدح و ثنا

گوش زد ایسا نہیں ظلمِ عیاں
طعن کے ہمراہ پھر تیغ و سناں
غم سا تیرا غم ہو تو کریئے بیاں

السلام اے مبتلائے صد بلا

کس جگہ آیا کہ یوں حیراں ہوا
کن سیہ کاروں کا تو مہماں ہوا
کس قدر محتاجِ آب و ناں ہوا

السلام اے خلق کے حاجت روا

تجھ سے خوبیٔ امامت چار چند
تیرا رایت تھا ولایت میں بلند
تیرے در کا ہر گدا اقبال مند

السلام اے شاہِ اقلیمِ ولا

تیرے سجدے میں سدا اہلِ یقیں
صبح خیزوں کی ترے در پر جبیں
وائے شامی جن کو تجھ سے بیعت وکیں

السلام اے قبلۂ اہلِ صفا

حیف تو افسوس تو اے آہ تو
.... رحمت تو زہے تو واہ تو
جی سے گزرا فی سبیل اللہ تو

السلام اے عاشق طرزِ فنا

سانحہ تیرا بھی یہاں ہے یادگار
دل جگر لے کر گیا دونوں فگار
ایک پسر چھوڑا ہے سو بیمار و زار

السلام اے دردمندوں کی دوا

دل کو تیری آرزو ہر صبح و شام
جی کو تیری ہی تمنائے تمام
جان و دل صدقے کیے حاصل کلام

السلام اے جان و دل کے مدعا

چشم رکھیں تجھ سے سب درویش و شاہ
کج رکھیں تیرے بھروسے پر کلاہ
آفتابِ حشر سے دے تو پناہ

السلام اے سایۂ لطفِ خدا

میر داخل ظلم کے ماروں میں ہے
یعنی تیرے تعزیت داروں میں ہے
مرحمت کر گو گنہ گاروں میں ہے

السلام اے شافعِ روزِ جزا

عبدالغفار شکیل

سرسیّد اسٹیج پر!

عشق میں آدمی کامیاب ہوتا ہے یا رسوا۔ سرسیّد کی قسمت میں یہ دونوں باتیں آئیں، ان کو عشق قوم سے تھا اور قوم نے انھیں ممکن حد تک رسوا بھی کیا۔ سرسیّد کافر، مرتد، ملحد، زندیق، اسلام کے دشمن، مسلمانوں کے ہاجی، قوم کے عیب جو، دین و دنیا سے آزاد۔ غرض قوم کے لیے کیا کیا نہ کہلائے۔ آخر وہ دن بھی آئے کہ قوم کو ان کے عشق اور جذبۂ صادق کا معترف ہونا پڑا اور قوم ہمیشہ کے لیے ان کی خدمت کے آگے سرنگوں ہوگئی۔

قوم کے لیے سرسیّد نے کیا کیا صعوبتیں اٹھائیں، کن کن مرحلوں سے گزرے، کس کس کے آگے ہاتھ پھیلائے یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس طویل داستان کا ایک باب یہ بھی ہے کہ سرسیّد اسٹیج پر آئے خود ایکٹر بنے، اپنے ساتھیوں کو ایکٹر بنایا، طرح طرح کے سوانگ بھرے اور قوم کے لیے بھیک مانگی۔ ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں:-

"اتنے بڑے عظیم الشان کام کا جیسا کہ محمڈن کالج ہے اور قومی ترقی کے جس خیال سے قائم ہوا ہے اور جس کا پورا ہونا صرف قومی امداد پر منحصر تھا، اس کی تکمیل کے لیے روپیہ فراہم کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کیوں کہ روپیہ کی امداد کے بغیر اس کا پورا ہونا محالات سے تھا، اس کے لیے ہم نے دست گدا گری ہر امیر و فقیر کے آگے دراز کیا اور اس عار کو اپنے اوپر گوارہ کیا جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بدست آہک تفتہ کردن خمیر
بہ از دست دریوزہ پیشِ امیر

ہم نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قیامت کا عذاب اپنی گردن پر لیا۔ کالج کی تکمیل کے لیے! نہیں! بلکہ قومی ترقی کا سامان مہیا کرنے کے لیے۔ لاٹری ڈالی، جوا کھیلا۔ اس پر بھی بس نہیں کیا، سوانگ بھرا اسٹیج پر کھڑے ہوئے، دوستوں نے فقیروں کا بھیس بدلا،

۱۱ بد دین کرا دیندھا ابجل میں داب کر خدا کے لیے مانگا ہے

روپے کی فراہمی اور اپنے عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے مذکورہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ سرسید نے ایک اسٹیج بھی بنایا۔ اس اسٹیج یا قومی تھیئٹر کے بنانے کا خیال انھیں سب سے پہلے ۱۸۸۴ء میں ہوا، جب وہ پنجاب کا سفر کر رہے تھے۔ امرت سر میں سرسید نے ایک بڑا ہال دیکھا جو ایک یوروپین افسر کی تجویز سے تھیئٹر کے طور پر بنایا گیا تھا۔ جب کسی کار خیر یا قومی رفاہ کے کام کی ضرورت ہوتی تو انگریز عورتیں اور مرد اس میں تماشا کرتے اور گاتے بجاتے تھے۔ تماشا دیکھنے والوں کو ٹکٹ خرید کر اندر جانا پڑتا تھا، اس طرح جتنا روپیہ جمع ہوتا وہ قومی کام میں صرف کیا جاتا۔

مولوی سید اقبال علی جو پنجاب کے سفر میں سرسید کے ہمراہ تھے سفرنامۂ پنجاب میں لکھتے ہیں:

"سید صاحب ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے مدرستہ العلوم کے لیے روپیہ جمع کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ امیروں سے التجا کی، والیان ملک سے درخواست کی، قوم سے بھیک مانگی، غیرت کو طاق پر رکھا اور غیر قوموں کے سامنے گداگری کے لیے ہاتھ پھیلایا، لاٹری کا جوا کھیلا، مگر پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ قوم کی اور ملک کی حالت یہ ہے کہ کھیل تماشے ناچ رنگ، مسخراپن سے روپیہ وہ دیتے ہیں۔ پس اگر کالج کمیٹی کے لوگ بھی مل کر ایک تھیئٹر بنائیں اور خود مقدس مقدس ممبر اس میں گانے والے اور تماشا کرنے والے ہوں تو صرف تین چار شہروں میں تماشا کرنے سے کافی روپیہ ہاتھ آجائے۔ انھوں نے فرمایا کہ خیال کرو کہ جب ہماری قومی تھیئٹر کی پارٹی کسی شہر میں پہنچے اور اشتہار دیا جائے کہ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سب جج علی گڑھ [illegible] کے سوانگ بھریں گے اور مولوی سید فریدالدین احمد خاں بہادر سب جج کان پور [illegible] بدلیں گے، مولوی سید زین العابدین خاں بہادر سب جج آگرہ اس طرح [illegible] کریں گے، مولوی سید مہدی علی خاں ریونیو سکریٹری گورنمنٹ نظام حیدرآباد یہ غزل [illegible]، مولوی مشتاق حسین صاحب ممبر صدر بورڈ ریونیو حیدرآباد کے ہاتھ میں دُرّہ ہوگا اور محتسب کا سوانگ دکھاویں گے، اور لوگ تکرار کریں گے کہ "محتسب را درون خانہ چکار"، منشی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد "چرغم" کا تماشا دکھاویں گے، مولوی سید اقبال علی اس طرح سے ہنس مکھ جوان رعنا کا سوانگ [illegible] مولوی سید مہدی حسن صاحب [illegible] فراموش کی نقل کریں گے، اور سید میر تراب علی صاحب ڈپٹی کلکٹر پھوار بڑھیل کے روٹھ بیٹھنے کا تماشا دکھاویں گے، مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل علی گڑھ

کفایت شعاری کے ساتھ سوداگروں کی دوکانوں اور نیلاموں کے مجمع میں اسباب خریدنے کی نقل کریں گے، نواب ضیاءالدین احمد خاں بہادر رئیستان کے بادشاہ بن کر آویں گے، اور یلدوز خلیفہ سید محمد حسین خاں بہادر پرنس بسمارک کی نقل اتاریں گے، مولوی الطاف حسین حالی اپنا مسدس گاویں گے، اور فلاں صاحب یہ نقل کریں گے اور فلاں صاحب وہ نقل کریں گے اُن صاحب کے گلے میں ڈھولک ہوگی اور وہ صاحب سارنگی بجاویں گے، اُن کے ہاتھ میں مجیرے ہوں گے اور ان کے پاس دوتارا اور آنریبل سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی اس شعر ـــــــ

مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز

تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

ہر ایک مجلس کے مسخرے ہوں گے تو کس قدر لوگ تماشا دیکھنے کو آویں گے اور کس قدر روپیہ ہاتھ آجاوے گا۔ اگر ہم لوگ ایسا کریں اور اس طرح پر اپنی قوم کی بھلائی کے لیے روپیہ جمع کریں تو دنیا میں کوئی قومی عزت ایسی نہیں ہے جو اس پارٹی کو نصیب نہ ہو اور عقبیٰ میں کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ رتبہ ثواب کا ایسا باقی نہ رہے جو یہ پارٹی حاصل نہ کرے۔"

قومی تھیٹر بنانے کا منصوبہ ایک عرصہ دراز سے سرسید کے ذہن میں تھا لیکن وہ اس کو عملی جامہ صرف ۱۶ فروری ۱۸۹۴ء ہی کو پہنا سکے۔ اس سال علی گڑھ میں نمائش کے موقع پر سرسید نے نمائش گاہ میں بڑے بڑے شامیانوں اور قناتوں سے ایک بہت وسیع جگہ پر قومی تھیٹر بنایا اور اس کو حتی الامکان آراستہ کیا۔ سرسید کی اس تجویز کی خود ان کے دوستوں نے مخالفت کی اور کہا کہ لوگ مطعون کریں گے۔ بعضوں نے کہا کہ ہم کو شرم آتی ہے لوگ ہمیں تھیٹر والا کہیں گے، اخبار والے جو ہمارے مخالف ہیں ہماری ہنسی اڑائیں گے لیکن سرسید نے جواب دیا کہ "لوگوں کے بُرا کہنے کا اگر میں خیال کرتا تو جو کچھ کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کرتا لوگوں کو کہنے دو، لوگوں کے بکنے سے کیا ہوتا ہے، یہ دیکھنا چاہیے کہ درحقیقت اس سے قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں؟" آخر سرسید کا خلوص رنگ لایا۔ سرسید کے اس عزم اور عظیم مقصد کو دیکھ کر ان کے وہ رفقا بھی جو اختلاف رکھتے تھے اُن کے ساتھ ہو گئے اور سرسید نے اپنا ترتیب دیا ہوا ڈرامہ اسٹیج کرنے کی ٹھان لی۔

اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ پونے نو بجے رات کو بابو فدا حسین نے جو بہت کامل الفن تھے ہارمونیم بجانا شروع کیا اور لوگ آنے شروع ہو گئے۔ ایک عالم بوڑھے سرسید اور ان کے ساتھیوں کو اسٹیج پر دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا۔ ہال جب بھر گیا اور لوگوں کے اشتیاق کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو سرسید کا ڈرامہ شروع ہوا۔

اس ڈرامے کی تفصیل محمڈن کالج ہسٹری مرتبہ سید افتخار عالم سے یہاں نقل کی جاتی ہے:

پہلا سین

حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی ایک کپتان بن کر اسٹیج پر آتے ہیں، وہ نہایت عمدہ ترکی لباس میں ملبوس تلوار کمر میں لٹکائے ہوئے اسٹیج پر ٹہل رہے ہیں۔ بارہ سپاہی جھنڈی بردار وردی پہنے ایک ایک کرکے اسٹیج پر آتے ہیں اور کپتان کو سپاہیانہ انداز میں سلام کرتے ہیں اور کپتان ہر ایک سپاہی سے فرداً فرداً بولتے ہیں:

کپتان: (پہلے سپاہی حبیب محمد خاں سے) واٹ از ایور پرول

سپاہی: پرودر توتی

ک: ٹیک اِیور پلیس

ک: (دوسرے سپاہی فریدالدین سے) ماشانک

س: ابتغاءِ للخیر

ک: الزام مکانک

ک: (تیسرے سپاہی اسلام محمد سے) چہ راز داری

س: فلاح قوم

ک: جائے خود بگیر

ک: (چوتھے سپاہی اصغر حسین سے) ماشانک

س: لوجہ اللہ

ک: الزام مکانک

ک: (پانچویں سپاہی رضی الدین سے) چہ راز داری

س: قوم

ک: جائے خود بگیر

ک: (چھٹے سپاہی اعجاز الدین سے) ماشانک

س: حُب القوم

ک : الزام مکانک
ک : (ساتویں سپاہی تصدق حسین سے) چہ راز داری
س : عزت
ک : جائے خود بگیر
ک : (آٹھویں سپاہی ظریف احمد سے) ماشانک
س : حب الوطن
ک : الزام مکانک
ک : (نویں سپاہی عبدالرحیم سے) چہ راز داری
س : ترقی
ک : جائے خود بگیر
ک : (دسویں سپاہی عبداللطیف سے) ماشانک
س : اسلام
ک : الزام مکانک
ک : (گیارہویں سپاہی عبدالغفور سے) چہ راز داری
س : تعلیم
ک : جائے خود بگیر
ک : (بارہویں سپاہی ابرار حسین سے) واٹ اِز ایور یو ول
س : ایجوکیشن
ک : ٹیک ایور پلیس

دوسرا سین

ہر ایک سپاہی اپنی اپنی جگہ متعین ہوگیا۔ کپتان نے پھر ٹہلنا شروع کیا اتنے میں سید احمد خاں آتے ہیں جو عربی جبہ، ریشمی و سفید و سرخ دھاری کا پہنے ہوئے تھے کپتان نے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا:

ک : ہو آر یو ؟

سید احمد خاں نے جواب نہ دیا اور چپ کھڑے رہے۔

ک : (ذرا زور سے ترش ہو کر) ہو آر یو؟
سید احمد: میں انگریزی نہیں جانتا
ک : من انت؟
سید احمد: میں عربی نہیں جانتا
ک : (ترکی میں) سن کیم سن
سید احمد: میں ترکی نہیں جانتا
ک : (غصہ ہو کر) تم کون ہو جی؟
سید احمد: (اپنی طرف اشارہ کر کے) میں ہوں میں
ک : کون؟
سید احمد: وہی جو ہوں
(کپتان نے آگے بڑھ کر کالج کے تمغے کو جو سر سید احمد کے سینے پر لگا ہوا تھا غور سے دیکھ کر)
ک : سید احمد!
سید احمد: ہاں
ک : سر سید احمد
سید احمد: ہاں ہاں ہاں!

اس کے بعد سر سید احمد خاں نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا:۔

"لیڈیز اور جنٹلمین!

کون ہے جو آج مجھ کو اس اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا۔ وہی جن کے دل میں اپنی قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے ہمیشہ بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو ان باتوں کو جن سے انسان کو شرم اور حیا اور غیرت ہونی چاہیے اپنی شیخی اور اپنے افتخار کا باعث سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو قوم کی، انسان کی بھلائی کے کاموں کو جو نیک نیتی سے نیکی کے لیے کیے جاویں، بے عزتی کے کام سمجھے۔

آہ! اس قوم پر جو خدا کو دھوکا دینے کے لیے مکر یا پندار کے کالے سوت سے بُنے ہوئے تقدس کے برقعے کو اپنے منہ پر ڈالے مگر اپنی بد صورتی اور دل کی بُرائی کا کچھ علاج نہ سوچے، آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام ہے جس سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جاوے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و نفرت کا کام سمجھے۔

اے رئیسو اور دولتمندو! تم اپنی دولت اور حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کیسی ہی بدحالت میں ہو، ہمارے بچوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ یہی اُن لوگوں کا بھی خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انھیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جن کے لیے آج ہم اسٹیج پر کھڑے ہیں۔

اے صاحبان ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے، قوم مفلس ہو گئی ہے، قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل و رذیل ہوتے جا رہے ہیں میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کی اخراجات تعلیم میں اعانت پہنچے مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، بہت ہی قلیل ملی۔ والنٹیر بنانے چاہے بہت ہی کم بنے، اور جو بنے اُن سے بھی کچھ بن نہ آئی۔ پس آج میں اس اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرسکوں۔

لیڈیز اور یوروپین جنٹلمین! میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے اپنی قوم کے غریب بچوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے بڑے بڑے ڈیوک، ڈچس اسٹیج پر آئے ہیں اور غریبوں کی امداد کرنے سے عزت پائی ہے۔ اس وقت بھی یوروپینوں نے اپنی نیک دلی ثابت کی ہے۔ باوجود ہم قوم نہ ہونے کے ہمارے شریک ہیں اور تھوڑی دیر میں ہمارے یوروپین دوست مسٹر کنیڈی کلکٹر و افسر ضلع! نہیں نہیں..... مسٹر کنیڈی میرے دوست اسی اسٹیج پر آنے والے ہیں۔ مگر ہندوستان کا وہ خیال ہے نہ وہ دل اور نہ دلی نیکی جو ایسے کاموں کے باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے جو میں اس قومی کام کے لیے اسٹیج پر کھڑا ہوا ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کروں گا اور ضرور کروں گا، اور لوگوں کو جو بکنا چاہیں بکنے دوں گا۔ کون سی بات ہے جو لوگوں نے میری نسبت نہیں کہی اور میں نہایت خوش ہوں گا کہ جو کچھ کہنا باقی رہ گیا ہو وہ بھی اب کہہ لیں۔ اس موقع پر میں حافظ کی ایک غزل پڑھوں گا جو میرے فیلنگ کے مناسب ہے اور جس میں میں نے دو شعر اور ملا دیے ہیں۔"

اس کے بعد سرسیدؒ نے حافظ شیرازی کی یہ غزل نہایت جوش سے پڑھی:

ساقیا برخیز و در دہ جام را　　خاک بر سر کن غمِ ایام را
ساغرِ مے بر کفم نہ تا ز بر　　برکشم ایں دلق ازرق خام را
بادہ در دہ چند ازیں بادِ غرور　　خاک بر سر نفسِ نافرجام را
دودِ آہِ سینۂ نالانِ من　　سوخت ایں افسردگانِ خام را
محرمِ رازِ دلِ شیدائے خود　　کس نمی بینم ز خاص و عام را
با دل آرامے مرا خاطر خوش است　　کز دلم یکبارہ برد آرام را
ننگرد دیگر بسرو اندر چمن　　ہر کہ دید آں سروِ سیم اندام را

قوم ما اے قوم ماکز بہر تو　　دادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمد بسختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

تیسرا سین

مسٹر کینیڈی، ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر اسمتھ، مسٹر انتونی اسٹیج پر آگئے اور چاروں نے مل کر انگریزی میں ایک گیت گایا۔

پھر آغا کمال الدین سنجر ایرانی شاعر اسٹیج پر آئے اور نہایت خوبی سے اپنا فارسی قصیدہ پڑھا[1]۔

اس کے بعد آغا محمد حسین جو ایک مشہور سیاح ہیں اور افغانستان اور کوہستانی قوموں میں رہتے ہیں اور مصر میں اور سوڈانیوں میں کچھ عرصے تک رہے تھے، سوڈانی بدوی لباس میں اور کھجور کی زنبیل لٹکائے اور برچھی ہاتھ میں لیے اور دنبہ ساتھ اس کی رسّی پکڑے اسٹیج پر آئے۔ خالص عربی بدوی میں گفتگو کی اور بدوی جوش دکھایا اور دنبہ کی تعریف کی اور جس طرح کہ بدوی گیت گاتے ہیں عربی گیت گایا اور رجز پڑھے اور سلام علیک و تحیۃ کہہ کر چلے گئے۔

اس خوبی سے انھوں نے بدوی لہجے میں گفتگو کی اور اشعار پڑھے کہ جن لوگوں نے بدوؤں کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں وہ متعجب ہو گئے۔

اس کے بعد مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب اسٹیج پر آئے۔ اول انھوں نے نہایت مختصر اور دل چسپ گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ جب اوّلاً سیّد صاحب نے اس طرح پر دینی ریڈنگ کا جلسہ کرنا چاہا تو میں نے مخالفت کی مگر جب اس وقت قوم کی حالت پر گفتگو ہوئی اور اسی خیال نے میرے دل پر کہ قوم کی بھلائی کے لیے یہ کام ہے تو میری رائے بدل گئی لومۃ لائم کا اندیشہ میرے دل میں نہ رہا۔

ایک لطیفہ بھی اس مقام پر لکھنے کے قابل ہے جس وقت مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب سے یہ گفتگو ہوئی تھی ایک دوست نے مولوی خواجہ محمد یوسف سے کہا کہ اگر تم کو ایسا ہی قومی بھلائی کا جوش ہے تو میں قوم کی بھلائی کے لیے تم کو دیتا ہوں اگر تم لوگوں کے سامنے پشواز پہن کر اور گھنگرو باندھ کر ناچو۔ مولوی خواجہ محمد یوسف نے نہایت دلی جوش سے کہا "مجھے منظور ہے" غرض کہ مختصر گفتگو کے بعد مولوی خواجہ محمد یوسف نے اپنی مثنوی جو اس موقع

---

[1] یہ فارسی قصیدہ یہاں بخوف طوالت حذف کیا جاتا ہے۔

کے لیے کہی تھی درد دل سے پڑھی۔

اس کے بعد مسٹر آرنلڈ اسٹیج پر آئے اور نہایت عمدگی سے ایک انگریزی نظم پڑھی۔

پھر مولانا مولوی شبلی صاحب اسٹیج پر آئے اور انھوں نے اپنا تصنیف کیا ہوا مسدس جو اسی موقع کے لیے تصنیف کیا تھا پڑھا۔ ان کے دل میں خود قومی درد تھا، ان کی آواز درد انگیز تھی۔ مسدس کا مضمون جیسا دل چسپ تھا ویسا ہی قومی ہمدردی سے بھرا تھا۔ ان تگڈا دردوں نے لوگوں کے دلوں پر جو اثر کیا اس کو انھیں لوگوں کا دل جانتا ہے جو اس وقت موجود تھے۔ بہرحال جو مسدس انھوں نے پڑھا وہ یہ ہے:

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم — بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانانِ ہنر پرور و اربابِ ہمم — جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے پیہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں
شاید اس بزم کو یہ بزم طرب سمجھے ہیں

ہے گماں ان کو کہ آیا ہے تھیٹر کوئی — یا کہ اس سے بھی تماشا ہے یہ بڑھ کر کوئی
اس سبھا میں نظر آئے گا اِندر کوئی — مسخرا بن کے بھی آئے گا مقرر کوئی
نقل وہ ہوگی کہ دیکھی نہ سنی ہوگی کبھی
سیر وہ آج کریں گے جو نہ کی ہوگی کبھی

کوئی کہتا ہے کہ تھیئٹر تو نہیں ہے لیکن — ساز و نغمہ بھی نہ ہو یہ تو نہیں ہے ممکن
راتیں کاٹی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن — دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگانِ مسن
کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہوگی آخر
بوڑھے غمزوں میں کوئی بات تو ہوگی آخر

دوستو کیا تمھیں سچ مچ ہی تھا تھیئٹر کا یقیں — کیا یہ سمجھے تھے کہ یہ وہ کوئی ہوگا رنگیں
نظر آئے گی جو سوئی ہوئی اک زہرہ جبیں — آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں
قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے تھے تو بے جا سمجھے

ہائے افسوس کہ ہو قوم تو یوں خستہ و زار — مرض الموت میں جس طرح سے کوئی بیمار
نہ معالج ہو کوئی پاس نہ سر پہ غم خوار — نظر آتے ہوں دمِ نزع کے سارے آثار

واں تو یہ حال کہ مرنے میں بھی کچھ دیر نہیں
آپ ادھر سیر تماشے سے ابھی سیر نہیں

نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا — ہے یہ حسرت کا سماں جوش مسرت کیسا
ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا — قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہ شرفا — صاحب افسر و اورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدۂ مشکل کے جو ہیں عقدہ کشا — ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما
قوم کے خواب پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

بانیٔ مدرسہ وہ سیّد والا گوہر — وہ مینیجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلی غم زدہ وہ شاعر اعجاز اثر — اور یہ نو بادۂ اقبال کے سب برگ و ثمر
نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اللہ کی شان

اپنے رتبوں کا نہ کچھ دھیان نہ کچھ وضع کا پاس — دوستوں سے نہ جھجک اور نہ دشمن سے ہراس
گرچہ سب کہتے ہیں حاصل نہیں کچھ بھی جز یاس — ہائے کیا دھن ہے کہ پھر بھی تو نہیں ٹوٹتی آس
عرض مطلب کی ہے تصویر سراپا اُن کا
ہاتھ خود کاسۂ دریوزہ ہے گویا اُن کا

ان کا ہر لفظ ہے اک مرثیۂ جاں فرسا — قوم کی شان دکھا دیتی ہے اک ایک ادا
دیکھ اے قوم جواب تک ہو نہ تو نے دیکھا — اپنے بگڑے ہوئے انداز کا پورا خاکا[۱]
گرچہ تدبیر بھی ہم سے نہیں کچھ کی جاتی
ہائے حالت بھی تو تیری نہیں دیکھی جاتی

یوں بھلانے کو تو ہم دل سے بھلاتے ہیں مگر — یاد آ جاتے ہیں پھر بھی ترے اگلے جوہر

۱؎ خاکہ

وہ بھی اک دن تھا کہ جس سمت سے ہوتا تھا گزر　　ساتھ چلتے تھے جلو میں ترے اقبال و ظفر
تو کبھی روم میں قیصر کو مٹا کر آئی
کبھی یورپ میں نئے فتنے اٹھا کر آئی

تھے نصیبوں میں ترے دولت و اقبال و حشم　　تیرے حملوں سے دہل جاتا تھا سارا عالم
ایشیا کا جو کیا تو نے مرقع برہم　　جا کے یورپ کے افق پر بھی اڑایا پرچم
کر دیا دفترِ تاتار کو ابتر تو نے
نیزہ گاڑا تھا جگر گاہِ تتر پر تو نے

کون تھا جس نے کیا فارس و یوناں تاراج　　کس کی آمد میں فدا کر دیا جبرال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج　　کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصے　　یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے　　دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی بھولے سے سلف کو نہ کریں یاد مگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیوں کر

مرو و شیراز و صفاہان کے وہ زیبا منظر　　بیت احمر کے وہ ایوان وہ دیوار و در
مصر و غرناطہ و بغداد کا اک اک پتھر　　اور وہ دہلیِ مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذرّوں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں از بر اب تک

ان سے سنیے کوئی افسانۂ یارانِ وطن　　یہ دکھا دیتے ہیں آنکھوں کو وہی خوابِ کہن
تیرے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن　　تیرے ہی نغمۂ پُر درد کے ہیں یہ ارگن[1]
پوچھتا ہے جو کوئی ان سے نشانی تیری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری

---

[1] ارگن۔ انگریزی باجا۔

اس کے بعد محمد سعید خاں صاحب جو درحقیقت درویش صفت شخص ہیں اور درویشوں کی صحبت میں رہے ہیں، درویشی لباس میں اسٹیج پر آئے، یہ درویشی جبہ جس کو بدن کہتے ہیں پہنے ہوئے تھے گلے میں موٹے موٹے دانوں کے کنٹھے پڑے تھے، سر پر لمبی ٹوپی تھی اور اس پر گیروا انچیٹا لپٹا ہوا تھا اور ہاتھ میں تونبی تھی۔

اسٹیج پر آتے ہی انھوں نے آواز دی یا علی مدد! اور تونبی لوگوں کو دکھائی اور کہا "بابا قوم کے لیے یہ تونبی باندھی اور قوم کے لیے یہ روپ بھرا ہے۔ بھلا ہو قوم کا"

اس کے بعد انھوں نے ہندی دوہے پڑھے جن میں سے ایک دوہے کو نہایت خوبی سے پڑھا جس نے لوگوں کے دلوں پر خوب اثر کیا، وہ دوہا یہ ہے:

رام کا بیوپاری اسے سادھو
رام کا بیوپاری
کسی نے لادا مونگ کسی نے سام کھاری
ہم نے لادا نام سائیں داپوری کھیپ ہماری
سادھو رام کا بیوپاری

پھر انھوں نے ایک گیت جناب حضرت علی مرتضیٰ کی منقبت میں پڑھا اور چلے گئے۔

اس کے بعد آغا محمد افغانی لباس پہنے اور یاقوت خاں پٹھان اپنا قومی لباس سپاہیانہ پہنے ہوئے اور پٹھانی طریقے سے تلوار لٹکائے ہوئے اسٹیج پر آئے۔ پہلے ان دونوں نے بطور اجنبی شخصوں کے سلام علیک کی اور پٹھانوں کی طرح گلے ملے پھر آپس میں پشتو زبان میں بات چیت کی۔ بات چیت کرنے میں معلوم ہوا کہ یاقوت خاں آغا محمد حسین کے بہت بڑے دوست کے بیٹے ہیں۔ اس پر دونوں نہایت خوش ہوئے اور دوڑ کر پھر گلے ملے۔ اور نہایت خوشی کی یہ حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

اس کے بعد آغا محمد حسین نے پشتو کا افغانی لہجے میں ایک گیت گایا اور یاقوت خاں نے پشتو کے اشعار پڑھے جو مسٹر بیگ پرنسپل کی مدح میں بنائے تھے۔ پھر دونوں نے آپس میں ہاتھ پکڑ کر قومی گیت پشتو کا ٹھیک پٹھانوں کی مانند گایا اور چلے گئے۔

اس کے بعد دس منٹ کی مہلت آرام کے لیے تھی۔

(وقفہ)

پھر دوبارہ مسٹر کنیڈی، ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر اسمتھ، مسٹر انتونی اسٹیج پر آئے اور مل کر ایسا عمدہ انگریزی گیت گایا کہ تمام لوگ عش عش کر گئے۔ آواز اور رسیلے سُر لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔

اس کے بعد قطب الدین اسٹیج پر آئے، انھوں نے نہایت خوبی اور فصاحت سے بیٹل آف واٹرلو BATTLE OF WATERLOO انگریزی میں پڑھا۔

پھر احمد حسین اسٹیج پر آئے اور مولانا حالی کی مثنوی "تعصب و انصاف" کے یہ اشعار :

یاد ہے ہم کو وہ اپنا عالم جب کہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا

نہایت خوبی سے پڑھے۔

پھر عباس حسین اسٹیج پر آئے اور مولانا حالی کے "شکوہ ہند" کے اشعار نہایت دل دوز آواز سے پڑھے۔

اس کے بعد یاقوت خاں اسٹیج پر آئے اور مولوی شبلی کے قصیدے کے چند اشعار پڑھے۔ مگر انھوں نے حسب مقتضائے وقت اصل اشعار میں چند لفظ تبدیل کر دیے تھے۔

اب محمد مصطفےٰ خاں اسٹیج پر آئے اور انگریزی میں قومی ہمدردی پر نہایت عمدہ اسپیچ کی۔

اس کے بعد خواجہ عبدالعلی اسٹیج پر آئے اور کوئن وکٹوریہ ایمپریس آف انڈیا کی سلامتی کی دعا میں مسدس پڑھا۔

اس کے بعد مسٹر کینڈی، ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر اسمتھ، مسٹر انتونی اسٹیج پر آئے اور انگریزی اشعار سب نے مل کر گلئے۔ گاڈ سیو دی کوئن کا گیت گایا۔

اس کے بعد سر سید احمد خاں، حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی، مولوی خواجہ محمد یوسف اور کالج کے اور ممبران نے مل کر مسٹر جی کینڈی کے آنرمیں بدوی الحان میں یہ عربی اشعار پڑھے :

ندعوا حبیبی لکم السلاما
من الالہ ابدا دواما
تحیۃ مبارکا ما داما
وجودکم یا اکرام الکراما

اس کے بعد ان سب نے یہی اشعار ڈاکٹر موریارٹی، مسٹر آرنلڈ، مسٹر انتونی اور مسٹر کینڈی کے آنر میں اسی الحان سے پڑھے، پھر ہارمونیم باجا بجا اور ڈرامہ ختم ہوا۔

نوٹ: سرسید نے اس نمایش کے موقع پر قوم کے لیے کتب فروشی بھی کی تھی۔

نادؔم سیتاپوری

شعلۂ جوّالہ

(اردو کے واسوخت نگار شعرا کا ایک تذکرہ)

اردو زبان وادب میں تذکرہ نگاری کا رواج تخمیناً ڈیڑھ دو سو برس ادھر ہو چکا تھا لیکن ان میں کوئی جدت یا ندرت تقریباً ایک صدی تک پیدا نہ ہو سکی ـــــ خصوصاً اصناف سخن کی تخصیص کے ساتھ تذکروں کی ترتیب تدوین کی طرف تو مطلق توجہ نہیں کی گئی۔ شاعرات کے تذکرے لکھے گئے۔ ہندو شعراء کے حالات جمع کیے گئے۔ یوروپین شاعروں کے تذکرے ترتیب دیے گئے مگر شاید "مرثیہ" کے سوا یہ خصوصیت کسی اور صنفِ سخن کو حاصل نہیں ہے جس کے مکمل یا نامکمل تذکروں کی طرف توجہ کی گئی ہو ـــــ ہاں تخمیناً ایک قرن ادھر مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے "تذکرۂ خندۂ گل" لکھ کر ایک نئی راہ پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی لیکن "ہزل گو شعراء" کا موضوع اتنا محدود تھا کہ وہ اپنے کام کو صحیح طور پر مکمل نہ کر سکے۔

اصناف سخن کی تخصیص کے ساتھ اردو زبان میں غالباً سب سے پہلا بے ضابطہ تذکرہ "شعلۂ جوالہ" ہے جس میں یک جائی طور پر اردو کے درجنوں "واسوخت گو" شاعروں کے مختصر حالات جمع کر دیے گئے ہیں کہنے کو تو یہ ضخیم کتاب دراصل ایک "مجموعۂ واسوخت" ہے جس میں تخمیناً "پچاس" واسوخت گو شعرا کے واسوخت اور مختصر حالات زندگی شامل کیے گئے ہیں لیکن جس انداز سے یہ مجموعہ ترتیب دیا گیا ہے اس سے اس کی نوعیت ایک بے ضابطہ تذکرہ کی سی پیدا ہو گئی ہے اور شعوری یا لاشعوری طور پر یہ "واسوخت گو شعرا" کا ایک بے ضابطہ مگر اچھا خاصا تذکرہ بن گیا ہے جسے صنفِ سخن کی تخصیص کے اعتبار سے اپنے رنگ کا پہلا تذکرہ کہنا بے جا نہ ہو گا۔ "شعلۂ جوالہ" تخمیناً ایک صدی ادھر کی تالیف ہے جسے نو سو دس صفحات کی ضخامت پر (دو جلدوں میں) پہلی بار نول کشور پریس لکھنؤ نے ۱۲۸۵ھ میں شایع کیا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس کا دوسرا ایڈیشن شایع نہیں ہوا ـــــ اور "طبع اول" بھی کم یاب

ہو چلا ہے۔ اس مجموعے میں تقریباً پچھتر واسوخت شامل ہیں۔ چند کے سوا سبھی اردو میں ہیں۔ تین چار شاعروں کو چھوڑ کر عام طور سے ہر واسوخت کی ابتدا میں ایک صفحے پر واسوخت گو شاعر کے حالات ہیں اور کلام پر قدیم ڈھنگ کا مختصر سا تبصرہ بھی ۔۔۔۔ ! حالات اتنے مختصر اور سرسری ہیں کہ ان سے نہ تو شاعر کا سن ولادت معلوم ہو سکتا ہے نہ سن وفات ! لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے پرانے شاعروں کی نشان دہی ضرور ہو جاتی ہے جن کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا خصوصاً لکھنؤ کے ایسے متعدد شاعروں کا نام اور مختصر حالات اس مجموعے میں نظر آتے ہیں جن کے نام لینے والے بھی اب باقی نہیں ہیں۔

غیر معروف شعراء کے علاوہ اس مجموعے میں چند مشاہیر کا ذکر بھی ہے۔ میر تقی میر۔ مرزا رفیع سودا۔ جرأت۔ مومن مظہر جان جاناں۔ امیر مینائی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم (والی رام پور) نواب مراد علی خاں رعنا اور مرزا شوق۔ ان میں آخر الذکر چاروں حضرات کے حالات کئی کئی صفحات پر دیے گئے ہیں۔ اور تفصیلی تذکرے کے باوجود بھی ان کے حالات میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ملتی جو آج کی تحقیق و ریسرچ کو کوئی نئی روشنی دے سکے۔ البتہ نواب یوسف علی خاں ناظم کے حالات میں اس اختلافی مسئلے کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ناظم نے ابتدا میں کچھ دنوں حکیم مومن خاں مومن سے بھی مشورہ سخن کیا تھا۔ اس کے بعد مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ پھر آخر زمانے میں مظفر علی خاں اسیر کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

جس طرح مشاہیر شعراء کے حالات سے ہماری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا اسی طرح ان شاعروں کا ذکر بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے جن کے فارسی واسوخت اس مجموعے میں شامل ہیں۔ وحشی یزدی۔ پنڈت اجودھیا ناتھ نوائی دہلوی۔ فائض وغیرہ ایسے ہی چند شاعر ہیں جن کے فارسی واسوخت منتخب کیے گئے ہیں ۔۔۔ اور وہ میرے موضوع سے تعلق نہیں رکھتے اسی لیے انھیں بھی حذف کر دیا گیا ہے۔

عیش کے فراہم کردہ حالات میں جہاں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ کسی شاعر کا سن ولادت یا سن وفات نہیں دیا گیا ہے

لے جناب مالک رام تذکرہ "تلامذہ غالب" میں تحریر فرماتے ہیں: "ناظم فروری ۱۸۵۷ء میں "غالب" کے شاگرد ہوئے ان سے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا۔ دراصل شعر گوئی غالب کی سرپرستی کا بہانہ بن گئی ہے۔ امیر مینائی نے (تذکرہ) "یادگار انتخاب" میں لکھا ہے کہ وہ غالب سے پہلے "مومن" سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ جب پہلی بار نواب صاحب نے اپنا کلام بہ غرض اصلاح غالب کے پاس بھیجا ہے تو اس کے ساتھ خط میں لکھا ہے کہ مجھے آج تک کبھی ایک مصرع تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر وہ اس سے پہلے شعر کہتے ہوتے اور مومن سے اصلاح کا سلسلہ ہوتا تو یہ بات پوشیدہ رہنے والی نہ تھی اور نواب صاحب کو اس غلط بیانی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔"

(صفحہ ۲۷۶۔ تلامذہ غالب)

وہاں بعض ایسی باتیں بھی ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں جو عام طور سے تذکروں میں نظر نہیں آتیں۔ مثلاً

۱۔ شیخ امداد علی بحر لکھنوی کی آواز میں رعشہ تھا۔

۲۔ طالب علی خاں عیشی شاعر کے علاوہ ایک اچھے "نثر نگار" بھی تھے۔

۳۔ شیخ گوہر علی منیر (شاگرد مرزا دبیر) بھی بہ حیثیت استاد اصلاح سخن کرتے تھے۔

"شعلۂ جوالہ" کا سب سے تاریک پہلو وہ "اختصار" ہے جو اکثر لکھنوی شعراء کے حالات میں برتا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ اسے باقاعدہ تذکرہ کی شکل نہیں دی گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طرف تو والی رام پور، امیر مینائی، مرزا شوق اور نواب مردان علی خاں رعنا کے حالات کئی کئی صفحے پر پھیلا دیے گئے ہیں، دوسری طرف میر کلو عرش جیسی عظیم شخصیت کا ذکر سرسری طور پر چند سطروں میں کیا گیا ہے جو خود عیش کے استاد تھے ــــ اور استاد سے خواہ کیسی ہی "ان بن" کیوں نہ رہی ہو یہ بات اس دور کی وضع دارانہ قدروں سے بعید نظر آتی ہے کہ ان کے چشم دید حالات کو اس طرح پر نظر انداز کر دیا جاتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے "شعلہ جوالہ" پر تذکرے کا کلیتاً اطلاق نہیں ہوتا اسے صرف افادتاً تذکرے کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ خود عیش نے اپنے جو حالات اس مجموعے میں شامل کیے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ یہ حالات خود عیش کے لکھے ہوئے ہیں؟ تحریر فرماتے ہیں:

> عیش ــــ تخلص ہے منشی شیخ فدا علی عرف اچھے صاحب کا ــــ خلف الرشید ہیں شیخ منور علی صاحب مرحوم کے۔ اور نواسے ہیں محمد علی خاں صاحب مغفور عرف شیخ فقیرا صاحب مرحوم کے۔ رئیس لکھنؤ اور شیوخ اعظم لکھنؤ سے ہیں، مولد اور مسکن "ان کا" اور "ان کے" بزرگوں کا ہمیشہ سے شہر فیض بہر لکھنؤ ہے صاحب دیوان ہیں، شاگرد ہیں میر کلو صاحب (عرش) کے"

(صفحہ ۵۰ شعلہ جوالہ)

لیکن اس طرز بیان سے قطع نظر کرکے اگر عیش کی شخصیت کو پرکھا جائے تو وہ گزشتہ لکھنؤ کے ان باقیات الصالحات میں نظر آتے ہیں جو اپنے دور میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ تاریخ ادب کی یہ بوالعجبی کتنی افسوس ناک ہے کہ اگر کہیں بھولے بھٹکے "پیر و میر شاد" کا نام بھی لیا جاتا ہے تو عیش لکھنوی کو اس طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے جیسے اس نام کی کوئی ادبی شخصیت لکھنؤ میں تھی ہی نہیں!۔ اور دو چار سطروں میں اگر کہیں عیش کا ذکر ملتا بھی ہے تو بس اتنا!

> "شیخ فدا علی عیش لکھنوی۔ تلمیذ عرش دہلوی دخلیل لکھنوی۔ ان کے پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا۔ شعر کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ نہایت خوش گو تھے۔ اگلی وضع تھی، چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے تخمیناً ستر برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ نثر بھی اچھی لکھتے تھے"

(صفحہ ۱۷۵ "تذکرہ آب بقا" خواجہ عشرت لکھنوی طبع اول)

خواجہ عشرت مرحوم کی یہ اطلاع صحیح نہیں ہے، اچھے صاحب عیش نے صرف خدائے سخن میر تقی میر کے صاحب زادے میر کلو عرش کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا جب ان سے ان بن ہو گئی تو پھر کسی دوسرے استاد کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل اعتماد بیان خود عیش کے صاحب زادے علامہ شیخ فدا حسین مرحوم کا ہے جنھوں نے اپنے والد کے نامکمل مگر بہت کچھ تفصیلی حالات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ حالات "دیوان عیش" کے اس مخطوطے کا جزو ہیں جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

علامہ شیخ فدا حسین "سر سید تحریک" کے ابتدائی حامیوں میں تھے۔ سر سید نے اپنی زندگی میں انھیں علی گڑھ بلا لیا تھا اور یہ سر سید کے بعد عرصہ تک "محمڈن کالج" سے وابستہ رہے۔ اودھ سے کالج کو جو بڑے بڑے عطیات ملے وہ زیادہ تر انھیں کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔ تقریباً ساٹھ سال ہوئے جب "علامہ" دینی تعلیم کے سوال پر کالج سے علیحدہ ہوئے تھے، ان کے خلاف متعصب شیعہ ہونے کا الزام لگایا گیا تھا جو قطعاً غلط اور بے بنیاد تھا۔ مرحوم عبد اللہ العمادی نے اپنے مشہور (عربی اردو مشترک) ماہنامہ "البیان" میں علی گڑھ کے اس ناخوش گوار ہنگامے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "کہتے ہیں علی گڑھ کالج کے سُنی شیعی لڑکوں میں تعصب آ گیا ہے اور "اتحاد" کی رائے میں اس کے محرک (علامہ) شیخ فدا حسین پروفیسر دینیات شیعہ ہیں۔ جہاں تک ہماری واقفیت ہے پروفیسر صاحب کے متعلق یہ صرف بد گمانی اور نہایت بے سر و پا افترا ہے، ان کی صرف یہ خواہش ہے کہ کالج میں دنیاوی علوم کے ساتھ خفیف سی مذہبی تعلیم بھی ہو اور یہ کہ تعلیم مذہبی کا طریقہ محتاج اصلاح ہے، اگر اس خیال کو تعصب انگیز کہا جائے تو کہنے دیجیے۔"
>
> (ماہنامہ "البیان" لکھنؤ جلد ۱۲ شمارہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ)

علی گڑھ سے علیحدہ ہونے کے بعد "علامہ" نے مستقل طور پر "بسواں" (ضلع سیتا پور) میں قیام فرما لیا تھا۔ یہیں ان کی کوٹھی کے چھوٹے سے ہال میں ان کا بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا جو انھوں نے (غالباً) اپنی حیات ہی میں کچھ کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ اور کچھ محمود آباد کی لائبریری "سقراط" کو دے دیا تھا۔ ان کی تصانیف میں "مقتل ابن عیش" ان کا سب سے بڑا عالمانہ کارنامہ ہے جو ابھی تک شایع نہیں ہوا ہے۔ میرے والد مرحوم "علامہ" کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ اپنے بچپن میں میں نے ان علمی مجلسوں کی بہار دیکھی ہے۔ ہندوستان کے اکثر مشاہیر علامہ سے ملنے کے لیے "بسواں" جیسے کوردیہہ میں آیا کرتے تھے اور ان کی کوٹھی میں آئے دن چہل پہل رہا کرتی تھی، والد مرحوم سے علامہ کو کچھ ایسی قلبی و روحانی محبت تھی کہ والد کے وفات کی خبر انھیں مرتے دم تک نہیں دی گئی۔ جب والد کا انتقال ہوا علامہ پر فالج کا ہلکا سا حملہ ہو چکا تھا صاحب فراش تھے۔ میں عیادت کے لیے گیا تو مجھے بتایا گیا کہ تم اپنے والد کی وفات کا ذکر ان سے نہ کرنا۔

چناں چہ جب میں حاضرِ خدمت ہوا تو مجھے دیکھ کر رونے لگے اور والد مرحوم کا نام لے کر کہنے لگے کہ اب تو انھوں نے بھی مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے دیکھنے تک نہیں آتے۔ میں بہت دیر تک آب دیدہ بیٹھا رہا اور وہ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔

علامہ نے غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں بمقام بسواں رحلت فرمائی اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کے بڑے صاحب زادے حضرت علام شیخ بادشاہ حسین باپ کے سامنے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ شیخ زادگان لکھنؤ کے اس تاریخی خاندان میں اب صرف علامہ کے چھوٹے صاحب زادے جناب شیخ تجمل حسین ہمایہ (رئیس بسواں) باقی رہ گئے ہیں۔ اور وہ بھی چراغِ سحری ....! علامہ شیخ فدا حسین مرحوم نے اپنے والد (عیش) کے جو حالات تحریر فرمائے ہیں اگرچہ وہ مکمل نہیں ہیں پھر بھی اس کے ضروری حصے پیش ہیں :

"حضور (عیش مرحوم) شیخ زادگان والا نژاد شہر لکھنؤ سے ہیں ا در شیخ محمد علی خاں صاحب عرف شیخ نقیرا مرحوم رئیس اعظم لکھنؤ کے نواسے ہیں اور شیخ نوازش علی صاحب سپہ سالار معرکہ "خان بنگش" کے پوتے ہیں۔ یہ وہ سپہ سالار ہیں جنھوں نے نواب شیخ فخر الدین خاں صاحب مرحوم کے ساتھ "خان بنگش" کی حکومت کو درہم برہم کر دیا اور تمام پٹھانوں کو بس از محاربہ عظیم ملک اودھ سے نکال کر شکست فاش دی اور نواب صفدر جنگ منصور علی خاں بہادر کو صوبیداری ملک اودھ کی تفویض فرمائی .....

حضور (عیش) کے والد ماجد کا نام نامی و اسم گرامی شیخ منور علی صاحب ہے۔

"منور علی کرد خورشید دیں"

ان کا سجع "نگین خاتم ہے۔ بادشاہ جم جاہ غازی الدین حیدر بادشاہ غازی کے دربار میں عہدہ "تحصیل" کا رکھتے تھے .... تمام آبا و اجداد آپ کے مذہب اہلسنت و جماعت رکھتے تھے اور پیرزادے تھے۔ آپ نظام الدین اولیا کے خلیفہ و جانشین کی نسل سے ہیں اور نواب روشن خاں امیر الامرا ہندوستان کے پوتے ہیں۔ سلسلۂ پدری حضرت محمد ابن ابی بکر الصدیق رضوان اللہ علیہ تک منتہی ہوتا ہے اور سلسلہ مادری بواسطہ عبد اللہ ابن عمر خلیفہ ثانی تک پہنچتا ہے۔ اور سلسلۂ مادری راقم السطور کا بواسطہ ابان بن (حضرت) عثمان خلیفہ ثالث تک منتہی ہوتا ہے اور اسی سلسلہ میں راقم السطور حضرت قاضی ضیا الدین پیرانی پیر شاہ عبد الرزاق بانسوی و دیگر عرفائے ہند کے شیخ الشیوخ کا نواسہ ہے۔

فن خوشنویسی میں حضور (عیش) جناب میر مظفر علی صاحب سے استاد "یاقوت رقم" رشکِ میر عماد کے شاگرد ہیں۔ میر صاحب موصوف الصدر تین استاد خوش نویسوں کے شاگرد تھے۔ میرزا محمد باقر مہر کن۔ اور مرزا محمد عباس صاحب شاگرد حافظ نور اللہ صاحب کے تھے اور مرزا رضا علی صاحب جواہر رقم استاد نواب

وزیر الممالک مدار المہام نواب علی نقی خاں بہادر سہراب جنگ کے تھے اور مرزا صاحب ممدوح الصدر اپنے ماموں مرزا محمد عباس صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ اور حافظ نور اللہ صاحب معلم اول فن خوشنویسی کے مملکت ہند میں تھے۔ اور بہ اجماع محققین گویا خدائے فن خوشنویسی تھے۔ یہ وہی میر مظفر علی حسب (؟) خوشنویس ہیں جنھوں نے ایک بار ایک تختی "مفردات طوی" کی حافظ نور اللہ صاحب کی پائی۔ اس کو دیکھ کر ویسے ہی کاغذ کی وصلی بنا کر ویسا ہی خط و قلم بنا کر لکھی اور اس کے نیچے امتحاناً "نور اللہ" لکھ کر مرزا علی رضا صاحب کو دکھائی۔ انھوں نے دیر تک دونوں کو ملاحظہ فرمایا۔ باوجود غور بسیار دھوکا کھایا اور دونوں کو حافظ صاحب (نور اللہ) کا لکھا بتایا..... !

اب اگر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ حضور قبلہ و کعبہ (عیش) فن شاعری میں شاگرد کس کے ہیں؟ تو درحقیقت یہ حال ہے کہ حضور (عیش) نے ابتدائے عمر میں ... حضرت میر حسن عسکری صاحب مرحوم متخلص بہ عرش خلف الصدق ملک الشعرا حضرت میر تقی صاحب مرحوم (میر) سے مشورہ فرمایا تھا۔ وہ زمانہ عہد معدلت عہد بادشاہ جم جاہ فلک بارگاہ ابو المنصور مظفر الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی کا تھا کہ اون (عرش) سے کسی وجہ سے ایسی ناچاقی ہوئی کہ وہ راہ و رسم قدیم بالکل ترک ہوگئی۔ اوس زمانے سے حضور (عیش) نے پھر کسی سے مشورہ نہ فرمایا اپنے ذہنی زور طبیعت اور خداداد لیاقت و فطانت کے سبب سے کوس الملک بجایا۔

شاہی میں حضور (عیش) "سلطانی دفتر اخبار" میں بہ مشاہرہ ایک سو بیس روپیہ ماہوار شاہی ملازم تھے، لیکن اتنے بڑے عظیم الشان عہدے پر مامور ہو کر کبھی حرف رشوت سے آشنا نہ ہوئے اور ہمیشہ اپنے اعلیٰ درجے کے عزیزوں اور قرابت داروں کو عتاب سلطانی سے بچاتے رہے اور ان کی ملکی خطاؤں کو ایسے خطرناک مواقع پر نظر انداز فرماتے رہے کہ ان امور کی تفاصیل مصلحتاً اس مقام پر قلم انداز کی گئیں "

علامہ شیخ فدا حسین مرحوم کی نا تمام عبارت ان جملوں سے آگے نہ بڑھ سکی اور تاریخ کے وہ بہت سے

---

۹ نواب علی نقی خاں "مدار المہام" آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے خسر بھی تھے اور اودھ کے وزیر اعظم بھی۔ مشہور ہے کہ انھیں کی سازش سے "سلطان عالم" اودھ کے تخت سے محروم کیے گئے۔ نواب علی نقی خاں اردو کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ بیدؔ تخلص فرماتے تھے۔ ان کا یہ شعر کافی مشہور ہے ؎

قربان سادگی کے لگا کہنے غیر سے کیا جانے آج کیا تھا کہ بیدؔ خفا گیا

گوشے اُجاگر نہ ہو سکے جو عیشؔ کی شخصیت ۔ کردار اور فن کے بارے میں ہماری معلومات کو کسی منزل پر پہنچا سکتے تھے لیکن ان تمام سطور سے خواجہ عشرت مرحوم کے اس بیان کی واضح تردید ہو جاتی ہے کہ عیشؔ خلیل لکھنوی کے شاگرد نہ تھے ۔

عیشؔ نے لکھنو کی بہار بھی دیکھی تھی اور خزاں بھی ! عرشؔ ، اسیرؔ ، آتشؔ ، ناسخؔ ، انیسؔ ، دبیرؔ کا زمانہ تو ان کی نگاہوں میں تھا ۔ تعجب نہیں جو میرؔ ، مصحفیؔ ، ہوسؔ اور رطالب علی عیشیؔ کے آخری ایام زندگی بھی ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہوں ۔ برقؔ ، بحرؔ ، قلقؔ ، جلالؔ ، پیر و میر شاد ۔ حاتم علی مہرؔ ، امیرؔ مینائی ، داغؔ ، غالبؔ ، مومنؔ ، ذوقؔ ، مرزا شوقؔ ، اور امان علی سحرؔ وغیرہ تو ان کے معاصرین ہی میں تھے ۔ غدر کے بعد انھیں بھی مصائب سے دوچار ہونا پڑا مگر باوضع ایسے تھے کہ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد متعدد دیسی ریاستوں سے طلبی کے باوجود لکھنؤ سے باہر قدم نہیں نکالا ۔ تمام عمر خانہ نشین رہ کر لکھنؤ میں گزاری ۔ والی محمود آباد سے قدیم خاندانی قرابت تھی کبھی کبھی وہاں ضرور تشریف لے جاتے تھے مگر اسی "آن بان" سے جیسے ایک مساوی الدرجہ عزیز کسی دوسرے رشتہ دار کے یہاں جاتا ہے "پیر و میر شاد" کے پوتے شیخ علی حسن مرحوم عیشؔ کے دیکھنے والوں میں سے تھے ، ان کا بیان ہے :

"شیخ فدا علی عیشؔ لکھنوی متوسط القامت تھے ، لیکن جسیم ہونے کی وجہ سے پست قامت نظر آتے گندم رنگ ، جٹی بھویں ، گول چہرہ ، خشخشی داڑھی ، سارے سر پہ بال ، انگرکھا بغیر کرتے کا ۔ بر کا پاجامہ چڑھواں جوتا پیر میں ، بغیر قالب چوگوشیہ ٹوپی سر پہ ۔"

(ماہنامہ نگار لکھنو ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء)

نظم سے زیادہ عیشؔ کی نثری تصانیف کا پلہ بھاری ہے ۔ عہد واجدی میں مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کی جس ادبی تحریک نے جنم لیا تھا رجب علی بیگ سرورؔ کے ساتھ عیشؔ بھی اس تحریک کے سرگرم ساتھیوں میں تھے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہی دونوں تھے جنھوں نے مل جل کر اس انداز تحریر کو رائج کیا تھا ۔ عیشؔ کی نثری تصانیف زیادہ تر اسی طرز بیان کی عکاسی کرتی ہیں ۔ خود شعاہ جوالہ کا انداز تحریر بھی اسی ڈھنگ کا ہے ۔

عیشؔ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف جو اب تک مجھے دستیاب ہوئی ہیں ، درج ذیل ہیں :

۱ ۔ مثنوی گنج شہیداں ۔ مطبوعہ اودھ پریس لکھنو ۔ ۱۳۰۲ھ
۲ ۔ مثنوی نجم طالع ۔ مطبوعہ اودھ پریس لکھنو ۔ ۱۲۹۵ھ
۳ ۔ گلگشت عیش ۔ مطبوعہ مطبع احمدی علی گڑھ ۔ ۱۳۰۶ھ
۴ ۔ آتش عشق ۔ مطبوعہ
۵ ۔ فسانہ دل فریب ۔ مطبوعہ

۶۔ فغانِ عیش ۔ مطبوعہ
۷۔ حالات غدر ۔ قیصر باغ کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال ۔ اس کا قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔
۸۔ دیوان ۔ (غیر مطبوعہ) عیش کا پہلا دیوان ضایع ہوگیا تھا، یہ دیوان علامہ شیخ فدا حسین مرحوم ترتیب دے رہے تھے۔
۹۔ شعلۂ جوالہ۔ (مجموعہ واسوخت) جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔

عیش کے علمی وادبی مشاغل یہیں تک محدود نہیں تھے بلکہ اپنے دور میں وہ ایک کامیاب اور مقبول صحافی کا درجہ بھی رکھتے تھے اور ان کی یہ سرگرمیاں کوئی نئی تھیں بھی نہیں۔ کیوں کہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے وہ سلطنت اودھ میں جس عہدہ پر فائز تھے وہ بھی محکمۂ اخبار سلطانی ہی تھا۔ مولف "اختر شاہنشاہی" نے عیش کے اخبار "آثار الامصار" کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"آثار الامصار"۔ لکھنو۔ محلہ پاٹا نالہ، امام باڑہ جناب غفراں مآب، ہفتہ وار، چار ورق خورد، یوم (اشاعت) پنجشنبہ ... سالانہ سات روپیہ دس آنے۔ یہ اخبار مذہبی صاحبان اثنا عشری کا ہے۔ مالک سید سخاوت حسین اثنا عشری۔ اڈیٹر منشی فدا علی عیش۔
مطبع کنز العلوم (لکھنو) اجرائی ۲۔ جنوری ۱۸۷۶ء

(صفحہ ۱۴ "اختر شاہنشاہی" مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ ۱۸۸۸ء)

"آثار الامصار" صحافتی اعتبار سے کس معیار کا اخبار تھا؟ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا، کیوں کہ اس وقت تک اس اخبار کا ایک شمارہ بھی مجھے دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ اور یہ اخبار کب تک جاری رہا؟ اس کے بارے میں بھی میری معلومات کوئی رہنمائی نہیں کرسکیں۔

۱۸۹۹ء (مطابق ۱۳۱۶ھ) میں بہ مقام لکھنؤ رحلت فرمائی۔ اپنے خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ عیش کے تمام معاصرین نے فارسی اور اردو میں قطعات وفات لکھے۔ جو اس زمانے میں عرصے تک اخبارات میں شایع ہوتے رہے۔ امیر مینائی نے علامہ شیخ فدا حسین مرحوم کو تعزیت نامہ تحریر فرمایا تھا، وہ امیر مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب ہے۔ امیر مرحوم نے تحریر فرمایا تھا،

"واقعہ رحلت عیش مغفور سے جو صدمہ دل نے اٹھایا وہ قابل بیان نہیں، ایسے لائق و جوہر قابل کا دنیا سے اٹھ جانا دنیا کی کمال بدنصیبی ہے۔ اللہ مرحوم کو جنت نصیب کرے اور اعقاب کو صبر کی توفیق دے۔

جس وقت تمھارا سعادت نامہ آیا تھا، میں نے چاہا تھا کہ فی الفور تعزیت نامہ لکھوں اور تمھاری فرمایش کی تعمیل کروں مگر دفعتاً سخت مریض ہوگیا، اب تک اثر اس کا باقی ہے۔ آج فی الجملہ سکون

ہوا تو سطریں لکھیں۔ اور ایک مختصر سا قطعہ تاریخ موزوں کیا۔ جی تو بہت کچھ لکھنے اور کہنے کو چاہتا ہے مگر دل و دماغ کام نہیں دیتے۔ تاریخ اگر پسند آئے تو رسید سے مجھے مطمئن کرو۔ سب عزیز و احباب تعزیت گزار ہیں۔

امیر فقیر

قطع تاریخ

عیش مرحوم کی وفات سے آہ — غم کی تصویر ہر سخن ور ہے
ہائے کیا خوش مذاق شاعر تھے — ہر غزل خوبیوں کا دفتر ہے
خنجر ایک ایک شعر برجستہ — نشتر ایک ایک مصرعہ تر ہے
نمکینی کے ساتھ شیرینی — کس لطافت سے شیر و شکر ہے

ہے یہ سالِ وفاتِ عیش امیر
خلد کیا اچھا عیش کا گھر ہے

۱۳۱۶ھ

امیر کا یہ قطعہ تاریخ فنی حیثیت سے کوئی خاص چیز نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے ضرور اہم ہے کہ یہ قطعہ تاریخ غالباً امیر کا سب سے آخری قطعہ تاریخ ہے۔ اب عیش کے "شعلۂ جوالہ" سے "واسوخت گو شعرا" کے وہ حالات پیش کیے جا رہے ہیں، جن کا تذکرہ سطور بالا میں کیا جا چکا ہے:

(۱) آباد — تخلص ہے مہدی حسین خاں کا۔ خلف الرشید ہیں غلام جعفر خاں کے۔ باشندہ لکھنؤ ہیں شاگرد شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کے ہیں۔ صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ ہر بحر میں غزل کی ان کا دیوان ہے۔ بڑے خوش فکر اور صاحب طبع رسا ہیں، ایک دیوان ان کا مسمی "بہارستان سخن" مطبوع اور مشہور جہاں ہے۔"

آباد کے دو واسوخت نقل کیے گئے ہیں جن کے مطلعے ہیں:

۱۔ جب تلک تھی نہ جوانی تو عجب شادی تھی۔ (۹۸ بند)

۲۔ پیشتر حسن سے یوں آپ خبردار نہ تھے (۳۵ بند)

(۲) آزاد — تخلص ہے محمد امیر الدین صاحب کا۔ باشندہ ہیں بانس بریلی کے۔ شاگرد رشید میر غلام علی شرت تخلص کے۔ کلام ان کا سوائے اس واسوخت کے جو شامل مجموعہ ہذا ہے نظر سے نہیں گزرا اور نہ کوئی شعر ان کا سنا۔ ۔ ۔ تخلص کا توارد میر غلام علی آزاد مرحوم بلگرامی خلف مولوی عبدالجلیل بلگرامی سے ہے۔"

۴۱ بند کا ایک واسوخت آزاد کا بھی شامل ہے جس کا مطلع ہے:

عشق وہ ہوش ربا ہے کہ الٰہی توبہ

(۳) برق :- تخلص ہے جناب فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں بہادر مرحوم کا۔ خلف الرشید حضرت مرزا کاظم علی خاں صاحب علیہ الرحمہ کے تھے۔ جوان، خوش رو، مہذب، با وضع، لاغر اندام، عالم شباب میں، بڑے بانکے اور خانہ جنگ اور بہادر و جری تھے۔ حکمت آشنا بھی تھے۔ شاگرد رشید تھے شیخ امام بخش ناسخ کے۔[1]

برق کا جو واسوخت نقل کیا گیا ہے وہ سولہ بند کا ہے اور اس کا مطلع ہے:

کیا بیاں کیجیے اے برق گرفتاری دل۔

(۴) بحر :- تخلص ہے شیخ امداد علی صاحب کا۔ خلف الرشید ہیں امام بخش (ناسخ) کے۔ باشندۂ لکھنؤ۔ شاگرد رشید ہیں شیخ امام بخش ناسخ مغفور کے۔ صاحب دیوان ہیں۔ طبیعت بہت عالی رکھتے ہیں۔ شاعر بے مثل و لاجواب ہیں مشہور ہے کہ علم عروض و قافیہ خوب جانتے ہیں۔ بہت سے ان کے شاگرد ہیں۔ ان کی آواز میں رعشہ ہمیشہ سے ہے۔ اب بہ سبب ضعف کے رعشہ زیادہ ہو گیا ہے، اس سبب سے شعر کم پڑھتے۔ دو واسوخت ان کے شامل مجموعہ ہذا کیے گئے۔"

(۱) بحر جو حال ہمارا ہے نہ پوچھو ہم سے　　(۴۵ بند)

(۲) یا خدا عشق صنم کا کوئی بیمار نہ ہو　　(۴۶ بند)

(۵) جرأت :- تخلص ہے یحییٰ امان عرف میاں قلندر بخش مرحوم کا۔ خلف الرشید حافظ امان صاحب باشندہ دہلی مقیم لکھنؤ تھے۔ روشن دل بظاہر نابینا تھے۔ شاگرد تھے مرزا جعفر علی حسرت کے۔ الحق طبیعت عاشقانہ تھی کلام دردآمیز ہے۔"

جرأت کے واسوخت کا مطلع ہے:

یارب اندوہ جدائی سے تو مرنا بہتر　　(۲۷ بند)

(۶) جوہر :- تخلص ہے منشی جواہر سنگھ صاحب کا۔ فرزند رشید ہیں بختاور سنگھ راقم کے۔ باشندہ لکھنؤ۔ صاحب دیوان اردو و فارسی۔ فارسی میں شاگرد ہیں گل محمد خاں ناطق کرانی کے۔ اور اردو میں شاگرد ہیں خواجہ وزیر صاحب مرحوم وزیر تخلص کے۔"

---

[1] سن ولادت ۱۲۲۰ھ ۔ وفات ۱۲۷۵ھ۔ ہوشیار جنگ راجہ رتن سنگھ زخمی کے بھانجے تھے۔ دیوان اردو "مخزن فصاحت" فارسی دیوان "مطلع خورشید"، مثنوی قیافہ و نجوم وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔

(صفحہ ۱۱۳ "تذکرہ" بہار سخن" مطبوعہ ایل۔ بی پریس سیتاپور۔ مولفہ بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری)

جوہر کا واسوخت ۶۵ بند کا ہے۔ مطلع ہے:
"ہائے کیوں چرخ ستم گار ستایا مجھ کو"

(۷) جذب — تخلص ہے سید علی حسین صاحب کا۔ شاعر اچھے ہیں۔ صاحب طبع رسا ہیں۔ ملازم اور شاگرد ہیں نواب مرزا محمد مہدی علی خاں "افسوں" کے۔ اور وہ شاگرد ہیں شیخ امداد علی صاحب بحر تخلص کے۔ سوا اس واسوخت کے جو شامل اس مجموعے کے کیا گیا ہے اور کچھ کلام ان کا نہیں ہے۔ تعجب نہیں جو صاحب دیوان بھی ہوں۔ اس سے زیادہ حال ان کا دریافت نہیں ہوا"

جذب کے واسوخت کا مطلع ہے:
"بے سبب کیوں تجھے اے دل خفقاں رہتا ہے" (۶۰ بند)

(۸) جوش — تخلص ہے نواب احمد حسن خاں صاحب عرف اچھے صاحب کا۔ خلف الرشید ہیں نواب محمد مقیم خاں مرحوم کے (ابن نواب محبت خاں مغفور ابن نواب حافظ الملک رحمت خاں مبرور والی ملک کٹھیر) ساکن شہر لکھنؤ محلہ رستم نگر متصل درگاہ جناب حضرت عباس علیہ السلام اندرون کٹرہ نواب محبت خاں مرحوم شاعر خوش فکر عمدہ کلام ہیں" ان کا بھی ایک واسوخت شامل مجموعہ ہے:
"یاد ایام کہ کچھ غم سے سروکار نہ تھا" (بند ۶۵)

(۹) جولاں — "ان کا نام معلوم نہیں مگر تذکرہ "سراپا سخن" سے اس قدر معلوم ہوا کہ شاگرد خواجہ حیدر علی آتش کے ہیں۔ یہ واسوخت جو شامل مجموعہ ہذا ہوا ہے اس کے طرز اور مضمون سے دریافت ہوتا ہے کہ شاعر خوش فکر ہیں۔ طبیعت بھی اچھی ہے۔ سوا اس واسوخت کے اور کوئی کلام ان کا نظر سے نہیں گزرا۔ مولد اور مسکن بھی ان کا معلوم نہیں"

مطلع — یا تو وہ دن تھے کہ جب فصل بہار آئی تھی" (بند ۶۷)

(۱۰) جان صاحب — "تخلص ہے میر یار علی کا۔ ابتدائے شعر گوئی سے ریختہ فرماتے ہیں اور محلات معلی کے محاورے اور ان کی زبان خوب جانتے ہیں۔ ان کی ریختی میں غزل کا لطف ملتا ہے۔ پڑھنا بھی ریختی کا انھیں پر ختم ہے۔ شاگرد رشید ہیں نواب عاشور علی خاں صاحب مرحوم کے۔ فی الحال رام پور میں تشریف رکھتے ہیں۔ ملازم ہیں نواب صاحب رام پور کے۔ یہ "واسوختی" انھیں کی طبع زاد داخل مجموعۂ ہذا کی گئی"

مطلع — عشق کے نام سے میں تو کبھی آگاہ نہ تھی۔ (بند ۴۰)

(۱۱) حکیم — "تخلص ہے سید غضنفر علی صاحب کا۔ خلف الرشید ہیں تدبیر الدولہ منشی سید مظفر علی خاں بہادر "بہادر جنگ" اسیر تخلص۔ باشندہ لکھنؤ کے۔ اور وہ شاگرد ہیں میاں مصحفی صاحب مرحوم کے۔ بزرگ ان کے

ہمیشہ سے باشندۂ "امیٹھی" من مضافات لکھنؤ سے تھے۔ منشی صاحب موصوف مشاہیر اساتذہ لکھنؤ سے ہیں۔ عہد حضرت امجد علی شاہ جنت مکان میں میر منشی تھے محکمۂ وزارت کے۔ نواب امین الدولہ بہادر "ذوالفقار جنگ" مرحوم کی سرکار میں نہایت رسوخ رکھتے تھے۔"

حکیم کے واسوخت میں ۸۷ بند ہیں۔ مطلع ہے:

کار خانے عجب اس عشق فسوں ساز کے ہیں

(۱۲) ذکی ۔ تخلص ہے اسد الدولہ رستم الملک نواب محمد ذکی خاں بہادر "فیل جنگ" عرف نواب بہادر مرحوم کے۔ یہ خلف اکبر تھے نواب دلیر الدولہ مرزا حیدر صاحب مغفور حیدر تخلص کے۔ بزرگ ان کے سب نیشاپوری ہیں۔ بڑے سیر چشم امیر ابن امیر اور رئیس ابن رئیس۔ اسم با مسمیٰ طبیعت ذکی رکھتے ہیں۔ صاحب دیوان ہیں مگر دیوان ان کا نظر راقم سے نہیں گزرا۔"

ذکی کے واسوخت کا مطلع ہے:

یاد ایام کہ کچھ دل کو غم و درد نہ تھا (بند ۳۶)

(۱۳) رعنا[1] ۔ (منشی مراد علی خاں) جناب ممدوح قوم سے افغان یوسف زئی ۔ گہر شریف ہیں۔ اصل اسلاف کی ولایت افغانستان ہے مگر عہد شاہ جہاں بادشاہ سے از روز بنا شہر مراد آباد (یو۔پی) جو نام سے "سلطان مراد" ابن شاہ جہاں کے بسا ہے اس شہر کے متوطن اور روسا سے ہیں۔ بزرگ ان کے سلاطین دہلی سے لے کر تا تسلط وزیر اودھ جاگیردار و مختار رہے۔ حضرت سرکار انگریزی ملک پنجاب سرحد افغانستان میں ۱۸۵۰ء سے تا ۱۸۵۸ء کمال لیاقت اور شجاعت اور نام آوری اور عزت سے روزگار بیش قرار کیا۔ ہزاروں روپیہ انعام اور اکثر اسناد کارگزاری پائیں اور ترقی اور خیر خواہی سے مورد تحسین و آفرین حکام گورنمنٹ برٹش رہے۔ بعدہ روزگار انگریزی سے استعفا دے کر ریاست "کپور تھلہ" و مالیر کوٹلہ ملک پنجاب والور میں ممتاز رہے اور ذاتی لیاقت اور رسائی اور تدبیر سے ہر ریاست کے مشکل کاروبار میں تا محکمہ عالیہ گورنری اعلیٰ ہند فتحیاب رہے اور ہر جگہ سے خود ترک روزگار کیا۔ اور ۱۸۶۹ء سے حسب الطلب والی ملک کے "جودھ پور" میں اکر نائب ریاست مقرر ہوئے۔ ہر کہ و مہ ان کے حسن سلوک اور خوش وضعی کا مداح ہے، حکام انگریزی اور سری مہاراجہ صاحب بہادر والی "مارواڑ"

---

[1] رعنا کے علاوہ نواب مراد علی خاں "نظام" اور "مضطر" بھی تخلص کرتے تھے۔ جناب مالک رام نے تذکرہ "تلامذۂ غالب" میں ان کے تحقیقی حالات تحریر فرمائے ہیں۔ غالب کے علاوہ انھوں نے منشی مظفر علی خاں اسیر کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۲ جون ۱۸۹۶ء کو سری نگر (کشمیر) میں بعارضہ ہیضہ وفات پائی اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔

بھی بہت عزت و عنایت کرتے ہیں۔ اکثر اعلیٰ اعلیٰ حکام انگریزی سے تا جناب وائسرائے و گورنر جنرل بہادر ہند حال اور نوابان عالی شان اور راجگان و مہاراجگان والی ملک سے ملاقات ہے اور سب تعظیم و تکریم سے پیش آتے ہیں۔ سن چالیس سال سے متجاوز ہو چلا ہے۔ قد و قامت۔ تناسب اعضا۔ خد و خال۔ چہرہ مہرہ۔ وجاہت خداداد اور سیرت و صورت سے اسم بامسمیٰ اور بے شبہ جوان رعنا ہیں۔ فکر سلیم طبع مستقیم۔ ذہن رسا۔ طبیعت میں اپج اور ذکا۔ طینت پاک۔ دل صاف۔ ہر بات میں انداز۔ یاروں کے یار۔ مزاج میں انکسار۔ شاطر بے رنج۔ خلیق۔ متواضع۔ بامروت۔ رقیق القلب۔ با اوقات۔ کریم النفس۔ عالی ہمت۔ جہاں آشنا۔ خوش پوش۔ خوش وضع۔ لطیف۔ ظریف اور بڑے آن بان کے یک رنگ شخص ہیں۔ ان کے محامد و کارنامے قابل اس کے ہیں کہ بطور یادگار و سوانح عمری لکھے جاویں۔ اکثر کمیٹی اور انجمن علمی وغیرہ واقع ہندوستان کے ممبر بھی ہیں اور رائے صواب ان کی ہر معاملے میں برجستہ و عمدہ ہے۔ جفاکش اور محنتی حد درجہ حتیٰ الوسع اوقات عزیز کی سب سے زیادہ قدر کرتے ہیں اور اکثر وقت آپ کا بعد فراغ امور منصبی کے ہمیشہ تحریر یا مطالعہ کتب میں صرف ہوتا ہے۔ کلکتہ سے تا جموں و پشاور اور شملہ سے تا ریواں و راجپوتانہ سیاحت ہند بھی کی ہے۔ علوم متعارفہ عربی و فارسی گھر میں تحصیل کیے۔ تحریر چست۔ تقریر درست ہے۔ معاملہ نویسی قلم برداشتہ اور اردو نثر مقفیٰ ایسی کم دیکھی ہے۔ علم نجوم و جفر و تاریخ و علم موسیقی و تصوف وغیرہ صرف مطالعہ کتب و زور طبیعت سے حاصل کیا۔ اور "تاریخ البلاد" و "نوائے غریب" تاریخ میں۔ اور "نغمۂ صنم" و "غنچۂ راگ" فن موسیقی ہند میں۔ اور "ظل ناصری" علم جفر میں آپ کی عمدہ تالیفات سے قابل یادگار ہے۔ اور یہ سب نام تاریخی ہیں اور ایک نظم کی کتاب کئی ہزار شعر کی اور ایک عجیب نسخہ علم تسخیر بزم کا زیر تالیف ہے۔ اس عجوبہ علم و عمل میں بھی آپ کو خوب دست گاہ حاصل ہے یعنی بقولے

دل بیار و دست بکار

نماز روزہ کی پابندی اور چلہ۔ زکواۃ و عملیات کا شوق بھی چلا جاتا ہے۔ چناں چہ یمن اسمائے باری تعالیٰ سے ایک بار شب قدر دیکھی اور کئی بار زیارت حرمین شریفین و کربلائے معلیٰ اور حضرت معین الدین چشتی اور صحابہ کرام اور جناب علی مرتضیٰ۔ امامین حسنین علیہم السلام اور کئی بار رویت و زیارت حضرت رحمۃ اللعالمین جناب رسالت مآب محمد صلعم سے بھی بہ عالم رویائے صادقہ مشرف ہوئے بلکہ دو بار حضور صلعم کے ساتھ جماعت میں نماز پڑھی۔ خلاصہ کلام آں کہ :-

حدیث است و کاوش اعجاز است
مرا بہ خواب نماید جمال نورانی

بہ ایں ہمہ کثرت اشغال و قدر اوقات عزیز کے شعر و سخن سے ذوق ہے۔ آپ کو ملک الشعرائے ہند

حضرت نجم الدولہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالبؔ دہلوی سے تلمذ حاصل ہے اور صاحب دیوان ہیں۔ اکثر اردو فرماتے ہیں۔ مدتوں کلام آپ کا طرہ اخبارات ہند ہوتا رہا ہے۔ رہا یہ واسوخت سب سے نرالا ہے۔"

مطلع ۔۔۔۔ (بند ۔۔۔۔)

(۱۴) رندؔ ۔ "تخلص ہے جناب نواب سید محمد خان بہادر کا۔ خلف الرشید ہیں نواب سراج الدولہ غیاث الدین محمد خان بہادر نصرت جنگ نیشاپوری کے۔ نواسے نجف خاں بہادر کے۔ باشندۂ فیض آباد بمقیم لکھنؤ تھے صاحب دیوان۔ ارشد تلامذہ خواجہ حیدر علی آتشؔ مرحوم سے ہیں۔ فی الواقع دیوان ان کا قابل ملاحظہ ہے۔ طبیعت عاشقانہ رکھتے تھے۔"

رند کے واسوخت کا مطلع ہے:

بیش ازیں یار ترا عاشق شیدا تھا میں (بند ۴۴)

(۱۵) رقتؔ ۔ "تخلص ہے مرزا قاسم علی مرحوم کا۔ بزرگ ان کے قدیم الایام سے متوطن خطۂ جنت نظیر کشمیر تھے۔ مگر مولد و مسکن مرزا صاحب مرحوم کا دہلی ہے۔ مقیم لکھنؤ تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ شاگرد تھے میاں قلندر بخش جرأت مغفور کے۔ کوئی کلام ان کا سوا اس واسوخت کے جو شامل مجموعۂ ہذا ہے نظر سے نہیں گزرا ۔ ۔ ۔ ۔ باقی حال دریافت نہیں ہوا۔"

مطلع واسوخت:

دوستو! حال زبوں کا مرے افسانہ سنو (بند ۲۲)

(۱۶) راحتؔ ۔ "تخلص ہے مرزا محمود بیگ دہلوی کا۔ معلوم نہیں شاگرد کس کے ہیں، نہ اور حالات ان کے معلوم ہوئے۔"

مطلع ۔ ایک دن وہ تھا کہ الفت سے ہم آگاہ نہ تھے۔ (بند ۶۰)

(۱۷) سحرؔ ۔ "تخلص ہے شیخ امان علی مرحوم کا۔ خلف الرشید شیخ محمد امین باشندۂ لکھنؤ کے ہیں۔ اور صاحب دیوان ہیں۔ شاگرد بخشی الملک فتح الدولہ مرزا محمد رضا خاں برقؔ کے ۔ ۔ ۔ تا حیات اپنی ایک وضع اور نہایت آن بان سے بسر کی۔"

سحر کے تین واسوخت نقل کیے گئے ہیں:

۱۔ ناک میں دم ہے بہت عشق سے جی عاری ہے (بند ۲۲)

۲۔ اب دل میں رنج اٹھانے کی طاقت نہیں رہی (بند ۴۰)

۳۔ نئے انداز کا واسوخت سُناتے ہیں تمھیں (بند ۱۷)

(۱۸) سپہر — تخلص ہے مرزا محمد عباس عرف چھوٹے مرزا صاحب۔ خلف الرشید ہیں مرزا بندہ حسن خاں صاحب کے۔ شاگرد رشید ہیں سید آغا حسین مرزا صاحب عشق کے۔ ساکن ہیں کشمیری محلہ من محلات شہر لکھنؤ کے۔"

مطلع واسوخت — دل مرا شیفتۂ زلف گرہ گیر نہ تھا۔ (بند ۸۴)

(۱۹) شوق — یہ تخلص ہے حکیم تصدق حسین عرف نواب مرزا کا۔ خلف حکیم آغا علی خاں ہیں مولد اور مسکن ان کا لکھنؤ ہے ... شاگرد استاد عدیم المثال، یگانہ روزگار، آتش بیان خواجہ حیدر علی آتش کے ہیں۔ مثنوی "بہار عشق" اور "زہر عشق" اور "فریب عشق" کہ جو مشہور فی الآفاق ہے اور یہ واسوخت جو شامل اس مجموعہ بے نظیر کے کیا گیا ہے ان سے یادگار ہے۔"

شوق کے واسوخت کا مطلع ہے:

وہ بھی کیا دن تھے کہ تم شوخ جفا کار نہ تھے۔ (بند ۱۴)

(۲۰) شوق — یہ بزرگ سوائے حکیم نواب مرزا شوق (کے) ہیں۔ نام ان کا معلوم نہیں اور مولد اور مسکن بھی ان کا دریافت نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کس کے شاگرد ہیں۔ سوائے اس واسوخت کے جو درج صحیفہ ہذا کے ہے کچھ کلام ان کا دیکھا نہ سنا۔"

مطلع — پیش ازیں غیر نہ تھا بزم میں اے یار کوئی (بند ۲۲)

(۲۱) شایاں — تخلص ہے منشی طوطا رام کا۔ خلف الرشید ہیں منشی آتما رام ولد لالہ من سکھ رائے ابن رائے منسا رام بخشی الملک۔ قوم کایستھ سری باستم، ملقب بہ "کالی ڈھال" کے۔ جدامجد ان کے رائے تلسی رام حضور نواب آصف الدولہ بہادر سے مخاطب بہ خطاب "رائے" ہوئے اور "مہر نگیں زمرد" خطاب مذکور کو عطا ہوئے اور عہد یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں بہادر جنت آرام گاہ میں بعہدۂ بخشی گری فوج پر ممتاز ہوئے۔"

مطلع واسوخت — آج کھولے پر پرواز ہے عنقائے قلم (بند ۱۲۹)

(۲۲) شکوہ — تخلص ہے آغا محمد حسین صاحب کا۔ صاحب دیوان ہیں۔ شاعر عالی فکر نازک خیال ہیں۔ شاگرد ہیں مرزا محمد اصغر علی نسیم دہلوی کے۔ قدیم سے باشندہ لکھنؤ ہیں۔ مگر فی الحال کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں۔"

شکوہ کے واسوخت میں ۱۳۷ بند ہیں۔ مطلع ہے:

شکر خدا کہ اب تو طبیعت بحال ہے۔

الف لیلہ منظوم۔ تاریخ طلسم ہند، طلسم شاہان اور رمابھارت منظوم ان کی یادگار ہیں۔ [illegible] میں وفات پائی۔

(صفحہ ۸۲ "تذکرہ ہندو شعرا" خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی)

(۲۳) **شیدا** — تخلص ہے نواب مرزا علی خاں صاحب خلف نواب رمضان علی خاں بہادر کا۔ جو برادر نسبتی تھے عین الدولہ نواب سعادت علی خاں بہادر جنت آرام گاہ کے۔ صاحب دیوان ہیں۔ شاگرد ہیں خواجہ حیدر علی آتش مغفور کے۔ چناں چہ یہ واسوخت جو درج مجموعہ ہذا ہے خواجہ صاحب مرحوم کے نام سے مشہور ہے مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ واسوخت نواب صاحب ممدوح کا تصنیف فرمایا ہوا ہے۔"

مطلع واسوخت — آگے اک یار نہ تھا یار ترے یار تھے ہم (بند ۱۷)

(۲۴) **صفیر** — تخلص ہے سید فرزند احمد صاحب رئیس قصبۂ مردم خیز بلگرام کا۔ شاگرد رشید ہیں شیخ امان علی سحر تخلص کے۔ اور فارسی میں شاگرد ہیں جناب نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر عرف مرزا نوشہ دہلوی غالب تخلص کے۔ ان کے کلام سے سراپا رنگ طبیعت جناب شیخ امان سحر کا ٹپکتا ہے۔"

صفیر کے دو واسوخت شامل مجموعہ ہیں:

۱۔ رخصت اے ضبط و تحمل دم فریاد آیا (بند ۶۷)

۲۔ اے جنوں عالم تنہائی ہے (بند ۵۵)

(۲۵) **عرش** — تخلص ہے جناب سید عسکری عرف میر کلو صاحب کا۔ خلف الرشید ہیں جناب ملک الشعرا بلبل ہند میر محمد تقی صاحب دہلوی میر تخلص کے۔ صاحب دیوان ہیں۔ شاگرد ہیں اپنے والد مرحوم کے۔ بعد ان کے پھر کسی کے شاگرد نہیں ہوئے فقط ان کو اپنی طبیعت سے مشورہ رہا۔ مولد اور مسکن ان کا لکھنؤ ہے۔ مرد قانع فیاض باخدا ہیں۔"

عرش کے واسوخت میں ۲۱ بند ہیں۔ مطلع ہے:

یار صورت بھی نہیں اب مجھے دکھلاتا ہے

(۲۶) **عاشق** — تخلص ہے مرزا محمد تقی عرف چھجو بیگ کا۔ خلف الرشید ہیں مرزا اچھو بیگ صاحب بانکے کے۔ اور خویش ہیں محمد مصطفیٰ خاں صاحب مرحوم (مالک مطبع مصطفائی) کے۔ شاگرد رشید ہیں مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے۔ صاحب دیوان ہیں۔"

عاشق کے واسوخت کا مطلع ہے:

دوستو درد محبت کا بیاں کرتے ہیں (بند ۴۶)

(۲۷) **عقیل** — تخلص ہے شیخ محمد حسن کا۔ خلف الصدق ہیں شیخ شفیع علی خاں کے۔ پوتے ہیں خلیل الرحمٰن خاں مرحوم کے۔ جو عہد نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم میں رسالہ دار تھے۔ شیخ زادہائے لکھنؤ سے ہیں۔ مولد اور مسکن ان کا اور ان کے بزرگوں کا قدیم سے لکھنؤ ہے۔ صاحب دیوان ہیں۔

شاگرد ہیں مرزا بسم اللہ شاعرؔ کے۔ والد ان کے داستان گوئی میں کو سن لمن الملکی بجاتے ہیں اور خود فن داستان (گوئی) میں صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں۔ کئی دفتر ضخیم الحجم تصنیف فرمائے ہیں۔"

عقیلؔ کے واسوخت کا مطلع ہے:

واہ اے عشق عجب مفسدہ پرداز ہے تو (بند ۳۷)

(۲۸) علیشیؔ — "تخلص ہے طالب علی خاں مرحوم ابن علی بخش خاں باشندہ لکھنؤ کا۔ دیوان فارسی مع قصائد اور دیوان ہندی اور مثنوی "سرو چراغاں" ان سے یادگار ہے۔ نظم و نثر میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ شاگرد رشید تھے مرزا احمد حسن قتیلؔ مغفور کے۔ عین شباب میں وفات پائی۔ قتیل مغفور اکثر ان کی ابتدائے شاگردی میں فرماتے تھے:

پارہ خواہد شد ازین دست گریبانی چند

مطلع — عشق کا پھر سروساماں ہے خدا خیر کرے (بند ۲۱)

(۲۹) فراقؔ — "تخلص ہے خواجہ بہادر حسین خلف خواجہ مرزا جان آتکی۔ باشندہ لکھنؤ کا۔ صاحب دیوان و شاگرد شیخ ناسخ مرحوم کے ہیں ..... سوائے اس واسوخت کے جو مجموعہ ہذا میں درج ہے کچھ کلام ان کا نہیں سنا۔"

مطلع — وہ بھی کیا دن تھے کہ جن روزوں میں باہم ہم تھے (بند ۲۴)

(۳۰) قلقؔ — "تخلص ہے آفتاب الدولہ خواجہ اسد بہادر کا۔ خلف الرشید ہیں خواجہ بہادر حسین فراقؔ بن خواجہ آتکی کے عہد شاہی میں مصاحب تھے حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اعاد اللہ ملکہ کے۔ باشندہ لکھنؤ ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ شاگرد رشید اور ہمشیر زادہ خواجہ وزیر۔ وزیرؔ تخلص کے۔ یہ واسوخت اور ایک "نامہ" اور "سہ نثر" اور "طلسم الفت" "مثنوی ان سے یادگار ہے۔"

قلقؔ کے واسوخت کا مطلع ہے:

آج وہ غیروں سے ملنے کی قسم کھاتے ہیں۔ (بند ۵۲)

(۳۱) قیصرؔ — "ان کا حال کچھ دریافت نہیں۔ واللہ واعلم یہ کون بزرگ ہیں۔ مگر تذکرۂ "سراپا سخن" سے

---

۵ میر محمد علی عرف میر بسم اللہ لکھنوی انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تک بقید حیات تھے۔ ان کا قلمی دیوان میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

۵ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ سن ولادت تخمیناً ۱۱۹۰ھ اور سن وفات ۱۲۳۳ھ۔ اردو فارسی کے کلیات (قلمی) رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔

(ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ۔ اپریل ۱۹۹۰ء)

اس قدر واضح ہوتا ہے کہ یہ تخلص ہے شہزادہ مرزا محمد خورشید بخت بہادر کا۔ خلف اکبر مرزا محمد آسماں قدر بہادر مغفور کے ہیں۔ پوتے مرزا محمد خرم بخت بہادر بن مرزا جہاں دار شاہ بہادر کے۔ شیخ گوہر علی مشیر[۱] شاگرد رشید مرزا دبیر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ سے ان کو مشورہ ہے۔ بہ سبب سیر اور تصنیف کتب تاریخ فکر شعر کم تر فرماتے ہیں بہر حال یہ واسوخت جن بزرگ کا ہے خوب تصنیف فرمایا ہے۔"

مطلع ــــ کل کا ہے ذکر نہ واقف تھا دل آزاری سے　　(بند ۳۱)

(۳۲) لا اوری[۲] ـ "ان کا نام و تخلص کچھ دریافت نہیں ہے۔"

واسوخت کا مطلع ہے:

اب تو کچھ نام خدا طرز نیا سیکھے ہو　　(بند ۲۳)

(۳۳) لا اوری[۲] ـ" کچھ پتا نہیں۔ نام و نشان معلوم نہ ہو سکا۔"

مطلع ــــ عشق بے طرح ستاتا ہے خدا خیر کرے　　(بند ۱۴)

(۳۴) مہر ـ "تخلص ہے محمد کامیاب خاں عرف عبداللہ خاں کا۔ خلف الرشید ہیں محمد مصطفےٰ خاں مرحوم "صاحب مطبع مصطفائی" کے۔ باشندہ لکھنؤ ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ فارسی میں شاگرد ہیں میر ناصر علی صاحب مرحوم متخلص بہ نصیر مصنف "گلستان مسرت" اور اردو میں شاگرد رشید ہیں مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی مرحوم کے۔"

ان کے واسوخت کا مطلع ہے:

لو سنبھالو مجھے درد جگری بڑھتا ہے۔　　(بند ۲۹)

(۳۵) مجرم ـ "کچھ حال معلوم نہیں۔"

مطلع واسوخت میاں مجرم:

دوستو سنیو یہ قصہ مری نادانی کا۔　　(بند ۱۱)

---

[۱] شیخ گوہر علی مشیر قصبہ "پینتے پور" (ضلع سیتاپور) کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں کے مناظرانہ ماحول میں پرورش پائی۔ مرزا دبیر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے مگر طبیعت کا رنگ کچھ اور تھا۔ بجائے مرثیہ کے "ہرسیہ" ایجاد کیا جس میں قاتلان حسینؓ کی ہجو سودا کے رنگ میں شروع کی۔ دبیر سے جوش عقیدت میں کبھی کبھی میر انیس پر بھی چوٹ کر جاتے تھے۔ مولوی حیدر فیض آبادی کی مناظرانہ کتاب "قبقاب" کا جواب "کنتاپ" لکھا جو اتنی فحش تھی کہ ۱۸۸۲ء میں ضبط کر لی گئی۔

[۲] غالباً یہ دونوں ایک ہی کردار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "لااوری" لاہوری کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(نادم سیتاپوری)

(۳۶) معجز — "تخلص ہے مرزا محمد رضا ولد مرزا علی اکبر باشندہ لکھنو کا۔ صاحب دیوان ہیں۔ شاگرد رشید ہیں حکیم محمد علی خاں مسیحا تخلص اور خواجہ وزیر۔ وزیر تخلص کے"

مطلع — کون سے باغ میں گل سبزۂ بے گانہ ہے (بند ۲۳۲)

(۳۷) ملال — "تخلص ہے شیخ محمد حسین صاحب کا۔ صاحب دیوان ہیں۔ شاعر خوش فکر رنگین طبع ہیں۔ شاگرد ہیں مرزا محمد اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے۔ مولد اور مسکن ان کا اور ان کے بزرگوں کا ہمیشہ سے لکھنو ہے"

ملال کے واسوخت میں پچاس بند ہیں۔ مطلع ہے:

ہاں خبردار کہ دل گرم فغاں ہوتا ہے

(۳۸) نور — "تخلص ہے میر وزیر صاحب کا۔ خلف الصدق نیر بادشاہ صاحب باشندہ لکھنؤ کے ہیں۔ صاحب دیوان۔ شاگرد رشید ہیں بخشی الملک فتح الدولہ بہادر مرزا محمد رضا خاں برق مرحوم کے۔ مشاہیر شعرا لکھنؤ سے ہیں۔ شاعر رنگین طبع ہیں، خوش فکران لکھنو ہیں، بہت غنیمت ہیں۔ چند عرصے سے سرکار جناب مستطاب معلی الالقاب نواب وزیر مرزا صاحب بہادر میں ملازم ہیں"

مطلع — کوئی وارفتۂ زلف سیہ یار نہ ہو (بند ۴۳)

(۳۹) نثار — "تخلص ہے منشی سدا سکھ دہلوی خلف منشی سیتل چند منصب بادشاہ کا۔ شاگرد ہیں مرزا رفیع سودا کے۔ مقیم الہ آباد ہیں۔ جد امجد ہیں منشی کشوری لال صاحب منصف قنوج ضلع فرخ آباد کے"

نثار کے دو واسوخت شامل ہیں جن کے مطلعے ہیں:

۱ — ہر چند کہ اے مشفق دل کے تئیں سمجھایا (بند ۱۰)

۲ — ہجر میں عشق کی سوزش کا بیاں کیا کیجے (بند ۹)

(۴۰) ہلال[1] — "تخلص ہے مرزا محمد صاحب خلف مرزا حاجی صاحب کا۔ معلوم نہیں کہ یہ شاگرد کس

---

[1] عام طور سے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ مشہور یہی ہے کہ "مرزا محمد" امیر علی خاں ہلال کا عرف تھا۔ یہ حکیم ضامن علی جلال کے پہلے استاد تھے۔ بعد میں ہلال نے انھیں اپنے استاد علی اوسط رشک کے سپرد کر دیا تھا۔

خواجہ عشرت مرحوم نے تذکرۂ "آب بقا" میں انھیں فتح الدولہ برق کا شاگرد بھی لکھا ہے۔ عشرت مرحوم تحریر فرماتے ہیں — "شاگرد میاں برق "پار" میں رہتے تھے۔ اور "جلال" نواز تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ قبر "گؤگھاٹ" (لکھنؤ) پر سنی جاتی ہے"

(صفحہ ۴۰ آب بقا)

استاد کے ہیں ؟ اور مولد اور مسکن ان کا کہاں ہے ؟ سوا اس واسوخت کے جو درج مجموعۂ ہذا کیا گیا ہے کچھ کلام ان کا نہ دیکھا نہ سُنا۔"

مطلع ـــ کل کی ہے بات صنم تیرا یہ انداز نہ تھا۔　　(بند ۲۴)

(۴۱) ہمت[1] ـــ تخلص ہے لالہ بنسی دھر صاحب کا۔ شاگرد ہیں منشی مینڈھو لال[2] صاحب زار تخلص کے۔ مولد اور مسکن ان کا لکھنؤ ہے۔ شاعر اچھے ہیں۔ بجز اس واسوخت کے جو شامل مجموعہ ہذا ہے کچھ کلام ان کا نہیں سُنا۔

واسوخت کا مطلع ہے:

نیم خوابی میں عجب خواب ہے ہم نے دیکھا　　(بند ۶۰)

(۴۲) یادگار ـــ تخلص ہے حسن علی خاں ولد اکرام احمد خاں ابن کاظم علی خاں کا۔ ساکن قدیم ہیں احاطہ خانساماں واقع لکھنؤ کے۔ تحصیل علم و شاعری میں شاگرد ہیں میاں جعفر صاحب متخلص بہ مخمور کے۔"

یادگار کے واسوخت کا مطلع ہے:

بد بلا عشقِ حسینانِ زماں ہوتا ہے　　(بند ۳۲)

اب سے ایک صدی قبل کے یہ نقش و نگار فن شعر کی صرف ایک صنف "واسوخت" کے ان باکمالوں کی نشاندہی کرتی ہے جنھیں ہم بھلا چکے ہیں۔ فن و ادب کے بدلتے ہی اب بہت سی اصناف سخن بھی ختم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ "واسوخت" کہنا تو درکنار۔ اب "واسوخت" پڑھنے والے ہی کتنے رہ گئے ہیں جنھیں اس صنفِ سخن سے دلچسپی ہو۔ پھر بھی اردو ادب کی تاریخ میں اگر "لکھنؤ" کی کوئی جگہ باقی رہی تو مرثیہ اور واسوخت کسی نہ کسی نہج سے زندہ ضرور رہیں گے۔

---

[1] خواجہ عشرت لکھنوی نے تذکرۂ "ہندو شعرا" (صفحہ ۱۲۸) میں لکھا ہے۔ "منشی بنسی دھر کائستھ سکسینہ بن رائے دیبی دین خلف منو لال زار، شاگرد (رام دیال) نادم۔ ان کے شاگردوں میں منشی باقر علی ہمسر نواب کسریٰ جاہ بہت مشہور تھے۔ ساکن محلہ نوبستہ (لکھنؤ) کہنہ مشق شاعر تھے۔ قصہ ہنس جواہر آپ نے اردو میں نظم کیا ہے تحقیق الفاظ کا بہت شوق تھا۔۔۔۔ ۱۸۸۱ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا دیوان قلمی موجود ہے۔"

بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری نے "تذکرۂ بہار سخن" (صفحہ ۳۹۴) میں بھی ہمت کو منشی مینڈھو لال زار و منشی رام دیال نادم کا شاگرد لکھا ہے۔ مہاراجہ بال کرشن بہادر دیوان شاہ اودھ کے خاندانی تھے۔

[2] منشی مینڈھو لال زار خلف منشی سیندی لال لکھنوی تلمیذ منشی طوطا رام عاصی لکھنؤ کے باکمال استاد تھے۔ ان کی انشاء "گلزار فصاحت" فارسی درس کی مشہور و مقبول کتاب ہے۔ ۱۸۶۸ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ منشی بنسی دھر ہمت کے علاوہ منشی گوبند پرشاد فضا، کنور جی مدہو لالے جی تجلی، رائے دولت رائے شوق، بخشی نوندھ رائے وفا، منشی جے سکھ رائے مقبول اور راجہ جن لال نظم وغیرہ ان کے شاگردوں میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔

(صفحہ ۱۸۱ بہار سخن)

عابد رضا بیدار

اودھ پنچ، اُنیسویں صدی میں

"اودھ پنچ" ہندوستانی ظرافت نگاری کے لیے ایک اہم ارتقائی کڑی ہونے کے علاوہ اس لحاظ سے بڑا اہم اخبار رہا ہے کہ اس نے اپنے زمانے میں بڑا متوازن ترقی پسند رول ادا کرنے کی کوشش کی۔ سیاست میں انڈین نیشنل کانگرس کی غیر مشروط حمایت، اور اصلاحات کی مانگ، ادب میں قدیم قافیہ پیمائی پر اعتراضات کی بھرمار، تہذیب میں دیوالی، ہولی اور عید، محرم میں یکساں دلچسپی اور صحافت میں بے لاگ تبصروں اور خوشامد سے گریز کرنے کی طرح ڈالنے میں اپنے ہم عصروں میں اودھ پنچ کا مثیل ملنا دشوار ہے۔ بعض جگہ مخالفت میں یہ اپنے حدود سے گزر بھی جاتا تھا۔ اسی لیے علی گڑھ تحریک کے بعض جاندار پہلوؤں کو بھی اس نے اپنی مخالفت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا۔ حالیؔ پر اعتراضات اس کا ایک مظہر ہیں اور جدید تعلیم کا مضحکہ اڑانا دوسرا مظہر۔

"اودھ پنچ" کے ۱۸۷۵ء، ۱۸۷۸ء، ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۷ء، ۱۸۸۸ء، ۱۸۸۹ء، ۱۸۹۱ء، ۱۸۹۲ء، ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۸ء کے فائل میرے پیش نظر رہے ہیں۔ یہ فائل رام پور، انجمن ترقی اردو اور آزاد لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان میں بعض اہم عنوانات پر یا بعض اہم شخصیتوں کی لکھی ہوئی ایسی تحریریں جو آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مفید ہو سکتی ہیں میں نے یک جا کر دی ہیں۔

پہلے اہم عنوانات یا اہم لکھنے والوں کی تحریریں ملاحظہ ہوں اور آخر میں متفرقات:

علی گڑھ اور سرسید

اودھ پنچ علی گڑھ تحریک کے مخالف کیمپ کے قائدوں میں سے تھا۔ جب جب موقع ملتا تھا سنجیدہ یا مزاحیہ انداز میں علی گڑھ، سرسید، کانفرنس، اور سرسید کے ساتھیوں کے کمزور پہلوؤں کی گرفت اور اعتراضات کی بوچھار کرتا رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں کانگرس اور سرسید میں جو آویزش تھی، اور خود پنچ کی کانگرس کے حق میں مستقل طرف دارانہ

پالیسی کا اظہار بھی ہوتا رہتا تھا۔

۱۸۸۸ء

یکم مارچ کے پرچے میں ۲۸ فروری کو سید محمود کی شادی ہوئی، اس کی خبر دے کر اس پر ایک اعتراضیہ شذرہ لکھا ہے۔ ۷ رجون کی اشاعت میں ایک نیچری مضمون کا عنوان ملاحظہ ہو۔ یہ مضمون لکھنؤ کی کسی کانفرنس سے سرسید کے کسی ساتھی کے خارج کرنے پر لکھا گیا ہے:

نیچری محفل رنداں میں بہت آئے گئے
خوب لاچار تھے کچھ مفسدہ پھیلائے گئے
شرکا، پہلے بہت غصہ وغم کھائے گئے
آخرالامر وہ اس ڈھب سے نکلوائے گئے
پا بدست دگرے دست بدست دگرے

۹ راگست کے پرچے میں "اردو شاعری" کے عنوان سے جو مضمون ہے اس لحاظ سے خاصا دلچسپ ہے کہ حالی کی شاعری میں جن عیوب کو تلاش کر کے ۱۸۸۷ء تک ان کا مذاق اُڑایا گیا تھا حالی ہی کی باتیں اس مضمون کے مصنف اصغر حسین نے بھی اپنی زبان میں لکھی ہیں۔ ذیلی عنوان بھی سُن لیجئے: "ہندستانی موجودہ شاعری نے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈالا ہے"

۶ ستمبر کے اودھ پنچ کا ایک نکتہ ملاحظہ ہو ــــــ اور یہ کل مضمون بس اتنا ہی ہے اور اسی طرح لکھا بھی ہے:

"سرسید احمد خاں صاحب کی
پیٹ ریا ٹک سوسائٹی
کی اصلیت مندرجہ بالا عنوان سے ظاہر ہے"

۱۸۸۹ء

۷ مارچ کے اڈیٹوریل میں
محسن الملک اور وقار الملک پر "معاملہ معدنیات میں محسن الملک مولوی مہدی علی خاں اور رزیڈنٹ ریاست نظام ایک طرف، اور فتح نواز جنگ اور سر آسماں جاہ مدار المہام کے نفس ناطقہ یعنی مولوی مشتاق حسین صاحب انتصار جنگ اور اسی وجہ سے خود سر آسماں جاہ دوسری طرف کوشش میں ہیں کہ اپنی اپنی تجویزوں کے مطابق کارروائی ہو۔ اس کش مکش نے سر آسماں جاہ کو مجبور کیا کہ لارڈ لینسڈون سے ملاقات کریں۔ حیدر آبادی سازشوں کے واقف کار دیکھ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں کھلاڑیوں نے اپنے مذاق کے مخالف پہلو اختیار کیا ہے۔ اگر محسن الملک اور انتصار جنگ اپنی اپنی جگہ باہم دگر تبادلہ کرلیں تو یقیناً دوسرے ہی دن پالا محسن الملک کے ہاتھ رہے"

نیشنل کانگریس، محسن الملک اور گلیڈ اسٹون:

مکتوب محسن الملک: "جب ماہ ستمبر میں آپ نے مجھ سے ہوارڈن میں ملاقات فرما کر میری عزت افزائی کی تھی، میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اس مسئلے پر کہ جس پر ہندوستان میں دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے غور فرمائیں یعنی مسئلہ نیشنل کانگریس۔ سربرآوردہ اخبارات میں دو فریق ہو گئے ہیں یعنی ایک سرسید احمد خاں سرآکلینڈ کالون وغیرہ کے خلاف، دوسرے وہ لوگ جو ان کی رایوں پر جو انھوں نے وسعت کے ساتھ ظاہر کی ہیں رہنمائی کے واسطے نگاہ کرتے ہیں۔ اگر ایسی حالت میں کوئی وجہ آپ کو خاموش رہنے کو مجبور نہ کرتی ہو تو آپ کی رائے اور مرتبہ کا اثر کسی حصہ دنیا میں اس سے زیادہ نہ پڑے گا جیسا کہ ہندوستان میں ہوگا۔

ہم لوگ، مسلمان، کانگریس ہی کے خلاف ہیں۔ مگر زیادہ تر اختلاف ان طریقوں سے ہے جو اس کے بانیوں نے اس کے ہر دلعزیز کرنے کے واسطے اختیار کیے ہیں۔ یہ مسئلہ ہمارے واسطے بہت وسیع ہے اور نہ ہم نے ابھی یہاں اس قدر تعلیم پائی ہے کہ ایسے ملکی معاملات کو فائدے کے ساتھ سمجھ سکیں اور نہ کوئی تاریخی شہادت اس امر کی موجود ہے کہ ایک مجلس واضعان قانون ہو، اس کے ممبر قوم اور مذہب جداگانہ ہوں۔ ممکن ہے زیادہ کانگریس مقامی نزاع اور گورنمنٹ میں عیب بینی کرے بہ مقابلہ اس امر کے کہ وہ کوئی مفید قانون بنائے۔"

جواب گلیڈ اسٹون:

"۱۰ دسمبر ۱۸۸۸ء: صاحب من! آپ کے دلچسپ خط کے جواب دینے میں اور ان ہندی مسائل کی پوری تحقیقات کو جن کا آپ نے ذکر کیا ہے بہت کچھ وقت کی ضرورت ہے کہ صرف کیا جائے جو میرے امکان سے بعید ہے انتخابی اصول نے بہت بڑا کام دنیا کی پچھلی تاریخ میں کیا ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی زیادہ کرے۔۔۔ اس باعث میں اس کی وسعت کا خواہاں ہوں۔ میں نے یہ نہیں سنا کہ مسلمان اور بلگیریہ کے عیسائیوں کی باہمی شرکت اور اتفاق سے کوئی نقصان پیدا ہو مگر یہ بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر وہ اپنی موجودہ حالت میں وہ ایسے ممالک میں دیا جائے کہ جہاں اس کی حالت دوسری ہے۔ ایک عرصہ کا غور اور ابتدائی صورت میں ایسے اصول کا رواج ایسی حالتوں میں بہت مناسب ہے۔۔۔۔"

"مدرستہ العلوم علی گڑھ اور تھیٹر" کے عنوان سے ڈراما اور ناچ پر، ۲۸ مارچ اور ۴ اپریل کے پرچوں میں سخت تنقیدی مضامین ہیں۔

۱۸ اپریل کے پرچے میں نواب محسن الملک کی ایک تقریر ہے۔ تقریر طویل ہے جو ۲۵ اپریل کے پرچے میں جاکر تمام ہوئی ہے۔

۲۵ اپریل کی اشاعت میں، سرسید کو اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے، اس کی خبر ہے۔

اور ۱۸۸۹ء کے فائل میں سب سے دلچسپ مضمون ہے "معلم الملکوت کی پیر نیچر کے نام چٹھی" جو ۲۶ ستمبر کی اشاعت میں چھپا ہے۔ اس میں ہنچ کا خاص رنگ ہے اور علی گڑھ کی تفصیل بھی:

"مائی ڈیر سید

شاید تم کو تعجب ہوگا کہ میں نے ان محبت آمیز الفاظ سے تم کو پھر یاد کیا۔ اور پھر ایسی ضرورت کے وقت تمھاری مدد پر آمادہ ہوتا ہوں۔ مجھ کو بے شک ملال تھا کہ تم نے باوجود میری اس درجہ حقوق اور عنایتوں کے بھی، میری رفاقت کی کچھ پروا نہ کی اور لارڈ ڈفرن کو ترجیح دے کر میرے خلاف بیعت کر لی۔ واقعی تمھاری ایک بہت بڑی غلطی تھی جو میرے مشن سے علیحدہ ہو کر تم معاملات ملکی کی جانب رجوع ہو گئے اور یکایک تم نے دین کی رخنہ اندازی سے اپنے خیالات کو پھیر کر بالکل پولیٹیکل کر لیا۔ مگر نہیں ؎

این درگہ ما درگہ نومید نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

..... مجھے ایک زمانے میں علی گڑھ کے طلبا کو نماز روزہ کا مائل دیکھ کر نہایت رنج ہوا تھا.... مگر معاف کرنا میں تمھاری بیش بندیوں کو اس وقت نہ سمجھ سکا... جس خوبی سے تم نے ٹٹی کی آڑ شکار کھیلا اس کے شکریہ کا اظہار بھی ضروری ہے۔ خانقاہ اور مسجد کے رتبہ سے کالج کو تماشہ خانہ اور تھیٹر کر دینا تمھارے ہی بائیں ہاتھ کا ایک کھیل تھا۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

.. .."

۱۸۹۱ء

اس سال کے فائل میں کئی اہم مضامین ہیں جن کے اقتباسات دینے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

اب عرش تلک جاتے دل کے مرے نالے ہیں
بے تابیوں نے دل کی کیا پانوں نکالے ہیں

بعالی خدمت جناب آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب آنریری سکریٹری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

آنریبل سر سید! الہ آباد محمڈن کانفرنس کے اجلاس کے بعد سے آپ کے عقیدت کیشوں، نیاز مندوں اور بہی خواہوں نے جو کچھ اپنی بداندیشی اور ناسمجھی سے طوفان برپا کر رکھا ہے اور جس طرح دھڑتے سے وہ منہ اور زبانیں جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا وقف ستائش و زیبائش تھیں ناساز راگ چھیڑ رہی ہیں اور جس طرح آپ کے تمام اگلے پچھلے کارناموں پر زہریلے قلموں سے ریمارک ہو رہے ہیں اور دعویٰ صادق البیانی و آزادی کے ساتھ آپ کی نیک نامیوں پر پانی پھیرنے اور صفحۂ ہستی سے آپ کی یادگاروں کو مٹانے کی کوششیں کی جاتی ہیں غالباً جب کبھی آپ ان باتوں

کا خیال کرتے ہوں گے تو آپ کو سخت حیرت ہو جاتی ہوگی کہ خداوندا ؎

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

ایک سرے سے یہ کیسا نیل کا ماٹھ بگڑا ہے بنی بنائی بات میں فرق آیا جاتا ہے۔ گھر کے گھر ہی میں پھوٹ پھیل گئی۔ افسوس! ؎

تھے جو دل سونہیے وفا ٹھہرے
جھوٹے کولوں کی آگ کیا ٹھہرے

مگر جناب سید صاحب آپ زیادہ تعجب نہ فرمائیے۔ مستقل مزاج حضرات جو پُرانی لکیر پیٹتے پیٹتے علما کی درس سنتے وعظ و نصیحت پر روتے روتے آپ کی شہنائی کی سُریلی دل کش آواز پر ایسے محو اور خود رفتہ ہو گئے کہ پٹہ توڑ کر داخل یارانِ نیچریہ ہو گئے۔ اور دین دنیا، مذہب و ملت خدا و رسول سے ہاتھ دھو تہذیب و آزادی کا دم بھرنے لگے یہی ہاتھ جو ابھی حضرت واعظ کی بدولت گریباں چاک کرنے کو بڑھے تھے اب گویا پیر میکدہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو کام آئے۔ اور وہی دل جن میں ابھی مذہبی جوش نے گرما گرمی پیدا کر دی تھی اور جن میں پُر اثر وعظ کی برکت سے ع

دنیا ہمہ ہیچ و کار دنیا ہمہ ہیچ

کا خیال جم گیا تھا صرف آپ کی جادو بیانیوں اور خیالی سبز باغوں پر وارفتہ ہو کر سارے عالم کو چھوڑ ؎

مسجد ایسی بھری بھری کب ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا

کا وظیفہ پڑھنے لگے ایسے حضرات سے بھلا کیا خاک امید ہو سکتی تھی کہ آپ کی رفاقت و وفاداری میں ثابت قدم رہیں گے۔ بلاشک ایسے اہل دل حضرات سے آپ کو یہی توقع رکھنی چاہیے تھی کہ ایک نہ ایک دن اس اگر رنگ سے بھی یوں ہی منہ موڑیں گے اور ایسا بپھر جائیں گے کہ کسی طرح قابو میں نہ آئیں گے۔ جس زمین میں خود مادہ قابلیت نہیں ہوتا اس میں چاہے کتنا ہی زوردار بیج ڈالیے ہرگز اس کا درخت قوی نہیں ہوتا نہ زیادہ برگ و بار لاتا ہے نہ کوئی معتد بہ فائدہ پہنچاتا ہے۔ جن دماغوں میں جوہر قابلیت کی کمی ہوتی ہے، جو لوگ زوردار طبیعت نہیں رکھتے وہ ع

آندھی کی طرح آئی طبیعت جدھر آئی

خواص رکھتے ہیں پس ایسے لوگوں کی نہ موافقت کا کوئی اثر نہ مخالفت کا۔ نہ ان کا اتفاق باعث مسرت نہ اختلاف عث تاسف "من قال" سے مجھے زیادہ بحث کرنا نہیں۔ "ما قال" پر نظر کرتا ہوں کہ ان کے اعتراضات کس قسم کے ہیں رکھاں تک ان میں آپ کی مستغنی الصفات ذات کو دخل ہے۔

جناب سید صاحب۔ یقیناً آپ میرے اس بے محل تخاطب سے بھی کسی قدر چونکتا ہوں گے اور کان کھڑے کریں گے کہ دیکھئے یہ کیا ذہر اوگلتا ہے کیوں کہ اب تو او دھر سے جو ہوا چلتی ہے وہ مخالف ہی چلتی ہے اور ہر جھونکے میں

دل مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

مگر آپ مطمئن رہئیے۔ ان معاملات میں میں ہرگز آپ کو خاطی و مجرم قرار نہیں دے سکتا۔ مسلمانوں سے آپ سے آج نیا سابقہ نہیں ہے۔ برسوں سے آپ اور وہ ملے ہوئے ہیں۔ آپ کی خو بو، عادات و اطوار سے وہ بخوبی واقف۔ پس یہ انھیں کی خطا ہے کہ آپ کو رفارمر بنایا۔ جس قوم کی رفارمری اور لیڈری آپ جیسے برگزیدہ بزرگوار کے ہاتھ میں ہو اُس قوم کا اللہ بیلی ہے بھلا آپ اور مسلمانوں کی ریفارمری۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

جو کچھ الزام آپ کے مخالفین آپ پر رکھتے ہیں ایک سرے سے (میں جو غور کرتا ہوں تو) انھیں حضرات کو ملزم پاتا ہوں کیا معنی کہ آپ نے ایک نہیں ہزار مرتبہ اپنی زبان و قلم سے لوگوں کو آگاہ کر دیا متنبہ کر دیا قولاً و فعلاً ہر طرح سے ایک عالم پر آشکارا کر دیا کہ یہ کھیل کھیلتا ہوں یوں کھیلتا ہوں یہ لکڑی ہے اور اسی کے بل سب بندروں کو نچاتا ہوں اُس پر پر بھی آپ کے کاموں میں جان بوجھ کے دخل دینا اور برابر ناعاقبت اندیشی سے شریک حال رہنا اور آخر کار نتیجہ پر غور کر کے چیخنا چلّانا اور زبان شکایت کھولنا یعنی چہ؟ اول تو یہ کس نے کہا تھا کہ تم آنکھ بند کر کے امنا صدقنا کر کے شریک ہو۔ اتفاق رائے کرو اور پھر بعد خرابی بسیار دوہائی تہائی بچاؤ کہ اے غضب ہو گیا بڑی بُرد ماری اگر ساتھ دیا تھا تو قولِ مرداں جاں دارد پر عمل کرتے کڑیاں جھیلتے مگر رفاقت سے منہ موڑتے، نقصان ہوتا گوارا کرتے شماتت ہمسایہ بھی سہ لیتے کہ شاید خدا کو کچھ اس میں بھلائی منظور ہوگی۔ اور یا بالکل الگ تھلگ ہی رہتے کسی بات میں دخل نہ دیتے، کسی مشورہ میں شریک نہ ہوتے۔ خود ہی تمام باتوں میں دخل درمعقولات دینا اور پھر اس پر معترض ہونا۔ یہ کس استاد نے پڑھایا ہے۔ یہ تو وہ ہوئی کہ ؎

دیدہ بودم روئے تو دانستہ بودم خوئے تو
دیدہ و دانستہ خود را در بلا انداختیم

خود ہی تو ہاں میں ہاں ملا پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند کے مصداق بنے اب پیر جی نے ذرا بلند پروازی کی تو طاحیاں سُنانے لگے۔ خود کردہ را چہ علاج جیسا کیا ہے ویسا پاؤ گے۔ اگر پہلے ہی سے عاقبت اندیشی سے کام لیتے ناصح مشفق کی بات سنتے تو آج کیوں روتے پس قصہ مختصر یہ جہاں تک میں نے سمجھا اور غور کیا ہے۔ ہرگز ہرگز آپ کا قصور نہیں یہ سب انھیں معترضین کے اعمالوں کی سزا ہے اور واللہ آپ جس قدر بے عنوانیاں بے ضابطگیاں کریں سب روا ہیں۔ کیوں کہ بغیر اس کے ان لوگوں کے کان نہ ہوں گے اور زنہار متنبہ نہ ہوگا۔ آپ کے سابق

مرید اور حال مخالف حضرات کا بڑا اعتراض الہ آباد کانفرنس کے پریسیڈنٹ پر ہے حالاں کہ یہ اُن حضرات کی محض غلط فہمی ہے۔ پریسیڈنٹی کا کام ایک ذمّہ داری کا کام ہے اور ہرگز آپ جیسے آدمی کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ ایرے غیرے نتھو خیرے کو بلا کر پریسیڈنٹ بناتے۔ آپ نے اپنے اعتبار و ذمہ داری پر پریسیڈنٹ کا انتخاب فرمایا۔ کانفرنس آپ نے بنائی، اس کی تمام کارروائیاں آپ کی آنکھ کے اشاروں پر ہوئیں، اس کے تمام قواعد آپ کے غور و فکر کے نتائج، اس کے رزولیوشن آپ کے مختلف خیالات کے آئینہ، پھر پریسیڈنٹی کا انتخاب آپ نہ کرتے تو کون کرتا۔ دوسرے یہ کہ دو سال تک تو قوم نے ان کو پریسیڈنٹ بنا ہی لیا تھا اب کی سال چوں کہ زیادہ جھنجھٹ کارروائی میں منظور نہ تھا وہی سپاٹ پریسیڈنٹ پھر کرسی پر بٹھا دیے گئے۔ اس میں قباحت ہی کیا ہوئی۔ نئے پریسیڈنٹ بنانے میں ہر طرح کے وسوسے تھے کوئی افتاد پڑ جاتی تو سبھی منہ نوچنے کو تیار ہوتے۔ اس سے بہتر ہوا کہ وہی جانا بوجھا دیکھا بھالا پریسیڈنٹ پھر کانفرنس میں ایک مرتبہ بٹھا دیا گیا۔ باقی یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کانفرنس کے اب وجد ہیں تو آپ ہیں، جزو کل ہیں تو آپ ہیں، نفس ناطقہ ہیں تو آپ ہیں، وہی ہوتا ہے جو آپ کی مرضی ہوتی ہے، اسی پر عمل ہوتا ہے پھر اگر یہ پریسیڈنٹ نہ ہوتے کوئی اور ہوتا، تو نتیجہ کیا نکلتا۔ پریسیڈنٹ صاحب کرسی کی رونق کے واسطے بٹھائے گئے تھے کچھ مجسٹریٹ یا کلکٹر نہیں بنائے گئے تھے کہ مقدمات کا انفصال کرتے، قومی جھگڑے چکاتے۔ اور نہ ان جھگڑوں کے واسطے کانفرنس قائم ہوئی ہے۔

جناب سید صاحب۔ اس وقت مجھے فرصت کم ہے اور معترضین کے اعتراضات ابھی بہت باقی ہیں۔ اس لیے ہفتۂ آئندہ میں دوسری چٹھی میں سب کے جواب دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان جوابات کو کافی سمجھ کے علی گڑھ گزٹ میں بھی شائع فرمائیں گے۔ زیادہ حد ادب

آپ کا نیازمند فیثا غورث

(۱۲ مارچ ۱۸۹۱ء)

نیچری کانفرنس کا خاکہ

(مقام الہ آباد)

سر سید محسن الملک کو آتے دیکھ کے (جی ہی جی میں) { بڑی مشکل سے یاروں کانگریس میں محسن الملک آئے
کوئی تدبیر ایسی ہو کہ یہ بھی جھومتے نکلیں

لہ یہ نون نیچری ہے جو سید صاحب کی تحریر کی مخصوصیات... ۔ ۔

محسن الملک سرِ نیاز جھکا کر	نہ غرض کفر سے رکھتا ہوں نہ اسلام سے کام مدعا مجھ کو تو سید سے ہے اور نام سے کام
پریسیڈنٹ صاحب سہ بارہ اعزاز صدارت پا کر جوشِ مسرت سے	دیگرے بار صدارت نہ توانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ ناکارہ زدند
جسٹس محمود	تری کیا بات تو خوش ظرف عالیجاہ ہے سید بہک جاتے ہیں کم ظرفی سے ہم تو اک پیالے میں
سید صاحب پرانے رفقا سے	اب نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تم ہو نہ وہ دل نہ وہ آنکھ آپ بھی چوک گئے ہم نے بھی دھوکا کھایا
پرانے رفقا سید صاحب سے	تسلّی دمِ واپسیں ہو چکی ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی
دیندار مسلمان محسن الملک سے	محتسب آج تو میخانہ میں تیرے ہاتھوں دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا
نیچری مسلمان سید صاحب سے	جام ٹوٹا بت بدست کہ مینا ٹوٹا دل مسلماں کا کوئی چیز ہے؟ ٹوٹا ٹوٹا
سید صاحب جھوم جھوم کے	اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

راقم

ہم بھی کشتہ تری نگاہ کے ہیں
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

(اودھ پنچ ۱۵:۱۱ ، ۱۲؍مارچ ۱۸۹۱ء)

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

سید احمد خانیوں کے نیچر میں خلاق ازل نے ابتدا ہی سے یہ بات رکھ دی ہے کہ سارے عالم کے مباحث میں پیرجی موجود ہو جاتے ہیں۔ پولیٹکل۔ سوشل۔ مارل۔ اغیرہ وغیرہ میں لکھتے لکھتے آخری تان ہمیشہ مدرستہ العلوم یا بانی مدرستہ العلوم کی مدح سرائی میں ٹوٹتے ہی مرثیوں میں رقت کا بند، ٹیپ کا مصرع اور نیچری بھائیوں کے

مضامین سید۔ بک اینڈ کمپنی کی ستائش بے جا کانفرنس ہوئی اس میں رباعیوں، قصیدوں، مسدسوں کے ذریعہ اسی عارضہ نے حلول کیا۔ تھیٹر ہوا اس میں قومی نظموں کے پردے میں اسی نے جھگڑا دکھلایا۔ الغرض جس چیز کو دیکھئے اس میں حضرت کا گزر جس شے پہ نظر ڈالیے آپ ہی کا دخل۔

ایک صاحب نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے باہم مناکحت پہ مضمون لکھا ہے اس میں سید محمود صاحب کی تعریفوں کا پل باندھ دیا۔ ان کے زہد و تقویٰ۔ پرہیزگاری کی دھومیں مچائیں۔ حالاں کہ جن لوگوں کو انگلستان جانے والوں کی کماہی حالات سے آگاہی ہے اور جو شخص مسٹر محمود صاحب کے طرز معاشرت اور روش سے آگاہ وہ بخوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ اس معاملہ میں مسٹر محمود کس درجہ تعریف کے مستحق ہیں۔ سوا مسٹر محمد احمد صاحب کے اور کن بزرگوار نے کسی عیسائی لیڈی سے مناکحت کی بہت سے مسلمان بیرسٹر خاص ان عیسویات و دیگر عیوب خاص کے اب موجود ہیں جن میں یہ صفت مشترکہ موجود ہے۔ پھر مسٹر محمود صاحب میں کیا شاخ زعفران لگی تھی کہ سب ایک طرف رہے مگر حضرت کے زہد و تقویٰ کا ڈنکا بجایا گیا۔ وہی صاحب اب مجوزۂ نئے بورڈنگ ہاؤس میں ایک یوروپین معلمہ کی تقرری کی بحث میں لکھتے ہیں کہ "انگریزی لفظ ڈیوٹی یا فرض اور فرض منصبی کے ایسے عمدہ معنی جانتے ہیں جس بنا پہ برٹش گورنمنٹ نے تمام ہندوستانی ریاستوں کو زیر کرتے وقت یہ معاہدہ کرلیا کہ وہ کسی یورپین کو بلا اجازت و حکم گورنمنٹ انگریزی کے نوکر نہ رکھیں۔" واقعی اس سے انگریزوں کے سنس آف ڈیوٹی کو آپ نے خود ثابت کیا ہے۔ گورنمنٹ اس خیال سے کہ مبادا اور حریف یورپین قوم کا کوئی شخص دیسی روساء کے درباروں میں گھسیں یا پاکے گورنمنٹ کے خلاف کوئی سازش نہ کرے۔ ایسا معاہدہ کرلیا ہے۔ اس کو ڈیوٹی سے کیا علاقہ۔

اسی "ڈیوٹی" کے معنی جاننے کی دوسری مثال میں مسٹر بک آدھمکے اور راقم صاحب یوں گوہرافشاں ہوئے،
"اور جس کی بنا پہ مائی ڈیر بیک ایک عیسائی، مدرسۃ العلوم کے ایک طالب علم کو اس بات پہ سزا دیتا ہے کہ اس نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔" آمدم بر سر مطلب۔

واہ حاجی صاحب واہ۔ کیا خوب مثال آپ نے عنایت فرمائی ہے۔ واقعی کیا جدید بات ہے ہم تو برابر دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہندوستان کے میاں جی سے جو ہنود کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پہ مامور کیے جاتے ہیں ایسا ہی کچھ کرتے ہیں اور کسی مذہبی عقائد کا ذکر بھی درمیان میں نہیں لاتے وہ غیر مہذب ہو کے وہی کرتے ہیں جو آپ کے کالج کے پرنسپل صاحب کرتے ہیں۔ پھر اس میں قابل فخر کون بات ہوئی۔ اب رہا یہ امر کہ یورپین لیڈی مقرر کی جائے گی تو وہ کیا کرے گی۔ اس کے واسطے ہم آپ ہی کا ایک قول پیش کرتے ہیں۔ آپ ایک مضمون میں تحریر فرما چکے ہیں۔

"یورپین لیڈیاں ہندوستانیوں کی کس قدر تحقیر کرتی ہیں یعنی وہ ہندوستانیوں کو ایک وحشی یا ایک جانور کے برابر جانتے ہیں۔"

جب عام طور سے آپ کی یہ رائے یورپین لیڈیوں کی نسبت قائم ہو چکی ہے مذہبی نظر غالباً اور یہی ان کی صحبت اُلٹا اثر پیدا کرنے والی ہوگی۔ ہاں مسٹر بک کے کوئی قرابت دار ہوں تو شاید اُن میں یہ مادہ نفرت و تحقیر نہ ہو۔

اسی مضمون میں حاجی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"خوش قسمتی سے مدرسۃ العلوم کی قسمت ابھی ان مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے جن کو طنزاً نیچری کہا جاتا ہے۔"

ایں۔ یہ کیا کلمۂ کفر بک دیا۔ ذری زبان سنبھالے ہوئے۔ دیکھئے پیر جی بُرا مان جائیں گے۔ ماشاءاللہ یہ طنزاً نیچری کہے جانے کی بھی ایک ہی ہوئی۔ اے حضرت گرو جی سے پوچھئے۔ نیچر نے ان میں حلول کیا ہے ان کا تن من دھن سب نیچر ہے۔ خلاف نیچر تو ان میں کچھ ہے ہی نہیں۔ پھر اس میں کوئی طنز کیوں کرنے لگا اور اس کی حاجت ہی کیا رہی جب کہ وہ خود ہزار مرتبہ بندۂ نیچر ہونے کا دعویٰ کر چکے۔ اور ڈنکے کی چوٹ نیچری بن چکے۔ ان کے نزدیک مذہب، ملت، دین، ایمان، خدا، رسول سب (معاذ اللہ) نیچر ہی نیچر ہے۔ ہر جگہ نیچر کا جلوہ۔ ہر چیز میں نیچر کا کرشمہ۔ ان کے قول میں فعل میں، کھانے میں، پینے میں، اٹھنے میں، بیٹھنے میں بالکل نیچر ہی نیچر ہے۔ سوتے جاگتے نیچر کے زور سے۔ بولتے چالتے نیچر کی مدد سے۔ الغرض وہ کون سی زمین ہے جہاں آسمان نہیں۔

راقـــــــــــم

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پانوں میں

بقلم اختر لکھنوی

(۱۵ : ۲۹ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۸۹۱ء)

خوش آمدی!

لیجئے حضرت سید صاحب کی دم کش پہاڑی مینا سر مور گزٹ نے ہندی حالت میں رہ کے پردۂ خفا سے عالم ظہور میں جلوہ فرمایا۔ خدا سید صاحب اور ان کے چیلوں کو مبارک کرے۔ اس مرتبہ دوسرے جنم لینے کی برکت سے کس قدر

قد و قامت میں کم ہو کے نکلا ہے۔ ہم کو ہمیشہ سے اس بے چارے کے حال پر یہ تاسف رہا ہے کہ یہ اپنے زمانۂ نشو و نما میں گوہ کے بھنگے کی طرح نیچریوں کے تنگ و محدود دائرہ ہی کی بہاریں دیکھا کرتا ہے اور دنیا بھر کی سیروں سے کوئی حظ نہیں اٹھاتا۔ انھیں کی سی زٹلیں بولتا اور انھیں کے سے چیچے بھرتا ہے۔ اسی مرتبہ ٹرسٹیز بل کا معاملہ درپیش ہوا، یہ بے چارا ایک ایک سے لڑتا پھرا، اب الٰہ آباد کانفرنس کی ڈھاک باندھتا اور محسن الملک کے لکچر کی دھوم مچاتا ہے اور نکتہ چیں حضرات کے اعتراضات سنتا کڑیاں جھیلتا اور دو چونچیں لڑتا ہے۔ حق یہ ہے کہ سید صاحب کے پیچھے یہ بے چارہ مرتا مگر سید صاحب نے قدر نہ جانی حتیٰ کہ ٹرسٹیز بل کے معاملے کے ختم ہوتے ہی سب نے عدم آباد کی سیڑھیاں بھریں اور دنیا کو خیر باد کہا۔

سرمور گزٹ کی اشاعت سے ہم کو دھڑکا لگا ہے کہ نیچری دنیا میں کچھ انقلاب ہونے والا ہے اور طویلے ہی میں دولتی چلنے کے سامان ضرور نظر آتے ہیں۔ کیا وجہ کہ اس مرتبہ جب حضرت نکلے تھے تو بہ طور مقدمۃ الجیش کے ٹرسٹیز بل کے واسطے راستہ صاف کرتے اور تھیئٹر کی اچھل کود پر واہ واہ کی تانیں لگاتے نکلے تھے۔ اب کے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ چوں کہ سید صاحب ایک دور اندیش آدمی ہیں یقیناً ہم کو اس کی علت غائی دریافت کرنے کے واسطے بہت عرصہ لگے گا اور جلد کوئی حال نہ کھلے گا۔ خیر آپ چشم براہ رہیے عنقریب پردہ اٹھا جاتا ہے۔ ہم تہ دل سے دعا کرتے ہیں کہ سرمور گزٹ نیچری دنیا میں خوب پھلے پھولے اور پیرجی کے دل کو ڈھارس دیتا رہے۔ اور ہم کہ ایک دفعہ تو پڑھ چکے ہیں۔ دوسری دفعہ

ع در بہاراں زاد و مرگش در دے است

راقم وہی نیاز مند قدیم۔ اختر

(اودھ پنچ مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۸۹۱ء)

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس سیّد
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ہمارے سرسید گلے میں جھولی ڈال چیلوں کو ساتھ لے دکن کی طرف گداگری کے واسطے نکلنے والے ہیں۔ خدا اس فقیر کی جھولی کو طرح طرح کے ٹکڑوں سے بھرا پُرا واپس لائے۔ سچ ہے۔ ع

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

ایک زمانہ تھا کہ سید صاحب اور ترکیبوں سے روپیہ وصول کرتے تھے۔ کبھی قوم کو سبز باغ دکھلاتے، کبھی ڈانٹتے کبھی ڈپٹ کر کبھی غیرت دلا کر۔ کبھی قلم کے زور سے مطلب نکالا کبھی سحر بیانی سے رنگ جمایا۔ اب ضعیفی کا زمانہ۔ بہت سی باتوں میں کمی۔ اب سہل نسخہ یہی سوجھا کہ اس معزز طریقہ سے کچھ وصول کر لو۔ لیکن ایک نئی

بات پیدا ہوگئی ہے اس کا جواب نہیں معلوم کیا ذہن عالی میں ہے۔ افسوس حضرت کا ٹھوسر مورگوٹ دوبارہ زندہ ہوکر خواب عدم میں سوگیا نہیں تو اسی سے پوچھتے کہ اس طرح کی گداگری ملک اور قوم کے واسطے توکسی طرح معیوب نہیں بلکہ موجب فخر ومباہات ہے مگر یہ بات اس وقت تک تھی جب تک کالج قوم کا کالج تھا۔ اب توسلامتی سے آپ اس تمام فنڈ اور املاک کو گویا آپ نے اپنے صاحبزادے کے نام ہبہ فرمادیا۔ اب ذاتی جائداد ہوگی اور آئندہ جو کچھ اضافہ، ترقی ہوگی وہ بھی ذاتی ہوگی۔ پس ذات کے واسطے بھیک مانگنا اگر وجب فخر ہے تو میاں مدارا اور کلو ملو جو بے چارے در بدر خاک بسر صدائیں لگاتے بھیک مانگتے پھرتے ہیں وہ بھی قابل ملامت نہیں۔ بلکہ آپ سے زیادہ مستحق اعانت ہیں۔

خیر یہ تو دکھنیوں کی رائے پر چھوڑ دینا چاہیے جو چاہیں سمجھیں اور جس طرح چاہیں پیش آئیں مگر بدولت چوں کہ ہمیشہ نیک صلاح سے دریغ نہیں فرماتے تھے لہذا حسب عادت اس دفعہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے مقصد کے مناسب اگر سامان بھی رکھیں تو سرسید کو زیادہ بھیک ملنے کی امید ہو اور دل لگی کے واسطے تماشے کا تماشا ہے یعنی اول تو ریل کا سفر خیرباد کہیں۔ منزل بمنزل سفر عجب لطف خیز ہوتا ہے خصوص جب حالی وذکا اور کون اور کون اہالی موالی ہم رکاب ہوں۔ پس مناسب ہے کہ ایک کا ناٹٹو سستے داموں کا خرید فرمائیں نسل اگر اس گھوڑے کی ہو جس پر بقول سودا شیطان سوار ہوکر جنت سے نکلا ہے نہایت مناسب ہو اور درصورت عدم دستیابی اٹلی کا گدھا مضائقہ ندارد اور کیا۔ عجب نہیں یورپین ہونے کی وجہ سے یہی پسند طبع بھی ہو سکے ہیں جھولی کی حاجت نہیں۔ دونوں طرف خورجی کافی ہوگی۔ مولانا حالی کی تصنیف کوئی نیچری مناجات ؎

عزیز وحق تعالیٰ کبریا ہے شرف جس نے یہ چندے کو دیا ہے

یا

محبوب ہوا چاہے تو چندے کا ذکر کر گر حق کی شفع چاہے تو چندے کا ذکر کر

کے طرز پر اونچے سروں میں پڑھتے جانا چاہیے۔ اگر مولوی صاحب معذور ہوں تو اپنی جانب کی خدمت میں بھی نامہ بھیج دیں یہاں سے انشاءاللہ تازہ دم ترترا تا منا جاتا روانہ ہوگا۔ اللہ نے چاہا جس گلی کوچے میں ہوکر نکلیں گے ہزاروں پیسے برسیں گے۔ خصوص تو چندے اتوار منگل کو تو بہت سے لڑکے ________ بال بینے کو ٹوٹ پڑیں گے اس واسطے مناسب ہے کہ سل رسکن ولایتی مکمل کالانگ کوٹ موجود رہے ورنہ نہایت دقت ہوگی۔

ہمارے نزدیک اب سفر میں عجلت کرنا چاہیے کیوں کہ پنجاب میں ایک حضرت مسیح پیدا ہوئے ہیں۔ کہیں وہ بھی نہ سفر شروع کردیں تو مقدم موخر لکھنا پڑے۔

(اودھ پنچ مورخہ ۶ اگست ۱۸۹۱ء)

۱۸۹۳ء

کھلے خط کے عنوان سے رفیق ہند کے ایڈیٹر اور مولوی نذیر احمد کے نام اصغر حسین کے دو مضمون ہیں :

" بنام ایڈیٹر رفیق ہند "

" چشتی صاحب !

..... میں نے جب آپ کے مقاصد غور سے دیکھے تو وہ یہ نکلے : (۱) سرسید کے اثر کو پنجاب سے مٹانا۔ (۲) خان بہادر برکت علی صاحب کی سرکاری اور عام ہردل عزیزی کو نیست و نابود کرنا۔

ان مقاصد میں فروغ و کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے :

(۱) آپ نے سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ کی، جس کے اس زمانہ میں مسٹر امیر علی سکریٹری تھے، لاہور میں ایک شاخ قائم کی۔ (۲) دیگر انجمن ہائے اسلامی لاہور کے مقابلے میں اپنی انجمن کے وجود کی نمایاں طریقے سے سرکار و عوام کو بتانا چاہا (۳) اپنے اخبار اور دیگر صاحبان اخبار سے جو معاملات کانگریس کی وجہ سے سرسید احمد اور انجمن اسلامیہ کے مخالف تھے، قلمی مدد چاہی جو فوراً ملی۔

جب حکام و عوام کی کج فہمی یا بدقسمتی سے اس طریق عمل میں آپ کو کامیابی نہ ہو سکی اس وقت محض مجبوری سے آپ بے چارے نے یہ تدابیر اختیار کیں :

(۱) اخبار رفیق عام بند کر دیا (۲) کشمیر چلے گئے (۳) وہاں سے واپس آکر دوبارہ اخبار جاری کیا (۴) اس بار بجائے پولٹیکل یا جماعتی مضامین کے زیادہ تر ذوق و شوق محبت خدائی کا اظہار کیا (۵) دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ، پر ایمان لے آئے۔ (۶) توکل کا شیوہ اختیار کیا (۷) خود کو صوفیہ کبار کا معتقد ظاہر کیا (۸) سرسید احمد سے پرانے مذہبی اختلافات کی تجدید کی ـــــ یہ سب امور ملحوظ رکھ کر اب ایک خوفناک زبانی کا محض 'توکل بخدا' آغاز ہوا، اور مقاصد کی نوعیت صاف الفاظ میں ظاہر کر دی گئی یا بقول آپ کے کاروبار شروع ہو گئے۔

مگر اس کاروبار کا معتد بہ حصہ ایسا ہے کہ شاید ہی خدا تنہا آپ کی مدد کرے۔ اس لیے کہ سرسید احمد، برکت علی خاں اور نذیر احمد صاحب کی نسبت ہم کو نہایت معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ خدا کے بندے ہیں اور یہ عظمت و اقتدار دنیاوی جو کہ ان کو حاصل ہوا ہے وہ منجانب اللہ ہے اور اس کا خود وہ لوگ اقرار کرتے ہیں .....

میری فہم ناقص میں آپ کے مقاصد و طریق عمل دونوں براہ راست مرضئ باری تعالیٰ کی مخالفت کر رہے ہیں۔

خدا تنہا آپ کا پریس نہیں چلاتا۔ اس کے احسانات اور رحمتیں عالم گیر ہیں، وہ لامذہب و بداعمال کے بھی اسی طرح آڑے وقتوں کام آتا ہے جیسا کہ ایک زاہد پرہیزگار کے جس نے راتوں کو تہجد میں صرف کیا ہو یا ایک صوفی رند طبیعت کے، جس کے سر میں سودائے جستجوئے حقیقت کے سوا کوئی ہوا و ہوس نہ ہو۔

..... آپ نے کسی پرچے میں اطلاع دی تھی کہ لاہور میں کوئی انجمن حمایت چشتی قائم ہوئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر ہوا تھا کہ نیچری پارٹی مولوی نذیر احمد کی امداد بڑی سرگرمی سے کر رہی ہے اور یہ کہ آپ کو ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے اگر کسی کے لیے کشمیر کا تمام خزانہ صرف کر دیا جائے۔

مضمون کے بغور پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں انجمن حمایت چشتی تو محض خدائی احکام کی تعمیل ہے مگر نیچری پارٹی کی امداد جو مولوی نذیر احمد کے لیے شروع ہوئی ہے وہ بغیر حکم باری تعالیٰ کے ہوئی اور ہو بھی سکتی ہے۔ ان خیالات کے قلم بند کرنے سے آپ نے اپنے خدا کو جو صرف آپ ہی کی مدد کرتا ہے اپنی مدد پر بہت کچھ ترغیب و حوصلہ دلایا، یا یوں کہئے کہ نذیر احمد کے خلاف خوب بھڑکایا ہے۔

..... مجھ کو اس ضعف یقین اور تذبذب عقائد پر بڑا افسوس ہوا کیوں کہ آپ نیچریوں کو کم سے کم خدائے عالم اسباب تو ضرور تسلیم کرتے ہیں اور جو کچھ باقی رہتا ہے وہ آپ اپنے خدا کے سپرد کر دیتے ہیں ..... جو دنیا میں (صرف) دو کام کرتا ہے۔ ایک تو آپ کا پریس چلاتا ہے، دوسرے تمام عالم کے خلاف مقدمات ازالہ حیثیت عرفی دائر کرتا ہے۔

انسان فطرتاً خود غرض ہے۔ وہ ہر بات میں اپنا نفع اور نقصان بہت جلد دریافت کر لیتا ہے اور عام طور سے محض خدا کی راہ میں کوئی کام نہیں کرتا۔ میں ہوں یا آپ اس کلیہ کی صداقت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔

(۴ مئی)

..... سر سید احمد کہتے ہیں کہ ہم ہیں جس نے مسلمانوں کو تعلیم دی۔ مسٹر امیر علی اصرار کرتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو ان کی پولٹیکل حیثیت سمجھائی۔ برکت علی خاں کا خیال ہے کہ ہم نے بھی پنجاب میں حقوق اسلامی کی حمایت کی ہے۔ مگر اب آپ فرماتے ہیں کہ ہم سب میں اچھے۔ اکیلے ہم ہی نے سب کچھ کیا ہے۔

ان تینوں صاحبوں کو تو جانے دیجیے کیوں کہ ان کی خدمات کا تصفیہ عامۂ مسلمان پہلے ہی کر چکے ہیں مگر ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے قبل ایسا دعویٰ کرنے کے ہم لوگوں سے رائے کیوں نہ لی کہ یہ بات ہم ہی لوگ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے کچھ کیا بھی ہے۔

چشتی صاحب! ہم کو آپ سے بڑی شکایت ہے کہ جو فرض ہمارا ہے اس کو بھی آپ اڑائے ڈالتے

ہیں۔ آپ کی شتابی ظاہر کر رہی ہے کہ جس چیز کے آپ طلب گار ہیں وہ آپ جیسے شخص کے لیے بہت ہی عظیم الشان ہے۔ اور یہ کہ آپ اس کی صلاحیت و قابلیت سے اس قدر دور ہیں جتنا کہ ایک زاہد جنت پرست حق پرستی سے ؎

دھوپ میں ہم کو خراب و خوار رہنے دیجئے
آپ اپنا سایۂ دیوار رہنے دیجئے

آپ کا نیازمند غائبانہ، محمد اصغر حسین
(۲۵ مئی)

کھلا خط

"بنام مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی"

"معلوم ہوتا ہے آپ نے اپنی اسپیچوں اور لکچروں کا یہ انتظام کر رکھا ہے کہ تمام تمسخر اور بے تکلفی کی باتیں جو آپ اوقات خاص پر احباب خاص سے کرتے ہیں مجتمع کر کے کبھی کانفرنس میں پڑھ دیں اور کبھی کسی انجمن میں سنا آئیں۔ اور پھر آپ کے حامیوں کی دیدہ دلیری یا بدقسمتی سے کبھی وہ مسلمانوں کی تعلیم پر اسپیچ کہلاتی ہے اور کبھی فطرت اللہ پر لکچر سے نامزد کیا جاتا ہے۔

.... لوگوں نے آپ کی تصانیف بابت تعلیم نسواں کی اشاعت کے بعد آپ کو اردو زبان کا ایک اچھا ادیب اور اسلامی خاندانوں کے طرز معاشرت کا ایک ہوشیار واقف کار سمجھا تھا۔ اور بہ حیثیت ایک مصنف کے قدر و عزت کی تھی۔

.... اب آپ نے ان تمام غلطیوں کو ایک بارگی کرنا چاہا جن کو یہ گنجائش تمام آپ بقیہ عمر میں اطمینان سے کر سکتے تھے .... کوئی ایک شخص تمام طرح کے کاموں اور مختلف صیغہ جات پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ توبۃ النصوح، مراۃ العروس اور بنات النعش کے سوا اچھے پولٹیکل اور علمی لکچر دینے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے یا جناب میر انیس صاحب مرحوم کے طرز میں گرم اشعار نکال لیتے، یا جدید مسائل ہندوستان کے متعلق کوئی سنجیدہ اور قابل درآمد رائے قائم کر سکتے تو انتظام عالم درہم و برہم ہو جاتا۔

ایجوکیشنل کانگریس یا انجمن حمایت الاسلام کوئی آپ کا پرائیویٹ کمرہ نہ تھا اور نہ تمام مسلمان یا حاضرین جلسہ کھلی بازی کے ذریعے سے انتظام معاملات کرنے کے مشتاق تھے۔ آپ اکیلے نے تمام دنیا کے ساتھ چھیڑ خانی کی، اب تمام دنیا آپ کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہی ہے۔

ایک دانا شخص کی رائے ہے کہ نقصان جلد بھلا دیا جا سکتا ہے مگر توہین کبھی نہیں بھولتی۔" اور پھر

کہتا ہے کہ "اشخاص معافی تو ہین کر سکتے ہیں، مگر اقوام و مجامع نہیں کر سکتے ....

.... کانگریس یا انجمنوں کی شرکت اچھی بات ہے لیکن اختلافات مذہبی اور فریقی کا تصفیہ آپ سے کس نے چاہا تھا، اور کس نے آپ سے راہ حقیقت یا صراط المستقیم دریافت کی تھی کہ آپ صرف وہابیت کو ایک ناجی مذہب قرار دینے لگے اور صوفیان صافی صفت کو یک بارگی اور بلا استثناء جو جی میں آیا خطاب دینے میں دریغ نہ کیا! .... "

"محمد اصغر حسین"

(۴ ربیع)

تکیۂ نامرداں

لیجئے نیچر گڑھ عرف علی گڑھ .... ادھر ادھر کے متروک الدنیا، مخرج البلد بزرگواروں کا مامن ہو گیا جو صاحب نوکری سے چھوٹے، عہدے سے برطرف کیے گئے، اپنی چراگاہ سے نکالے گئے، سیدھے بوقدمہ تجم کی طرف منہ اٹھائے، آنکھیں مارے خجالت کے بند کیے سرسید کے قدوم نیچریت لزوم کی بو سونگھنے علی گڑھ کی طرف بھاگے چلے آتے ہیں۔ اور آتے کے ساتھ ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ، دکھنی کمائی کا گٹھر کاندھے سے اتار، پس پشت رکھ، بستر البِ سڑک جما، مسافروں کو حقہ پانی دینے والوں کی طرح اپنی معزولی کو قوم کے تنزل کے ساتھ مدغم کرکے وتعز من تشاء وتذل من تشاء۔ بیدک الخیر کی تفسیر قصہ شاہ روم کے پیرایہ میں اونچے سروں میں گانے لگے۔ مولوی انتصار جنگ جس آؤ بھگت کے ساتھ نکالے گئے سب پر ظاہر ہے۔ کسی نے نصر منصراً فھو ناصرٌ کی گردان نہ پڑھی۔ بے چارے ازاں سو راندہ ازیں درماندہ کٹے کنکوے کی طرح تیاتے، دوسری دفعہ بھی شمال مغرب کی طرف کنیاتے، حسب عادت جھپا کر علی گڑھ میں مدرستہ العلوم کی عمارت پر آگرے۔ انتصار جنگی دم چھلا دکن کی طوفانی ہوا میں پیچ کر وہیں رہا۔ یہاں خالی خولی مشتاق حسین ہو کر پہنچے۔ خیر صحیح گئے سلامت آئے جان بچی لاکھوں پائے۔

دوسرا نمبر محسن الدولہ نواب مہدی علی خاں منیر نواز جنگ کا تھا ....

نمبر میں ہمارے مولوی الطاف حسین حالی، یہ بھی سنا ہے علی گڑھ ہی میں آپڑیں گے یا آپڑے۔

سب سے بڑھ کر تاسف کی خبر یہ ہے کہ سید محمود، ہمارے پیر نیچر کے پیسر زادے، چیف جسٹس وغیرہ کے تظلم سے اکتا کر ہائی کورٹ کو چھوڑنے پر مجبور ہوں گے .... "

(۲۰ جولائی)

۱۰ اگست کی اشاعت میں صوبہ بہار پر نیچری کانفرنس کا ناکامیاب جلسہ کے عنوان سے لکھا ہے:
"پہلے پہل سر سید احمد خاں صاحب نے جس نیک نیتی سے ایڈ وکیشنل کانفرنس کی بنا ڈالی تھی اس سے کم و بیش تمام واقف کار اور باخبر لوگ واقف ہیں۔ انھوں نے اپنے ذہن میں گو یا نیشنل کانگرس کا جواب دیا تھا، اور ان کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کا خیال، ان کے تعلیمی مشاعرے کی طرف بٹ جائے اور وہ نیشنل کانگریس کی طرف متوجہ نہ ہوں ......"

اس کے بعد بہار میں ہونے والی مجوزہ سالانہ کانفرنس کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بہار میں عام طور سے مخالفت ہو رہی ہے۔

• راقم

کوئی اللہ کا بندہ"

۱۸۹۸ء

سر سید کے انتقال کے بعد کی ایک تحریر:

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

بے چارے سید احمد خاں صاحب بمقتضائے فطرت راہی عالم بقا ہوئے۔ مگر ناقدر داں حضرات ابھی تک ان کو برا بھلا کہنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ارے صاحب مرنے کے بعد تو بروں کو بھی اچھا کہہ کر ان کی مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ مگر برعکس اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس بے چارے کی شکایت شیطان کی آنت ہو گئی ہے۔ نہ آج ختم ہوتی ہے نہ کل۔

ہماری رائے میں تو اب ان کی پچھلی غلطیوں سے چشم پوشی کرنا چاہیے کیوں کہ مذہب کے بارے میں جو رخنہ اندازیاں انھوں نے کیں ان کی نسبت کچھ کہنے سننے کا ہمارا منصب نہیں۔ جس کا مذہب ہے وہ آپ سمجھ لے گا۔ ہم کو اب دخل در معقولات سے کیا حاصل۔

انصاف کے یہ معنی ہیں کہ ان کی خدمات کا تذکرہ کیا جائے جو انھوں نے قوم و ملک کے ساتھ کی ہیں۔

اے مرحوم سید تیری ہڈیاں پھولوں میں رہیں۔ تو جنت میں حوروں سے ہم آغوش ہو۔ تیری روح بلبل بن کر بہشت کے مثمر درختوں پر چہچہائے۔ اور قمری بن کر قدس سرہٗ پڑھے۔ درخت طوبیٰ پر تیرا آشیانہ ہو۔ تو نے ہمارے ساتھ کئی بڑے بڑے احسان کیے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ دنیا میں تیری قابل قدر خدمات کے منکر بہت ہیں مگر اس کے ساتھ ہی بہ کثرت لوگ ایسے بھی ہیں جو تجھ کو دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ تیرے حسن خدمات ایسے نہیں کہ کسی کا دامن نازان کو مٹا سکے۔ ہم سچ کہیں کہ تیرا ساحامی۔ مددگار۔ جاں نثار خادم اور ہمدرد قوم دوسرا ملنا دشوار ہے۔ جو اب دعویٰ بھی کرے وہ تیری ہی قائم کی ہوئی مثال پر اور تیری ہی فیض بخش صحبت کا اثر ہے۔ اے سید! دیکھ قوم

تیری یادگار قائم کرنے پر تیار ہے۔ تیری دیرینہ آرزو پوری کرنے کے واسطے خوب چندہ وصول کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں۔ دیکھ تیرا کالج انشاءاللہ بہت جلد محمڈن یونیورسٹی ہو کر ہندوستان کی تاریخ میں تیری یادگار بن کر رہے گا اور دنیا میں بہت عمدہ مثال سلف ہلپ کی قائم کرے گا۔

راقم منصف مزاج
ا ۔ ع ۔ ک
(اودھ پنچ ۔ یکم ستمبر ۱۸۹۸ء)

کانگریس اور آزادی کی مانگیں

۱۸۹۳ء

۸ جون کے پرچے میں "من نہ کردم شما حذر بکنید" کے قلمی نام سے ۱۸۹۲ء کی آئینی اصلاحات اور اس کے نتیجہ میں امیدواروں کی دوڑ دھوپ، سعی و سفارش اور پروپیگنڈے کے سلسلے میں کسی صاحب نے لکھا ہے:

"حضرت۔ میں تو صاف صاف کہتا ہوں مسٹر ہیوم اور ان کے ساتھی کانگریس والوں سے خدا سمجھے، برسوں رات دن شور غل ہنگامہ واویلا مچا مچا کر کونسل کے ممبروں کا انتخاب چاہا کیے اور پارلیمنٹ والوں کو کچھ ایسا قائل معقول کیا وہ حقوق جتائے ایسی مصلحتیں سوجھائیں کہ وہاں سے قانون پاس کرا ہی لیا اور انتخاب جاری ہو ہی گیا ۔۔۔۔ مگر ہم پر ایک عجب عذاب کشمکش کا نازل ہوا ہے۔ اگر ہم کو پہلے سے اس کا شبہ ہوتا تو مردود ہوتا جو مخالفت نہ کرتا۔ افسوس ہے سر سید نے زمانے بھر کی باتیں نکالیں، سینکڑوں اعتراضات جتائے، مسلمانوں کو بھڑکایا، حکام کو اکسایا، مگر ایک یہ بات نہ سوجھی کہ بے چارے انتخاب کرنے والوں پر کیسا عذاب نازل ہوگا اور یہ کس مصیبت میں گرفتار ہوں گے ۔۔۔۔"

پاکیزہ خیالات

شاگرد اپنے ماسٹر سے۔

شاگرد۔ حضرت ایک مدت سے میں شورش سن رہا ہوں کہ نیشنل کانگریس، اینٹی کانگریس اور حیران ہوں کہ الٰہی کیا ماجرا ہے۔ یہ مختلف الاسم کانگریس کیا چیز ہے، کیا عجائب خانہ میں کوئی جانور آئے ہیں جس کا شہرہ ہے، دھوم ہے، جسے دیکھے لپکتا بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ریل کا ٹرین ہے کہ کانگریس کے دساور سے بوجھل ہو رہا ہے۔ مختلف زبان میں مختلف قوم کے لوگ گلخپ کر رہے ہیں۔ اڈیٹران اخبار کالم کے کالم کاغذوں کے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کر رہے ہیں۔ کوئی ہے کہ بے جا تعریفوں اور خوشامد سرائی میں بھاٹ بن رہا ہے۔ کوئی ہے کہ موافقت موافقت خیرخواہی خیرخواہی پکار رہا ہے۔

کوئی مخالفت کی آواز۔ اور انھیں خیرخواہانِ قوم پر بغاوت کا الزام لگا رہا ہے۔

ماسٹر۔ نہیں میاں تم صاحبزادے پن کی باتیں کرتے ہو۔ ابھی تم پورے تعلیم یافتہ نہیں ہو۔ لہٰذا تمھاری سمجھ میں یہ باریک باتیں نہیں آنے کے قابل ہیں۔ یہ کانگریس ایسی چیز نہیں ہے کہ جب تک آدمی پورا مدبر نہ ہو سمجھ سکے۔ نیشنل کانگریس ایک قومی جلسہ کا نام ہے جس کے بانیوں کا غلط زعم یہ ہے کہ ہم نے اصلاح ملک و باشندگان ملک کے لیے یہ جلسہ قائم کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے ہم ان امور کی اصلاح چاہیں گے جو ملک اور رعایا کے مضر ہیں اور دبے ہوئے حقوق کے لیے بھی بحث پیش کریں گے اور بہت سے مقاصد جو نہایت درجہ نازک ہیں اُس میں داخل کر دیے گئے جس کے سمجھنے اور انجام دینے کی لیاقت قوم میں ابھی نہیں آئی ہے۔ چناں چہ اسی وجہ سے ایک گروہ عقلا کا اس سے مخالف ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ ابھی تعلیم یافتگی اس حد کو نہیں پہنچی کہ نیشنل کانگریس جس کے معنی ہیں وہ باتفاق جمہور قائم ہو کر اپنے مقاصد کو ظاہر کر سکے یا گورنمنٹ سے مانگ سکے۔ چناں چہ اس فریق نے بھی اینٹی کانگریس کے نام سے ایک جلسہ قائم کیا اور بڑے زور شور سے نقصانات نیشنل کانگریس کے ظاہر کیے ہیں۔

تم خود ہی انصاف کرو جو خواہش رعایائے ہند کی ہے جن میں مختلف اقوام، مختلف مذاہب کے لوگ تعصبات میں بھرے ہوئے ہیں اگر گورنمنٹ پورے کر دے تو ہندوستان میں کیا حشر برپا ہو جائے۔ دن رات کشت و خون لڑائی جھگڑے، قصہ و فساد ہی ہوا کریں۔ شاید بجائے ایک حاکم ضلع کے اگر دس حاکم ضلع بھی مقرر ہوں تو ایک ضلع کا کام نہ کر سکیں۔ ہر چند گورنمنٹ کچھ ایسی بے عقل نہیں ہے کہ ایسے جاہل اور غیر مہذب لوگوں کے خواہشات کو پورا کر دے لیکن یہ عقلا لوگ گورنمنٹ پر ظاہر کر رہے ہیں کہ ملک ہند میں سب ایسے ناعاقبت اندیش نہیں ہیں جو ایسے بیہودہ خواہشات میں شریک ہوں۔ البتہ کوئی وقت بعد پوری تعلیم یافتگی کے ایسا بھی آ سکتا ہے کہ رعایائے ہند کی یہ خواہش شاید بے جا نہ کہی جائے گی۔

شاگرد۔ حضرت وہ وقت کب آئے گا اور اس کا انتظار ہم کو اور آپ کو کب تک کرنا چاہیے۔

ماسٹر۔ وہ وقت جب آئے گا کہ تمام تعلیم یافتہ ہو جائیں اور جہالت کے زنگ آلودہ خیالات ان سے دور ہو جائیں جب تو یہ تعصبات مذہبی اور نفاق اور لڑائی اور جھگڑے کے نقائص اور برائیاں ان کے ذہن میں آئیں گی۔

شاگرد۔ اس کے واسطے تو جناب کئی صدیاں درکار ہوں گی کیوں کہ سو برس سے تو زیادہ گورنمنٹ کی عملداری کو ہوئے لیکن میں ابھی فی صدی دس بیس کو بھی تعلیم یافتہ نہیں دیکھتا ہوں۔ تو یہ کہیے وہ زمانہ ہمارے وقت میں آنے والا ہی نہیں ہے۔ ہاں سرسید ہی کو عاقبت کے بوریے سمیٹنے کا بھروسہ ہوگا وہی اس کا بھی ٹھیکہ لے سکتے ہیں کہ وہ اس وقت کو بھی دیکھ کر جائیں گے۔ لیکن یہ جانشینی خلف الرشید کی بننے ولی عہدی کے ہم پلہ ہو کے ہمیشہ ولی عہد صاحب کو منتظر اور دعائے درازی عمر پدری میں مصروف رکھنے والی معلوم ہوتی ہے۔ یہی ہوگا کہ خود ولی عہد صاحب یا ان کی

اولاً سفر و سیاحت چرنے چگنے کو چھوڑ دی جائے۔ اور چند سے کھائے۔
ماسٹر۔ ہاں یہ تو ضرور ہے کہ دیکھئے گی۔ لیکن انصاف کرو قصور کس کا ہے تم اور تمہارے ملک کے لوگ تحصیل علم میں قصور کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ اپنی طرف سے رعایا پروری کا حق پورا پورا ادا کر رہی ہے اسکولوں میں لاکھوں روپیہ تمھیں لوگوں کے لیے خرچ کر رہی ہے اور اذنِ عام دیا ہے کہ امیر غریب شریف رذیل ہر قوم ہر ملت کے لوگوں کو آزادی گئی ہے کہ شوق سے تحصیل علم کریں نہ کچھ اگلی سی تکالیف سفر ہیں جو تمھارے بزرگ لوگ اپنے ذمہ انگیز کرتے تھے اور تمام سخت محنت اور تنگی میں جس کو اس وقت کی اصطلاح میں طالب العلمی کہتے تھے بسر کرتے تھے چناں چہ طالب علم کی لنگی مشہور ہے کہ وہی لنگی تھی وہی چادر وہی بستر وہی دستر خوان وہی رومال وغیرہ ہوتی تھی اور پھر استاد شفیق نہیں ملتا تھا اور ملا بھی تو اس میں جامعیت کہاں ہوتی تھی۔ صرف و نحو مشرق میں پڑھی تو فقہ و اصول فقہ و حدیث مغرب میں کبھی دکن میں منطق حاصل کی تو شمال میں ادب۔ تمھارے یہاں شیخ سعدی جو بڑے صاحب کمال گزرے ہیں فرما گئے ہیں ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم
زہر خرمنے خوشۂ یافتم

غرض اب سب دقتیں اس عادل گورنمنٹ نے مٹا دیں۔ قصبوں میں، شہروں میں حتیٰ کہ دیہات میں بھی کالج، ہائی اسکول وغیرہ سب قائم کر دیے ہیں اور کیسے کیسے لائق پروفیسر اور پرنسپل اور ماسٹر رعایا پروری سے بہم پہنچائے۔ تمھیں تو دل و جان سے تحصیل علم میں کوشش کرنی چاہیے اور گورنمنٹ کے حق میں دعائے خیر۔ لیکن واہ رے ہندوستانی بھائی کہ بجائے شکریہ کے مٹیا بھوس دقیانوسی خیال کے لوگ سب سنتے ہیں کہ روس منحوس نے سرحدی چھیڑ چھاڑ شروع کی تو مارے خوشی کے باچھیں کھل جاتی ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ اگر خدا نہ کردہ وہ گھڑی آئی تو قیامتِ کبریٰ قائم ہو جائے گی۔ غدر میں قیامت صغریٰ جو قائم ہوئی تھی اس کا نتیجہ ابھی تک بھگت رہے ہیں۔ بھلا اس سے زیادہ کیا جہالت اور بے عقلی ہو گی۔
شاگرد۔ حضرت یہ سب درست اور بجا ہے۔ ہم تو اپنی گورنمنٹ کے دل سے دعاگو ہیں۔ بعض بے عقل ایسے بھی ہوں گے جن کا آپ نے ذکر فرمایا مشہور ہے عوام کالانعام اس کا ذکر ہی کیا۔ لیکن مجھے اس میں تامل ہے کہ عورت کیسے تعلیم یافتہ ہو سکے گی اور پھر شرفا اور چھوٹی امت سب کی۔ سرکار نے اگرچہ فیاضی سے گرل اسکول بھی قائم فرمائے ہیں لیکن اس وقت اس میں شرفا کی لڑکیاں تو شاید کہیں داخل نہ ہوئی ہوں گی اور نہ ایسی امید ہے۔ اب اس وقت کی عبرت خیز حالت جو دیکھی جاتی ہے۔ اگرچہ اخلاف ہی کی لڑکیاں پڑھتی ہیں لیکن اُن سے ماسٹر اور پروفیسر کوئی بھی نہیں بچ سکتے۔ چناں چہ ایک طبیعت دار میرے دوست نے اسکول میں جوان جوان حسین حسین لڑکیوں کو

دیکھ کر ایک شعر برجستہ کہہ دیا ؎

بہ مکتب میروؤ تو خیزد و نخستم
مبارک باد مرگ نو بہ ٹیچر

ماسٹر۔ قہقہہ مار کے تم ابھی ان باتوں کو کیا خاک جانو۔ یہی تو جہالت ہے۔ جب پوری تہذیب ہو گی دیکھ لینا کہ یہی شریفوں کی عورتیں اور لڑکیاں بازاروں میں، باغوں میں غیر مردوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیئے سیر گشت کرتی نظر آئیں گی۔ کیا یورپین شریف قوم نہیں ہیں۔ پھر ان کی عورات کیوں کر پھرتی ہیں، نہ خاوند کو بدگمانی ہوتی ہے، نہ رقابت کا رشک، نہ لڑائی دنگا کشت و خون۔ یہ مقتضائے جہالت ہے کہ آئے دن ہندوستان میں اس کی وجہ سے کشت و خون ہوا کرتا ہے۔

شاگرد۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے لوگ ایسی بے حیائی اختیار کریں گے۔ اگر تہذیب اسی کا نام ہے تو میں درگزرا۔ بھلا یہ کیسے دیکھا جا سکتا ہے کہ جورو غیر کا ہاتھ پکڑے اور بگھی پر غیر کے پہلو سے پہلو ملا کے بیٹھے اور جہاں جا ہے چلی جائے اور شوہر صاحب بہادر کھڑے ہوئے منہ دیکھا کریں۔ ہندوستانی تو اسی کو نہیں برداشت کر سکتے کہ ان کی آشنا بازاری رنڈی بھی ان کے سامنے بے موقع مذاق کرے یا ایک کے سامنے دوسرے کو اپنے مکان میں آنے دے۔ چناں چہ کسی نے ایسے ہی موقع پر بگڑ کے کہا ہے۔ ع

لال کوٹھی تیرے کمرے کو بنا دیں گے آج

ماسٹر۔ ہاں سچ ہے حالت موجودہ کو دیکھ کر جن کے خیالات دوربین نہیں ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں اور دراصل یہ سب کم ظرفی اور جہالت ہے۔ تم ہی کہو کہ یہ وحشیانہ حرکات ہیں یا عاقلانہ۔ جب تہذیب آئے گی تو اس کے ساتھ عالی ظرفی بھی آئے گی اور اس قسم کے خرف حرکات اور خرف خیالات جاتے رہیں گے۔

شاگرد۔ سبحان اللہ یہ عالی ظرفی کاہے کو ہے کھلی کھلی بے حیائی ہے۔ معلوم نہیں جس تہذیب کو آپ تہذیب سمجھتے ہیں اس میں حیا و شرم کیوں جاتی رہتی ہے۔ کیا مت پلٹ جاتی ہے، دماغ میں خلل آجاتا ہے، جنون ہو جاتا ہے میں تو دیکھتا ہوں کہ اکثر وہ لوگ جو تہذیب یافتہ کہلاتے ہیں مجنونانہ حرکات کرتے ہیں۔

ماسٹر۔ نہیں صرف خیالات بدل جاتے ہیں جن باتوں کو تم اپنے خیالات سے بے فائدہ عیب سمجھتے ہو ان کو وہ عیب نہیں جانتے۔ تم لوگ ادب اور تہذیب کو بے ادبی اور مجنونانہ حرکات سے تعبیر جو کرتے ہو یہ سب تمھاری جہالت ہے۔ کوٹ پہننا اس وجہ سے معیوب سمجھتے ہو کہ وہ نیچے دامن نہیں رکھتا۔ اسفل جسم کا ساتر نہیں دامن دار انگرکھے، اچکن، عبائیں ساتر ہوتی ہیں۔ لیکن دراصل غور کرو تو معلوم ہو سکتا ہے کہ کس قدر اس میں آرام چستی پھرتی کم کپڑے کا خرچ اور ستر کی ضرورت صرف اس قدر ہے کہ برہنگی دفع ہو نہ یہ کہ اسفل جسم کا نشان اور علامت

اور نقش سب معلوم رہے وہ اس حالت میں جب کہ آدمی پاجامہ یا پتلون پہنے ہوئے ہے حاصل ہے تو اس افراط سے فائدہ۔ بڑی بے تہذیبی کھڑے ہوکے پیشاب کرنے میں کہی جاتی ہے وہ صرف اس وجہ سے کہ رسم نہیں ہے وہ ڈاکٹروں سے پوچھیے تو معلوم ہو جائے کہ کھڑے ہوکے پیشاب کرنے میں کیا کیا فائدے ہیں۔ غرض میں کہاں تک دماغ خالی کروں سب تمھاری جہالت ہے۔ چناں چہ تم اس وقت بہت سے کھیلوں کو اچھا سمجھتے ہو اور شایق کنکوا بازی۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ گنجفہ۔ چوسر۔ شطرنج۔ لیکن جب اپنی ہی مذہبی تعلیم حاصل کرو تو معلوم جائے گا کہ یہ سب ممنوعات سے ہیں۔

شاگرد۔ خیر ان سب کو ہم آپ کے کہنے سے تسلیم بھی کرلیں لیکن یہ تو کسی طرح کبھی تسلیم نہیں کرسکتے کہ عورات کی مخالطت غیر مردوں سے جائز سمجھی جاسکے کیوں کہ یہ دونوں اضداد ہیں بارود اور آگ کی یک جائی اور پھر انھیں بدگمانی کو دخل نہ دینا کسی عاقل کا کام ہے۔ اس معاملہ میں عقلا کا قول کیا ہے۔ آپ نے تو ملاحظہ کیا ہوگا کیوں کہ آپ تعلیم یافتہ ہیں عقل کیسے قبول کرسکتی ہے کہ آتش اور آتش گیر مادہ اور دونوں طرف سے کشش مقناطیسی موجود اور پھر گل نہ کھلے۔

ماسٹر۔ میاں صاحب زادے یہ خیال تمھارا اُس وقت تک ہے جس وقت اس فعل کو عیب سمجھتے ہو جو جہالت کا اثر ہے۔

شاگرد۔ میں نہیں مانوں گا اب آپ گریز کرتے ہیں اور اصل مطلب کو جو بے اختیار زبان پر آنے والا ہے آپ پھر روک لیتے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں فرماتے۔ آخر کیا میری تعلیم میں آپ کو کسر رکھنی منظور ہے۔

ماسٹر۔ نہیں نہیں تعلیم تمھاری پوری منظور ہے لیکن میں ابھی تم میں اتنا مادہ نہیں دیکھتا کہ تم میری تقریر کا مطلب پورے طور پر سمجھ سکو جب اس ڈگری کو پاس کرلوگے جس کو میں نے پاس کیا ہے تو خود بخود منکشف ہو جائے گا۔

شاگرد۔ ماسٹر صاحب یہ سب صحیح ہے مگر میں پوچھتا ہوں کہ وہ کیا کوئی فری میشن کا راز ہے جس کو آپ اپنی زبان سے نکالتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ لیجیے میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں کسی سے بھی نہیں کہوں گا۔

ماسٹر۔ دیکھو بڑی احتیاط اس میں کرنا۔ تمھاری جہالت پیشہ قوم جو پہلے ہی سے اس امر کو سن پائے گی تو وہ اور بھی تہذیب سے کوسوں بھاگے گی۔ تمھارے آبا جان عمو جان وغیرہ تم سے اسکول ہی چھوڑا دیں گے کیوں کہ ان کو یہ خیال مذہبی تعصب پر آمادہ کرے گا۔

شاگرد۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ایسے عمدہ امر کو جو سینہ بہ سینہ تعلیم یافتوں میں چلا آتا ہے ہرگز افشا نہ کروں گا۔

(اودھ پنچ، مورخہ ۱۲ مارچ و ۱۹ مارچ ۱۸۹۱ء)

اکبر الہ آبادی کے مضامین

اکبر الہ آبادی کے یہ مضامین جو بالترتیب ۱۱ر اگست، پھر ۱۱ر اگست، یکم دسمبر اور ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۸ء کے شماروں میں شایع ہوئے ہیں، اپنے موضوعات کے لحاظ سے بھی اور اس اعتبار سے بھی کہ اکبر کے نوادر ہیں، دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔ پہلی تحریر "اردو ناگری" پر ہے، دوسری اور تیسری داغ کے شعر پر اور آخری اکبر کے مزاج اور اودھ پنچ کے انداز کی ایک نمایندہ تحریر ہے۔

اردو ناگری

جناب اودھ پنچ صاحب میں نے سنا ہے کہ میر سید علی صاحب بلگرامی نے رائے ظاہر فرمائی ہے کہ ناگری حروف فارسی حروف پر ترجیح رکھتے ہیں اور مسلمانوں میں کمی تعلیم کا باعث یہی ہے کہ فارسی حروف جاری ہیں۔

میر سید علی صاحب بڑے عالم شخص مشہور ہیں۔ بہت سی زبانیں جانتے ہیں۔ بڑے عالم ہونے کا کبھی کبھی نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی ساری قوم ہوئے طبل کی بولی اور حضرت بولیں عنقا کی بولی۔ یہ نہ ہو تو عالم ہونے کا ثبوت ہی کیا ہوا۔ جناب ممدوح کی رائے پر کچھ اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں مسلمانوں میں علما کی کمی اس سبب سے ہے کہ بہت پڑھنے کی شرط لگائی گئی ہے۔ صرف پڑھو، نحو پڑھو، منطق پڑھو، معنی پڑھو، معنی بدیع پڑھو، فقہ پڑھو، حدیث پڑھو، تفسیر پڑھو تاریخیں پڑھو، ادب جانو، تب عالم کہلاؤ۔ وہ بھی بہ شرط حسن عمل۔

وہی کورس جو پاٹ شالوں میں مقرر ہے کیوں نہ کافی سمجھا جائے۔ سچپیا۔ چھبیسا۔ ستائیسا۔ اس میں کیا کچھ کم کرتیں ہیں۔ اگر کچھ کسر رہ جائے ملک محمد جائسی کی پدماوت یاد کرا دی جائے۔ الہیات پر پورا عبور ہو جائے۔ لغت دانی کے لیے یہ کیا جائے کہ بتا دیا جائے کہ بیل کو فارسی میں یہ کہتے ہیں۔ جرمن میں یہ کہتے ہیں۔ بآسانی زیادہ علما پیدا ہو جائیں۔

داغ و ہیرا

ناتو ابرہانکم، "ازم ک" نے ماشاءاللہ خوب مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے جو محاورات تصنیف کیے ہیں، وہ ان لوگوں کے لیے سبق ہیں، جو محاورات کے استحکام اور ان کی نزاکت سے آگاہ ہونا چاہیں۔

اس سلسلے میں بعض ضروری باتوں کے عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

حضرت داغ کے استاد ہونے میں شک نہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم لوگ اپنے شعرا اور اہل کمال کی قدر

نہیں کرتے یا اُن کا ادب اور ان کی عزت نہیں کرتے ، یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی استاد کے کلام پر اعتراض کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ معترض کے نزدیک وہ استاد نہ رہا۔ کون ایسا استاد گزرا ہے جس کے کسی ایک شعر پر بھی اعتراض نہ ہوا ہو۔ لیکن اس سے کیا اس کی استادی جاتی رہی، ہرگز نہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اشعار پر اعتراض کر دینا بہت سہل ہے خصوصاً جب کہ صحت الفاظ و ترکیب نحوی کو چھوڑ کر بہ لحاظ معنی و مفہوم کے شعر پر نظر کی جائے ہر شخص کا مذاق و طرز خیال جداگانہ ہے۔ شاعر کا خیال آخر ایک رخ رکھتا ہے معنی کے پہلو اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کا حصر دشوار ہے۔ یہ بات اس سبب سے پیدا ہوتی ہے کہ عموماً مجازی معنی الفاظ کے لیے جاتے ہیں۔

پس ہم حضرت داغ کا اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے ملک اور زبان کے ایک نامور اور نہایت ذہین شاعر ہیں۔ نہایت ادب کرتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نے اپنی استادی کو مدت سے ملتوی کر رکھا ہے۔

حسن زبان اور حُسن خیال دونوں کے امتزاج سے عمدہ شعر پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے حسن زبان کی دُھن میں حسن خیال سے بہت کچھ قطع نظر کی ہے اور حُسن زبان کو اس قدر روندا ہے کہ غالباً زبان ہی رہ گئی ہے۔ حُسن جاتا رہا ہے۔

اسی پر اودھ پنچ کے ایک نامہ نگار نے یہ مقطع کہا ہے ؎

جناب داغ سے نسبت ہے کیا مجھے...
میں بات کہتا ہوں اور وہ زبان کہتے ہیں

(مصنف کا جو کچھ مطلب ہو ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ زبان ہی زبان ہوتی ہے۔ کوئی بات نہیں ہوتی)

حضرت داغ کی طرف سے بہت کچھ معذرت ہو سکتی ہے کہ ہمارا مخاطب اسی طرز سخن پر پھڑک جاتا ہے ہم کیوں نہ اسی رنگ کو شوخ کریں۔ لیکن معترض کی تسکین کو یہ جواب کافی نہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ردیفوں کا چمکنا اور نہایت بے تکلف طور پر ان سے معنی کا پیدا ہونا اور ان کا بامحاورہ ہونا مقبولیت شعر میں نہایت درجہ موثر ہے۔ لیکن درحقیقت ردیفوں ہی کو چمکا کر داد لینا اور اسی پر قناعت کرنا اور زبان ہی کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرنا دلیل اس بات کی ہے کہ شاعر عمدہ خیالات اور بلند مضامین پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ وہ دلوں کو بے چین نہیں کر سکتا۔ ان کو لٹریری تعجب ہی میں محو کیا چاہتا ہے۔ وہ چمن نہیں کھلا سکتا، آتشبازی چھوڑ سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں یہ بھی ایک رنگ ہے اور اس رنگ کا کامل بھی استادی کا مستحق ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خیالات رکیک اور نیچرل واقعات کے خلاف نہ ہوں اور زبان صحیح اور پاکیزہ اور بامحاورہ ہو۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم صرف حسن خیالات یا خیالات مفیدہ کے طرف دار ہیں۔ ہرگز نہیں۔ شاعری کا لچ

یا مدرسہ کا سبق نہیں ہے۔ دنیا آنکھوں کے سامنے ہو۔ نازک اور بے چین دل پہلو میں ہو۔ لطیف اور رنگین خیالات ہوں۔ طرزِ بیان دل کش ہو۔ یہ باتیں شاعری کی ہیں۔

ہمارے مولانا حالی بھی کسی زمانے میں اچھے شاعر تھے۔ لیکن حضرت نے اب حُسن خیال کی دُھن میں حسنِ بیان سے قطع نظر کی ہے۔ اور حسن خیال کو اس قدر رو ندا ہے کہ حُسن جاتا رہا، خیال ہی خیال رہ گیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے نہایت مجمل ہے۔ مثالوں سے اثبات و توضیح چاہیے۔ ماشاء اللہ اس کی کوشش کروں گا۔

داغی شعر

عزیز بھائیو۔ اب میرے کی کنی کی بحث چھوڑو۔ جو اس شعر کو بے داغ کہتے ہیں۔ ان پر کچھ الزام نہیں ہے۔ اردو شاعری ایسی ہی ہوگئی ہے۔ اور داغ کا یہی رنگ ہے بلکہ سامعین کا یہی رنگ ہے جو اس شعر کو ناپسند کرتے ہیں، ان پر زبردستی نہیں ہوسکتی کہ خواہ مخواہ پسند کریں۔ زبان اور محاورات اور اصولِ بلاغت کی نسبت بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔ شعر کا یہ مطلب ہے کہ ہم رونا ضبط نہیں کرسکتے ورنہ مرجائیں گے۔ اگر کوئی پوچھے کہ پھر مر جائیے گا تو کیا ہرج ہے؟ مرنے سے احتراز اور خوف عشق کی شان نہیں ہے۔ جواب ہوگا کہ وصل کا انتظار ہے، اس کی امید ہے، سو اس کے اور بھی بہت سے مشاغل ہیں۔ ازاں جملہ تعشق بھی۔ اس وجہ سے مرنا منظور نہیں۔ اور خودکشی شرعاً ناجائز ہے۔ اور سو بات کی یہ بات ہے کہ اپنا اپنا مذاق ہے۔ کسی کو مرنا منظور، کسی کو مرنا نہیں منظور۔ محتاط آدمی عشق میں ایسی تکلیف کیوں اٹھائے کہ مر جائے۔ اس جواب کا کچھ جواب نہیں ہوسکتا بجز اس کے کہ ہم کو یہ مذاق پسند نہیں۔ اچھا آپ کو پسند نہ ہو۔ خاموش رہیے۔ کیا استادوں کے تمام شعر ہر ایک کو پسند ہوتے ہیں:

حضرت دل۔ جن کا آخری فقرہ طعن آمیز ہے۔ اس کے سوا ان کی ساری تقریر تہذیب اور عمدگی کے ساتھ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی صحت تسلیم نہ کی جائے۔

(اودھ پنچ، مورخہ یکم دسمبر ۱۸۹۸ء)

مکرمی کی فتنہ انگیزی

ایک عنایت فرما جن کی خدمت میں مجھ کو کچھ بہت زیادہ نیاز حاصل نہیں ہے مجھ سے ناخوش ہوگئے ہیں اگرچہ میں بے قصور ہوں اور میرے لائق دوستوں نے جناب ممدوح سے ظاہرا میری صفائی کردی ہے لیکن ہنوز ان کا اطمینان نہیں ہوا۔ حالت یہ پیش آئی کہ جس دوست کے ہاں صاحب موصوف مقیم تھے ان کو میں اکثر رقعے لکھا کر

اوران میں اپنے دوست کو بہ لقب مکرما مخاطب کرتا تھا اور یہ بزرگوار بھی ان رقعوں کو دیکھا کرتے تھے۔ ایک دن ایک خاص موقع پر میں نے جناب ممدوح کو ایک رقعہ لکھا اور بلا ارادہ بہ لفظ مکرمی خطاب کیا پہلے سے بھی ان کی نسبت بعض احباب کا خیال کچھ اور تھا اور وہ اپنا درجہ ثابت رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ذرا اس بدگمانی کو ملاحظہ فرمائیے مکرمی کو مکرما کی مادہ سمجھے جس طرح بکرا بکری۔ اسی طرح انھوں نے مکرما مکرمی کو خیال کرکے سمجھا کہ میں نے ان سے دل لگی کی ہے۔ ب لوگوں سے میری شکایت شروع کی۔ لوگ بھی دل لگی باز۔ انھوں نے اور بھی ان کو برہم کیا۔ جب مجھ کو اطلاع ہوئی ذمیں نے ہنسنا ملتوی کرکے احباب کے ذریعہ سے ان کی خدمت میں التماس کیا کہ وہ الف ندا ہے اور یہ یائے متکلم ہے لفت اور ترقی پر وہ اور بگڑے۔ اب میں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ تعلیم کی کمی سے یہ خرابیاں پیدا ہوئی ہیں بہرکیف یں پھر اس تحریر کے ذریعہ سے ان کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ مکرمی کی ی بکری والی نہیں ہے۔

اودھ اخبار، نول کشور، اور سرشار

۱۸۹۱ء

سوال

جناب اودھ پنچ خاں صاحب السلام علیکم۔ آیا لکھنؤ شما "نول" نیز نام دارد "نول کشور" شہر مشہور است امیر بل بنابلیہ فہرست بمبئی کتابے طلب کرد بعد مطالعہ اش روزے ازیں احقر فرمودکہ "بہ بینید ایں کتاب مطبوعہ کشور "نول" ست، من ہیچ نہ فہمیدم وسکوت ورزیدم۔ ایشاں دوبارہ گفتند۔ عرض کردم کہ "نول" چہ فرمودند۔ کشور نول ہندوستان است عرض نمودم کہ نول نام شہرے نیست وگاہے نشنیدم و ندیدم امیر صاحب از حد افروختند کتاب را برہم زدند و پیش چشم آوردہ گفتند، "بہ بیں بغور بہ بیں، شہر یست "نول" یا نہ۔ ترسیدم و شنیدم کہ بغرض محال نول کشور شہر یست پس منشی یعنی چہ۔ اے بندہ نواز۔ امیر صاحب را خیلے غصہ آمد و رنگ ہر دو رخسارہ سرخ شد۔ کمال کرختگی آواز و بخنگی صوت کریہہ گفتند، منشی منشی منشی نیست، منشی است (یعنی نشہ کنندہ) کشور منشی بچہ طور خواہد شد۔ من از سابق زیادہ ترسیدم و بہ لہجۂ خائفان بکمال ادب سر خم کردہ و چشم بستہ گفتم کہ اگر لفظ منشی برائے شہر نامناسب و ناموزوں نیست پس منشی نیز ہمیں حکم دارد۔ کشور منشی بچہ طور خواہد شد، اے حضرت غضب بر غضب کردہ غصہ بر غصہ افزود۔ امیر صاحب بسیار آشفتند و گفتند کہ ایں صفت مطبع واقع شدہ یعنی مطبع منشی ہست۔ سبب صرف سیاہی، دو و چانڈو کہ در مطابع ہندوستان بکثرت خرچ میشود، بہ مجبوری از خوف جلالت و سوادب راست و بجا گفتم و اقرار فہمیدن نمودم مگر بسر شما اطمینان نماند لہٰذا بہ ہزار آرزو ملتمس و مستدعی میشوم کہ آیا آنچہ امیر لفت صحیح و بجا است و "نول کشور شہر یست یا نام لکھنؤ شما است" از راہ عنایت جواب جلد از جلد مرحمت فرمایند

و مرا از خلفشار وا رہانید۔ احسانِ عظیم خواہد شد۔ زیادہ چہ تکلیف دہم۔

راقـــــــــــــــــم

نیاز مند جدید۔ عبد المجید

(اودھ پنچ مطبوعہ ۱۹ر فروری ۱۸۹۱ء)

۱۸۹۳ء

۱۹ر اکتوبر کے اودھ پنچ میں:

کامنی

"ہمیں پورا یقین ہے کہ اس پر یا نام کے عنوان سے عاشق مزاج شاہد باز بزرگواروں کی نظر اس مضمون پر ضرور فوراً پڑے گی۔ یہ ایک ناول کا نام ہے جو رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی سابق نامہ نگار اودھ پنچ و بعد اڈیٹر بنیا اخبار نے حال میں تصنیف کیا ہے۔ خدا جانے انھوں نے کیا جاتی دنیا دیکھی کسی لنیئے بنیئے کے ہاتھ اس ناول کو اونے پونے نہ پٹیل ڈالا۔ اب کی ان کا قصد ہے کہ خود چھپوائیں اور حق تصنیف بنیئے کی گون یا کھاری کنوئیں میں نہ پھینکیں۔ کسی بڑے گرو نے سوجھائی ہے۔ بارے شکر ہے کہ صبح کا بھولا شام کو تو گھر آیا۔ اس ناول کی خریداری کی درخواستیں مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا کے نام لکھنؤ توپ والی کوٹھی کے پتے سے بھیجی جائیں۔"

اس پر سرشار نے ۱۶ر نومبر کے پرچے میں لکھا:

"ڈیر پنچ۔ میرے نئے ناول کامنی کی نسبت جو مضمونچہ آپ نے شایع کیا۔ اس کا ع

شکر نعمت ہائے تو، چنداں کہ نعمت ہائے تو

اور میں نے جواب تک شکریہ نہیں ادا کیا تو۔ ع

عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

کامنی، بی کامنی، مس کامنی ـــ جو نام رکھیے وہ اس پریا کے لیے موزوں ہے اور پدمنی عورت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اگر ساری اور کرتی پہنا دو تو بھی جوبن پھٹ پڑے اور دوپٹے پائجامے اور محرم آب رواں میں بھی پری کو شرمائے اور گون اور شمی اور اسکرٹ میں خاص الخاص فرنگن معلوم ہونے لگے۔ جامہ زیب۔

ہاں خوب یاد آیا۔ یہ آپ آئے دن بنیوں پر کیوں منہ آجایا کرتے ہیں۔ اول تو بنیا وہ جو آٹا دال نون تیل لکڑی بیچے کسی رئیس کو ضد سے بنیا کہنا، یعنی چہ۔ دوسرے بندہ نواز، اگر بنیے نہ ہوں تو کال کے زمانے میں تو بہی کھلی ایک

اور کال پڑ جائے۔ خدا کرے آپ کے گولہ گنج کے بنیے کچھ دن کے لیے دوکانیں ایک سرے سے بند کر دیں، پھر حضور کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ دو اور دو، چار روٹیاں بتائیے۔ اگر اخبار کا نام قومیت کے لحاظ سے رکھا جائے تو بھار گو اخبار کہیئے، یہ بنیا اخبار کیا معنی۔ ورنہ اب ہم بھی اودھ پنچ کے عوض شیخ بٹے پنچ کہیں گے۔ یوں تو یوں ہی سہی۔ ہم بھی سوم نیک ذات میں ہیں [یعنی کشمیری] ہات تیرے کی۔ جب دیکھو بنیوں پر آوازہ۔ سنتے سنتے کلیجا پک گیا۔ لاحول ولا قوۃ!

کجا بود منزل کجا تاختم

دراز نفسی معاف۔

کامنی ناول کے قدر دانوں کا بھی لگے ہاتھوں شکریہ ادا کرنے دیجیے۔ اس ناول کا مختصر سا انتخاب انشاء اللہ ہدیۂ ناظرین اولی الابصار کیا جائے گا۔ درخواستیں مسٹر حامد علی صاحب کے نام بھجوائیے۔ دیر نہ کیجیے۔ اس ناول میں وہ وہ جدتیں ہیں کہ پھڑک جائیے گا۔

راقم ــــ پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

لکھنؤ۔ ۲۹ نومبر"

متفرقات

رسالہ ناول کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسالہ مذکور یکم جنوری ۱۸۹۳ء سے شایع ہوتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ انگریزی ڈھنگ کے اوریجنل ناول ماہوار رسالے کی صورت میں شایع کیے جائیں۔ (مالک منشی جے نراین ہیں)

(۳۰ مارچ ۱۸۹۳ء)

تو کار زمیں را نکو ساختی

کہ با آسماں نیز پرداختی

دلگداز کو ہم نہیں کہتے کہ بقول خود اردو لٹریچر میں نئی روح نہ پھونکے .... اس کے لیے وسیع میدان ناول اور دل چسپ خانۂ ڈراما موجود ہے.... لیکن ــــ .... ماہ جون ۱۸۹۳ء کے پرچے میں امیر معاویہ کا فتح قسطنطنیہ کے لیے فوج بھیجنا اور اس کے محاصرے میں حضرت امام حسین کا ماتحتی یزید شرکت کرنا کس آب و تاب اور بلند پروازی کے ساتھ لکھا گیا ہے جو سراسر عقلاً و نقلاً غلط ہے۔..." سید الفت علی۔ امیٹھی۔ لکھنؤ (۲۰ جولائی ۱۸۹۳ء)

۱۹ر نومبر کے پرچے کے ایک مضمون کا عنوان :

"ہوں گے جب ہوں گے حضرت یوسف
آج تو آپ کا جواب نہیں "

لکھنے والے ہیں مجلسی

۱۸۸۵ء کے فائل میں شوق قدوائی کی طرف سے اخبار آزاد میں اشتہار ہے۔

۱۸۸۶ء میں بھوپال پر ایک تذکرہ ہے۔ نظام دکن کے نام کھلے خط ہیں جن میں سے کچھ ۱۸۸۵ء میں آچکے ہیں۔

عورتوں کی آزادی کی مانگ پر ایک دلچسپ شذرہ ہے جس کا عنوان مجھے بہت پسند آیا: "بلبل بھی بولتا ہے تو صیاد کی طرف"

ایک جگہ شوکت ہند پر تبصرہ ہے اور تبصرے کا یہ انداز بہت ہی پیارا ہے: "یہ وسیع دو ورقہ اخبار بمبئی سے شایع ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں جیسے اردو اخبار ہوتے ہیں ویسا ہی یہ بھی ہے ؎

دندان تو جملہ در دہانند
چشمان تو زیر ابروانند"

۲۹ر اپریل اور ۱۳ر مئی کے شماروں میں بالترتیب پنڈت بشن ناتھ در اور مہاراجہ دلیپ سنگھ پر مضامین ہیں۔

۲۶ر اگست کے پرچے میں ٹیکس کے خلاف جو مستقل مہم جاری تھی۔ اس سلسلے میں کچھ دوہرے ہیں۔ دوہرے مزے کے ہیں اس لیے سُن لیجیے۔ یہ کسی صاحب آر (R) کے کہے ہوئے ہیں:

لارڈ ڈفرن کے راج ماں ٹیکس کی بھرمار　　ہم کا ایسا ڈانڈ سے بچایو کرتار
پیا ڈفرن سے جا کہیو اتنا سندیس ہمار　　پیا پیا تو موس چکے اب ٹیکیو گھر بار
پہلے پہل مورو ٹی کھیا اب انکم ٹیکس کی مار　　دیکھیو ہم رے سبرن سے جلئے نام تمہار
رہا سہا گھروا ہارا ہے وہ ہو ٹیکیو ہمار　　پیا ڈفرن داہ باتن پر میں توری بلہار
روئے روئے کہیں پنچ سے یوں مسٹر آر
ہم جانت ہیں کو وجتن سے بچے نا جان ہمار

اسی ٹیکس کے چکر میں ۹ر ستمبر کو طاہر بجنوری نے ایک شذرہ لکھا تھا اور اس میں بھی پرانے شعر کی ایک ہیروڈی کی تھی:

فکر امیر، الفت رشید، خیال ٹکس
اس پنج سالہ عہد میں کیا کیا کرے کوئی

۱۸۸۷ء

ایک پرچے ۱۸۸۷ء کو اودھ پنچ کے ایک خفیہ نگار نے سن ستیاناسی کا خطاب دیا ہے۔ (۱۷ مارچ ۱۸۸۷ء کے ۲۴ مارچ اور ۳۱ مارچ کے شماروں میں ایک دیوان بلکہ "دیوان کے بچہ" پر تفصیلی تنقید چھپی ہے۔ لکھنے والے منصف لکھنوی اور عنوان ہے "اے خدا ایشیائی شاعری کو اٹھا لے" اس میں ۸۶ اشعار کا اس طرح پوسٹ مارٹم کیا ہے کہ فلاں لفظ بھرتی کا ہے۔" ذرا سی توجہ سے بدل سکتا تھا" تراکیب کے بے ڈھنگے پن پر اعتراض کیا ہے۔ بعض الفاظ کی کسی شعر میں کمی پڑ جاتی ہے تو ان کی طرف اشارے ہیں جو زائد بتائے ہیں۔ اور اسی قسم کے بہت سے عیوب بتائے ہیں۔ اس مضمون سے اس زمانے کے ان معیاروں کا بڑی خوبی سے پتا چلتا ہے کہ شعر کے نقائص کیا کیا سمجھے جاتے تھے۔ اس عہد کی لکھنؤ اسکول کی تنقید کو سمجھنے کے لیے یہ اچھا خاصا نمائندہ قسم کا مضمون ہے۔

۲۸ اپریل، ۵ مئی، ۲۶ مئی، ۲ جون اور ۱۱ اگست کے شماروں میں "معاملات حیدرآباد دکن" پر ایک مضمون ہے۔

۷ جولائی ۱۸۸۷ء کے شمارے میں ریاست رام پور کے مدارالمہام جنرل اعظم الدین خاں کے حسن انتظام پر ایک تحسینی نوٹ ہے (یہ بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ ۱۸۹۱ء کے اودھ پنچ کے متعدد شماروں میں جنرل کی شہادت کے بعد اس کے مقدمہ کی تفصیلات میں جتنا اودھ پنچ نے دلچسپی لی اتنا یا اس کا عشر عشیر بھی کسی اور جگہ نہیں دیکھی گئی)۔

۲۹ ستمبر کے پرچے میں ایک خبر کا عنوان اس طرح لکھا ہے کہ "نیبو (لیمو) مہنگے ہو گئے" نیبو بھی لکھا ہے اور بریکٹ میں لیمو بھی لکھا ہے۔ اور ۲۴ نومبر کے پرچے میں ایک عنوان ہے "نخالص انصاف" نخالص خالص کے کے لیے روہیلکھنڈ والوں کے بقول پشتو کا لفظ ہے۔ اسی طرح لیمو کے لیے نیبو لکھنؤ میں بھی بولا جاتا رہا ہے یہ دلچسپ ہے۔

مثیلِ حضرت عیسیٰ بن ...... ہوا پیدا
عدوِ جانِ سرسید عجیب الشاں ہوا پیدا

ابھی حضرتنا و استادنا مولانا اودھ پنچ تسلیم۔ سواد سوڈان سے صدائے انا المہدی الموعود اور ایلیا کالج سے آوازہ انا المسیح الدجال تو غلغلہ انداز چار دانگ عالم تھا ہی تھا اب مملکت پنجاب کے ایک کھنڈ سے ولولۂ انا المثیل المسیح بڑے زور شور کے ساتھ امنڈ اٹھا ہے خدا ہی خیر کرے رہے سہے یاجوج روس منحوس وہ بھی بمصداق خبر مخبر صادق یَبْعَثَ اللہ یاجوج ماجوج وھو من کل حدب ینسلون فیمر اوائلہم علی بحیرۃ طبریۃ فیشربون ما فیھا کے ڈنڈناتے اور تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں بحیرہ طبریہ (اٹک واقع پنجاب بھی

ان کی آتش تشنگی بجھانے کو قریب ہی لہلہا رہا ہے اور پیروانِ مسیح بھی ان کے مقابلہ کو دست بقبضہ ہیں اور من کل حدب سے مراد دروب کابل و کشمیر اور نیپال اور سواد سکندر وغیرہ وغیرہ ہے الغرض آثار کبریٰ تو سب کے سب ظاہری ہیں قیامت کے آنے میں بھلا اب کس کو شک و شبہ واقع ہوگا۔ ہر کہ شک آرد کافر بود۔ ان دنوں ایک بزرگوار جن کا نام نامی واسم گرامی مولوی غلام احمد صاحب قادیانی ہے بڑے مضبوط دعوے کے ساتھ اپنے آپ کو مثیل مسیح قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ فقیر حقیر کو بذریعہ الہام منجانب ملک العلام اس بات کا یقین دلایا گیا کہ فقیہ مثیل مسیح ہے اور پھر اس پر طرہ کہ کتب اربعہ سماوی مصدق فقیر ہیں اور اگر آئندہ از روئے عقائد اہل اسلام کوئی اور بھی مثیل آنے والا ہو تو وہ بھی غالباً میری ہی ذریت سے ہوگا اور عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انتقال ہوگیا ان کی روح پرفتوح اعلیٰ علیین پر فردوس بریں کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہی ہے۔ اور ان کی موت قرآن و حدیث سے بروایت ابن عباس ثابت کرتے ہیں۔ چلو سارا قصہ کھیڑا فرو ہوا الوہیت کا دعویٰ رہ گیا وہ بھی عنقریب ہوا چاہتا ہے۔ قرآن پاک اور حدیث صاحب لولاک اور دیگر کتب سابقہ سماوی میں جن کی زبانی حوالہ سے مولانائے موصوف اپنے دعویٰ عیسویت کو ثابت اور مضبوط کرتے ہیں کہیں مثیل کی آج تک خبر نہیں پائی جاتی اور بندۂ درگاہ کے نزدیک تو لفظ مثیل ایک ظاہری اوٹ ہے اور در اصل مولانا مدعی عیسویت بن بیٹھے ہیں۔ اور جناب مسیح علیہ السلام کو مفت بے موت مارے ڈالتے ہیں۔ اور اپنے ظہور کی سند بانی کتب اربعہ سماوی سے ثابت کرتے ہیں حالاں کہ قرآن پاک میں اللہ جل جلالہٗ نے صاف طور پر ارشاد فرمایا ہے۔ وما قتلوہ وما صلبوہ ولٰکن شبہ لہ اور آگے چل کے فرماتا ہے یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ دوسری یہ کہ احادیث نبوی میں حضرت عیسیٰ کا آسمان چہارم پر موجود ہونا اور حضرت مہدی کے وقت میں بغرض انتقام دجال بدمآل دنیا میں نزول فرمانا بخوبی متحقق ہے جو شخص ذرہ برابر ایمان رکھتا ہوگا کبھی انکار نہ کرے گا۔ اذ بعث اللہ عیسی بن مریم فینزل علی المنارۃ البیضاء الشرقی دمشق مہرودتین واضعاً کفیہ علی اجنحۃ الملکین اب دمشق سے مراد اگر پنجاب کے نواح کا کوئی کھنڈر ہے تو اور آثارات اور واقعات کی نسبت مولانا کیا فرماتے ہیں۔ اور قرآن اور حدیث وغیرہ وغیرہ میں جہاں کہیں ذکر ہے تو عیسیٰ بن مریم کا ہے نہ قادیانی صاحب کا الٰہو میاں مسٹر سر سید تمہارے دشمن جانی نے نزول اجلال فرمایا اب اپنے اور اپنے پیروؤں کی جان کی حفاظت کیجیے۔ کیا آپ نے مخبر صادق کا قول نہیں سنا بشرطیکہ قادیانی صاحب اپنے دعویٰ میں سچے ہوں (فینزل عیسی بن مریم فاقبھم فاذا راٰہ عدو اللہ ذاب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لانذاب حتیٰ یھلک ولٰکن یقتلہ بیدہ ویریہ دمہ فی حربتہ اب حضرت قادیانی صاحب سے صرف اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ جناب مسیح علیہ السلام کا کس تاریخ اور کہاں اور کس مقام پر انتقال ہوا اور مثیل کس جانور کا نام ہے اور والدہ کا کیا اسم مبارک ہے اور کتب اربعہ سماوی میں کس مقام پر آپ کا ذکر خیر ہے۔

ذرا مہربانی فرما کر ان سب باتوں کا جواب ارشاد فرمایئے غالباً ہماری سرکار گورنمنٹ بھی آپ کے اس بے دلیل دعویٰ کو قبول نہ فرمائے گی۔

راقم
ایک سچا مسلمان از دکن

(اودھ پنچ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۸۹۱ء)

۱۸۹۲ء

۴ فروری کے پرچے میں حکیم محمود خاں کے انتقال پر تعزیتی نوٹ ہے۔ انتقال ۲۴ جنوری کو ہوا۔

---

۲۵ فروری کے پرچے میں لطیفے کے عنوان سے احمد حسن عرشی رام پوری کا ایک خطرناک طنز چھپا ہے:

"ایک خانساماں سے برتنوں کی الماری گر پڑی۔ آواز سے میم صاحبہ کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً خانساماں کو بلایا۔ بہت بد دماغ تھیں کہنے لگیں کہ تم سؤر ابھی جہنم کو جاؤ۔ خانساماں تقضائے وقت دیکھ کر کچھ نہ بولا اور چپ چاپ گھر کو چلا گیا۔ ایک ہفتہ بعد خانساماں پھر روبرو میم صاحبہ کے گیا اور کہنے لگا۔ غریب پرور! میں نہایت دشواری و جانفشانی سے جہنم تک پہنچا لیکن وہاں پر گوروں کا سنگین پہرا جو باہر کھڑا تھا اس نے مجھ کو ٹوکا۔ اندر جانے سے روکا۔ میں نے کہا کہ میں ہرگز ہرگز نہ مانوں گا۔ میم صاحبہ کا حکم کیوں کر ٹالوں گا۔ اس نے یہ سن کر اپنے افسر کو اطلاع دی جو اندر سے نکلا اور کہا۔ کیوں کر آیا ہے؟ میں نے کہا کہ فلانی میم صاحبہ نے جہنم کو بھیجا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہاں نیٹیو کا کچھ کام نہیں۔ یہ تو بڑے آدمیوں کی جگہ ہے۔ میم صاحبہ جن کا غصہ فرو ہو چکا تھا، یہ سن کر خفت سے مسکرائیں، اور خانساماں کا قصور معاف فرمایا۔"

---

۳ مارچ کے پرچے میں 'اترولی ضلع علی گڑھ سے ایک پرچہ روح الاخبار نکلا ہے' اس پر تبصرہ ہے۔

---

۳۱ مارچ کے نمبر میں لکھا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیح ثانی ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے تو سرسید کو یحییٰ ثانی بن جانا چاہیے۔ اسی پرچہ میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر کے ۲۸ مارچ کو وفات کی خبر ہے۔ ۱۴ اپریل کے شمارے میں ان کی تصویر بھی چھاپی گئی ہے۔

۱۸۹۳ء

ایک روز اکبر شکار میں شیر کے پیچھے اپنے ہمراہیوں سے علیحدہ ہو گیا۔ ایک نوعمر دہقانی کو دیکھا کسی کے انتظار

میں درخت کے نیچے کھڑا ہے۔

اکبر۔ کس کے انتظار میں ہو؟

نوجوان ۔ سُنتے رہوں اکبر بادشاہ سکار کا نکلے ہیں۔ ٹوں ورسین کا ٹھاڑ ہوں۔

اکبر۔ بس یہی بات ہے۔ اچھا تو آ، تو میرے ساتھ چل میں تجھے ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں سے تو بادشاہ کو اچھی طرح سے دیکھ سکے۔

یہ سن کر وہ جوان اٹھا اور بادشاہ کے گھوڑے کے شکار بند تھام کے اس کے ہمراہ رکاب ہو لیا مگر تھوڑی دور گیا تھا کہ بولا۔

کاہے ہو کیسے جان پڑے بادساہ کون آہیں!

اکبر۔ بہت ہی آسانی سے۔ سوا اس کے اور سب کی نگاہیں اور گردنیں جھکی ہوں گی۔

اتنا کہہ کر بادشاہ تھوڑی دور چلا ہوگا کہ سامنے کے ایک جھنڈ سے اس کے ہمراہی خوشی خوشی گھوڑا دوڑاتے حاضر ہوئے اور سر جھکا کر اس کو واپسی اور سلامتی کی مبارک باد دینے لگے۔

اکبر۔ (مسکرا کر نرم آواز سے) کیوں، تو نے اب پہچانا۔ کون اکبر ہے۔

نوجوان ۔ اب کن کا بنائی، ہم ہیں یا تم ہو۔

اس جواب کو سُن کر اکبر بہت خوش ہوا اور اس کو اپنے رفیقوں میں جگہ دے کر سرفراز کیا۔

(۳۰ مارچ)

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ڈیر سر

جو لوگ مضامین کی چوری کرتے ہیں ان کو شاید یہ خیال ہے کہ چوروں کے واسطے دنیا میں کوئی سزا نہیں ہے، مگر وہ بڑے نادان ہیں۔ علاوہ قانونی سزا کے، آپس کی ذلت اور ہم چشموں کی نگاہوں سے گرنے کی سزا کیا کم ہے۔

کلکتہ کے اخبار جنرل وگوہر آصفی مطبوعہ، جولائی ۱۸۹۳ء میں سب سے پہلے ایک مضمون چھاپا گیا ہے .... جو اودھ پنچ میں کئی برس ہوئے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ا۔ع۔ شوق کا ہے۔ گوہر آصفی نے علاوہ مضمون کی چوری کے ایک عجیب لغو حرکت کی ہے کہ آخر میں ا۔ع لکھ دیا۔ تاکہ لوگ یہ گمان کریں کہ کوئی شخص

۱۔ع اس کے نامہ نگاروں میں ہے۔ شوق کا لفظ وہ چاٹ گیا ہے ..... "

" راقم: واقف کار"

(۶ جولائی ۱۸۹۳ء)

"اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست"

مندرجہ بالا عنوان سے گاؤکشی کے سلسلے میں ہندو مسلمانوں میں (خاص کر گیا میں) جو جوتی بیزار اور کشت وخون ہو رہا تھا، اس پر لکھا ہے:

حکومت نے تو اس کی ذمہ داری گئو رکھشنی سبھا پر ڈالی ہے اور ولایت کے اخباروں نے کانگریس کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے ....

مگر اصل وجہ .... ـــــ ... اجی یہ تو انگریزی طرز حکومت کے کھلے کھلے نتائج ہیں۔ یہ گائے اور محرم اور دسہرے اور پارس ناتھ کی رتھ وغیرہ تو حیلے ہیں جن کے پیرائے میں بخارات نکلتے ہیں بخارات پیدا ہونے کے اسباب پر نظر کرنی چاہیے ..... "

" راقم: صاف گو"

(۳۱ اگست ۱۸۹۳ء)

(اسی سلسلہ میں، ستمبر کے نمبر میں بھی دو شذرے ہیں۔ اور ایک ۱۹ اکتوبر کے پرچے میں)

---

۲۳ نومبر کے شمارے میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ایک شکایت نامہ ہے۔ باشندگان اضلاع شمال ومغرب کی طرف سے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک ہندستانی کو ہائی کورٹ کا جج کرنے پر ہم شکر گزار ہیں مگر بنگالی کے بجائے بہتر ہوتا کہ اسی طرف کا کوئی آدمی ہوتا۔ لہجہ خاصا سخت ہے۔

(۱۸۹۳ء)

رام پور پر ۱۸۸۹ء میں ۱۸۹۱ء میں اور ۱۸۹۲ء میں جنرل اعظم الدین خاں کے سلسلہ میں اہم معلومات ہیں۔

۱۸۸۸ء میں ۱۶ رفروری کے پرچے میں لکھنؤ کے ہدایت رسول بزم کی طرف سے "ادیب" نام کے رسالہ کا اشتہار ہے جو ماہانہ شایع ہوا کرے گا۔ اشتہار میں لکھا ہے کہ اس میں عروض و قوافی کے مباحث کے علاوہ "پولیٹیکل اور سوشل معاملات" پر آزادانہ رائے زنی ہوگی۔ اگر یہ پرچہ نکلا ہے تو پیارے لال شاکر اور نوبت رائے نظر کے "ادیب" بلکہ فیروز آباد کے ادیب (۱۸۹۹ء) سے بھی پہلے، بہت پہلے ایک اسی نوعیت کے رسالہ ادیب کا سراغ مل جائے گا۔

اور ۷ رجون کے پرچے میں امتیاز علی کے مترجمہ ڈرامے "جہانگیر" پر تبصرہ کے ذیل میں ڈرامائی صنف پر نظری حیثیت سے جو بحث کی گئی ہے اس کی آج بھی اہمیت ہے۔

نسیر اقبال

لے بے ڈف

اردو زبان و ادب کی تاریخ کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن پر ابھی تک کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوا۔ اردو قواعد کے تدوین کی تاریخ بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بڑی دلچسپ بات تو یہ ہے کہ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے اسی پہلو زورِ قلم صرف کیا ہے کہ یہ زبان کیوں کر اور کیسے پیدا ہوئی، اور یہ ایک دستور سا رہا ہے کہ جو بزرگ بھی تاریخ یا تذکرہ لکھنے بیٹھے انھوں نے پہلے زبان کی پیدائش سے متعلق ایک نیا نظریہ ضرور قائم کیا، یا کم از کم پرانے نظریات کا اعادہ کرنا ہی ضروری سمجھا۔ لیکن اس زبان کے قواعد کی تدوین کیسے ہوئی؟ اس سوال کی طرف تقریباً بالکل دھیان ہی نہیں دیا گیا حتیٰ کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اردو زبان کی قواعد کی کتابیں پہلے کن لوگوں نے مرتب کیں۔ عموماً تذکرے اور تاریخ کی کتابیں ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ چند تاریخوں میں اگر تذکرہ بھی کیا گیا ہے تو وہ اغلاط سے پُر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گرسیم لیبے ڈف کا نام اردو داں طبقہ کے لیے اگر بالکل ہی نامانوس نہیں ہے تو بھی کسی حد تک اجنبی سا ضرور ہی ہے۔

گرسیم لے بے ڈف ایک روسی سیاح تھا۔ انگریزی زبان میں اس کا نام ہر جگہ ہیرسیم لے بے ڈف لکھا گیا ہے۔ خود اس نے بھی اپنی کتاب میں ہیرسیم ہی لکھا ہے لیکن یہ ہیرسیم لفظ دو وجہوں سے غلط معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو روسی زبان میں 'ہ' یا 'H' کی آواز ہی نہیں ہے۔ دوسرے روسی لسانیات کی تاریخوں میں جہاں کہیں بھی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے گرسیم ہی لکھا گیا ہے۔

گرسیم لے بے دف ۱۷۸۵ء میں ہندوستان آیا تھا اور یہاں پہلے مدراس کے حاکم شہر نے اس کو بینڈ ماسٹری کی خدمت سپرد کی۔ اس کے بعد وہ کلکتہ چلا گیا اور اس نے ہندستانی زبانوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اسی نے بنگال میں اسٹیج ڈرامہ کی ابتدا کی اور اس کے بعد اس نے "ہندستانی ملی جلی بولیوں کی صرف و نحو" مرتب کی۔

اردو زبان میں اس کا ذکر سب سے پہلے مولوی عبد الحق صاحب نے "اہلِ یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی"

میں کیا ہے۔ اردو زبان میں لے بے ڈف کا غالباً یہی سب سے مفصل تذکرہ ہے لیکن یہ بھی رسالہ کے صرف تین چوتھائی صفحے تک محدود ہے، جو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

"۱۸۰۱ء میں ایک روسی شخص لے بے ڈف (Lebedef) نامی نے ہندستانی زبان کی صرف و نحو لکھی۔ اس شخص کے حالات بہت دل چسپ ہیں جو خود اس نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان پہلے پہل ۱۷۸۵ء میں مدراس پہنچا۔ جہاں غالباً اس کی خدمت بینڈ نوازی کی تھی۔ وہاں دو سال رہ کر وہ کلکتہ چلا گیا۔ کلکتہ میں اس کی ایک پنڈت سے ملاقات ہوئی جس نے اسے سنسکرت، بنگالی اور ہندوستانی زبانیں سکھائیں۔ ہندوستانی کو وہ ہندوستان کی ملی جلی زبان لکھتا ہے۔ دوسرا کام اس کا یہ تھا کہ اس نے انگریزی کے دو ناٹکوں کا ترجمہ کیا اور بقول ان کے ان میں سے ایک ۱۷۹۵ء اور ۱۷۹۶ء میں اسٹیج پر دکھایا گیا اور اس کی بہت قدر ہوئی۔ ایڈنگ کے قول کے مطابق وہ اس کے بعد شہنشاہ دہلی کے تھیٹر کا منتظم ہو گیا اور کوئی بیس برس مشرق میں رہ کر انگلستان واپس چلا گیا۔ لندن میں اس نے اپنی صرف و نحو لکھی اور اس وقت کے روسی سفیر ووارونزوف سے راہ و رسم پیدا کی جس نے اسے روس بھیج دیا۔ وہاں وہ روسی محکمۂ خارجہ میں ملازم ہو گیا اور سنسکرت کا مطبع قائم کرنے میں بیش قدر اعانت دی گئی۔ شاید وہ ہندوستانی کی نسبت سنسکرت اور بنگالی بہتر جانتا ہو۔ کیوں کہ ہندوستانی الفاظ اور جملوں کا جو تلفظ اس نے دیا ہے وہ بہت غلط ہے اور یہی حال ساری صرف و نحو کا ہے۔ اس کے دیباچے کے آخری جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے استقام پر مطلع نہ تھا اور اسی جملے سے ہندوستان کے یورپیوں کی اخلاقی حالت کی ذرا سی جھلک بھی نظر آتی ہے وہ لکھتا ہے کہ اس کتاب میں جو ہندستانی لفظ درج ہیں وہ بہت تحقیق سے لکھے گئے ہیں اور ان کے صحیح ہونے میں مطلق شبہ نہیں لیکن یورپین نوآموز پنڈت یا منشی کی مدد سے بلکہ بی بی صاحب کی اعانت سے تھوڑے ہی عرصے میں ان کے (دیسیوں کے) محاورے سیکھ جائے گا اور نہایت آسانی کے ساتھ اسے ہندوستانی زبانوں پر قدرت حاصل ہو جائے گی۔"[1]

اسی عبارت کا اعادہ انھوں نے اپنی قواعد اردو[2] کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے

---

[1] رسالہ اردو ۱۹۲۴ء، ص ۱۶

[2] قواعد اردو، مولوی عبد الحق، ص ۱۳ و ۱۴

کہ مولوی عبدالحق نے نہ تو لے بے ڈوف کی کتاب ہی دیکھی تھی اور نہ بک لینڈ کی "ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی" ہی میں انھوں نے اس کے حالات کی جستجو کی۔ انھوں نے ڈرامے کے دوبارہ دکھائے جانے کی تاریخ ۹۶،۱ء لکھی ہے جب کہ بک لینڈ[1] نے اور خود لے بے[2] ڈوف نے بھی اس کی تاریخ مارچ ۱۷۹۶ء لکھی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ غلطی گریرسن سے اخذ کی ہے جس کا انھوں نے قواعد اردو کے حاشیہ[3] میں حوالہ بھی دیا ہے۔ گریرسن نے ڈرامہ کے دوبارہ دکھائے جانے کا سن نہیں لکھا ہے صرف یہ لکھ دیا ہے کہ یہ دوبارہ "اگلے سال[4]" دکھایا گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب کے بعد جن حضرات نے قلم اٹھایا انھوں نے مولوی صاحب کی "قواعد اردو" ہی سے استفادہ کرنے پر اکتفا کی اور کسی نے لے بے ڈوف کی کتاب تو دور رہی گریرسن کو بھی دیکھنے کی زحمت نہیں گوارا کی۔

حامد حسن قادری صاحب نے "داستان تاریخ اردو" میں یورپین مصنفین اردو کے باب میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> "ڈوف نے قیام ہندستان کے زمانے میں ایک ہندستانی گرامر لکھی اور لندن میں شائع کی۔ یہ شخص ۱۷۸۵ء میں ہندستان آیا کلکتہ میں اس نے سنسکرت، بنگالی اور ہندستانی (اردو) زبانیں سیکھیں مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کی رائے ہے کہ اس نے اردو قواعد میں بہت غلطیاں کی ہیں[5]"

رسالہ زمانہ اگست ۱۹۴۳ء میں "یورپینوں کی خدمات اردو" کے تحت اور بھی مضحکہ خیز بیان ملتا ہے:

> "۱۷۸۵ء میں مسٹر کے۔ بی۔ ڈوف (K. B. DUFF) نے مدراس میں ایک اردو گرامر لکھی۔ یہ شخص بنگالی اور سنسکرت جانتا تھا۔ چناں چہ اس نے دو ڈراموں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا تھا[6]"

صفدر آہ نے اپنی تصنیف "ہندستانی ڈرامہ" میں بنگالی تھیئٹر کے سلسلے میں لے بے ڈوف کا تذکرہ کیا ہے:

> "۱۷۹۵ء میں ایک روسی سیاح ہیرسن لے بے ڈوف HERASIN LEBEDEFF نے گورنر سے اجازت لے کر دوم ٹولہ کلکتہ میں ایک بنگالی تھیئٹر بہ طرز مغرب تعمیر کرایا جس میں انگریزی ڈراموں کے کئی بنگالی ترجمے بنگالی ایکٹر اور ایکٹریسوں کے ساتھ اسٹیج ہوئے۔ اس کے علاوہ کچھ سنسکرت ڈراموں کے ترجمے بھی اس تھیئٹر میں اسٹیج کیے گئے گویا بنگالی تھیئٹر کی ابتدا ایک روسی نے کی[7]"

عشرت رحمانی نے بھی "اردو ڈرامہ تاریخ و تنقید" میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن ڈرامہ پیش ہونے کی

---

[1] ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی ص ۲۴۸۔ [2] قواعد ص XIII۔ [3] قواعد اردو ص ۱۴ مقدمہ۔ [4] لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد ۹ حصہ ۱ ص ۱۰۔ [5] داستان تاریخ اردو ص ۷۱۔ [6] رسالہ زمانہ اگست ۱۹۴۳ء ص ۹۔ [7] ہندوستانی ڈراما ص ۱۰۹ اور ۱۱۰۔

تاریخ غلط لکھی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق:

"بنگال میں بنگلہ اسٹیج کے آغاز کی تاریخ ۲۷ نومبر ۱۷۹۵ء بتائی جاتی ہے ایک روسی فن کار لے بیڈوف نے کئی مغربی ڈرامے بنگالی زبان میں اہل زبان کی مدد سے ترجمہ کرکے اسٹیج کرنا شروع کیے۔ اس سلسلہ کا پہلا ڈراما، ۲۷ نومبر ۱۷۹۵ء کو پیش کیا گیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ ایک ایک ٹکٹ ایک ایک اشرفی کو فروخت ہونے لگا اور بیٹھنے کو جگہ تک نہ ملتی تھی۔ یہ کھیل کئی بار کھیلا گیا اور اس طرح بنگالی اسٹیج کا افتتاح ہوا۔"[۱]

عشرت رحمانی نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ لے بے ڈوف کے بارے میں اتنی کم معلومات فراہم ہونے یا اس کے اس طرح سے نظر انداز کیے جانے کی غالباً دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتا تھا جس کا ہندستان کے ساتھ تو کسی قسم کا تجارتی یا سیاسی تعلق نہ تھا۔ وہ ملک یہاں سے قریب بھی نہ تھا۔ کوئی ایک آدھ سیلانی بھولا بھٹکا سیاح دوسرے ملکوں سے ہوتا ہوا ادھر آ بھی نکلتا تھا تو وہ چند سال یہاں گزار کر چل دیتا۔ لے بے ڈوف بھی اسی طرح کا ایک سیلانی تھا۔ یہاں اس کے ہم وطن تو تھے نہیں جن کو اس کی کتاب اہم معلوم ہوتی اور جن کی بدولت وہ اردو داں طبقے میں کم از کم ہیڈلے کے برابر تو مقبول و مشہور ہو ہی جاتا۔ جس کی کتاب کی فروخت سے گل کرسٹ کو بھی حسد ہوا تھا۔[۲] دوسری اور بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی کتاب تھی بھی بہت ناقص۔ اور اس زمانے میں شایع ہوئی جب کہ گل کرسٹ کی کتاب شایع ہو چکی تھی اور فورٹ ولیم کالج بھی قایم ہو چکا تھا۔ اسی صورت میں دوسرے ممالک کے لوگ اس کی کتاب کو کیوں اہمیت دیتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انگریزی نگاروں نے بھی اس کے سلسلے میں زیادہ تحقیق و تجسس غیر ضروری سمجھا۔ ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی کا مولف بک لینڈ لکھتا ہے:

"ہیرسم لے بے ڈوف ۱۷۴۹ء سے ۱۸۱۵ء کوئی روسی یوکرینی کسان تھا۔ ۱۷۷۵ء میں روسی سفیر کے ساتھ نیپلز گیا۔ اس کے بعد پیرس اور پھر لندن گیا۔ ۱۷۸۵ء میں ایک بینڈ ماسٹر کی حیثیت سے لندن سے مدراس روانہ ہوا۔ وہاں دو برس قیام کرنے کے بعد اگست ۱۷۸۷ء میں کلکتہ پہنچا، جہاں ایک پنڈت سے اس کی ملاقات ہوئی جس نے اس کو سنسکرت، بنگالی اور ہندستانی پڑھائی۔ وہ ہندستانی کو ملی جلی ہندستانی بولیاں کہتا ہے۔ حکومت کی اجازت سے ۱۷۹۵ء اس نے ایک ہندستانی تھیٹر کلکتے میں قایم کیا۔ اسی نے دو انگریزی ڈراموں (سوانگ اور محبت بہترین معالج ہے) کو بنگلہ میں منتقل کیا۔ پہلا ڈرامہ نومبر ۱۷۹۵ء میں پبلک کے سامنے پیش

---

[۱] اردو ڈرامہ تاریخ و تنقید ص ۱۴۲۔ [۲] گل کرسٹ اور اس کا عہد (محمد عتیق صدیقی)

کیا گیا جو ۱۷۹۶ء میں دوبارہ اسٹیج کیا گیا۔ خود اسی کے مطابق اس کے کمال کی بہت زیادہ ستائش کی گئی۔ اس کے بعد وہ مغل اعظم کے تھیئٹر کا منتظم بنا دیا گیا۔ اور آخر میں مشرق میں بیس برس قیام کرنے کے بعد ۱۸۰۱ء میں وہ انگلستان واپس لوٹا۔ لندن ہی سے اس نے اپنی ہندستانی قواعد شایع کی (خالص اور ملی جلی بولیاں جو سنسکرت زبان کے برہمنی دستور کے مطابق ترکیب دی گئی ہیں) اس کا سن اشاعت ۱۸۰۱ء ہے۔ لندن میں اس نے روسی سفیر وو رونزو WORONZOW سے رسم و راہ پیدا کی جس نے اس کو روس بھجوا دیا جہاں روسی دفتر خارجہ میں اس کو ملازمت مل گئی اور سینٹ پٹرسبرگ میں ایک سنسکرت کا چھاپہ خانہ قائم کرنے کے لیے ایک بڑی رقم بھی دی گئی۔ ۱۸۱۵ء کے بعد اس کا انتقال ہوا۔[1]

ان سائیکلوپیڈیا برٹینیکا وغیرہ اس کے بارے میں خاموش ہیں۔

انگریزی میں لیبے ڈف کے بارے میں فنی معلومات گریرسن نے "ہندوستان کے لسانی جائزے" میں فراہم کر دی ہیں، کسی اور کتاب سے نہیں ہوئیں اس نے ۱۷۸۵ء سے لے کر ۱۸۰۱ء تک کے واقعات تو لیبے ڈف کی اپنی قواعد کے تعارف کے حوالے سے لکھے ہیں اور باقی ۱۷۸۵ء سے پہلے[2] اور ۱۸۰۱ء کے بعد[3] کے واقعات کے بارے میں ریڈلنگ سے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

گریرسن اور بک لینڈ کی زبان میں حیرت انگیز مماثلت ہے لیکن نہ تو گریرسن نے کہیں بھی انڈین بایوگرافی کا حوالہ دیا ہے اور نہ بک لینڈ نے ریڈلنگ کا لیکن گمان یہی ہوتا ہے کہ دونوں نے ریڈلنگ کو ہی معلومات کا ذریعہ بنایا

گریرسن کا خیال ہے کہ لیبے ڈف کا کام اس مصنف کی غیر معمولی مہمات کی وجہ سے صرف شمار کر لیے جانے سے کچھ زیادہ اہم ہے۔ گریرسن کو لیبے ڈف کی کسی اور کتاب کا پتہ نہیں تھا آگے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ لیبے ڈف کی قواعد کے نمونوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو ہندستانی سے بنگالی اور سنسکرت کی معلومات زیادہ تھی جس کی وجہ غالباً اس کے سرپرستوں کی دلچسپی تھی۔ اس کے یہاں صرف جملوں کی ترکیب ناگوار حد تک غلط ہے بلکہ قواعد کا سارا ڈھانچ ہی اس نے غلط کھڑا کیا ہے۔ اس کے دیباچہ کا آخری جملہ ظا کرتا ہے کہ وہ اپنی خامیوں سے آگاہ نہ تھا ساتھ ہی اس کے معاصر یورپین جو ہندستان میں تھے۔ ان کے اخلاق پر بھی عجیب و غریب روشنی پڑتی ہے۔

نیچے حاشیہ میں گریرسن ریڈلنگ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ لیبے ڈف ایک یوکرینی کسان تھا۔ اس

---

[1] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی ص ۲۴۰ [2] لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد ۹ حصہ ۱ ص ۱۰۔ [3] حاشیہ۔ [4] متن: لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد ۹ حصہ ۱ ص ۱۰۔

موسیقی کی صلاحیتوں کی وجہ سے شہزادہ نارو موسکی نے اپنے پاس رکھ کیا۔ یہ شہزادہ اس کو اٹلی لے گیا جہاں اس نے وائیلن چیلو بجانے میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے پیرس اور لندن کی سیاحت کی۔ لندن میں اس نے ایک امیر کی ملازمت اختیار کی جسے گورنر بنا کر ہندستان بھیج دیا گیا۔

ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ خود اس کے وطن میں اس پر کتنا کام ہوا ہے لیکن اکثر تاریخوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

لے بے ڈف نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اپنے ہندستان آنے سے لے کر کتاب شایع ہونے تک کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ اس میں اس نے تفصیل کے ساتھ ان کاوشوں اور مشکلات کی روداد پیش کی ہے جو یہاں اسٹیج قائم کرنے، زبان سیکھنے اور قواعد مرتب کرنے میں اسے پیش آئیں۔ لیکن اس دیباچے سے اس کے ہندستان آنے سے پہلے کے حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ وہ لکھتا ہے:

"انسانی ذہن کی فطری خواہش نے اس کتاب کے مصنف کو اپنے وطن روس سے نکلنے کی دعوت دی۔ دنیا کی وسیع معلومات کی تحصیل کی خواہش تھی۔ اس کاوش میں اس کو پتہ چلا کہ فطرت نے اپنے ذخیرے کسی ایک ملک یا ایک طبقے کے لیے مخصوص نہیں کیے ہیں بلکہ بنی نوع انسان کی بھلائی کے عظیم مقصد کی خاطر اپنے خزانوں کو ساری دنیا میں بکھیر دیا ہے اور افق کے پار تک کی ایک وسیع فضا ہمارے نظارے کے لیے کھول دی ہے، تاکہ ہماری محفل وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے ..... میں ۲۱ فروری ۱۷۸۵ء کو میں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز اوڈنی میں انگلستان سے سوار ہوا۔ اس کی کمان کپتان یک مین کے ہاتھ میں تھی اور اپنی منزل مقصود مدراس پہنچا۔ مدراس سینٹ جارج کا قلعہ بھی کہلاتا ہے۔ یہ کورمنڈل کے ساحل پر آباد ہے، جو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوآبادی ہے۔ اب حیثیت کے اعتبار سے یہ دوسرے نمبر پر ہے پہلے اول تھا۔

" ہمارے مدراس پہنچنے کے دوسرے دن کپتان ولیم سیڈن نے، جو اس وقت مدراس کے حاکم شہر تھے اور اس کے بعد ترقی کر کے میجر جنرل کے ممتاز عہدہ پر فائز ہوئے، مجھ کو ساحل پر مدعو کر کے میری عزت افزائی کی۔ اس معزز شخص نے میری موسیقی کی مہارت سے خوش ہو کر صرف نمائشی تعریف و تحسین نہیں کی بلکہ مجھے انھیں شرطوں پر جو میں نے پیش کی تھیں ملازمت کا معاہدہ کر کے میری ہمت افزائی کی۔ اس وقت وہ میرے خیال کے مطابق بڑی نادر پیش کش تھی، اور آج بھی ان کا احسان مند ہوں۔ ملازمت کی تجویز پر انھوں نے پُرخلوص کشادہ دلی سے اصرار کیا۔ اور میں نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ میں نے یہ دو سال بڑی اچھی طرح بلکہ ہنسی خوشی گذارے

لیکن اُن چرچوں کی کشش میں گرفتار ہو کر کہ بنگال منجملے متلاشیوں کے لیے مدراس سے وسیع تر چوگان ہے اور انسانوں اور اشیا کے بارے میں اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کرنے کی ہوس سے مغلوب ہو کر میں نے اس ملک کو دیکھنے کا فوراً مصمم ارادہ کر لیا۔

میں ۱۷۸۰ء میں کلکتہ پہنچا۔ یہاں بھی میرے ساتھ ہر طبقے کے لوگ بڑی تواضع سے پیش آئے۔ اور میں اس وقت کے کلکتہ کے حاکم شہر کرنل الکزینڈر کیڈ اور کرنل کرسٹوفر گرین کی دوستی اور فراخ دلی کا بے حد ممنون ہوں۔ ان کے علاوہ میں اپنے بڑے اچھے دوست جسٹس ہابیڈ علاقائی جج اور برٹش کرپ کمپنی کے مشیر جون شانیز دوسرے بہت سے دوستوں کا بھی مشکور ہوں۔

"۱۷۸۹ء میں میں نے پہلے پہل کلکتہ میں ہندستانی زبان کی تحقیق کا کام شروع کیا، اور اس بات سے سخت مایوس ہوا کہ تقریباً دو برس تک مجھے کوئی ایسا استاد نہیں ملا جو مجھے سنسکرت حروف تہجی کی جو بنگالہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور پراکرت یا بھدا شا کہلاتی ہے، باضابطہ تشریح کر سکے۔ یورپین مصنفوں کی ناقص قواعدوں سے بھی جو بلا تفریق "ہندستانی زبان" کہلاتی ہیں، مجھے کوئی مدد نہ مل سکی۔ میں اس خیال کو بالکل چھوڑنے والا ہی تھا کہ مجھ کو میرے آقا نے ایک بنگالی اسکول ماسٹر مسمیٰ شری گورک ناتھ سے ملایا۔ وہ بنگالی کی اور ملی جلی بولیوں کی قواعد کا ماہر تھا اور سنسکرت زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔

"میرے دریافت کرنے پر اس نے بتلایا کہ مشرقی ممالک میں عموماً ملی جلی بولیاں سب سے زیادہ بولی جاتی ہیں لیکن ان کو سیکھنے کے لیے کوئی مخصوص حروف تہجی نہیں ہیں اور قواعد کی کوئی ایسی کتاب بھی نہیں ہے جس سے اہل یورپ کو ہندستانی زبان کے قواعد سمجھنے میں مدد مل سکے یہ قاعدے ان کے لیے بہت ہی انوکھے ہیں اس لیے وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ملے جلے قاعدے جو ان بولیوں میں استعمال کیے جاتے ہیں، اسما و ضمائر کی جنس اور ارکان، افعال کی گردان، مختلف حروف تہجی کی تفریق کا لحاظ رکھ کر سنسکرت حروف اور قواعد سے حاصل کیے جاتے ہیں جن کے مبادیات اور قاعدے اپنے ابتدائی اور بنیادی لباس میں بہت وسیع، ساتھ ہی بے حد جامع اور صحیح ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلے گا کہ اہل یورپ نے بلا استثنیٰ ہندستانی ملی جلی بولیوں کے قواعد کی کتابیں تہجی کی بنیادوں کی صحیح معلومات اور حروف کی آوازوں کو سمجھنے کے مقررہ اصولوں کا واضح احساس نہ رکھتے ہوئے لکھی ہیں۔ یہ مصنفین ان بولیوں کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام ہوئے ہیں اور انھوں نے بجائے سچائی کی تلاش کے، اپنی صلاحیتوں کو ہندستانیوں کے واضح ترین علوم کو شک و شبہ

اور تذبذب میں الجھانے میں صرف کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں جن کی عقل زمانہ قدیم سے دنیا کے تمام علوم و فنون کے لیے آرائشی حیثیت رکھتی ہے، انھوں نے ناقص معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ میرے ماہر زبان نے اسی لیے مجھے سنسکرت حروف تہجی استعمال کرنے کا مشورہ دیا، جو علوم و فنون کے ان خزانوں کی اہم کلید ہیں، جن کو اب تک تحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔

"گولک ناتھ کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ چناں چہ ابتدا ہی سے میں تہجی کی بنیادوں کو اور ان کی اندرونی پانچ تقسیموں کو سمجھنے میں مصروف ہو گیا تاکہ ایسے مفید کام کو غیر یقینی طریق کار سے رائیگاں نہ کروں اور ہندستانی علوم و فنون کی صحیح معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں غلط اور ناقص طریقوں میں پھنسنے سے گریز کروں اور کئی برس کی گہری جانچ کے بعد علوم نجوم، اساطیری علوم، علم حساب، علم صرف و نحو اور تہجی کے اندرونی آہنگ کی معلومات بہم پہنچانے کے بعد ان کے محاوروں، قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق ان کی مبادیات کو سلسلے وار واضح اور جامع طور پر مرتب کیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی کوششوں کو مخلصانہ طور پر جگن موہن بدے، پنچانن بھٹاریہ، جگن ناتھ ترکا اور دوسرے ممتاز پنڈتوں کے سامنے پیش کیا، جنھوں نے میرے ایک ایسی چیز کا انکشاف کرنے کے جوش کو بے حد پسند کیا جو ابھی تک اہل یورپ کے لیے انجانی تھی۔

"کافی ترقی کر لینے کے بعد اب میں نے ہندستانی ملی جلی بولیوں اور بنگلہ کی لغت کا ترجمہ کیا اور کچھ مکالمات، عمومی روزمرہ کے استعمال کے اور سائنسی مضامین سے متعلق بنگالی اور ملی جلی بولیوں میں تصنیف کیے۔ میں چوں کہ ان کے درمیانی فرق کو بہتر طریقہ پر سمجھ سکتا تھا۔ اس سے میں نے ان بولیوں کو پرکھا اور میں نے پایا کہ دوسرے علاقوں کی زبان کے مقابلے میں ہندستانی ملی جلی بولیاں یقینی طور پر زیادہ تر بنگال کی دو ابتدائی بنیادی شاخوں سے مشتق ہیں جو دیب یا دیبے ناگرا اور سنسکرت زبان کہلاتی ہیں۔

"ان تحقیقات کے بعد میں نے انگریزی ڈراموں "سوانگ" اور "محبت بہترین معالج ہے" کا بنگلہ میں ترجمہ کیا اور یہ دیکھنے کے بعد کہ ہندستانی صاف سنجیدہ ٹھوس مطالب پر مسخرے پن اور نقالی کو ترجیح دیتے ہیں میں نے ان ہی ڈراموں پر زیادہ توجہ دی اور ان میں خوشگوار طریقے پر چوکی داروں، مسخروں، چوروں، گماشتوں اور باقی کرداروں میں معمولی لٹیروں کو بھی شامل کر دیا۔

"جب میرا ترجمہ ختم ہوا تو میں نے کئی فاضل پنڈتوں کو مدعو کیا جنھوں نے بڑی توجہ کے ساتھ میرے ترجمے کو پڑھا۔ اس موقع پر مجھے ان جملوں پر غور کرنے کا موقع ملا، جو ان کو سب سے زیادہ

خوش کن معلوم ہوئے تھے اور جنھوں نے سب سے زیادہ ان کے جذبات کو جگایا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعویٰ کرکے میں خودستائی نہیں کر رہا ہوں کہ اس ترجمہ نے سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں مطالب کا پایہ بلند کر دیا ہے اور کوئی یورپین، جس کو اتنا اچھا معلم رکھنے کا اعزاز نہ حاصل ہو جیسا کہ خوش قسمتی سے مجھے مل گیا ہے، میرا تتبع کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوگا۔

" پنڈتوں کی پسندیدگی کے بعد گولک ناتھ داس میرے ماہر زبان معلم نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر میں اس کھیل کو عوام کے سامنے پیش کرنا چاہوں تو وہ دیسیوں میں سے دونوں جنسوں کے اداکار لا سکیں گے۔ اس خیال سے میں بے حد خوش ہوا۔ چناں چہ فوراً میں نے یورپین پبلک کے فائدے کی خاطر اپنی کوششوں کا مظاہرہ کرنے کی نیت سے گورنر جنرل سر جون شور کے مستقل لائیسنس کے لیے درخواست کی جو انھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے منظور کر لی۔

" اس سرپرستی نے میری ہمت افزائی کی اور اپنی کوششوں کا مظاہرہ کرنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر میں نے اپنے مرتبہ نقشے پر کلکتے کے قلب ڈوم تولہ میں ایک وسیع تھیٹر بنانا شروع کیا اور میں نے اس دوران میں اپنے استاد کو دونوں جنسوں کے دیسی اداکار فراہم کرنے پر لگایا۔ تین مہینوں میں تھیٹر اور اداکار، دونوں 'سوانگ' پیش کرنے کے لیے تیار ہو گئے، اس کو میں نے بنگلہ میں پہلی بار ۲۷ر نومبر ۱۷۹۵ء کو اور دوسری بار ۲۱ر مارچ ۱۷۹۶ء کو پیش کیا۔ ان مظاہروں کے بعد جن میں تھیٹر بہت زیادہ بھرا ہوا رہا تھا، میں نے انگریزی اور بنگلہ ڈرامے اسٹیج کرنے کی مستقل اجازت حاصل کر لی۔ ہندستانی علوم یعنی سنسکرت اور بنگلہ زبانیں نیز ہندستانی ملی جلی بولیاں، علم تاریخ، علم نجوم وغیرہ کی تحقیقات کے دوران میں گورنر جنرل اور دوسرے سرپرستوں اور دوستوں نے میری بے حد ہمت افزائی کی اس کاوش اور مطالعہ کے دوران میں اُن لوگوں کی بے شمار خامیاں اور غلطیاں میری نظروں کے سامنے آئیں، جنھوں نے ان عنوانات پر کچھ کام کیا تھا۔ میں نے اپنی کاوشوں اور چھان بین کے نتائج بالکل غیر جانب دار قارئین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کیا اور اسی مقصد کے پیش نظر اس ملک میں آنے اور یہاں کے عوام کے سامنے اس کتاب کو رکھنے کی خاطر میں نے ہندستان کو خیر باد کہا۔"

لے بے ڈف کی کتاب کا یہ دیباچہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ وہ ماہر نفسیات بھی تھا۔ ڈراموں کے سلسلے میں اس نے ہر بار اس پہلو پر بھی نگاہ رکھی کہ لوگ عموماً کن باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس کی رائے ڈرامہ دیکھنے والے ہندستانیوں کے مذاق کے بارے میں غلط بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اس زمانے کے ڈرامے جو بھی دستیاب ہوئے ہیں اسی مذاق کے آئینہ دار ہیں اس لیے وہ اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے ڈراموں نے غیر معمولی کامیابی

حاصل کی تھی۔ تو یہ کسی حد تک درست ہی معلوم دیتا ہے۔

اس دیباچے کو دیکھنے کے بعد ایڈلنگ، گریرسن اور بک لینڈ کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مغل بادشاہ کے دربار تک لے بے ڈف کی رسائی ہو گئی تھی اور شاہی تھیٹر کے منتظم کا عہدہ اس کو مل گیا تھا۔ اس نے اپنے ہر مربی کی سرپرستی کی مفصل روداد لکھی ہے حتیٰ کہ معمولی پنڈتوں کا بھی اس نے ذکر کیا ہے تو بھلا مغل دربار تک اپنی رسائی کا تذکرہ وہ اس دیباچہ میں کیوں نہ کرتا۔ اس دور کے سفرناموں اور تاریخ کی کتابوں سے بھی اس کا مغل دربار سے متعلق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بنگالی تھیٹروں کے سلسلے میں تو اکثر اس کا تذکرہ ملتا ہے لیکن کسی بھی ہندستانی یا یورپین مورخ نے اس کے مغل دربار تک پہنچنے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ معلوم نہیں ایڈلنگ نے یہ تحقیق کس طرح کی کہ وہ مغل دربار سے متعلق تھا۔

لے بے ڈف نے اپنی کتاب کے مقدمے میں ان سب یورپینوں کی نکتہ چینی کی ہے جنھوں نے ہندستانی زبان کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے ہیل ہڈ[۱]۔ ہیڈلے[۲]۔ فرگوسن[۳] اور ولیم جونس[۴] کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ ان میں جونس۔ ہیڈلے اور فرگوسن پر اس نے خصوصاً کڑی اور بے جا تنقید کی ہے۔ فرگوسن کے بارے میں تو اس کی بحث کا ایک ایک لفظ غلط ہے

لے بے ڈف نے اپنی کتاب کے مقدمے میں خصوصیت سے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ سنسکرت علوم کو صحیح طور پر انگریزی میں منتقل کرنے میں اس وجہ سے لوگوں کو کامیابی نہیں ہوئی کہ سنسکرت کے جملوں کی ساخت انگریزوں کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ نیز انگریزی حروفِ تہجی سنسکرت کی آوازوں کو ادا کرنے کے لیے ناقص تھی۔ جس کا خود ولیم جونس نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ہندستانیوں کے اصولوں اور قاعدوں کو یا تو نظر انداز کیا گیا یا ان کو غلط طریقے سے ظاہر کیا گیا۔ اسی لیے آوازیں خلط ملط بھی ہو گئیں۔ یہ نہ صرف اس لیے ہوا کہ آوازوں کو ادا کرنا مشکل تھا بلکہ اس لیے بھی ہوا کہ وہ ان آوازوں کو صحیح طور سے جانتے ہی نہ تھے۔

لے بے ڈف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ دوسرے یورپین مصنفین کے مقابلے میں وہ سنسکرت کی آوازوں کو زیادہ بہتر سمجھ سکتا تھا اور ان کو ادا کر سکتا تھا، کیوں کہ وہ اس کی مادری زبان روسی سے قریب تر ہیں[۵]۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ غلط فہمی یا خود ستائی پر مبنی ہے کیوں کہ روسی آوازیں قطعاً سنسکرت سے ملتی جلتی نہیں ہیں۔ روسی زبان

---

[۱] ہیل ہڈ نے ۱۷۷۸ء میں بنگلہ زبان کی پہلی گرامر مرتب کی تھی۔ [۲] ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں ہندستانی زبان کی پہلی فرہنگ مرتب کی۔ [۳] فرگوسن نے ۱۷۷۳ء میں ہندستانی زبان کا گرامر مرتب کیا تھا اس سے پہلے ایک لغت بھی ترتیب دی تھی۔ [۴] سر ولیم جونس ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی تھے۔ [۵] قواعد مقدمہ صفحہ X ۔

میں "ہاکار" یعنی ASPIRATION بالکل نہیں ہے جب کہ سنسکرت میں ہاکاری آوازیں بے شمار ہیں۔ روسی زبان میں کوز آوازیں بھی نہیں ہیں۔ ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ خالص ہندستانی آوازیں ہیں۔ دوسرے روسی میں اور یورپی زبانوں کی طرح صفیری آوازیں ژ۔ ز۔ غ۔ ف وغیرہ اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہیں۔ لے بے ڈف کا یہ دعویٰ وطلی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اس کو آوازوں کا صحیح احساس درحقیقت تھا ہی نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کا استاد بنگالی تھا اور بنگلہ میں بدقسمتی سے بہت ہی کم صفیری آوازیں ہیں۔ اس زبان میں ان آوازوں کی تفریق بھی واضح نہیں ہے جن کی تفریق ہندی میں قابل امتیاز ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ لے بے ڈف اپنی قواعد میں مثالیں دیتے ہوئے خدا کو "حدا" (HHODA) لکھتا ہے حالاں کہ خ کی آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی کیوں کہ یہ اس کی مادری زبان روسی میں موجود ہے جو تحریر میں X سے ظاہر کی جاتی ہے۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سنسکرت اور روسی میں جو باتیں مماثلت رکھتی ہیں ان کا وہ قطعی ذکر نہیں کرتا۔ یہ مماثلت افعال کی گردان اور اسما کی تعریف کی ہے۔ لیکن ہندستانی یعنی اردو ہندی سے اس کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

لے بے ڈف کا بیان ہے کہ ہندستانیوں کی بنیادی کتابوں کی اہل یورپ نے صحیح ستائش نہیں کی کیوں کہ وہ ان کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہندستانیوں کی ان کتابوں میں پہلی کتاب ویدانت ہے، دوسری تیجی ہے اور قواعد ہے جو ویاکرن کہلاتی ہے[1] جو براہ راست خدا کا عطیہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اہل یورپ اس بات کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ اگر ان بنیادی کتابوں کی تعلیم حاصل کی جائے اور ان کی مبادیات کو سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ زبانیں اس فراخ تحسین سے کہیں زیادہ کی مستحق ہیں جو ان کو ادا کیا جاتا ہے۔

لے بے ڈف کا بیان ہے کہ یورپ کے بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ مشرقی زبانوں میں کلمہ کی اقسام نہیں ہوتیں حتیٰ کہ اسما و افعال بھی نہیں ہوتے[2]۔ لیکن اس کی کتاب کے پڑھنے والے کو معلوم ہوگا کہ ان زبانوں میں نہ صرف کلمہ کی اقسام ہی پائی جاتی ہیں بلکہ صرفی و نحوی تعمیر و ترتیب کے اعتبار سے بھی بعض یورپی زبانوں سے بہتر ہیں۔ سنسکرت تیجی اور ہندستانی قواعد دونوں میں سے ایک بھی ابھی تک اپنی اصلی شکل میں سامنے نہیں آئی ہیں اور جو لکھا بھی گیا ہے وہ ناقص اور الجھانے والا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر وہ ہندستانی زبان کی وہ بات چیت" (DIALOGUES) ہے جو جارج ہیڈلے نے "مورس یا مورش" کے عنوان سے قلم بند کی ہے۔ یہ حقیقت ہے اور قابل تعریف حقیقت ہے کہ یورپین مصنفین نے مقدور بھر ان کو صحیح لکھنے کی کوشش

---

[1] قواعد مقدمہ ص X ۔ [2] قواعد مقدمہ ص X

کی ہے ۔ اور ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی معلومات زیادہ دوسروں سے سن کر لکھا ہے ۔ اس مصنف (لے بے ڈف) کا فرض ہے کہ ان غلطیوں کو اس "(ہندستان) اور اس کے حکمرانوں کی بہتری کے لیے درست کر دے ۔ فرگوسن کے سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ

(۱) فرگوسن نے کتاب کے دیباچہ میں ہندستانی حروف تہجی کی تشریح میں a کو پہلی جگہ دی ہے جب کہ a دوسرا حرف ہے ۔

(۲) فرگوسن اپنی قواعد میں لکھتا ہے کہ ہندستانی زبان میں ۵۶ حروف یا آوازیں ہیں، اگرچہ صرف ۵۰ مرکب اور سادی آوازیں ہیں ۔

فرگوسن پر بے جا اعتراض کرتے ہوئے لے بے ڈف لکھتا ہے کہ فرگوسن تینوں ضمائر شخصی ۔ ناواقف تھا کیوں کہ وہ واحد متکلم کی جمع "ہم لوگ" کی جگہ پر "ہم" لکھتا ہے ۔ اسی طرح "تم اور تم لوگ" بلکہ "تو" اور "تم" لکھتا ہے ۔ فرگوسن کے لکھے ہوئے ضمیر غائب کی تو لے بے ڈف بہت ہی سخت مذمت ہے، کیوں کہ فرگوسن نے صرف ایک لفظ 'وہ' دیا ہے اور تینوں جنسوں کو صرف اسی ایک لفظ سے ظاہر

فرگوسن کے بعد لے بے ڈف نے ہیڈلے پر ہاتھ صاف کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ہیڈلے کی قواعد اڈیشن اس کی زندگی ہی میں شایع ہوئے اور چوتھا اور پانچواں مرزا محمد فطرت کی نظر ثانی و اضافے کے ہوا ۔ اس میں بنگلہ تہجی بھی شامل کر دی گئی تھی جو نہ صرف بہ اعتبار ترتیب غلط تھی بلکہ اس میں حروف بھی غلط لکھے گئے تھے ۔ ہیڈلے اپنی خامیوں کے باوجود ہندستانی محاورے اور بول چال کی زبان کا رکھتا تھا لیکن اس کو کوئی ماہر استاد ان اصولوں کی تشریح کرنے کے واسطے نہیں ملا ۔ اس لیے اس کو ان لو انحصار کرنا پڑا جو خود ناواقف تھے، وہ بھی اسما کی تعریف اور افعال کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہا ہے او کے زمانوں کی ترتیب کو اس نے بھی خلط ملط کر دیا ہے ۔ اس کی خامیاں بھی اس کتاب سے موازنہ کرنے پر نظر آ جائیں گی ۔

یہ غلطیاں ان یورپین مصنفین نے کیوں کیں؟ اس کی وجہ لے بے ڈف یہ بتاتا ہے کہ سوسائٹی (ایشیاٹک سوسائٹی) جو کلکتہ میں ۱۵ جنوری ۱۷۸۴ء میں قائم کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مشرقی علوم کی بنیاد پیش کرے لیکن اس سوسائٹی کے قائم کرنے والے خود سرکاری کاموں میں مشغول رہتے تھے اس لیے ضر تھا کہ دوسرے لوگ ان کے لیے یہ کام انجام دیں ۔ اس سوسائٹی کے صدر ولیم جونس سے لے بے ڈف ناراض معلوم ہوتا ہے جن پر اس نے بے حد سخت تنقید کی ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ انھوں نے سوسائٹی کے جو اصول رکھے وہ سرے سے غلط تھے ۔ اس کے خیال کے مطابق ولیم جونس سنسکرت کی مبادیات سے ناوا

اس لیے اس نے تہجی کی غلط تشریح کی مثلاً اپنے مضمون میں پہلے حرف کو انھوں نے A سے ظاہر کیا ہے۔ لے بے ڈف کے خیال کے مطابق 'o' (او) سے ہونا چاہیے۔ 'A' جب 'o' میں شامل ہو جاتا ہے اس وقت 'o' کی اپنی قوت ختم ہو جاتی ہے۔

'o' کی آواز میں تین طرح کی آوازیں چھپی ہوتی ہیں۔ پہلی سادی گول آواز، دوسری چوڑی حلقی آواز، تیسری جو بشرگ کہلاتی ہے چوڑی زوردار یا قوی غنائی آواز۔ اس کے علاوہ بھی اس آواز کے کئی انحرافات ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ولیم جونس نے تہجی کی بنیادی تقسیموں کی صراحت بھی نہیں کی ہے اور نہ تعریف میں بدلنے والی آوازوں کی صراحت کی ہے۔ انھوں نے 'B' کی آواز کو 'v' اور 'w' میں تبدیل کر دیا ہے، اور "ش" اور "س" کو غلط ملط کر دیا ہے ان اعتراضات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے سنسکرت کا ایک اشلوک نقل کیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق جن لوگوں نے ولیم جونس سے استفادہ کیا ہے ان کی تحقیق اسی وجہ سے ناکام رہی ہے۔

وہ قواعد میں حروف تہجی کی تشریح و توضیح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ قواعد کو حروف تہجی سے شروع کرنے کا دستور سا رہا ہے، لیکن ہندستانی ملی جلی بولیاں زمانۂ قدیم سے بغیر سنسکرت حروف تہجی کے استعمال کے بولی جاتی ہیں یہاں جن کی تشریح کرنا غیر ضروری ہوگا۔ لیکن اگر براہمی تہجی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو مذہبی اور تہذیبی بنگالی سنسکرت زبان کو سمجھنا مشکل نہیں ہوگا۔

سنسکرت کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ دنیا کی تمام آوازوں اور زبانوں کا منبع ہے اور تمام آوازیں اسی کی آوازوں سے مشتق ہیں۔ یہ نظریہ خالصاً ہندستان کے پرانے مذہبی خیالات سے تعلق رکھتا ہے۔ لے بے ڈف اسی نظریے سے بھی متاثر معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کی تمام آوازیں ان ہی آوازوں کے اندر چھپی ہوئی ہیں اور ان کے مخرج میں بہت تھوڑی تبدیلی سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔ یہ نقطۂ نظر بذاتِ خود خواہ بہت صحیح نہ ہو لیکن اس نے اس کے ذہن میں ایک دوسرا خیال پیدا کیا۔ وہ کہتا ہے کہ سنسکرت کی انھیں آوازوں کے ادا کرنے کے باریک اختلافات ہیں اور انھیں سے تمام ملی جلی ہندستانی بولیاں بھری ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق یہ نظریہ کہ ہندستانی بولیاں فاتحوں اور غیر ملکیوں کی زبان کے اثر سے پیدا ہوئی ہیں بے حد غلط ہے۔ ہندستانی زبانوں کی پیدائش کے بارے میں اس کا یہ نظریہ بڑا منطقی اور سائنٹفک ہے، اور اسی نے لے بے ڈف کی کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ لے بے ڈف نے اپنی کتاب کا ایک مختصر سا جائزہ بھی لیا ہے۔

حالت اضافی کے سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ اسم معرفہ کی حالت اضافی میں 'کا' لگایا جاتا ہے "خدا کا" "آدمی کا" اور اسم نکرہ کی حالت اضافی میں "کے" استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً "بہشت کے"، "پانی کے"۔ اسی طرح سے

ہندستانی ضمائر میں دو اضافی حالتیں ہوتی ہیں ۔ یہ تذکیر کا مزاج رکھتے ہیں اسی لیے ان کو صرف واحد غائب میں تانیث کے مطابق بنالیا جاتا ہے ۔

"اُو" کا معرفت مذکر اور "اسے" کی معرفت مونث (معرفت کے لحاظ سے تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ ضمیر کے مذکر اور مونث کے لحاظ سے ہوتی ہے) اس کے بعد ضمائر شخصی کے متعلق اس نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق "میں" بولنا غلط ہے "ہم" اور "ہم لوگ" درست ہے۔ "تو" مذکر "تی" مونث ہے۔ یہ "تی" اور "تو" فعل کی گردان کے لحاظ سے بدلتے جاتے ہیں ۔

اس مقدمے کے آخر میں وہ رسوائے زمانہ جملہ ہے جس کی طرف تمام تبصرہ نگاروں نے اشارہ کیا ہے۔ اپنی کتاب کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ "اس کتاب میں جو ہندستانی الفاظ قلم بند کیے گئے ہیں وہ لکھنے میں مرتب کیے گئے ہیں اور یہ انگریزی املا کے لحاظ سے نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ ان کا تلفظ ہندستانیوں سے بات چیت کر کے درست کیا گیا ہے۔ اور اب بلاشبہ ایک یورپین متعلم کسی پنڈت یا منشی کی نہیں بلکہ صرف ایک 'بی بی صاحب' کی مدد سے ان محاورات کو سیکھ کر ہندستانی بول چال پر آسانی سے قادر ہو سکتا ہے۔"

کسی صرف و نحو کی کتاب کی صحیح حیثیت واضح کرنے کے لیے اس میں دیے ہوئے ضمائر، اسما کی تعریف، افعال کی گردان اور حروف کے صحیح استعمال کو دیکھنا ہوتا ہے ۔ اس میں ان تمام حصوں کے باریک نکتے جس حد تک صحیح بیان کیے جاتے ہیں۔ اسی کے لحاظ سے اس کا مقام متعین کیا جاتا ہے، اردو زبان کے قواعد دوسری زبانوں کے مقابلے نسبتاً مشکل ہیں۔ اس میں بعض ایسی الجھنیں ہیں جو اچھے اچھے قواعد دانوں کو الجھا لیتی ہیں۔ اہل یورپ نے خاص طور سے، قواعد مرتب کرتے وقت ان ہی رکاوٹوں سے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اگر ایک الجھن سے وہ عہدہ برا ہوئے ہیں تو دوسری سے الجھ گئے ہیں۔ ان میں سب سے مشکل بے جان چیزوں کی جنس کا تعین اور "نے" فاعلی کا استعمال ہے ۔ یہ "نے" فاعلی اسما کی حالتوں اور افعال کے صیغوں دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی لیے گریرسن نے اردو قواعد کی ان پرانی کتابوں کو پرکھنے کا ایک معیار مقرر کر دیا ہے، جو دو نکاتی ہے۔ "ضمائر شخصی کے واحد جمع" اور "نے فاعلی کا استعمال"۔ اس نے اس سے زیادہ کی توقع کسی سے نہیں رکھی ہے لیکن لے بے ذف کی اس قواعد سے تو ہم کوئی بھی توقع وابستہ نہیں کر سکتے ۔ ہر جا مہ اس کے لیے چھوٹا ہے اس نے تو قواعد ہی نئے بنائے ہیں ۔ ضمائر شخصی کے سلسلے میں اس کا اپنا نظریہ ہے "ہم" واحد بمعنی میں اور ہم لوگ جمع بمعنی "ہم"، "تم" واحد "تم لوگ" جمع وہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق "لوگ" POST POSITION ہے اور 'ایک' اور 'سب' ARTICLES ہیں۔ وہ "لوگ" یا "لوگ" سے ضمائر کے اور اسما کے جمع صیغے بناتا ہے۔ اس کے مطابق 'آدمی' واحد "آدمی لوگ" جمع، "کتا" واحد "کتا لوگ" جمع ہے۔

اسی طرح سے "گھوڑا لوگ"، "لڑکا لوگ"۔ لوگ کے بجائے سب بھی آسکتا ہے: "سب لڑکا"، "سب گھوڑا"، "سب آدمی"۔ یہ محض جمع کا ہی صیغہ ہوگا۔ اس کے خیال کے مطابق بے جان چیزوں میں 'لوگ' کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ ان کے لیے وہ "سب" استعمال کرتا ہے۔ مثلاً "سب چیز"، "سب گھر"۔ سب اور لوگ اگر دونوں ملا کر استعمال کر دیے جائیں تو وہ صیغۂ مبالغہ SUPERLATIVE DEGREE جیسے "سب آدمی لوگ"۔

وہ اسما کی چھ حالتیں قائم کرتا ہے:

(۱) فاعلی (۲) اضافی (۳) مفعولی بالواسطہ (۴) مفعولی بلاواسطہ (۵) ندائی (۶) ظرفی یا آلاتی۔

اس سلسلے میں اس نے اصطلاحات ہندی یا سنسکرت کی اور انگریزی کی استعمال کی ہیں۔ مثلاً 'نومتا' "ایک بچن"، "بہو بچن" وغیرہ۔

وہ نے فاعلی کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔ اس کی تحریروں کے نمونوں میں بھی نے نہیں ملتا۔ سب سے زیادہ غلطیاں اس نے ضمائر کی گردان میں کی ہیں۔ اس نے ضمائر غائب کو تین جنسوں میں بانٹا ہے:

(۱) اُوا (OOA) یعنی ———— HE مذکر

(۲) اُوے (OOE) ———— SHE مونث

(۳) آ۔ اِے۔ اِیا وغیرہ (A, AY, EIA) IT ———— بے جان ضمائر کی تعریف پر بنگالی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

تمام ضمائر میں جمع صیغہ بنانے کے لیے اس نے سب یا لوگ کا اضافہ کیا ہے۔ اس نے ایک نوٹ میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہندستانی ملی جلی بولیوں کے ضمائر کی حالتوں کے لیے اس طرح کی کوئی اصطلاحات متعین نہیں ہیں، جس طرح سے کہ سنسکرت میں پائی جاتی ہیں۔ ہندستانی زبان کی یہ حالتیں عددوں سے گنی جاتی ہیں۔ مثلاً سنسکرت حالتیں تو فاعلی، مفعولی، اضافی وغیرہ کہلاتی ہیں۔ لیکن ہندستانی میں ان کو 'پہلی حالت'، 'دوسری حالت'، 'تیسری حالت' کہتے ہیں۔

اس بات کا اس کو احساس ہے کہ ضمائر شخصی ہندستانی میں بھی اسم کا مزاج رکھتے ہیں اور ضمیری صفات کی طرح سے استعمال ہو سکتے ہیں۔ ہمارا، ہمارے، میرا، میرے OUR'S اور MINE کے واسطے استعمال ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں اسما محذوف ہوتے ہیں۔

اس کے بیان کے مطابق صفات صرف ایک تبدیلی قبول کرتے ہیں اور وہ ہے تقابل۔ اس کی تین قسمیں ہیں (۱) بڑا (۲) اور بڑا (۳) سب سے بڑا۔ افعال کے سلسلہ میں وہ کہتا ہے کہ لازم اور متعدی دو طرح کے افعال ہوتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جملے میں پہلے فاعل، پھر فعل اور پھر مفعول آتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے

جو مثال دی ہے وہ بہت دل چسپ ہے ــــــ "ہم پیار کر کے بھولا ناتھ" (I LOVE BHOLANAT) وہ فعل لازم میں فاعل اور پھر فعل کی ترتیب اختیار کرتا ہے جس کی مثال یہ ہے: "ہم ہا" (میں ہوں) اور "ہم سوا" (میں سوتا ہوں)۔

لے بے ڈف کے یہاں ایک فعل میں تین شخصی صیغے اور دو عدد ہوتے ہیں۔ یہ شخصی صیغے پہلا، دوسرا اور تیسرا کہلاتے ہیں۔ فعل کی گردان کی مثالیں یہ ہیں:

"ہم ہا" حال
"ماتا یا ماتے" ماضی
"ماہوگا، ماہونگے" مستقبل

بیان ہو یا سوال ہو تو بیانیہ INDICATIVE MOOD ہوگا۔
(بیان) "ہم پیار کو رو" (سوال) "تم پیار کو رو؟"
صیغۂ امر "پیار کو رو تم"
اس نے اس طرح سے پانچ MOOD مقرر کیے ہیں۔
مصدر کی مثال ہے "پیاری کرکے" (TO LOVE)

اس کے خیال کے مطابق ہندستانی میں فعل معروف اور مجہول ہوتا ہے۔ فعل کی گردان میں اس نے معروف اور مجہول کی مثالیں دی ہیں۔ متعلقات فعل یا حروف تمیز کی اور دوسرے حروف کے اقسام کی بھی صراحت ملتی ہے۔ مشتقات پر بھی اس نے کئی صفحات لکھے ہیں۔ مشتقات افعال سے بھی ہیں اور اسما سے بھی۔

فعل: "کول"، "کول دو"، "کولو"
اسم مشتق: "کول کورنے والا"، "کول دینوں والا"
فعل: "لور"، "لورا یا جنگ"، "لورو"، "لارو"، "لورسے"، "لورائے"
اسم مشتق: "لور کورنے والا"، "لوسے کوروں والا"، "لورائے دینوں والا"

لے بے ڈف کی قواعد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندستانی ملی جلی بولیوں کو صوبہ جاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ طبقہ واری بنیادوں پر تقسیم کرتا ہے، اور ہر طبقہ کی بولی کو وہ یکساں تعظیم کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ تقسیم اور تکریم انوکھی بات ہے۔ اگرچہ اس کا صوبہ جاتی بنیادوں پر تقسیم نہ کرنا اور بنگال سے لے کر شمالی ہند تک کی تمام بولیوں کو ملا دینا۔ اس کی معلومات کی کمی پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن یہ طبقہ واری تقسیم اور یہ تکریم نظر کی گہرائی اور انسان دوستی کے ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس تقسیم کا لحاظ اس نے ہر جگہ رکھا ہے۔ تمام تعریفات

اور گردانیں اس نے اسی نقطۂ نظر سے کی ہیں۔

وہ بولیوں کی تین شکلیں متعین کرتا ہے۔ عوام کی ملی جلی بولی۔ روزمرہ کی بولی، تہذیبی ملی جلی بولی۔ زمانہ حال کی گردان اس نے ان میں سے دو شکلیں دی ہیں:

عوامی ملی جلی بولی	تہذیبی ملی جلی بولی
ما، مے یا ماے رہا	ہم رہے
تو، تا، تے یا توے رہا	تم رہے

ضمائر کی گردان میں وہ تینوں شکلوں کی مثالیں دیتا ہے۔

لے بے ڈث نے تعریف کے واسطے زیادہ تر ان الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو ہندستانی میں عربی فارسی سے آئے ہیں۔ 'خدا' یا 'بہشت' یا 'آدمی'۔ اس نے ان کے مترادف بنگلہ الفاظ بھی حاشیے میں دیے ہیں۔

اس کی قواعد میں سب سے بڑا نقص آوازوں کا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال شدت سے جاگزیں تھا کہ روسی آوازیں سنسکرت کی آوازوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اور چوں کہ سنسکرت سے ہندستانی نکلی ہے اس لیے ہندستانی آوازیں بھی روسی انداز رکھتی ہیں۔ اس نے ان آوازوں کے TRANSCRIPTION میں بھی اسی طریقے کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے الگ سے تو حروف تہجی اور ان کی آوازوں کے کوئی اصول مقرر نہیں کیے لیکن ولیم جونس کے مضمون کے سلسلے میں وہ خاصی بحث کرتا ہے۔ دراصل اس نے اپنے اصولوں کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، بلکہ ان کو کامل طور سے صحیح اور فطری مان لیا ہے۔ اس کے یہ اصول ولیم جونس کے سلسلے میں "تنقید اور اس کی قواعد کے متن سے ظاہر ہوتے ہیں، جو کچھ اس طرح سے ہیں۔

ﻩ یا زبر کی آواز 'o' سے ظاہر کی جائے۔ اس سلسلے میں درحقیقت اس کو مغالطہ کے لیے جواز مل گیا ہے بنگلہ اور اڑیا میں یہ آواز "او" کے قریب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ روسی میں 'o' کی آواز UNSTRESSED ہو تو یہ زبر کی آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آواز کی اس جزوی مماثلت نے اس کو سخت غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔

آخر میں آنے والی 'ای' کی آواز کو IE سے ظاہر کیا ہے۔ مثلاً " PANIE " (پانی)

آخر میں آنے والی " ر " کہیں موجود ہے اور کہیں محذوف۔ جنوا (جانور)۔ گار (گھر)۔ لیکن سب سے غلط اصول جو اس نے وضع کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر جگہ آخری حروف اگر مسموع (VOICED) ہوں تو وہ غیر مسموع (UNVOICID) لگتا ہے۔ یہ روسی تلفظ کا اصول ہے اس کو وہ ہندستانی پر بھی عائد کرتا ہے۔ سب یا سپ، لوگ یا لوک، چیز یا چیس۔ اردو کے یورپین قواعد نویسوں میں یہ غلطی کرنے والا

وہ پہلا شخص نہیں ہے۔ دوسروں کے یہاں بھی مسموع یا غیر مسموع کی یہ غلطی ملتی ہے۔

کتاب کے آخر میں اس کی اردو کی تحریروں کے نمونے بھی ہم کو ملتے ہیں۔ وہ مرکب جملے کی مثال یہ دیتا ہے:

خدا پیدا کورنے ولا ہے، دنیا کا بہشت کا، جمیں کا

HHODA PAIDA- KORNE-WOLLA HAY, DOONEERKA, BHESHTKA, JOMEENKA.

کتاب کے آخر میں کچھ مکالمات بھی ملتے ہیں، جن میں اس نے ہندستانی کو "مورس" یا "مورشس" کہا ہے۔ یہ مکالمات روزمرہ کے استعمال ہیں، جو اس کے خیال کے مطابق صرف و نحو کے واضح اصولوں پر مرتب کیے گئے ہیں۔

محمد عتیق صدیقی

غالبؔ
(معاصرین کی نظروں میں)

"غالب (معاصرین کی نظروں میں)" پیش کرنے کے لیے کوئی لمبی چوڑی تمہید غیر ضروری ہے اردو شاعروں اور ادیبوں میں غالب ہی پر اب تک سب سے زیادہ کام ہوا ہے، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی ہوگی، امید ہے کہ اس عرصے میں غالب پر کام کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جائے گی۔

غالب سے عام دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً، اور غالب پر کام کرنے والوں کے لیے خصوصاً یہ جاننا دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں کہ غالب کے معاصر تذکرہ نگاروں نے ان کو کس نظر سے دیکھا تھا، اور ان کے معاصر اخباروں میں ان کے متعلق کیا کیا لکھا گیا تھا۔ غالب پر کام کرنے والے حضرات تو ان ماخذ سے بے خبر نہیں ہیں، جن کو تحقیق کی اصطلاح میں "حقیقی ماٰخذ" (ORIGINAL SOURCES) کہتے ہیں، لیکن غالب سے عام دلچسپی رکھنے والے ان سے کم واقف ہیں، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ تذکرے اور اخبارات نایاب ہونے کی حد تک کم یاب ہیں۔ کسی بڑے کتب خانے میں، یا کسی بڑے شہر میں، جو علمی مرکز بھی ہو، یہ سارے تذکرے شاید ہی یکجا مل سکیں۔ اسی احساس کے پیش نظر غالب کے معاصر تذکرہ نگاروں اور معاصر اخباروں کے متعلقہ اقتباسات تاریخی تسلسل (CHRONOLOGICAL ORDER) کے ساتھ کتابی شکل میں مرتب کیے گئے ہیں، جس سے غالب کی شہرت و عظمت اور ان کی شاعری کے ارتقا کے مطالعے میں بھی مدد ملے گی۔ آنے والے صفحات میں اسی کتاب کا

ایک حصہ پیش کیا جارہا ہے، جو اُن تذکروں اور اخبارات کے اقتباسات پر مشتمل ہے، جو غالب کی زندگی میں مرتب کیے گئے تھے۔

غالب کے معاصرین نے ان کے کلام کا جو انتخاب اپنے تذکروں میں پیش کیا ہے، اس جگہ طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ صرف عمدہ منتخبہ اور گلشن بے خار کے انتخابات اس لیے پیش کیے جارہے ہیں کہ یہ دونوں تذکرے دیوان غالب کی طباعت (۱۸۴۱ء) سے قبل مرتب کیے گئے تھے۔

فہرست ماخذ

۱۔ عمدہ منتخبہ	اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ	۱۸۰۱ - ۱۸۲۹ء
۲۔ گلشن بے خار	نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہ	۱۸۳۴ء
۳۔ دہلی اردو اخبار	مولوی محمد باقر (اڈیٹر)	۲۹ اگست ۱۸۴۰ء
۴۔ گلستان بے خزاں	حکیم قطب الدین باطن	۱۸۴۵ء
۵۔ بہار بے خزاں	احمد حسین سحر لکھنوی	۱۸۴۵ء
۶۔ آثار الصنادید	سید احمد خاں بہادر	۱۸۴۷ء
۷۔ احسن الاخبار		۲۵ جون ۱۸۴۷ء
۸۔ طبقات الشعرے ہند	مولوی کریم الدین و مسٹر فے لن	۱۸۴۷ء
۹۔ اسعد الاخبار	مولوی قمر الدین	فروری ۱۸۴۹ء
۱۰۔ ایضاً	ایضاً	ستمبر ۱۸۵۰ء
۱۱۔ فہرست کتب خانہ شاہ اودھ	ڈاکٹر اشپرنگر	۱۸۵۰ء
۱۲۔ گلشن ہمیشہ بہار	نصر اللہ خاں خیشگی	۱۸۵۴ء
۱۳۔ گلستان سخن	قادر بخش صابر	۱۸۵۵ء
۱۴ سراپا سخن	میر محسن علی	۱۸۶۱ء
۱۵ مراۃ الاشباہ	حکیم احسن اللہ خاں	۱۸۶۸ء
۱۶ اکمل الاخبار	مضمون میر مہدی مجروح	۱۸۶۹ء

(م، ع، ص)

(۱)

اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ[1]

اسد تخلص، اسد اللہ خاں معروف میرزا نوشہ۔ اصلش سمرقند، مولد مستقر الخلافہ اکبرآباد۔ جوانِ قابل و یار باش و دردمند۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر متمکن۔ غم ہائے عشقِ مجاز ... تربیت یافتۂ غم کدۂ نیاز۔ در فنِ سخن سنجی متبعِ محاورات میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ، و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجدِ طرز خود است، و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ بہ مضامینِ نازک موزوں گشتہ۔ روئے خیال بندی بیش از بیش پیش نہادِ خاطر دارد۔ از نتائج طبع اوست:

شمشیرِ صافِ یار جو زہر آب دادہ ہو   وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو   آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک   لایا ہے لعلِ بیش بہا کاروانِ اشک

آنسو کہوں کہ آہ سوارِ ہوا کہوں   ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے   یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

---

[1] عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور)؛ ڈاکٹر اشپرنگر کے بیان کے مطابق یہ تذکرہ ۱۲۱۶ھ و ۱۲۴۲ھ (م ۱۸۰۱ء-۱۸۲۶ء) کے درمیانی زمانے میں لکھا گیا تھا۔ فہرست مخطوطات کتب خانہ شاہ اودھ (دیکھیے عمدۂ منتخبہ)

دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بے تاب ہے   دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش   اب شکستِ توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

مجلسِ شعلہ عذاروں میں جو آ جاتا ہوں   شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام   جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ رہنے سے رہو   کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے   رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ   ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا   دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے قابل نہیں رہا   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر   جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط   کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست بہ ضبطِ دگر ہے آج   قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ   خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل   دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسدؔ کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے — فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے — ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے — عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز (ق) — گرم بازارِ فوجداری ہے
پھر ہوا ہے جہاں میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — بے قراری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے
بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

کب سُنے ہے وہ کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ — دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ — مگر آشفتہ بیانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ!　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(۲)

نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہ[۱]

غالب تخلص، اسم شریف اسد اللہ خاں، المشتہر مرزا نوشہ، از خاندان فخیم است، و از روسائے قدیم سابقاً مستقر الخلافتِ اکبر آباد از استقرارش سرگرمِ کبر و ناز بود، اکنوں دار الخلافہ شاہ جہاں آباد بدیں نسبت غیرت افزائے صفاہان و شیراز۔ طوطی بلند پروازِ چمن معانی است و بلبل نغمہ پردازِ شیوہ بیانی۔ پیش بلندیٔ خیالش اوجِ فلک پستیِ زمین است و در جنبِ دہ نشینیِ غورش سرفرازیِ قارون کرسی نشین۔ شاہین فکرش جز بشکارِ عنقا نہ پردازد، و اشہبِ طبعش جز بعرصۂ فلک نہ تازد۔ اگر امروز بتلاش متاعِ نفیس شتابی جز بہ دوکانش در نیابی کہ پا بہ دائرۂ شاعری نہادہ۔ در اوایلِ حال بہ تقاضائے طبعِ دشوار پسند بہ طرزِ مرزا عبد القادر بیدل سخن می گفت و دقت آفرینہا می کرد۔ آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ اندازِ مطبوع ابداع نمودہ۔ دیوانش را بعد ترتیب و تکمیل دگر نگریست، فراواں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ قدرے قلیلے انتخاب زدہ۔ مدتہا است کہ بہ نظمِ ریختہ سرے ندارد۔ و در زبانِ فارسی نیز دستگاہے بلند و مایہ وافر بہم رسانیدہ۔ پایہ اش از فحولِ استادان کم نیست۔ غزلش چوں غزلِ نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفی دل پذیر۔ مضامین شعری را کماحقہ می فہمد و بہ جمعِ نکات و لطایف پے می رود۔ ایں فضیلتے است کہ مخصوص بعضے اہلِ سخن است۔ اگر طبعِ سخن شناس داری بہ ایں نکتہ می رسی کہ خوش فکر اگرچہ کم یاب است اما خوش فہم کم یاب تر۔ خوش حال شخصے کہ از ہر دو بہرہ یافتہ و حظے ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنجِ نغز گفتار کم تر می شد۔ دیدنش ہرچہ گاہ گاہ صورت می بندد اما پیوند معنی مستحکم است۔ دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات ازاں منتخب گردید:

---

[۱] گلشنِ بے خار: ۱۲۵۰ھ م ۱۸۳۴ء

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

جاتی ہے کش مکش کوئی اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

تو اور سوے غیر نگہ ہائے تیز تیز — میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر — رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

واے! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو   اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا   غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ   سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف   عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ!   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا   خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق!   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے!   کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی   ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایے میں تو سایے سے   فدا ہوئے در و دیوار پہ در و دیوار

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے   متاعِ بردہ کو سمجھے ہیں قرض رہزن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے   کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے! — بیٹھنا اس کا وہ اکثر تری دیوار کے پاس

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا — رکھ لیجو میرے دعویِ وارستگی کی شرم

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر، ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے [تھے] غالب پیش دستی ایک دن

لوں وامِ بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے — غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں؟

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں؟

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں　　ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم　　دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا　　تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر　　عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں　　آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلا　　ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو　　ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے مجھ کو

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر　　آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے　　تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں　　خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا　　ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غیر کو یارب وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے　　گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

ہو کے عاشق، وہ پری رخ اور نازک بن گیا　　رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی　　فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا　　بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر　　غالب! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب　　ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی　　یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　پھر وہی زندگی ہماری ہے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے　　جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال　　مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر! کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور دل میں تو نظر آتی ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

---

(۳)

دہلی اردو اخبار[1]

قمار بازاں

سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز، مثل ہاشم خاں وغیرہ کے، جو سابق میں بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے [گرفتار ہوئے ہیں]۔ کہتے ہیں [کہ] بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب و کثرت مردان کے کسی طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے یہ تھانے دار، قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمع دار تھا۔ بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمع داری میں بھی بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے۔ بہت بے طمع ہے۔

یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ، نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی، لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔

عدالت سے جرمانہ علیٰ قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، نہ ادا کرنے پر نو مہینے قید۔ لیکن ان تھانے دار کی خدا خیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے، لیکن اس علاقہ میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ چپٹ کریں، اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو، چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔

---

(۴)

حکیم قطب الدین باطنؔ[2]

غالب و اسد تخلص، اسد اللہ خاں نام، ملقب بہ مرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں، کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از نبائر غلام حسین خاں کمیدان قبل اس سے جد دہلی میں ان کی سکونت

---

[1] جلد ۲ نمبر ۵۹۳۳ اگست ۱۸۴۱ء

[2] گلستان بے خزاں: ۱۸۴۵ء

سامکان (؟) استادانِ باشعور کے مثل خلیفۂ معظم، جو بڑے معظم و مکرم، اور ہادی شعرا، جو بے نظیر روزگار تھے، جن سے تعلیم پائی۔ ایامِ صبا سے بہ برکتِ انفاس متبرکہ ان استادوں کے بہ مرتبۂ کلام پہنچے، تب ان کی فکر رسا نے یہ صورت دکھائی کہیں نہ خوش گو ہوں، جن کے ایسے استاد دو ہوں۔ متانت فحوائے کلام میں لاکلام، کلام سے بنیادِ سخن کو استحکام۔ چوں کہ وہ استاد مر گئے، یہ جد دہلی سے ادھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔ ہاں خود استاد ہیں، مرغانِ مضامیں کے صیاد ہیں۔ ہاں ان کا فراخ حوصلہ ہے، پھر تبختر کا کیا گلہ ہے۔ گو فارسی میں متین ہیں پر اردو میں تو ذوق ہی نکتہ چیں ہیں۔ اب بعد وفاتِ ذوق ان کو شاعری میں کمال ہو، کلام ان کا سحر حلال ہو، مگر زمانہ خالی نہیں، کیا اور کسی کی طبیعت عالی نہیں؟ غالباً جو کسی سے مقابلہ ہو تو حاکمان محکمۂ شعر کے روبرو معاملہ ہو۔ بندے کے والد مرحوم سے کمال ملاقات تھی، اور از حد اتحاد کی بات تھی۔ انتخاب زماں ہیں، یکہ دوراں ہیں، جس طرف طبیعت آئی اسی کی خاک اڑائی۔ چناں چہ دخترِ رز سے جو تاک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ مینائے گردوں میں شرابِ شفق قاضیِ آفتاب باادب پیش کش لایا۔ اور قمار بازی پہ جو دھیان کیا تو چھکے جاری ہوئے کہ میرِ بساط اور بکھڑے داؤں کھانے لگے، ایسا کمال پایا۔ شعر کم قدر ان کا کبھی کسی کی زبان سے نہ سنا، نہ اپنی آنکھ سے دیکھا۔ لفاظی اور جودت زبان فیض ترجمان سے عیاں ہے۔ کلام شیریں وصف سرمۂ چشم فرہاد میں جس نے سنا حلاوتِ سخن اور گلوگیری سرمہ سے یارائے صفت شعر نہ رہا، گویا کہ وقت امتحان ہے۔ کثرتِ عذوبت سے ہونٹ چپک گئے، سرمہ کی خاصیت سے زبانِ سیہ گولال ہوئی، عدو تھک گئے، جو شخص ان کے کلام سے بہرہ ور ہوا، بے ساختہ آفریں اور سبحان اللہ اس کی زبان پہ ہوا، چوں کہ یارائے کام و دہاں نہیں کہ منزلِ وصف میں قدم سر کیجے، لہٰذا راقم لجامِ توسنِ سبک تگ کلک سوئے بادیۂ مطلب پھیرے۔ اب یہ دہلی والے ہیں، اور بڑے امادے والے ہیں۔ شاید قدیم کی نظم و نثر کو خفیف جانتے ہیں۔ غرور کی راہ چاہیں سو فرمائیں، پہ دل میں تو ان کا لوہا مانتے ہیں۔ دہلی والے صاحب کسی کو اپنے روبرو خاطر میں نہیں لاتے۔ مارے خودی و تبختر کے جی میں پھولے نہیں سماتے۔ پر جب کسی سے مقابلہ ہو تو دم بھر میں فیصلہ ہو۔ ان کو شراب و کباب چاہیے، خلافِ شرع کا بے حساب چاہیے۔ روزے کے نام سے انھیں کیا کام، نماز کو ان کا ہر دم سلام۔ اصحابِ تذکرہ کی تحریر دیکھی اور ان کی تقریر دیکھی، کیا غرور ہیں، اپنے نزدیک کتنے دور ہیں، یارانِ صحبت ان سے زیادہ غرور میں چور ہیں۔ گویا ان کے یار خوشامد کے مزدور ہیں۔ دہلی والے صاحبوں کے تذکرے جو عبارت رکھتے ہیں، متاعِ خیریت شعرائے ماضی و حال و مصنف کو غارت رکھتے ہیں۔ ہیں ہیں! باطن کدھر گیا۔ جوش میں بھر گیا، خبردار! ہوشیار! ان کے اسدِ فکر کا پنجہ مضمون پر غلبہ ہے۔ خمسہ ان کا شیر کا پنجہ ہے۔ دیوان فارسی ضخیم ہے۔ مگر اردو کا دیوان مانند آمد نامہ قبیل (قلیل؟) و قدیم ہے۔

اسدِ فکر نیستانِ کاغذ میں ڈکارتا ہے۔ روباہِ مضامین کو ناحق جان سے مارتا ہے[۱]۔

احمد حسین سحر لکھنوی[۲]

مرزا نوشہ، اسد اللہ خاں اسد تخلص، از خاندان عالی است۔ پیش تر [تخلص] غالب می کردہ و حالا اسد کردہ [؟]۔ دریں زماں بہ دار الخلافہ شاہ جہاں آباد سکہ بہ نامش می زنند۔ در اوائل بہ مقتضائے طبع دشوار پسند بہ طرز بے دل دقت آفرینی ہا در شعر می کردہ، و آخر بر آں طریقہ پشت پا زدہ۔ ہم چو نظیری طرز خاص ایجاد کردہ۔ دیوانے مختصر بعد از ترتیب و تکمیل مرتب ساختہ۔ اشعار قابل انتخاب منتخب کردہ۔ بہ حضور والا بس نزاکت بندان زانوے ادب تہ می کنند۔ درایں زمانہ قدر سخن چوں آب گوہر ریختہ۔ از مغتنمات است۔

سید احمد خاں بہادر[۳]

ہمائے اوج مفاخر و معالی، جاگزین سدرۃ المنتہیٰ، مراتب بلند و مدارج عالی، موسس اساس شیوا بیانی، بانی بنائے الفاظ و معانی، عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، اوج سمائے برتری، مہر سپہر بلند اختری و گردوں اقتداری، شاگرد رحمٰن استاد سحبان المعی زمان لوذعی بیان، فرزدق دہر و لبید آوان، سمی و صی رسول اللہ، جناب مستطاب مرزا اسد اللہ غالب تخلص۔ دیوانِ حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبانِ خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانے میں خاموش۔ چراغ انوری انھیں کے شعلۂ فکر سے روشن،

[۱] گلشن بےخزاں کے متعلق اشپرنگر کی مندرجہ ذیل رائے کا مطالعہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں:

"اس تذکرے کو سابقہ تذکرے [گلشن بےخار] کا ناقابل فہم ہندستانی ترجمہ سمجھنا چاہیے، جس میں چند احمقانہ خیالات کا اضافہ کیا گیا ہے۔"

(کتب خانۂ شاہِ اودھ کے عربی، فارسی و ہندستانی مخطوطات کی فہرست: دیکھیے گلشن بےخزاں)

[۲] بہارِ بےخزاں (مخطوطہ) ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء

یہ مخطوطہ ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے کتب خانے میں ہے، اور اس کی ایک نقل آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں ہے۔

[۳] آثار الصنادید: ۱۲۶۳ھ م ۱۸۴۷ء

اور سینہ آذری انھیں کی آتش حسرت سے گلخن، عنصری ان کے رشک افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصر آتش سے مشکون ہوا تھا۔ اور سحبانی ان کے حسرت کمال سے ایسا رویا کہ گر اس کی بینائی چشم فقط عنصر آب سے بنی تھی، نزالی ان کے چشم ہنر کا تشنہ لب، اور ابو اسحٰق اطعمہ ان کے خوان استعداد سے نعمت طلب۔ خاقانی اس خسرو معنی کی کم تر رعیت، اور اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت۔ ملاحت کلام سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار، اور شیرینی زبان حافظ ان کی نعمت مقال سے روزینہ دار۔ رنگینی معنی سے صفحہ کو گل رنگ، اور طراحی فکر سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خاصہ اسی چمن طراز سخن وری اور نقاش صحیفۂ ہنر پروری کا ہے اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ کاہ کا حکم پیدا کرے، اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورق بیاض صدمۂ مرصر سے جگہ سے نہ ہلے۔ قلم ان کا معنی روشن کی تراوش سے فوارۂ نور، اور عبارت پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شراب انگور۔ اگر اس سخن طراز کے کمال استعداد کو، جو ظرف حصر و شمار سے فزوں ہے، خامہ دو زبان بیان کرے، اول چاہیے کہ ملکہ عقل فعال سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب میں درج کروں، اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہر گاہ میں نے اس تقدیس جوہر اور امداد مبدا و فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا کارکنان بارگاہ جلال سے کمی استعداد کا طعنہ سنا اور سوء ادب کی سرزنش حاصل کی، تو با ایں ہمہ نقصان عقل و ہوش کس شمار میں ہے۔ فی الحقیقت اگر تنگ لگان اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈال دیا، تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ پایان انصاف طینت کے آگے حصول صلۂ آخرین تو کیا خجلت نارسائی اور طعنۂ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ ظہوری نے سچ کہا ہے:

"کسے کہ از عہدۂ ثنائے کسے بیروں نیاید، چرا اول اعتراف نہ نماید"

بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے۔ بیت:

بلاے است بہ صد بلندی و پستی ہاں پاے نہ لغزدت زمستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آپ اتراک سے ہیں، اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں، بہ سبب اس کے کہ ان کے ہم جنس و ہم گہر تھے، فرماں روائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دورہ تمام ہوا ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جد امجد اپنے پدر شفیق سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے، اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے، اور اس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح

کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باش اکبرآباد میں اختیار کی، اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنارِ شفقت اور آغوشِ عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جناتِ نعیم کی گل گشت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار تھے، آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے۔ جب ہندستان میں تصرف حکام انگریز کا ہوا، نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالہ سے اعادی بادیہ پیما کے سرگرم جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب نے اس کارنمایاں کے صلہ میں دو پرگنہ مضافات اکبرآباد سے ان کے حین حیات تک جاگیر میں عطا کیے۔ پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد، جو سنہ ۱۸۰۶ء میں پیش آیا، جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی۔ پھر وہاں سے بہ سبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے، اور اسی معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے۔ اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جانِ سخن پر منت اور سرِ معنی پر احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرہ الفاظ دہن شکر اور ہر مد حرف زبان سپاس ہے ان کی نعمت تربیت کا۔

راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے، اس کا بیان نہ قدرتِ تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آ سکتا ہے، اور چوں کہ "دل ہا را بہ دل ہا راہ باشد" آں حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہو گا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے، اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گل زار سے جانتا ہوں۔ اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمتِ بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں، اور جوہر گراں مایہ، کہ آپ سے حاصل کرتے ہیں اس کو مغتنم جان کر یہی جزودانِ حافظہ میں محفوظ اور یہی صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین عطائی ہر مستفید کے پاس خروار خروار فراہم آ گئے ہیں اور چوں کہ مثل مبدار فیاض کے آپ کی طبیعت فیض موہبت نسبت بخل سے مبرا ہے، آپ کو ان جواہر بے بہا کے اعطا میں کچھ دریغ نہیں، آرے:

نطقش کہ بدمست جاں توانا چوں بادہ خرد فزائے دانا

آپ کا جواہر خامۂ نفائسِ سخن حدِ شمار سے افزوں اور ظرفِ حصر سے بیروں ہے۔ ایک دیوان قصاید و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب و منطبع ہوا ہے، اور اسی طرح سے نثر [کا]، اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فوایدِ جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتایج فکر سے ہے کہ منتہیانِ معنی رس کے واسطے مغتنمات عظمیٰ سے ہے۔ اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزواتِ حضرت رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، اگر چہ ہنوز ناتمام ہے، لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے، انشاء اللہ تعالے

جس وقت اہتمام کو پہنچے گی، گل دستۂ بزم احباب ہو گی۔ راقم تیمناً و تبرکاً کچھ نظم اور کچھ نثر [فارسی] اس کی
میں لکھ کر بہ یۂ نظر ارباب شوق کرتا ہے، تاکہ معلوم کہ نظم کس رتبے کی ہے اور نثر کس شان کے ساتھ۔

(۷)

احسن الاخبار (بمبئی)

۱

[قمار بازی کے سلسلے میں مرزا غالب کی دوبارہ گرفتاری کی خبر]

مرزا اسد اللہ خاں کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدو بہادر [ریذیڈنٹ] کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کیا جائے کہ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔

عدالت فوج داری سے نواب صاحب کلاں بہادر [ریذیڈنٹ] نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۲

[سزا کی خبر]

مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوج داری میں جو مقدمہ دائر تھا، اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے میں او اضافہ ہو جائے گا، اور مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے

جب اس پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل ہیں سوا پرہیزی غذا قلیا چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت و مشقت برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوج داری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے یہ بات عدل و انصاف

لے احسن الاخبار جلد ۴ نمبر ۱۶، مورخہ ۲۵ رجون ۱۸۴۷ء، بہ حوالہ رسالہ اردو۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء (احسن الاخبار فارسی اخبار تھا، اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا تھا

کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت وحشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، ایسے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا احتمال ہو۔[1]

(۸)

مولوی کریم الدین اور مسٹر فیلن[2]

غالب تخلص، اسد اللہ خاں، مشہور مرزا نوشہ، خاندان فخیم اور روسائے قدیم سے ہے۔ ابتدا میں درمیان اکبرآباد کے رہتے تھے، اب شاہ جہاں آباد میں ۱۲۵۰ہجری [مطابق ۳۵-۱۸۳۴ء] سے رہتے ہیں۔ مہارت کتب فارسی کی ان کو مہارت ہے۔ اکثر آدمی شاہ جہاں آباد میں ان کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر بھی ان کا بہت اچھا ہوتا ہے۔ ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصنیف سے منشی نور الدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے، بہت بڑا دیوان ہے یہ دیوان ۱۲۶۳ہجری مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے، وہ بھی مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۸۴۳ء کے چھپا تھا۔[3]

---

[1] احسن الاخبار، جلد ۴، نمبر ۷، مورخہ ۲ جولائی ۱۸۴۷ء بہ حوالہ رسالہ اردو، متذکرہ

اس واقعے کے سلسلے میں خود مرزا غالب کا بیان یہ ہے:

"شحنہ عدو بود و مجسٹریٹ با من ناآشنا۔ فتنہ در کمین بود و بخت نارسا۔ مجسٹریٹ با آن کہ شحنہ را فرمان روا ہستی در خستن من شحنہ را فرمان برد و توقیع گرفتاری من نوشت۔ و ششن جج با آن کہ با من دوستی داشت و پیوستہ با من مہر ورزو مہربان بود و بارہا در بزم بہم پیوند چشم پوشید و با من تغافل زد۔ داوری بہ صدر بردند۔ ہیچ کس نشنید و ہمان فرمان بے داد بجا ماند۔"

زانم چہ رو داد کہ چون نیمہ میعاد سپری شد مجسٹریٹ را دل بہم برآمد و خود از صدر نسخ حکم خویش و رستگاری من خواست خواہش وے پذیرفتند بلکہ او را بدین خواہش ستا گفتند۔"

(باغ دو در ص ۷۲ الف۔ بہ حوالہ دیوان غالب عرشی ص ۵۹)

[2] طبقات الشعرائے ہند: ۱۸۴۷ء

[3] "درمیان ۱۸۴۳ء" نہیں بلکہ شہر شعبان سنہ ۱۲۵۷ ہجری مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۴۱ عیسوی کو "غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن" "سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ کے لیتھوگرافک پریس میں" چھپا تھا۔

(سرورق "دیوان اسد اللہ خاں صاحب غالب تخلص")

حال اس دیوان کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار شعر کا فراہم کیا تھا، اس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان دو تین جزو کا بنا لیا۔ وہ دیوان بندے کے پاس بھی ہے۔ میں نے جو کچھ لوگوں کی زبانی سنا تھا، نقل کر دیا۔ دروغ برگردن راوی۔ لیکن اس قول کا مؤید قول صاحب تذکرہ گلشن بے خار کا بھی ہے۔ وہ بھی یہ لکھتے ہیں کہ بہت اشعار حذف کر کے یہ دیوان کر لیا ہے۔

قصیدہ اور غزل دونوں اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت ہیں۔ اردو میں صرف غزلیں ہیں۔ اور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔

ان ایام میں، یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے، ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے بڑا پڑا، جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا[1]۔ عمر ان کی اس سال میں قریب ساٹھ برس کے ہوگی[2]۔

(۹)

اسعد الاخبار

۱

نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ

مصنفہ

حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب

جو اپریل کے مہینے میں قیمت بھیج دے، تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے

---

[1] یہ اشارہ ہے قمار بازی کے سلسلے میں غالب کی گرفتاری و سزا کی طرف، جس کی تفصیل احسن الاخبار کے اقتباس میں موجود ہے۔ غالب کو اس حادثے کا جو رنج و ملال ہوا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

"خواہم بس درجہاں نہ باشم، واگر باشم درہندوستان نہ باشم۔ روم است، و مصر است، و ایران است، و بغداد است، وگرنہ خود کعبہ پناہ آزادگان و سنگ آستانہ رحمۃ للعالمین تکیہ گاہ دلدادگان بس است۔"

(باغ دو در ص ۲، الف، بحوالہ دیوان غالب عرشی ایڈیشن ص ۶۰)

[2] ۱۸۴۷ء میں غالب کی عمر پچاس سال تھی۔

نظم

مژدہ اے رہروانِ راہِ سخن　　پایہ سنجانِ دست گاہِ سخن
طے کرو راہِ شوق زود زود　　آن پہنچی ہے منزلِ مقصود
پاس ہے اب سوادِ اعظمِ نثر　　دیکھیے چل کے نظمِ عالمِ نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی　　چشمِ بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا　　جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہ راہِ دہلی ہے　　مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ　　گل و ریحاں و لالہ رنگا رنگ
ہے یہ وہ گلشنِ ہمیشہ بہار　　بارور جس کا سرو، گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں　　نہیں ایسی کتاب عالم میں
اس سے انداز شوکتِ تحریر　　اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا طرزِ نغز گفتاری　　حبذا رسم و راہِ نثاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم　　ہے مقرر جو اب پئے تعلیم
اس کے فقروں میں کون آتا ہے　　کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلے　　ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلے
ورزشِ قصۂ کہن کب تک　　داستانِ شہ دکن کب تک
تا کجا درسِ نثر ہائے کہن　　تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب　　اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے　　اسد اللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے درست　　ہر کرا پنج روز نوبت اوست
کل وہ سرگرمِ خود نمائی تھے　　شمعِ بزمِ سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دانِ معنی ہے　　بادشاہِ جہانِ معنی ہے
نثر اس کی ہے کارنامۂ راز　　نظم اس کی نگارنامۂ ناز
دیکھو اس دفترِ معانی کو　　سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا　　سینہ گنجینۂ گہر ہو گا

جو سخن کی ہے طلب گاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست — تین بھیجے روپے وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب — زر قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے لیویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو وہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہار ریاض مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں در پے حصول شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصل تحریر — کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے
ابتدائے ورق شماری ہے

[نوٹ اسعد الاخبار]
مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار دہلی سے بسبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والاشان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا تھا۔

(فروری ۱۸۴۹ء)

۲

تاریخ عطائے خطاب و خلعت از حضور بادشاہ دہلی
بہ جناب اسد اللہ خاں غالب

از روے اخبارات کے ہر شہر و دیار میں مثل آفتاب روشن وظاہر ہو چکا ہے کہ شاہ دہلی نے جناب اسد اللہ خاں غالب کو، جو نظم و نثر میں استاد اکمل اور تمام کشور ہند میں لاثانی و بے بدل ہیں۔ حضرت شاہ والا بارگاہ نے باکمال اعزاز واکرام اپنے حضور بلوا کر بعطائے خلعت معزز فرمایا۔ اور کل سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ جناب تفتہ نے ان کے خطاب و خلعت عطا ہونے کی تاریخ لکھی۔ [جو درج ذیل ہے]

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را — خطاباتے کہ ہر ہر لفظ آں روشن تر از اختر
دبیر الملک و نجم الدولہ و یک جزو دیگر ہم — نظام اول بود، زاں بعد لفظ جنگ اے سرور

خطاب و خلعتِ شش پارچہ بخشید و بر خلعت / فزودہ جیغہ و سرپیچ و مالاے در و گوہر

بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسروِ دہلی / سخن فہم و سخن گو پرور و دانا و دانش ور

پے تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی / بہ دریاے تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر

بہ ہنگامے کہ شد در غوطہ پایش بر زمیں قایم / بہ گوش تفتہ ہاتف گفت کہ اے رند زباں آور

بگو، گر سالِ ایں پیش آمدِ اقبال می خواہی

یکے سامان، دوم حشمت، سوم اعزاز، چہارم فر

۱۲۶۶ھ (م ۱۸۵۰ء)

(ستمبر ۱۸۵۰ء)

(۱۰)

ڈاکٹر اشپران گر

(۱)

اسد تخلص، اسد اللہ خاں نام، عرف مرزا نوشہ۔ ان کے اجداد سمرقند سے آئے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے[۲] غالب تخلص کے تحت بھی اسی شاعر کا ذکر کیا جائے گا۔

۱۸۵۰ء میں ان کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال ہے[۳]۔ ان کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔ اس وقت وہ صرف فارسی میں لکھتے ہیں (شعر کہتے ہیں)۔ فارسی انشا کی ایک کتاب [پنج آہنگ] ان کی تصنیف ہے، [حضرت] علی کی منقبت میں ایک مثنوی بھی انھوں نے کہی ہے۔

---

[۱] A CATALOGUE OF ARABIC, PERSIAN AND HINDUSTANI MANUSCRIPTS OF THE LIBRARY OF THE KING OF OUDH. (۱۸۵۰)

[۲] اس جگہ غالب کے دہلی میں پیدا ہونے کا ذکر تذکرۂ سرور کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ سرور نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کا "مولد مستقر دار الخلافہ اکبر آباد" ہے۔ اس جگہ حوالہ دینے میں اشپران گر سے کچھ غلطی ہوئی ہے

[۳] غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے، اس حساب سے ۱۸۵۰ء میں ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔

۲

غالب، اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ۔ ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے آگرہ میں رہتے تھے اب دہلی میں قیام ہے۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ پہلے بیدل کا تتبع کرتے تھے، اب خود صاحب طرز ہیں۔

(۱۱)

نصر اللہ خاں خیشگی[1]

غالب تخلص، مرزا نوشہ کہ نام سامیش اسد اللہ خاں است، ناز پروردۂ دار الخلافہ شاہ جہان آباد نکتہ سنجی مزاج اوست، و موزونیت کلام از جوہر طبع وہاج او۔ شاعرے است کہ مانندش دریں عہد و زمان معدوم، و عالی طبع است کہ ندش تا قطع دور دوراں غیر معلوم۔ نظیری در تغزل پیش او بہ علو نظرش از شعرائے عالی است، و عرفی در تشبیب بہ عرفان مضامین عالیہ و وحید الکلامی غیر نامی۔ در فکر سخن نام برآوردہ، دریں عرصہ گوے سبقت از ہمسراں بردہ۔ صاحب دیوانِ منقبت است و ایں اشعار از آں استاد شریعت است۔

(۱۲)

مرزا قادر بخش صابر[2]

غالب تخلص، شیر نیستان سخن وری، ببر بیشۂ معنی پروری، یکہ تازِ عرصۂ کمال، یگانۂ کشورِ افضال، سیاح زمین سخن، دانائے نوادرِ فن، زبدۂ کملائے جہاں، مرزا اسد اللہ خاں، معروف بہ مرزا نوشہ سلمہ الرحمن ہسخن سنج بے مثل و نظیر اور صاحب طرز دل پذیر ہے۔ خامۂ گوہر بار سے اقلیم سخن میں لوائے جہاں گیری بلند کیا ہے، اور یوسف معنی کو اس ہجوم بے تمیزی میں زلیخا منشیانِ مصرِ سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے۔ فضائل اگر اس قدوۂ افاضل کی ذات پر نکتہ نہ کرتے، فضیلت نہ رکھتے، اور کمالات اگر اس زبدۂ کملا سے مدد نہ لیتے، عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے ہیا ہی

---

[1] گلشن ہمیشہ بہار مولفہ مولوی عبد العلیم نصر اللہ خاں خیشگی احمدی خورجوی۔ ۱۲۷۰ھ م ۱۸۵۴ء

[2] گلستان سخن،

رقوم اس کی رنگینیِ معنی سے ہم شکل طاؤس، صفحۂ قرطاس اس کے فروغِ مضامیں سے ہم رنگ فانوس۔ برق طور اگر اس کے تجلیِ معنی کے مقابل ہوتی، سرمہ ہو جاتی۔ شمعِ ایمن اگر اس کے شعلۂ فکر کے سامنے آتی، فروغ نہ پاتی۔ ایوانِ سخن اس کے فکر کی معماری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت۔ بنائے کلام اس کی طبیعت کی مدد سے قاف کے ساتھ ہم متانت۔ وصفِ بزم میں رفتارِ قلم رقصِ ناہید کے برابر۔ بیانِ رزم میں صریرِ خامہ نعرۂ شیر سے ہم سر۔ فکر اگر حوصلۂ ہمت کے لائق جہد کرے، فضائے لامکاں مرحلۂ مقصود کے رو بہ رو دیدۂ مور سے تنگ تر نظر آوے۔ خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جاوے، خزانۂ تحت العرش کو، اس جائے گاہ رفیع سے، گنجِ قارون سے پست تر پاوے۔ سخن کی فراوانی اور ہجومِ معنی اور متانتِ تراکیب اور رشاقتِ اسالیب اور شوخیٔ اشارات گاہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباسِ ذرہ میں جلوہ دینا، اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو و نما بخشنا، جدائی کو وصل کے قبیل سے ٹھہرا کر مباحثِ سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا، اور حشو و زواید سے بزمِ کلام میں مثلِ صحبتِ زہاد اجتناب کرنا۔ اور اسی طرح اور باتیں جو لوازمِ سخن اور مقتضیاتِ فن سے ہیں، جیسی اس ناظمِ کشورِ کمال میں مشاہدہ ہوتی ہیں، کم کسی میں دیکھی گئیں۔ ابیاتِ ریختہ عمارتِ ریختہ، دقایقِ فارسی جواہرِ قدس کا بیختہ۔ ہر چند اشعارِ ریختہ حدِ حصر سے خارج اور اندازۂ شمار سے افزوں تھے، لیکن ازبس کہ کمرِ یار اور دہانِ دل دار کا مضمون زیبِ اشعار ہوتا ہے، انھیں مضامین کی رعایت سے اختصار کو پسند کیا اور چند بیتیں دل بروں کے لب کے مانند نقطۂ انتخاب کے خال سے مزین کر کے ایک دیوان مختصر مرتب کیا، اور مجموعۂ فارسی کا دیوان محشر سے بھی زیادہ اشعار پر غوغا اور ابیاتِ بلند صدا سے مملو اور مشحون ہے۔ ریختہ میں گاہ گاہ اسدؔ تخلص بھی کیا ہے، لیکن غالبؔ غالب، اور ہر طالب اسی نام سے ہند و فارس میں اس کے نشان کا طالب ہے۔ یہ چند شعر لکھ کر چشمِ بندِ غفلت کا چارہ اور جلوۂ شاہدِ مدعا کو آشکارا کرتا ہے۔

(۱۳)

محسنؔ، میر محسن علی

مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ غالبؔ ولد عبد اللہ بیگ خاں، قوم ترک اولاد میں گستاسپ کی، مولد اکبرآباد، مسکن دہلی۔ دیوان فارسی اور ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہلی میں ہیں۔ مولف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ فدا حسین فدائیؔ قصبۂ دیبائی سے بھیجی ہے۔

---

[1] سراپا سخن

(۱۴) حکیم احسن اللہ خاںؒ

جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب

عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، سرمستِ نشۂ سخن دانی، نظر بازِ شاہد نکتہ دانی، غواص محیط تدقیق، آشنائے بحرِ تحقیق، افصح الفصحا، ابلغ البلغا، بادشاہِ کشورِ فصاحت، فرماں روائے قلمروِ بلاغت، خلاق مضامین لطیف، موجدِ قافیہ و ردیف، ناظمِ بے بدل، ناثرِ بے مثل، زبدۂ شعرائے جہاں نجم الدولہ، دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر۔ ان کے کمالات کا اندازہ ظرف خیال سے بیروں اور حیطۂ شمار سے افزوں ہے۔ معنی تازہ سے قالب الفاظ میں جان ڈالنا اور انفاس عیسوی سے معانی پژمردہ کو تازہ تر از گل بنانا حضرت ہی کا کام ہے۔ ان کے محاورات نازک سے خوے دل بران خجل اور مضامین پاکیزہ سے مزاج لطیف طبعاں منفعل، سودا کو ان کے رشک سخن سے جنوں، اور میر ان کے کلام بلاغت نظام سے سرنگوں۔ فردوسی ان کے عہد میں ہوتا تو بہ مقتضائے رشک آج زندگی سے ہاتھ دھوتا۔ ملاحت کلامِ سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبانِ حافظ شیراز ان کے مقال سے روزینہ دار۔ جو جو خوبیاں شعرائے سلف میں کسی کے ساتھ مختص تھیں وہ بالتمام حضرت کی ذات بابرکات میں موجود ہیں۔ ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ادنیٰ شاگرد آپ کا دمِ خاقانی بھرتا ہے۔ ہر ایک تلامذ (کذا) حضرت کا انوری و نظامی کے کلام پر سو اعتراض کرتا ہے۔ نظم اس صاحب کمال کی رنگین تر از گل ہے۔ نثر مطبوع تر از گل ہے۔ کلام معجز نظام حضرت سے پایا جاتا ہے کہ قسام ازل نے فن شاعری ان کے ہی حق میں عطا فرمایا ہے قطع نظر اس کے علم اخلاق میں طاق، مروت میں شہرۂ آفاق ہیں۔ سن شریف آپ کا ۷۰ اور ۸۰ کے درمیان ہے۔ چراغِ سحری ہیں، خدا نگہبان ہے، سماعت میں فرق بالکل آگیا ہے۔ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہوتا ہے بذریعہ تحریر جواب زبانی حاصل کرتا ہے۔

ؔ۱ مراۃ الاشباہ، حکیم احسن اللہ خاں کے فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے، جو ۱۸۶۸ء میں مطبع مرتضوی دہلی نے شائع کیا تھا۔ اس میں دہلی کے صاحبان کمال کا حال" لکھا گیا ہے۔

(۱۵)

میر مہدی مجروحؔ[1]

فخر عرفی و رشک طالب مُرد اسد اللہ خاں غالب مُرد

فغاں اس زمانۂ غدار سے، آہ روزگار ناہنجار سے، ہر روز نیا نیرنگ دکھاتا ہے، ہر دم دامِ غم والم میں پھنساتا ہے، اس محیطِ آفت کی موج بلاخیز ہے، اس وادیٔ ہولناک کی ہوا فتنہ انگیز ہے، اس کا آب، سراب، اس کی بنیاد خراب، اس کی راحت جز و جراحت، اس کی راحت سرمایۂ دو صد آفت، اس کی شکر زہر آلود، اس کی امید و آرزو فرسود، ہر روز نخلِ حیات کو سرِ سرِ ممات سے گراتا ہے، ہر دم محفلِ سرور سے صدائے ماتم اٹھاتا ہے، کبھی پدر کو فراقِ پسر سے خون کے آنسو رلاتا ہے، کبھی بھائی سے بھائی کو چھڑاتا ہے، ہر گلزار میں (دکذا) دامِ فریب نہاں ہے، ہر نوش لذت میں نیش محنت پنہاں ہے، خزاں سے توام فصلِ بہار ہے، روز روشن کے ساتھ ہی شبِ تار ہے، مآلِ خندۂ شادی گریۂ غم ہے، اور نتیجۂ عیش صد گونہ الم ہے، حباب ابھی نمودار ہوا ابھی کچھ نہ تھا، پھول ادھر کھلا اُدھر گر پڑا، لالہ لباسِ رنگیں میں بھی داغ دل پر رکھتا ہے، غنچہ خونِ جگر سے پرورش ہوتا ہے، بلبل نوحہ گر چمن ہے، اور مرغ سحر خوانِ اسیر محن ہے

دریں زمانہ بہار و خزاں ہم آغوش است زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

وائے ہم گراں خوابانِ غفلت پر کہ اس رشتۂ عمر پر جو تارِ عنکبوت سے زود گسل ہے، اس کے بھروسے پر کیا کیا طول امل ہے

ازاں سرو آمد ایں کاخ دل آویز کہ جاناگرم کردہ گویدت خیز

اس نابود کو بود، جحیم کو نعیم، دمن کو چمن، گلخن کو گلشن، خواب کو بے داری، غفلت کو ہوشیاری جانتے ہیں، اور اس قدر بادۂ غفلت سے مست و لایعقل ہیں کہ حق و باطل سے نہیں پہچانتے کیا عجب اگر آسماں درپے آزار ہے، بھلا اس سے کیا توقع آسودگی، جس کا خود گردش پر مدار ہے، دیکھو بیٹھے بٹھلائے کیا آفت اٹھائی ہے، کس منتخبِ روزگار کی جدائی دکھائی ہے، نخل برومند معانی کو بادِ خزانی سے گرایا، مہر سپہر سخن دانی کو خاک میں ملایا، جو خسرو کے بعد ملکِ سخن کا خسرو، مالکِ رقاب تھا۔ اس کا نامہ عمر طے ہوا، جو میدانِ سخن وری کا شہسوار

---

[1] ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو مرزا غالب کا انتقال ہوا۔ اس کے دو دن بعد اکمل الاخبار (دہلی) نے سیاہ حاشیوں میں یہ خبر شائع کی۔ (اس وقت تک روزناموں کی اشاعت شروع نہیں ہوئی تھی) یہ خبر مرزا غالب کے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروحؔ کے قلم سے نکلی تھی۔

ہلال رکاب تھا اس کا رخشِ زندگی پے ہوا، ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا بیان کیا جائے، دریا کوزے میں کس طرح سمائے، حسنِ خلق میں اخلاق کی کتاب، عمیم الاشفاق میں لاجواب، خوبیٔ تحریر میں بے نظیر، صفائی جادو تقریر میں فارسی زبان میں لاثانی، اردوئے معلیٰ کے بانی، افسوس جس کا شہبازِ خیال طائر سدرہ شکار ہو وہ پنجۂ گرگِ اجل میں گیا، صد حیف اس وسادہ آرائے سخن وری کو تختہ پر لٹائیں، ہائے اس رنگینِ سخن کو سفید کفن پہنائیں جو ایک دم فراقِ احباب کی تاب نہ لائے، اس کو یوں تنہا قبر میں چھوڑ آئے، اس غم میں سب کی حالت تباہ ہے، روز بھی اس مصیبت میں سیاہ ہے، اس روز کو روزِ محشر کہوں، مگر کیا کہوں، سنتے ہیں کہ قیامت میں بچھڑے ہوئے ملیں گے، ملاقاتیں کریں گے، یہ کیسی قیامت آئی ہے، جس میں ایسے شفیق سے جدائی ہے، دل ہے پتھر نہیں اس صدمۂ جانکاہ سے کیوں نہ گھبرائے، چشم ہے فولاد نہیں کیوں نہ اشک بہائے، جس سینہ نشترزار ہو، اس کے لب پر کیوں نہ آہ شرربار ہو، جس کا جگر خنجرِ غم سے فگار ہو، وہ کیوں کر نہ بے قرار ہو جس کی جان میں کاوش پنہاں ہو، وہ کیوں کر نہ نالاں ہو، جس کے دل میں غمِ جاں گسل دشنہ شکن ہو، اس کیوں کر نہ خوں چکاں سخن ہو، قلم بھی میری طرح سینہ چاک ہے، اور دیدۂ دوات گریہ ناک ہے۔ اب تو مختصر اجمال و تفصیل مقال ہے۔ واضح ہو کہ جناب مرحوم دو تین مہینے صاحبِ فراش رہے، ضعف و نقاہت کے صدمے سہے، آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک کر دیا۔ اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا تا آں کہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ روز دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے مہرِ فلک کے ساتھ اس خورشیدِ اوجِ فضل و کمال کو زوال ہوا۔ یعنی اس سپنجی سرائے بے بنیاد سے عدم آباد کی طرف کوچ کیا، نہ غرغرۂ نزع کی تکلیف پائی، نہ کشاکشِ جاں کنی کی مصیبت اٹھائی، سب عمائدینِ شہر بیرون دہلی دروازہ جنازے میں شریک ہوئے۔ بعد نماز کے حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ کی درگاہ میں پہنچایا، اور اس گنجِ معانی کو تہِ خاک چھپایا۔ اس مجروحِ دل افگار نے یہ حال سراپا ملال اس لیے درجِ اخبار کیا تا اس قدردان شعرا کے محبانِ باصفا حضرت مغفور مستغرقِ رحمت ہونے کی خبر پائیں اور چشمِ پرنم سے اشکِ حسرت بہائیں۔

قطعۂ تاریخ

کل مرقدِ استاد پہ افسردۂ الم میں　　　ہاتف نے جو بیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غم ناک
بولا، ہے اگر فکر میں تاریخ کی مجروح　　　کہہ دے نہ یہی، گنجِ معانی ہے تہِ خاک
　　　　　　　　　　　　　　۸۵　　　　　　۱۲

خاور جبل پوری

بے خود بدایونی کی خود نوشت منظوم رام کہانی

عبدالحی بے خود بدایونی مرحوم نصف صدی پہلے کے باکمال شاعر اور فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔

ان کے کلام سے سادگی اور پُرکاری کی صنعت کے ساتھ ہی اپنے استاد کے خصوصی رنگ کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

بے خود نے بہ عہد عنفوان شباب ایک عشقیہ منظوم افسانے میں آپ بیتی لکھی ہے جس کی اشاعت یا عدم اشاعت کا علم کافی جستجو پر بھی نہیں ہو سکا، کیوں کہ اس افسانے کی بنیادی تعمیر کے راویان اور واقف کار حضرات اس بارے میں مختلف الرائے لیکن اس بات پر متفق ہیں کہ بے خود کا یہ افسانہ اُن دنوں عوام کی زبان پر آ چکا تھا۔

اسی سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بے خود صاحب نے بوقت پیری شباب کی باتوں سے لطف اندوز ہونے یا نظر ثانی کرنے کے لیے خود نوشتہ افسانے کو بہتیرا تلاش کیا مگر دستیاب نہ ہو سکا۔

ایک علم دوست بدایونی صاحب نے (جو خود کو نبیرۂ بیخود بتلاتے ہیں) بر سبیل تذکرہ مجھ سے کہا تھا کہ ان کی نانی صاحبہ نے اس افسانے کو اپنے نجی واقعات پر مبنی بتا کر اس کی صحت پر تصدیق کی تھی۔

ان کی نانی صاحبہ نے جو قصہ انھیں سُنایا وہ جزوی اختلاف کے ساتھ تقریباً وہی ہے جسے بے خود صاحب نے نظم کیا ہے۔

نانی صاحبہ کی زبانی سنا ہوا قصہ اس طرح بتایا گیا ہے کہ بے خود صاحب اپنی عمر کے اس جنونی دور میں جب کہ عقل دہر کے آفات میں محصور اور جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو جاتی ہے۔ بڑے ذوق و شوق اور خوش الحانی سے مجالس عزا پڑھا کرتے تھے۔

ایک شب جب کہ وہ ہمارے یہاں مجلس خوانی کر رہے تھے، میں نے ان کی دل میں کھب جانے والی آواز اور نرالی طرز ادا سے متاثر ہو کر اور وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر ایک پان میں سونے کی انگوٹھی رکھ دی،

یان انھیں پہنچا دیا۔ یہیں سے عشق کی ابتدا ہوئی۔ مدتوں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر راتوں میں تنہائی کی ملاقاتوں کا رشتہ قائم ہوا۔

ہمارا عالی شان مکان ندی کے کنارے واقع تھا اور اس کی بالائی منزل پر میری خواب گاہ تھی۔

بے خود اکثر رات کو ندی کے راستے سے کشتی میں سوار ہو کر آتے اور پانی سے ملے ہوئے مکان کی دیوار کے سہارے کشتی لگا کر اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ دیتے اور کمند کے ذریعے اوپری منزل پر آجاتے تھے۔

ایک شب کچھ ایسی غفلت طاری ہوئی کہ خاصہ دن نکل آنے تک آنکھ نہیں کھلی۔ انھیں میرے کمرے میں محو خواب دیکھ کر میری والدہ کے شور مچانے پر میرے بھائی وغیرہ تلواریں سونت کر کمرے میں در آئے۔ اس ہنگامہ آرائی سے آنکھ کھلی، بے خود بھی بیدار ہو چکے تھے، وہ تلوار لے کر پلنگ سے نیچے کود ے، ان کے مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر وہ اکیلے کئی حملہ آوروں پر کیسے فتح پاتے، کافی بچاؤ کرنے پر بھی بری طرح مجبور ہوئے۔ جب کشتی والے ساتھیوں نے شور و غل سنا تو وہ مسلح ہو کر ان کی امداد کو آگئے اور انھیں دیکھ کر معاملہ طول پکڑنے کے خوف سے میرے عزیز حملہ آور مجھے گھسیٹتے ہوئے میرے کمرے سے باہر نکل آئے، اور بے خود عالم بے حالت بے ہوشی اسی راستے اپنے گھر پہنچا دیے گئے۔"

بیخود نے اپنے افسانے میں نہ تو خود کے آنے جانے کی تفصیل اس طرح بتائی ہے، نہ اس افسانے کی ہیروئن سے اپنے نکاح کا ذکر کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ ان خاتون کی طرح بیخود کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کہیں اور کردی گئی ہو جسے بیخود نے "منکوحۂ سابقہ سے خانہ ویرانی کی پریشانی پر محمول کیا ہے۔ پھر بیخود کے والد کا انتقال ہو جانے اور شاید پہلی بیوی کی موت کے بعد ان خاتون کے شوہر کا بھی انتقال ہو جانے یا جبری نکاح سے ناخوش ہو کر اور بیخود سے مسلسل ملاقاتوں کی تشہیر ہو جانے سے طلاق لے کر بیخود کے ساتھ نکاح ثانی کر لیا ہو۔

بیخود نے اپنی منکوحہ بیوی کے دائم المرض رہنے سے بیمارداری کی مصروفیت کا ذکر بھی دیوان کے مقدمہ میں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہی خاتون، بہ جبر و اکراہ "ناموس قید و بند میں پڑ جانے کے غم سے دائم المرض ہو گئی ہوں۔

بیخود چوں کہ روز ازل سے ذوق حسن بے محابا اور دل درد آشنا لے کر آئے تھے، حسن پرستی اور تعیش پسندی ان کے خمیر میں پڑی تھی، اس لیے افسانے کے مطابق واقعات کا ظہور پذیر ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سن شعور کو پہنچ کر انھوں نے اپنی عشقیہ کہانی کو منظر عام پر لانا مناسب نہ سمجھ کر مجموعۂ کلام میں شامل نہ کیا ہو کیوں کہ انھوں نے ابتدائے شباب کے طفیل پیش آنے والے واقعات اور مہیا ہو جانے والے اشعار کی اشاعت ممکن اور مناسب نہ سمجھنے کا اقرار کیا ہے۔

بیخود کا یہ منظوم افسانہ ۱۲۶ بند (مسدس) پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں جہاں زبان کی صفائی، فکر کی بلندی، چاؤ

خیالات کی رسائی، معاملات کی بندش، واقعات کا تسلسل اور طرزِ اسلوب کی یکسانیت کا عنصر غالب ہے، وہیں بعض اشعار نواب مرزا شوق کی مثنویوں کی طرح عریانیت کا مظہر بھی ہیں۔ لیکن اس معاملے میں تنہا بیخود کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیوں کہ اس زمانے کی عام روش اور منظوم افسانوں کا خاص رنگ یہی تھا کہ اگلے زمانے کے بزرگ اظہار واقعات پر پردہ پوشی زیادہ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ چناں چہ اسی نوع کی دوسری مثنویوں کے علاوہ بدرِ منیر، گلزارِ نسیم اور فریادِ داغ بھی اسی طرزِ نگارش کی آئینہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اشعار میں پھیکا پن بھی ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ افسانہ بیخود کی اوائل عمر اور آغاز شاعری کا ابتدائی کارنامہ ہے جسے نہ تو انھوں نے مصلحتاً بغرض اصلاح استاد کو دکھایا ہوگا اور نہ خود انھیں نظرِ ثانی کا موقع مل سکا ہوگا۔

بہر حال یہ ایک نایاب اور اس لحاظ سے کہ ایک باکمال شاعر کا ابتدائی خود نوشتہ افسانہ اور نادر نسخہ ہے۔ اربابِ ذوق کے مطالعے کے لیے من وعن پیش کر رہا ہوں تاکہ زیادہ واقف کار حضرات اس پر مزید روشنی ڈال سکیں۔

شباب کی باتیں

وہ بھی کیا دن تھے کہ دل کو غمِ دل دار نہ تھا   عشق سے کام، محبت سے سروکار نہ تھا
در پئے ظلم و ستم چرخِ ستم گار نہ تھا   خواہشِ مرگ نہ تھی، زیست سے بیزار نہ تھا
بزمِ احباب میں اک لطف رہا کرتا تھا
جشنِ جمشید، جہاں اس کو کہا کرتا تھا

تذکرے عشق کے سن سن کے ہنسی آتی تھی   جاگتے جاگتے ہی رات گزر جاتی تھی
بے قراری نہ دلِ زار کو تڑپاتی تھی   کیسی ہی شکل ہو لیکن نہ مجھے بھاتی تھی
دل میں اور درد میں کچھ ربط نہ تھا راہ نہ تھی
چشمِ پر آب نہ تھی، ورد زباں آہ نہ تھی

رنج سینے میں جگہ رہنے کو پاتا ہی نہ تھا   تذکرہ عشق کا لب تک مرے آتا ہی نہ تھا
کبھی قابو سے دل غم زدہ جاتا ہی نہ تھا   کوئی معشوق ہو لیکن مجھے بھاتا ہی نہ تھا
تھے نہ آگاہ کہ کہتے ہیں محبت کس کو
وصل کہتے ہیں کسے اور غمِ فرقت کس کو

انھیں روزوں میں ہوا ایک جگہ اک جلسا جس میں احباب وغیرہ کا مرے مجمع تھا
کچھ تکلف جو نہ تھا میں بھی شریک اس میں ہوا پان، واں ایک مرے واسطے بن کر آیا
میں نے وہ پان جو کھولا تو تماشا دیکھا
یعنی اس پان میں اک سونے کا چھلا دیکھا
دیکھ کر اس کو ہوا دل میں میں اپنے ششدر ایک حیرت کا سا عالم ہوا طاری مجھ پر
میں بھی گھبرانے لگا، دل بھی ہوا کچھ مضطر جب ہوئی ختم وہ محفل تو میں جلد آیا گھر
گو یہاں آکے وہی مجمع احباب رہا
پر مرا دل اسی تشویش میں بے تاب رہا
مجھ کو خاموش جو احباب مرے پاتے تھے کچھ سبب پوچھتے تھے، کچھ مجھے سمجھاتے تھے
گو ہر اک طرح سے سب دل مرا بہلاتے تھے مگر آنکھوں سے مری اشک چلے جاتے تھے
نہ فقط بات ہی یاروں کی بُری لگتی تھی
بات کے ساتھ کلیجے پہ چھری لگتی تھی
دم بدم جب کہ بڑھا دل کا مرے رنج و تعب اور کھلا رنج کا باعث نہ کوئی غم کا سبب
ہو کے مجبور کیا سب سے یہ عرضِ مطلب چاہتا ہوں میں اجازت، مجھے نیند آئی ہے اب
اُٹھ گئے وہ تو شبِ غم نے ستایا مجھ کو
بسترِ خواب پہ تا صبح لٹایا مجھ کو
ہوئی جس طرح ہوئی، وہ شبِ اندوہ تمام کسی کروٹ، کسی پہلو نہ ملا کچھ آرام
ناگہاں اک زنِ ذی ہوش، ولیکن گم نام پاس آکر مرے، یوں کرنے لگی مجھ سے کلام
میں تو سمجھی تھی کہ آرام میں ہو، سوتے ہو
ہیں، یہ کیا حال ہے؟ کیا رنج ہے؟ کیوں روتے ہو
اور کچھ حال بھی گو اس نے معمّوں میں کہا حالت ابتر تھی، مرے دل کی نہ میں کچھ سمجھا
جب بہت اس دل بے چین نے بے تاب کیا اٹھ کے بے ساختہ بولا میں کہ اے سحر نما!
کس لیے آئی ہو؟ ہو کون؟ کہاں رہتی ہو!
صاف فرماؤ، خدا کے لیے، جو کہنی ہو
ہو کے بے تاب بہت میں نے جو یہ بات کہی ہنس کے وہ سحر بیاں، پاس مرے بیٹھ گئی

شاق گزری بہت اس وقت مجھے اس کی ہنسی آخر الامر، وہ آہستہ یہ مجھ سے بولی
تم نہ گھبراؤ میں بے وجہ نہیں آئی ہوں
نامۂ شوق، کسی شوخ کا میں لائی ہوں
میں نے گھبرا کے کہا اس سے کہ کس کو؟ مجھ کو؟ سامنے لا کے کہا اس نے کہ دیکھو دیکھو!
ہوش میں آؤ ذرا صبر کرو، کچھ سنبھلو نظرِ غور سے اس خط کے مضامیں کو پڑھو
دیکھئے عشق نے کیا گل یہ کھلایا بیخود
کہ ہوئی پردہ نشیں آپ پہ شیدا بیخود
الغرض میں نے خط اس فتنۂ دوراں سے لیا اور کئی مرتبہ بے ساختہ اس کو چوما
کبھی آنکھوں سے ملا اور کبھی سر پر رکھا اُس فسوں ساز نے عیار نے آہستہ کہا
واہ واہ اے اثرِ الفت و جذبِ الفت
اللہ اللہ یہ عاشق کے خطوں کی عزت
سُن کے یہ میں نے خطِ شوق کو کھولا ہنس کر اس میں لکھا تھا کہ "اے راحتِ جانِ مضطر"
اے دل آرام، دل آزار مرے اے دل بر کچھ تمھیں بھی ہے مرے عشق و محبت کی خبر
بزم میں کل تمھیں اک غرفے سے دیکھا میں نے
اور کیا نذر تمھاری دلِ شیدا میں نے
پان بھی ہاتھ کا میں نے تمھیں اپنے بھیجا اور نشانی کا تھا اس پان میں رکھا چھلا
میں نے دیکھا تھا کہ اس چھلے کو تم نے دیکھا تم نے اس میری نشانی کو کہو کیا سمجھا؟
طاق سنتی ہوں تمھیں دانش و ہشیاری میں
مجھ کو بتلاؤ کہ سمجھے تم اسے کیا جی میں؟
جو مرا حال ہے اس وقت سے کس طرح لکھوں؟ بس یہ سمجھو کہ گرفتار عجب رنج میں ہوں
چل دیے ہوش و خرد تاب و تواں صبر و سکوں اب ہے آمادہ نکل جانے پہ جانِ محزوں
دل جگر دونوں مرے سینے میں گھبراتے ہیں
ہوش رخصت ہوئے پیغام جنوں آتے ہیں
کوئی مونس ہے مرا اور نہ کوئی ہے ہم دم جو بتائے مرا دُکھ اور سُنے قصۂ غم
رو کے کہتی ہوں کبھی ہائے ستم ہائے ستم کل تک اک خیر تھی اور آج یہ کیا ہو گئے ہم

گلۂ جورِ فلک وردِ زباں رہتا ہے
جی میں کہتی ہوں کہ وہ شخص کہاں رہتا ہے؟

قابلِ رحم ہے واللہ ہمارا احوال　　نبض ساقط ہے غش آتے ہیں، طبیعت ہے نڈھال
تم کسی طرح لو بس یہی رہتا ہے خیال　　حسرتِ وصل میں ہو جائے گا اک روز وصال
غمِ فرقت کے لیے تاب دل و جاں میں نہیں
طاقتِ ضبط مریضِ غمِ ہجراں میں نہیں

قید جو مجھ پہ ہے، کیا تم سے کروں اس کا بیاں　　ہے منادی کہ نہ آئے کوئی دل میں ارماں
دھیان بھی جائے نہ نامہ مرا جاتا تو کہاں　　تمھیں منصف ہو کہ کس طرح سے آؤں میں یہاں
ہاں جو تم چاہو تو مل سکتے ہو مجبور نہیں
غم کدہ بھی مرا نزدیک ہے کچھ دور نہیں

کیا کہوں تم سے میں، دل کو جو مرے اک غم ہے　　رنج سا رنج ہے! کل شام سے اک ماتم ہے
دیدۂ دل کے سوا جو ہے وہ نامحرم ہے　　دردِ پہلو میں ہے ایسا کہ کمر بھی خم ہے
ہاتھ بے ساختہ بڑھتے ہیں گریباں کی طرف
پاؤں ناخواستہ اٹھتے ہیں بیاباں کی طرف

یہ تمنا ہے کہ ہو تم سے ملاقات نصیب　　پر بظاہر نظر آتی نہیں کوئی ترکیب
کل سے اس فکر میں ہیں سارے عزیز و قریب　　کہ یہ بیمار ہے کچھ، کاش ملے کوئی طبیب
حسرتِ وصل میں یاں جاں مجھے بھاری ہے
یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو کوئی بیماری ہے

کیا لکھوں اس کے سوا تم کو میں خط میں کچھ اور　　کہ خدا کے لیے ملنے کا نکالو کچھ طور
واجب الرحم ہوں میں دل میں کرو اپنے غور　　نہ کرو مجھ پہ تغافل، نہ اٹھے گا یہ جور
تم یہاں آؤ، وہاں خواہ بلاؤ مجھ کو
شکل اپنی کسی صورت سے دکھاؤ مجھ کو

پڑھ کے اس خط کو ہوا حال جو میرے دل کا　　واقعی یہ ہے کہ ممکن نہیں اس کا لکھنا
جان بے چین ہوئی، زیست کا نقشہ بگڑا　　ایک دریا تھا کہ جس میں مرا دل ڈوب گیا

عشق بے دیکھے ہی آفت مجھے دکھلانے لگا
ہچکیاں آنے لگیں، ضعف سے غش آنے لگا

صبر رخصت ہوا اور سینے میں تڑپا دلِ زار رنگِ رخ زرد ہوا، آنکھیں ہوئیں ابرِ بہار
دفعتاً دل سے گئے تاب و تواں صبر و قرار یک بیک ہوگئے سب عشق کے ظاہر آثار
دل بے تاب سنبھالا نہ گیا پھر ہم سے
دم پہ کچھ ایسی بنی ہوگئے ہم بے دم سے

چیخ اٹھا میں کہ یہ کون سی آفت آئی دل بے تاب سنبھل، تجھ پہ قیامت آئی
ہائے افسوس یہ کیسی مری شامت آئی پردے میں بیٹھنے والی پہ طبیعت آئی
الغرض صبر و تحمل سے ذرا کام لیا
دونوں ہاتھوں سے دلِ غم زدہ کو تھام لیا

بعد کچھ دیر کے منگوا کے دوات اور قلم نامۂ شوق کیا میں نے یہ تب اس کو رقم
اے وفا پیشہ، ولے راحتِ جانِ پرغم اے مرے باعثِ اندوہ و فغان و ماتم
جلد پوری کرے اللہ تمنّا تیری
اور دکھلائے مجھے صورتِ زیبا تیری

کیا ہوا یہ کہ ہوئی تم کو محبت میری کیا پسند آئی بتاؤ تمھیں صورت میری؟
ٹھیک نقشہ ہے مرا اور نہ رنگت میری واقعی گر تمھیں الفت ہے تو قسمت میری
تم نے محفل میں کسی اور کو دیکھا ہوگا
میں نہ ہوں گا وہ کسی اور کا جلوا ہوگا

ہاں یہ سچ ہے کہ مجھے پان تمھارا پہنچا اور چھلا بھی بہت غور سے میں نے دیکھا
خیر وہ میں ہی سہی جس پہ ہوئیں تم شیدا مگر اس نور کی تحریر نے اندھیر کیا
نہ رکھا ہائے کسی بات کے قابل مجھ کو
جذبِ الفت نے کیا آپ پہ مائل مجھ کو

اس محبت نے تمھاری یہ عجب کام کیا کہ مجھے شیفتۂ عارضِ گلفام کیا
عیش برباد کیا، تلخ سب آرام کیا دل کو بے چین کیا جان کو ناکام کیا

میں کہاں، اور کہاں جور، یہ کیا کہتی ہو
دل میں اپنے ہی کرو غور، یہ کیا کہتی ہو

تم ہوئیں دیکھ کے صورت مری مجھ پہ شیدا — میں فقط نام ہی کو سُن کے ہوا تم پہ فدا
حال ابتر دلِ بسمل کا ہے میرے بہ خدا — کیسا معشوق، مجھے جان لو عاشق اپنا
شیفتہ سن کے مگر بھول نہ جانا صاحب
شکل اپنی کسی صورت سے دکھانا صاحب

میں نے مانا کہ گرفتار بڑی قید میں ہو — پر خدا کے لیے کچھ وصل کی ترکیب کرو
تم کو دشوار ہے جو، ہے وہی مشکل مجھ کو — میں بھی ہوں قید میں آزاد نہ مجھ کو سمجھو
مگر اس قید کو میں دھیان میں کب لاتا ہوں
تم بلاؤ تو ابھی اُٹھ کے چلا آتا ہوں

اور بہتر تو یہی ہے کہ تمہیں آؤ یہاں — عیش و عشرت کے یہاں سب ہیں مہیا ساماں
دخلِ اغیار یہاں کچھ نہیں اپنا ہے مکاں — رہیں آرام سے اور دل کے نکالیں ارماں
اپنے بیگانے کا کچھ خوف نہ بےتابی ہو
ہم کناری و سیہ مستی و ہم خوابی ہو

اور جو شہر میں رہنے کی ہو خواہش بہ خوشی — تو میں موجود ہوں جو کچھ کہ تمہاری مرضی
میں بھی اک عرصے سے ہوں اہلِ وطن کا شاکی — تم ہو آمادہ تو سامان کروں کچھ میں بھی
ہم سفر تم سا ہو گر مایۂ راحت میرا
رشکِ آرامِ وطن ہو غمِ غربت میرا

رائے میری تو یہی ہے کہ ذرا صبر کرو — تھوڑے روزوں کے لیے اور وطن کو چھوڑو
جتنے نوکر ہیں بہ تدریج ملا لو سب کو — ہوں یہ سامان مہیا تو خبر مجھ کو کرو
میں یہ سچ کہتا ہوں جس دم یہ خبر پاؤں گا
جس جگہ مجھ کو بلاؤ گی چلا آؤں گا

مل گئے سب تو کسی کو نہیں ہونے کی خبر — چندے آرام سے ہو جائے گی اوقات بسر
اور کیا خط میں لکھوں تجھ کو میں اے رشکِ قمر — بجز اس کے کہ بہت حال ہے دل کا ابتر

کسی صورت مرا اللہ سنبھالے مجھ کو
ورنہ بہتر ہے کہ دنیا سے اٹھا لے مجھ کو

لکھ چکا خط، تو پھر اس فتنۂ دوراں کو دیا　　لائی تھی جو کہ مرے پاس خط شوق اس کا
اس کے جاتے ہی بڑھا اور بھی سودا میرا　　بے خودی چھائی کچھ ایسی کہ نہ کچھ ہوش رہا
دفعتاً آ کے قلق نے جو مجھے گھیر لیا
صبر نے کوچ کیا، عقل نے منہ پھیر لیا
روز افزوں ہوا درد و الم و رنج و عذاب　　ابر کا ڈھنگ اڑانے لگی چشمِ پُر آب
ہو گئے ترک غم ہجر و الم میں خور و خواب　　چھ مہینے نہ ملا کچھ مرے نامے کا جواب
آہ و زاری نے رکھا خانۂ گردوں سر پہ
محشر تازہ رہا روز دلِ مضطر پر
ایک شب میں نے بتنگ آ کے غم فرقت سے　　جی میں ٹھانی کہ گلا کاٹ کے مر ہی رہیے
اور اس قصد سے اٹھا تھا میں خنجر لے کے　　ناگہاں آئی وہی خادمہ کمرے میں مرے
مطمئن آنے سے اس کے دلِ بیمار ہوا
ہوئی اس درجہ خوشی بولنا دشوار ہوا
جب ہوئے ہوش ٹھکانے تو میں بولا اس سے　　واہ واہ خوب کیا میرا مداوا تم نے
دیر لگتی نہیں انسان کو کچھ مرجاتے　　اب بھی ان کو ہیں وہی عیش و دفا کے وعدے
دل سے ہیں، مجھ سے دلِ غم زدہ محجوب ہوا
یہی شایاں تھا انھیں خوب کیا خوب کیا
سن کے تقریر مری بولی نہیں ان کا قصور　　آپ سب حال تو سُن لیجئے کانوں سے حضور
بہ خدا مرتی ہیں بیگم مری، پر ہیں مجبور　　مجھ کو کیوں بھیجتیں ہوتا جو نہ ملنا منظور
مبتلا تپ میں شب و روز جو دیکھا اُن کو
لے گئے بہرِ علاج ان کے اعزا اُن کو
جا کے دہلی میں کیا اُن کا مداوا پیہم　　پر وہ تپ تو تپِ فرقت تھی وہ کیا ہوتی کم
جب بڑھا آپ سے دوری کا بہت رنج و الم　　کر کے اصرار یہاں آئی ہیں کل سے بیگم

تنگ ہوتی ہیں بہت باتیں اگر ہوتی ہیں
اسی حیلے سے الگ کمرے میں وہ سوتی ہیں

کیا کہوں آپ کا جو شوق لگا ہے ان کو   بے قراری تو کہیں حد سے سوا ہے ان کو
جتنے دربان ہیں قابو میں کیا ہے ان کو   جتنے نوکر ہیں زر و مال دیا ہے ان کو
مجھ کو بھیجا ہے یہاں آپ وہاں بیٹھی ہیں
آپ کے شوق میں ہر سو نگراں بیٹھی ہیں

جب سنا میں نے یہ قصہ تو گیا دل سے قرار   بے قرارانہ چلا جانب کوئے دل دار
پہنچا جب در پہ تو اندر گئی وہ کارگزار   میں کھڑا ہو گیا اک شوق میں زیر دیوار
خوف یہ تھا کہ مجھے دیکھ نہ پائے کوئی
اور دعا یہ تھی کہ جلد آ کے بلائے کوئی

آئی پھر اُڑ کے مرے پاس وہ مانند صبا   اس کے ہمراہ جب اک کمرے کے اندر پہنچا
اور اک مسندِ پر نور پہ جا کر بیٹھا   اتنے میں دوسرے کمرے کا بھی پردہ اُٹھا
باہر اس پردے کے وہ رشکِ زلیخا آئی
اپنے مجنوں کی طرف غیرتِ لیلیٰ آئی

میں نے جب اس بتِ طناز کا چہرہ دیکھا   بند آنکھیں ہوئیں وہ نور کا جلوہ دیکھا
کیا کہوں ہائے کہ ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھا   کبھی رنگت پہ نظر کی کبھی نقشا دیکھا
حُسن کا رعب یہ چھایا کہ میں مدہوش ہوا
اور وہ آئی جب آگے تو میں بے ہوش ہوا

غش مجھے آیا تو وہ شوخ بھی کچھ گھبرا کر   پاس آئی مرے اور بیٹھ گئی مسند پر
مضطرب ہو کے رکھا زانوے نازک تہِ سر   کیوڑے کا پھر اسی وقت منگایا کنٹر
پھر کہا رو کے ذرا آنکھ تو کھولو صاحب
شرم کس بات کی ہے منہ سے تو بولو صاحب

اشک رونے سے جو ٹپکے مرے رخساروں پر   دور غفلت ہوئی اور کھول دیے دیدۂ تر
پایا جب زانوے دلدار کو میں نے تہِ سر   بے حجابانہ گلے اس کو لگایا اُٹھ کر

میری الفت کی کچھ اس وقت یہ تاثیر ہوئی
وہ بھی اک شوق میں پھر مجھ سے بغل گیر ہوئی

آرزو اس کی مجھے اور اسے میری حسرت ‏ ‏ جو تمنا تھی مری تھی وہی اس کی حسرت
خوب جی بھر کے غرض جی کی نکالی حسرت ‏ ‏ دل یہی کہتا تھا لیکن کہ ہے باقی حسرت
قصہ ہائے قلق ہجر بیاں ہوتے تھے
ہنسنے لگتے تھے کبھی اور کبھی روتے تھے

دونوں جانب سے ہوئے عہد وفا کے محکم ‏ ‏ شکوے ہوتے تھے کبھی اور کبھی قول و قسم
نہ انھیں کوئی الم تھا، نہ ہمیں کوئی غم ‏ ‏ ناگہاں چرخ ستم پیشہ نے ڈھایا یہ ستم
اس قدر اس کو گراں صحبت دلدار ہوئی
کہ یکایک سحر ہجر نمودار ہوئی

یک بہ یک کان میں آئی جو موذن کی صدا ‏ ‏ اُڑ گئے ہوش ذرا صبر کا یارا نہ رہا
اس وفا کیش نے اک یاس سے مجھ کو دیکھا ‏ ‏ آہ کی اور جگر تھام کے میں نے یہ کہا
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

گو بہت شاق تھی اس وقت جدائی اُن کو ‏ ‏ پاس عزت یہی کہتا تھا کہ اب جلد چلو
اس کو چھاتی سے لگا کر یہ کہا اے خوش خو ‏ ‏ دن نکل آئے گا للّٰہ بس اب رخصت دو
کل سر شام ہی سے دیکھنا آؤں گا میں
دیر اتنی نہ مری جان لگاؤں گا میں

الغرض ہو کے میں اس آئینہ رو سے رخصت ‏ ‏ لے کے اک سینۂ مجروح بہ داغِ فرقت
یاد میں جلوۂ رخسار کے محو حیرت ‏ ‏ باصد اندوہ فغان و غم و درد و فرقت
لوٹتا پیٹتا بے تاب میں گھر تک آیا
اور خوں نابۂ دل دیدۂ تر تک آیا

گھر میں آیا تو ہوا اور بھی ابتر احوال ‏ ‏ پھر چھپایا کہ نہ کھل جائے کہیں راز وصال
دل میں ہر لحظہ وہی وصل کی راحت کا خیال ‏ ‏ آنکھوں کے سامنے ہر وقت وہی حسن و جمال
کان مشتاق کہ سن پائیں صدا دل بر کی۔

آنکھیں بے تاب کہ پھر دیکھیں ادا دل بر کی

اس مصیبت سے غرض روزِ مصیبت کا تمام ہر گھڑی دل پہ رہی ایک قیامت برپا
بارے پھر رحم فلک نے مرے او پر کھایا یعنی...... دل دار کا وقت آ پہنچا
پھر تو میں صدمۂ دوری کو ذرا سہ نہ سکا
چاہا ہر چند پہ بے اس کے ملے رہ نہ سکا

خوب دیکھے تھے وہ اس شب کو جو ساماں سارے جی میں آئی کہ تکلف سے ذرا واں چلیے
دل کے کہنے سے غرض ہم نے بھی بدلے کپڑے اور اک شانِ تجمل سے وہاں جا پہنچے
منتظر شوق میں بیٹھے ہوئے پایا اس کو
جا کے بے ساختہ سینے سے لگایا اس کو

بس کہ ہے ذکرِ وصالِ صنمِ پردہ نشیں اس کا اظہار مجھے یاروں پہ منظور نہیں
تا نہ ہو جائے مکدر وہ بتِ زہرہ جبیں اتنا کہتا ہوں کہ بس عیش کی سب باتیں تھیں
مجھ میں اور اس میں تکلف کوئی زنہار نہ تھا
میری خاطر سے کسی بات پہ انکار نہ تھا

اس کا یہ قول تری شکل پہ شیدا ہوں میں میں یہ کہتا ہوں کہ اس حسن پہ مرتا ہوں میں
جھوٹ کہتا نہیں واللہ کہ سچا ہوں میں آپ کے لطف و عنایات کا بندا ہوں میں
تو وہ کہتی کہ میں اک خادمہ ہوں لونڈی ہوں
ہر ادا پہ یہ خدا جان فدا کرتی ہوں

یہی باتیں رہیں اس شوخ سے تا وقتِ سحر جب ہوئی صبح نمودار تو میں مثلِ نظر
چھپ کے اغیار سے، دل دار سے رخصت ہو کر لے کے پھر داغِ غمِ دوریٔ جاناں دل پہ
سو جگہ ضعف سے گرتا ہوا گھر پہ آیا
پھر خدا جانتا ہے اس کو کہ کیوں کر آیا

تھا تو بے تاب دلِ غم زدہ پہ صبر کیا آدمی بھیج کے احباب کو بھی بلوایا
عصر تک باتوں میں یاروں کی ذرا دل بہلا جب ہوئی شام تو پھر محفلِ جاناں کو چلا
اور سے وصل سے اس شوخ کی مسرور ہوا
دن کو جو درد تھا وہ رات کو سب دور ہوا

الغرض ملنے کا اپنے تو یہی طور رہا　　کہ جہاں شام ہوئی اور میں وہاں جا پہنچا
رات بھر عیش کیے، صبح کو گھر پہ آیا　　گھر پہ پھر شام تلک مجمع احباب رہا
کوئی دشمن جو نہ تھا عیش کا چرچا نہ ہوا
میرے اس بھید سے واقف کوئی اصلا نہ ہوا

یار کو مد نظر میری ملاقات رہی　　مدتوں عیش میں آرام میں اوقات رہی
دن کو احباب وغیرہ سے ملاقات رہی　　وصل دل بر میں گزرتی مری ہر رات رہی
چرخِ بد کیش بھی کچھ طرز ستم بھول گیا
غم کو میں بھول گیا اور مجھے غم بھول گیا

بھول کر بھی تو جدائی کا نہ آتا تھا خیال　　شادماں رہتا تھا دل، پاس نہ آتا تھا ملال
ہجر کا دھیان نہ آتا تھا، یہ تھا محو وصال　　بس اسی عیش میں گزرے مجھے پورے دو سال
دم بہ دم عشق و محبت میں یہ افزونی تھی
مجھ کو بھی، اس کو بھی محویت و مفتونی تھی

اس پری وش سے جو اک رات میں ملنے کو گیا　　سو گئے دونوں کچھ ایسے کہ نہ کچھ ہوش رہا
دن نکل آیا ولیکن نہ میں سو کر جاگا　　ماں نے اس شوخ کی ناگاہ مجھے دیکھ لیا
شور سُن کر جو اٹھا میں تو یہ آفت دیکھی
سحرِ ہجر تو کیا، صبحِ قیامت دیکھی

کہہ رہی کوئی ہم کو نہیں یہ طور پسند　　واہ وا خوب کیا نام گھرانے کا بلند
یا خدا اس کو ابھی خاک کا کر دے پیوند　　ارے لوگو میں اسے جانتی تھی غیرت مند
باپ جلاد ہے پر خوف نہ کھایا اس نے
بے دھڑک گھر میں جسے چاہا بلایا اس نے

میں نے جب طور یہ دیکھے تو بہت گھبرایا　　خواب سے اس بتِ مدہوش کو بھی چونکایا
اور کہا دیکھو مقدر نے یہ کیا دکھلایا　　اتنے میں مجمع اعدا بھی ادھر کو آیا
تیغیں کھینچے جو وہ کمرے کی طرف آتے تھے
دونوں ہم فکر کے عالم میں گھلے جاتے تھے

آخر اس نے یہ کہا مجھ سے کہ بیٹھے کیا ہو　　کسی گوشے میں خدا کے لیے تم جلد چھپو

مفت میرے لیے تم تو نہ مصیبت میں پڑو   میں بھگت لوں گی وہ سب گزرے گی مجھ پر جو جو
نہ چھپو گے تو میں کیا ان سے کہوں گی صاحب
بات بھی کوئی بنا میں نہ سکوں گی صاحب

اس کے کہنے سے میں اک گوشے میں جا کر بیٹھا   دھیان بھی جائے جہاں تک نہ کسی کا اصلا
ناگہاں غول وہ سب کمرے کے اندر آیا   اور بہت دیر سبھوں نے مجھے مل کر ڈھونڈا
گو رہا خوف بہت پردہ دری کا مجھ کو
پر کسی دشمنِ جانی نے نہ دیکھا مجھ کو

جب وہ سفاک مرے ملنے سے مایوس ہوئے   تو سب اس دلبر رعنا کے مقابل ٹھہرے
چند بے رحم جو اس بُت کے بزرگوں میں تھے   دینے آزار وہ اس صاحبِ الفت کو بڑھے
جان دینے کے سوا پھر کوئی چارا نہ رہا
جوشِ غیرت سے ہوا ضبط کا یارا نہ رہا

جب کہ یہ جور و ستم آنکھوں سے دیکھا نہ گیا   کھینچ کر تیغ میں اعدا کے مقابل آیا
مجھ سے لڑنے لگے سب بانیٔ بیداد و جفا   میں بھی زخمی ہوا اور ان کو بھی مجروح کیا
پہلے سب خوب لڑے عاشق شیدائی سے
اور پھر مل گئے اندیشۂ رسوائی سے

چھپ کے پھر سب سے روانہ ہوا میں سوئے مکاں   تنِ مجروح سے پر خون کا دریا تھا رواں
گھر پہ آیا تو نہ باقی تھی ذرا تاب و تواں   کربِ زخموں میں کچھ ایسا تھا کہ لب پر تھی جاں
جاں بہ لب فرطِ جراحت سے جو پایا اس نے
جلد کوشش سے کیا میرا مداوا اس نے

تھوڑے روزوں میں جو زخموں کو ہوا کچھ آرام   میں نے اس دل بر رعنا کو یہ بھیجا پیغام
اے سرورِ جگرِ خستہ و جانِ ناکام   اے مری مورد غم بسملِ رنج و آلام
زخم پر زخم نے دی جس قدر ایذا مجھ کو
تم نے اس حال میں افسوس نہ دیکھا مجھ کو

سر بہ سر چور تھا زخموں سے یہ جسمِ لاغر   اب تلک بھی تو خطِ تیغ عیاں ہیں اکثر
خیر جو کچھ کہ گزرنی تھی وہ گزری مجھ پہ   اب کہو ہاتھ سے اعدا کے بچیں تم کیوں کر

تم کو اعدا نے مری طرح ستایا تو نہیں
دل تمھارا بھی مری طرح دکھایا تو نہیں

کس قدر دشمن عشاق ہے یہ چرخ پیر   حیف اس پر نہ ہوئی کچھ مرے غم کی تاثیر
ستم و جور و جفا سے ہے ستم گر کا خمیر   یہ تو فرماؤ کہ اب ملنے کی کیا ہو تدبیر
گر ملاقات تمھاری نہ میسّر ہوگی
زیست پھر بے خود ناشاد کی کیونکر ہوگی

بعد دو دن کے وہی نامہ رساں پھر آئی   پہلے جو اس کا خط شوق مجھے تھی لائی
پاس آ کر مرے اس طرح سے وہ کہنے لگی   شکر ہے شکر کہ پھر شکل یہ ہم نے دیکھی
اب گماں آپ سے ملنے کا نہیں تھا مجھ کو
دور از حال کہ کچھ اور یقیں تھا مجھ کو

یہ تو فرماؤ مزاج آپ کا اب کیسا ہے   اب تو زخموں میں کبھی درد نہیں ہوتا ہے
اللہ اللہ نقاہت کا یہ کچھ نقشا ہے   آپ ہی بیٹھے ہیں یا مجھ ہی کو کچھ دھوکا ہے
سنی یہ باتیں مگر آنکھوں کو کھولا نہ گیا
ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ بولا نہ گیا

دو گھڑی بعد جو کچھ درد کی شدت ہوئی کم   حسرت دیدہ سے خود کھل گئی چشم پر نم
دیکھ کر اس کو یہ بولا میں بصد رنج و الم   پوچھتی کیا ہو کہ اب جاتی ہے جان پر غم
جلد فرماؤ جو کچھ اس بت نے کہا ہو مجھ کو
دے چکو خط جو خط کوئی دیا ہو مجھ کو

سن کے یہ اس نے مجھے نامۂ دلدار دیا   شاد دیکھے سے اسے یہ دل افسردہ ہوا
لیٹے لیٹے جو خط یار کو میں پڑھنے لگا   اس میں لکھا تھا کہ اے افسر ارباب وفا
بخت خفتہ نے یہ بے ہوش سلایا ہے ہے
کہ تمھیں خستہ و مجروح دکھایا ہے ہے

اسی غیرت سے گرفتار عجب رنج میں ہوں   کہ تمھیں زخم لگیں اور میں بیٹھی دیکھوں
جس قدر رنج و ندامت ہے میں کیا تم سے کہوں   جی میں آتا ہے گلا گھونٹ کے مر بھی جاؤں
شیفتہ دل سے ہوں پر عاجز و مجبور ہوں میں

پاس ہی اپنے سمجھنا مجھے گو دور ہوں میں

میں کہاں اور کہاں یہ غم و حرماں ہے ہے ایک دم اور جفا ہائے عزیزاں ہے ہے
دل مرا اور عذابِ شبِ ہجراں ہے ہے ہو گیا رازِ دلی سب پہ نمایاں ہے ہے
کیا کروں بہرِ خدا کچھ تو بتاؤ مجھ کو
آہ جی جاؤں جو پاس اپنے بلاؤ مجھ کو

آپ کے سر کی قسم جان سے بیزار ہوں میں لاکھ ضد کر کے بلانے کی خطاوار ہوں میں
یہ تو کس منہ سے کہوں میں کہ وفادار ہوں میں ہاں یہ کہہ سکتی ہوں مجبور ہوں ناچار ہوں میں
مجھے اس امر کی پہلے سے خبر آہ نہ تھی
مجھ سے آزردہ نہ ہونا میں کچھ آگاہ نہ تھی

تم اس آشوب سے جس وقت کہ نکلے چھپ کر ذبح کرنے کو مرے لوگوں نے کھینچے خنجر
بارے اتی کو مری رحم کچھ آیا مجھ پر اس بہانے سے بچی ہے مری جانِ مضطر
پر عجب طرح سے پہنچاتے ہیں آزار مجھے
چین لینے نہیں دیتے یہ ستمگار مجھے

مشورے ٹھہرے ہیں باہم یہ عزیزوں کے مرے ہتکِ عزت کا کچھ اور عوض لیں تم سے
ظالموں نے کئی اس واسطے نوکر ہیں رکھے کہ ملو تم جو کہیں چھوڑیں نہ بے جان لیے
اس خبر سے دلِ بیتاب گھلا جاتا ہے
شدّتِ وہم سے سودا سا ہوا جاتا ہے

میں نے تم کو جو لکھی ہے یہ خبر ہوش رُبا اس کے لکھنے سے فقط ہے یہی مطلب میرا
گو عزیزوں کو جدائی کا بہت غم ہوگا مان لو پھر یہ خدا کے لیے میرا کہنا
کہ اب اس وقت غم و درد و محن کو چھوڑو
کچھ دنوں کے لیے للہ وطن کو چھوڑو

ہم کو کیا آپ کے جانے کا نہیں رنج و الم پر کریں کیا کہ بہت لوگوں سے مجبور ہیں ہم
اے وفادار مرے، اے مرے پامالِ ستم کچھ ہمیشہ نہیں رہتا ہے کوئی شادی و غم
آن کی آن میں سب رنگ بدل جائے گا
بات کہنے میں زمانہ یہ نکل جائے گا

دل نہ بہلے تو میں دیتی ہوں اجازت اس کی　　کہ کسی اور سے غربت میں لگا لینا جی
ہاں مگر بھول نہ جانا یہ محبت میری　　بھیجتے رہنا خبر بھی مجھے گا ہے اپنی

.. ..

.. ..

دل کا جو حال ہوا پڑھ کے یہ مضمون جواب　　اس کے لکھنے کی مرے دست و قلم میں نہیں تاب
دفعتاً پیش نظر آ گئے فرقت کے عذاب　　ابر تر بن گئی رونے سے یہ چشم پُر آب
آہ اور دیدۂ تر نے یہ سماں دکھلایا
برق چمکی کبھی گہ جھوم کے بادل آیا
الغرض پھر تو بڑھا جوشِ جنوں کچھ ایسا　　گھر میں دم بھر بھی دلِ زار سے بیٹھا نہ گیا
کر کے احباب وغیرہ سے سفر کا حیلا　　بس اسی وقت میں گھر چھوڑ کے اپنا نکلا
اپنے مرنے کا نہ تھا خوف کچھ اصلا مجھ کو
اس کی رسوائیوں کا پاس بہت تھا مجھ کو
مختصر یہ ہے کہ با صد غم و اندوہ و الم　　دشتِ غربت کو روانہ ہوئے گھر چھوڑ کے ہم
مدتوں دشت مصیبت میں سہے ہجر کے غم　　خارِ صحرا بھی چبھے آ گیا پیروں پہ ورم
شکل پھر اہلِ وطن کو نہ دکھائی ہم نے
قیس کی طرح بہت خاک اُڑائی ہم نے
دیکھ کر دشت میں مجنوں کوئی کہتا مجھ کو　　اور کوئی ثانیِ فرہاد سمجھتا مجھ کو
جانتا دل میں کوئی وامقِ عذرا مجھ کو　　کیا کہوں لوگ سمجھنے لگے کیا کیا مجھ کو
میری ناکامیٔ قسمت نے عجب کام کیا
کر کے بدنام مجھے خوب مرا نام کیا
الغرض وادیٔ غربت میں جو دل گھبرایا　　جا کے شہروں میں دلِ غم زدہ کو بہلایا
لکھنؤ آیا کبھی اور کبھی دلی آیا　　اور تقدیر نے اک حشر نیا دکھلایا
مدتوں تک تو یہ برگشتہ پھرایا دل نے
کسی صورت سے کچھ آرام نہ پایا دل نے
دل میں آیا یہی آخر کہ وطن کو چلئے　　عزم مرنے کا اگر ہے تو مریں واں چل کے

تاکہ وہ شوخ بھی یہ قصۂ جاں کاہ سُنے   اور ہمیں مسلکِ عشاق میں راسخ سمجھے
جذبِ دل اس کو جنازے پہ اگر کھینچ نہ لائے
محنتِ غربتِ فرقت یہ ٹھکانے لگ جائے

دل کے کہنے سے میں القصہ وطن میں آیا   طائرِ سوختہ جاں اُڑ کے چمن میں آیا
دشت سے کوئے بتِ غنچہ دہن میں آیا   آتے ہی یہ دل پر رنج و محن میں آیا
لکھو اس شوخ کو کیفیتِ غربت اپنی
آزماؤ اسی تدبیر سے قسمت اپنی

جب بہت کش مکشِ شوق سے مجبور ہوا   اس وفا کیش وفادوست کو میں نے لکھا
اے سراپا کرم و شوخیِ و تمکین و حیا   پھر یہ پامالِ غمِ ہجر یہاں آ پہنچا
کیا کہوں دوریِ فرقت میں جو مجھ پہ گزری
بہ خدا زیست کہیں موت سے بدتر گزری

رنج و ناکامی و رسوائی کا صدمہ ہر دم   دردِ فرقت کی محن عالمِ دوری کا الم
چرخِ بے مہر ستم پیشہ کے ظلم اور ستم   لاکھ آزار تھے اور ایک یہ جانِ پُر غم
روز و شب غم کا رہا ہے دلِ مضطر پہ ہجوم
عیش مفقود تھا اور شادیِ راحت معدوم

گلۂ جورِ فلک وردِ زباں رہتا تھا   دل غمِ ہجر سے پہلو میں تپاں رہتا تھا
ہر گھڑی لب پہ مرے شور و فغاں رہتا تھا   خونِ دل آنکھوں سے ہر لحظہ رواں رہتا تھا
چین سینے میں دلِ غم زدہ پاتا ہی نہ تھا
دل میں کوئی بجز افسوس کے آتا ہی نہ تھا

اب میں تنگ ہو کے غمِ ہجر سے یاں آیا ہوں   پھر وہی جوششِ وحشت ہے وہی زورِ جنوں
آپ کے دید کی مشتاق ہے چشمِ پُرخوں   ہائے کیا حالِ دلِ غم زدہ میں تم کو لکھوں
ضعف اتنا ہے کہ بولوں تو نہ بولا جائے
لاغر ایسا ہوں کہ دیکھوں تو نہ دیکھا جائے

اب بھی گر وہی نگاہِ کرم و الفت ہو   تو پھر ملنے کی جلدی کوئی تدبیر کرو
میں وفا کیش ہوں واللہ نہ چھوڑو مجھ کو   ناتواں ہوں کسی صورت مجھے آ کر دیکھو

آؤ اور آ کے علاجِ دلِ رنجور کرو
بےخود خستہ کو پھر وصل سے مسرور کرو

جب کہ ینامۂ اندوہ مرا ختم ہوا واقف راز جو تھی جلد اسے بلوا یا
آئی وہ تو یہ خطِ شوق اسے میں نے دیا اور اس دل بر دل دادہ کے گھر پر بھیجا
دردِ دل اور بھی افزوں ہوا آفت آئی
نامہ بر لوٹ کے کیا آئی قیامت آئی

آ کے پھر نامہ رساں پاس مرے کہنے لگی جس پہ دم دیتے تھے تم ہوگئی اس کی شادی
پر نہیں ہے بہ خدا عشق و محبت میں کمی کیا کہوں دیکھ کے آئی ہوں جو حالت ان کی
صدقے کرتی ہے جگر جان فدا کرتی ہے
اب میں کہہ سکتی ہوں واللہ کہ وہ مرتی ہے

دیکھ کر آپ کا خط مجھ سے کہا رو رو کر میری جانب سے یہ کہہ دینا کہ اے نیک سیر
ہائے کس منہ سے کہوں تم سے جو گزری مجھ پر اب میری قید ہے پہلے سے کہیں افزوں تر
حالت ابتر جو بہت عشق میں دیکھی میری
کر دی بے رحموں نے اک شخص سے شادی میری

مگر اب تک دلِ بسمل کی وہی حالت ہے آپ ہیں ساتھ وہی عیش وہی عشرت ہے
میری نظروں میں بسی آپ کی ہی صورت ہے شکل منحوس سے اس کی بہ خدا نفرت ہے
جس کی آنکھوں میں وہ تصویر سما جائے گی
اس کو یہ طلعتِ مکروہ بھلا بھائے گی

گو کہ رہتی ہوں شب و روز میں گھر میں اُس کے بات بھی کوئی جو کی ہو تو قسم لو مجھ سے
بلبل باغ پڑی خارِ خزاں کے پالے اُن ستم گاروں سے اللہ مرا بدلا لے
بن کے بے گانہ عزیزوں نے ستایا مجھ کو
ہائے کس قید میں لوگوں نے پھنسایا مجھ کو

کیسا برگشتہ ہوا ہائے مرا طالعِ شوم بلبل خستہ کہاں اور کہاں صحبتِ بوم
زندگی بھر کے لیے ہوگئی راحت معدوم ایک دل اور یہ افکار جدائی کا ہجوم
عاشق خستہ کو کیوں وصل سے محروم کیا

خوش نہ ہوں وہ بھی جنھوں نے ہمیں مغموم کیا

تم وفادار ہو اس دھیان سے مسرور ہے دل　　جانتی ہوں کہ تم آسان کروگے مشکل
رشتۂ طعن و ملامت سے ہوئی ہوں گھائل　　صدمۂ تیغ جدائی نے کیا ہے بسمل
پاس اپنے مجھے جس طرح سے ممکن ہو بلاؤ
یہ نہ کرنا کہ میرے حال سے غافل ہو جاؤ

میں بھی مصروف ہوں تدبیر میں حتی المقدور　　گر خدا چاہے تو صورت کوئی نکلے گی ضرور
میں وہیں آکے ـے وصل سکھوں کی مسرور　　تم پریشان رہو یہ نہیں ہرگز منظور
بند و بست اب کوئی اگلا سا بھلا کرتی ہوں
آگئے بدنام ہوئی، اب کوئی میں ڈرتی ہوں

سچ ہے غربت میں سہی تم نے بہت کچھ ایذا　　اور مجھے رنج وطن نے دیے غربت سے سوا
رات دن حد سے سوا شوق ملاقات رہا　　خود بہ خود کل سے یہی شعر زباں پر مری تھا
لاکھ روکیں جو وہ الفت کے بھلانے والے
جاتے ہیں کوچۂ محبوب کے جانے والے

نامہ بر سے جو سنا میں نے یہ مضمون جواب　　ہوش جاتے رہے باقی نہ رہی ضبط کی تاب
دل کے ٹکڑے ہوئے آنکھوں سے بہایا خوں ناب　　مردنی چھا گئی منہ پر یہ ہوا مجھ کو عذاب
نہ رہی تاب فغاں ضبط کی طاقت کیسی
کیا کہوں غم سے مری ہوگئی حالت کیسی

نئی آفت میں پھنسا ہائے دل درد نصیب　　اس کی دوری کا الم، اور غم قرب رقیب
نظر آتی تھی نہ کچھ وصل صنم کی ترکیب　　تھوڑے ہی روزوں میں بس ہوگیا مرنے کے قریب
غیر کی گرمیٔ صحبت کا قلق رہنے لگا
آنکھیں تر رہنے لگیں رنگ بھی فق رہنے لگا

سینے میں دل نہ رہا صبر کہاں، تاب کہاں　　آنکھوں میں اشک بھی باقی نہ رہے آب کہاں
ہوش تک جمع نہ تھے مجمع احباب کہاں　　خوگر رنج کہاں، عیش کے اسباب کہاں
غم فرقت میں رہی روز قیامت دل پر
جوش میں رشک عدو کی رہی آفت دل پر

کوئی صدمہ نہیں جو ہجر میں میں نے نہ سہا — جان بے چین ہوئی قلب بھی بے تاب رہا
کیا کروں عرض میں وہ حال جو کچھ اپنا ہوا — روز و شب خون کا دریا مری آنکھوں سے بہا
قصۂ غم نہ عزیزوں کو سنایا میں نے
عیب کی طرح غمِ ہجر چھپایا میں نے

ایک شب حالِ زار بہت برہم تھا — آہ و زاری تھی کبھی اور کبھی ماتم تھا
زور پہ اس بتِ پردہ نشیں کا غم تھا — کچھ عجب حال، عجب رنگ، عجب عالم تھا
دل کو اندوہ طبیعت کو پریشانی تھی
کیوں پھنسے غم میں بس اس کی پشیمانی تھی

ناگہاں پاس مرے آ کے کسی نے یہ کہا — میرے دل بر میں تری مہر و محبت کے فدا
عمر بھر یاد رہے گی مجھے یہ تیری وفا — حق یہ ہے حق محبت کو کیا تو نے ادا
سن کے تقریر یہ آنکھوں کو جو کھولا میں نے
جلوہ گر یارِ وفا کیش کو دیکھا میں نے

گھر مرا نور سے اس بت کے جو معمور ہوا — دلِ بے تاب میں جو درد تھا سب دور ہوا
میں بھی خوش ہو گیا، دل بھی مرا مسرور ہوا — کلبۂ تار مرا رشکِ دہِ طور ہوا
اس کے آنے کا گماں بھی جو نہ تھا کچھ جی میں
شک ہوا خواب میں اور عالم بیداری میں

اٹھ کے آخر کو کلیجے سے لگایا میں نے — اور اس شوخ کو پہلو میں بٹھایا میں نے
کبھی زخموں کا نشاں اس کو دکھایا میں نے — کبھی فرقت کا بیاں اپنی سنایا میں نے
آ گیا یاد جو دورِ غمِ فرقت مجھ کو
رو دیا میں نہ رہی ضبط کی طاقت مجھ کو

اس وفادار نے جس وقت یہ حالت دیکھی — ڈال کر ہاتھ گلے میں مرے وہ رونے لگی
وہ جو روئی تو ہوئی دل کو غضب بے تابی — چوم کر ہاتھوں کو اس شوخ سے یہ بات کہی
صدمے بیداد کے گو سیکڑوں دل پر گزریں
بہ خدا آپ کی الفت سے نہ ہم در گزریں

مجھ کو معلوم ہے واللہ کہ تم ہو مجبور — اور یقیں ہے کہ تمھیں دل سے ہے ملنا منظور

اے مرے رشکِ پری، رشکِ قمر، رشکِ حور — اور ہنسو بولو کرو ختم یہ غم کا مذکور
بہ خدا کچھ بھی نہیں رنج و شکایت تم سے
یوں ہی کردی تھی بیاں اپنی حکایت تم سے

جانتا ہوں کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے کمال — میری فرحت کی خوشی ہے، مرے غم کا ہے ملال
میری ہی طرح تمھیں بھی ہے بہت شوقِ وصال — اس میں کچھ شک نہیں رکھتی ہو بدل میرا خیال
دل سے مشتاق ہوا اور جان سے شیدا ہو تم
سارے معشوقوں میں بے مثل ہو یکتا ہو تم

دیر تک ایسی ہی اس بت سے بہت باتیں کیں — پاؤں پر سر بھی رکھا اور بلائیں بھی لیں
گدگدایا بھی بہت سیکڑوں قسمیں بھی دیں — کچھ شگفتہ نہ ہوئی پر وہ بتِ زہرہ جبیں
ایسا قابو سے گیا کچھ دلِ نالاں اس کا
نہ ہوا کم نہ ہوا پر غمِ ہجراں اس کا

کیا کہوں اب کی مزے میں نے اُڑائے کیا کیا — وصل میں لطف دلِ خستہ نے پائے کیا کیا
جلوے اس برقِ تجلی نے دکھائے کیا کیا — ناز اس محوِ نظارہ نے اٹھائے کیا کیا
دل بری کا کوئی، فقرہ کوئی دل داری کا
بھولی باتیں کبھی، رونا کبھی عیاری کا

لطف دیتا تھا عجب ناز سے اس کا کہنا — کیسے جس شوخ پہ پردیس میں دل آیا تھا
کیا مرے رنگ سے کچھ رنگ تھا اس کا اچھا — مجھ کو بتلاؤ تو کچھ اس کا تھا نقشہ کیسا
مانا وہ حسن میں بے مثل تھا لاثانی تھا
سچ کہو مہر و وفا میں بھی مرا ثانی تھا

میں یہ کہتا تھا کہ اے جان یہ کیا کہتی ہو — بوالہوس جانتی ہو ہائے قیامت، مجھ کو
تمھیں انصاف سے اس بات کو دل میں سوچو — جس کی آنکھوں میں سما جائے یہ حسنِ نیکو
اس کی انسان پہ کیا خاک طبیعت آئے
حور بھی سامنے آجائے تو نفرت آئے

تم مگر دیتی ہو کس منہ سے مجھے یہ طعنے — دل لگایا کہیں تو کوئی خطا کی میں نے
اک ذرا آنکھ تو للہ ملاؤ مجھ سے — غیر نے لوٹے نہیں وصل کے کیا تم سے مزے

ملحدِ گرسنہ در خانۂ خالی بر خواں
باورم نیست کہ اندیشہ کند از رمضاں

مختصر یہ ہے کہ وہ رات میری تا بہ سحر　　ہوئی اس شوخ سے بس ایسی ہی باتوں میں بسر
چرخ پر صبح کے آثار جو کچھ آئے نظر　　مجھ سے رخصت ہوئی روتی ہوئی وہ رشکِ قمر
پھر وہی رنج وہی غم میرے دل پہ آیا
جان بے تاب ہوئی ہجر میں جی بھر آیا

پھر تو اس بت سے یہی طرزِ ملاقات رہی　　دن کو تا شام الم، رات کو تا صبح خوشی
ہوئی دونوں کے نہ کچھ عشق و محبت میں کمی　　بلکہ دستور چلا آتا ہے اب تک بھی یہی
جب میں غربت سے کبھی سوئے وطن آتا ہوں
حال اس شوخ کی الفت کا وہی پاتا ہوں

میرے آنے کی خبر اس کو جو ہو جاتی ہے　　جان پہ کھیل کے ملنے کو مرے آتی ہے
خادمہ اس کی نشانی کبھی کچھ لاتی ہے　　کبھی ملنے کے لیے خود مجھے بلواتی ہے
ہے اسی طرح کی الفت مری اس کے جی میں
واقعی یہ ہے کہ یکتا ہے وفاداری میں

مجھ کو بھی ہے بہ خدا دل سے ہی الفت اس کی　　کم نہیں دل میں ذرا میرے محبت اس کی
ہر گھڑی پیش نظر رہتی ہے صورت اس کی　　وہ ادائیں وہ نگاہیں وہ نزاکت اس کی
میں جو یوں راتوں کو بے خواب رہا کرتا ہوں
اس کی ہی یاد میں بے تاب رہا کرتا ہوں

بےخود خستہ مناسب نہیں اب طولِ سخن　　ختم کر بہر خدا قصۂ پُر رنج و محن
دیکھ احباب ترے کچھ نہ ہوں تجھ سے بدظن　　باز آ باز، بس او ہوش و خرد کے دشمن
کب تک ان شوخ مزاجوں سے محبت ناداں
تا بکے شوقِ وصال و غمِ فرقت ناداں

محمد عتیق صدیقی

تبصرہ

ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
تقطیع: $\frac{20\times30}{16}$، حجم ۳۸۰ صفحات، قیمت چھ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً اور اردو کے تحقیقی ادب سے شغف رکھنے والوں کے لیے خصوصاً ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نام اور ان کا کام محتاجِ تعارف نہیں۔ ۱۹۵۳ء کے دلی کالج میگزین کے قدیم دلی کالج نمبر میں ان کا ایک مضمون "دلی کالج کے پرنسپل" شائع ہوا تھا، جو شاید ان کا پہلا علمی و تحقیقی مضمون تھا۔ اس وقت وہ طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ اس میگزین کے نائب مدیر بھی تھے۔ یہ مضمون ان کی ادبی صلاحیتوں کی غمازی اور ان کے ادبی مستقبل کی نشان دہی کر رہا تھا، اور اس مضمون کے لکھنے والے سے جو توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں، وہ انھوں نے بہت جلد پوری کر دیں۔ دس سال کی مختصر مدت میں متعدد اہم مضامین کے علاوہ چھوٹی بڑی کئی کتابیں بھی انھوں نے تالیف و تصنیف کیں، اور اردو کی علمی و ادبی برادری میں اپنے لیے ایک ایسی باعزت جگہ بنالی جو بہتوں کے لیے باعثِ رشک ہوسکتی ہے۔ "ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" ان کا پہلا مبسوط تحقیقی کام ہے جو ہمارے پاس آیا ہے، اور یقیناً قابلِ قدر ہے۔

مثنوی ہماری شاعری کی ایک اہم صنف ہے، جس میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے تمام شعرا نے طبع آزمائی کی ہے، اور بعض شعرا نے تو اس میدان میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ ان کے نام کو ان کی مثنویوں ہی نے زندہ رکھا۔ لیکن مثنوی ہی ہماری شاعری کی ایسی صنف ہے، جو ناقدین اور محققین کے تغافل اور کم نگاہی کی نوحہ خواں ہے۔ غزل، جو ایک ناقد کے الفاظ میں "عہدِ وحشت کی یادگار" ہے، اس پر تو، بقول ڈاکٹر نارنگ "دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے گئے، لیکن مثنویوں کا کوئی پرسانِ حال" نہ ہوا۔ دو ایک حضرات نے اس طرف

وجہ بھی کی تو وہ اس کام کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکے۔ ڈاکٹر نارنگ کی یہ تالیف ہماری ادبی تاریخ کے ایک اہم خلا کو کچھ حد تک پُر کرتی ہے۔ "کچھ حد تک" کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ انھوں نے "اردو مثنویوں کو نہیں بلکہ اردو مثنویوں کے ایک مخصوص تہذیبی پہلو کو اپنا موضوع بنایا ہے، جس نے ایک طرف ان کے کام کے دائرے کو محدود تو کیا، لیکن دوسری طرف موضوع کے اچھوتے پن نے ان کے کام کی مشکلات میں اضافہ بھی کر دیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر نارنگ نے ان اردو مثنویوں کی توضیحی فہرست مرتب کی ہے، جو ہندستانی دیو مالا، ہندستانی عوامی قصوں، سنسکرت ڈراموں اور ہندستانی تاریخ سے اخذ کی گئی ہیں۔ انھوں نے ہر مثنوی کے ماخذ کی تفصیلی نشان دہی بھی کی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس فہرست میں ایسی مثنویوں کے نام بھی ہم کو ملتے ہیں، جن کے ذکر سے ہماری ادبی تاریخیں خالی ہیں اور جن کا وجود نقش ونگار طاق نسیاں بن چکا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ جو تقریباً سوا سو صفحات پر پھیلا ہے، "اضافے، تصحیحات و استدراکات" پر مشتمل ہے، یہ حصہ خاصا اہم ہے، اور اس سے ان کی علمی لگن کا اور اپنے کام کو زیادہ سے زیادہ مکمل کرنے کی تڑپ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے موضوع سے متعلق مثنویوں کا کھوج لگانے اور متعلقہ مواد جمع کرنے میں یقیناً بڑی دردسری سے کام لیا ہے، جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کو اس نوع کے کام کا تجربہ ہے۔

ہماری ادبی تاریخ کا خام مواد سارے ملک کا طول و عرض میں نیز ملک کے باہر غیر منظم یا نیم منظم حالت میں بکھرا ہے۔ ہمارے ملک کے نجی کتب خانوں سے قطع نظر بیشتر سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرستیں ابھی تک مرتب نہیں کی گئی ہیں، اور جن کتب خانوں کی فہرستیں ملتی بھی ہیں، ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے لیے "مثنوی سندر سنگار" کو لیجیے، جس کا ڈاکٹر نارنگ نے بھی نام لیا ہے، لیکن اس کے متعلق وہ اس سے زیادہ معلومات فراہم نہ کر سکے کہ ـــــ "از شاہ علی گجراتی، مکتوبہ ۱۷۱۹ء کتب خانۂ مان چیسٹر، ہندستانی مخطوطات (بہ حوالۂ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، معاصر نمبر ۱۰، ص ۲۷)"۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں ہے۔ لیکن اس کو "شاہ علی گجراتی" سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہ مثنوی برج بھاشا کی ہے، جو ۱۶۳۱ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کا رسم خط اردو ہے۔ مصنف کا نام سندر داس کویشور ہے۔ ممکن ہے کہ شاہ علی گجراتی نے اسی کا ترجمہ کیا ہو۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطے کا پہلا شعر یہ ہے:

کلمہ کہا رسول کا، پوجی گور کی پائی   نمسکار کر جور کی کہی ماکبرائی

برٹش میوزیم کے ہندی مخطوطات کی فہرست میں بھی "سندر سنگار" کا ذکر ہے، جس کے دو مخطوطے وہاں موجود ہیں۔ اور ان میں پہلا شعر یوں ہے:

देवी पूजन सरसती पूजौं हरि के पाइ ।
नमस्कार कर जोरिकै कहै महाकविराइ ॥१॥

(دیوی پوجن سرسوتی پوجہری کو پاے نمسکار کر جوری کو کہو مہاکوی راے)

ایشیاٹک سوسائٹی کے مخطوطے کا پہلا مصرع غالباً کسی مسلمان نے بدل دیا ہے، لیکن اس کی زبان بھی قدامت کی غمازی کرتی ہے۔ دوسرا مصرع وہی ہے جو ہندی مخطوطات میں بھی پایا جاتا ہے۔

سندر داس گوالیار کا برہمن اور شاہ جہاں کا درباری شاعر تھا۔ شاہ جہاں ہی نے اس کو مہاکوی راے کا خطاب دیا تھا، جو "ملک الشعرا" کا مرادف ہے۔ اس مثنوی میں سندر داس نے شاہ جہاں اور ان کے اجداد کی مدح سرائی بھی کی ہے۔ اس سلسلے کا ایک شعر یہ ہے:

جن پرکھن کے بنس سے اُپجو ساہ جہان تن ساہن کے نام کو اب کُب کرت بکھان

برٹش میوزیم کے ہندی مخطوطات کی فہرست سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ دیوناگری لپی میں یہ مثنوی ۱۸۶۴ء میں بمبئی سے اور ۱۸۶۵ء میں بنارس سے شایع بھی ہو چکی ہے۔

"ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" ایک اہم تاریخی و تہذیبی حقیقت کی بھی نشان دہی کرتی ہے جس کی طرف عام طور سے نظر نہیں جاتی، اور وہ یہ ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہمارے شعرا اپنے اس تہذیبی ورثے سے باخبر ہی نہیں بلکہ متاثر بھی تھے، جو ہندستان کی قدیم سماجی زندگی اور قدیم شعر و ادب نے ان کو عطا کیا تھا۔ ہم میں سے کم ہی لوگوں کو اس کا احساس رہا ہوگا کہ ہماری بیش تر مثنویوں کے پلاٹ، اور ان کے کردار سنسکرت کے قدیم افسانوں، ڈراماؤں، ادب اور ہندستانی لوک کہانیوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جو مثنویاں ایرانی قصوں کی بنیادوں پر لکھی گئی ہیں، ان کو بھی بڑی حد تک ہندستانی ماحول اور ہندستانی فضا میں پیش کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ "ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" ہندی میں بھی منتقل کی جائے۔ اس سے ہندی والوں کی، اردو کے متعلق، بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں، اور یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔

ڈاکٹر نارنگ کی "اردو مثنویاں" اس اہم ضرورت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ اردو شعر و ادب کے ہندستانی عناصر کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تاکہ یہ حقیقت پوری شدت سے واضح ہو سکے کہ اردو ادب کی جڑیں ہندستان ہی کی سرزمین سے پھوٹی ہیں، اور "آب رود گنگا" ہی نے ان کی آبیاری کی ہے۔